بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفہیم اسلام

"دو اسلام" کا محققانہ جواب

مصنّف
مسعود احمد بی۔ ایس سی

جماعت المسلمین (رجسٹرڈ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتابت ———— خالد فاروق خوشنویس

مطبع ————

اشاعت ———— ثالث

تعداد ———— ایک ہزار

سال طباعت ———— ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۷ء

قیمت ———— ۷۰/ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ طبع ثانی

تمام تعریفیں اللہ تبارک و تعالےٰ کے لئے ہیں اور لاکھ لاکھ شکر و احسان اسی مالک ذوالجلال والاکرام کا ہے جس نے جماعت المسلمین کو تفہیم اسلام کی طبع ثانی کی توفیق عطاء فرمائی۔

۲ الحمدللہ تفہیم اسلام کی اشاعت اول قلیل عرصہ میں ختم ہوگئی ، ہر طبقہ کے لوگوں نے اسے پسند کیا اور اپنے قیمتی تبصروں سے ہماری ہمت افزائی فرمائی چند تبصروں کے علاوہ یہ تمام تبصرے زبانی دئے گئے تھے۔ ان زبانی تبصروں کو ہم نے تحریری صورت میں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ان تبصروں کی اشاعت کو ضروری سمجھا اس لئے کہ یہ کتاب تبصروں کی محتاج نہیں۔

۳۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ صاحب کو بھی بھیجا گیا تھا اور انہوں نے اس پر ایک تبصرہ بھی تحریر فرما کر بذریعہ ڈاک ہم کو روانہ کیا تھا لیکن افسوس کہ وہ تبصرہ ہم تک نہ پہنچ سکا اور ڈاکٹر صاحب عدیم الفرصتی کی وجہ سے دوبارہ تبصرہ نہ لکھ سکے۔

۴۔ کتاب دو اسلام کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کے چند خطوط بھی موصول ہوئے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ خطوط بھی اس کتاب کے ساتھ شائع کر دئے جائیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے ان خطوط کی اشاعت کی اجازت طلب کی تھی لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ لہٰذا ہم بغیر ان خطوط کے ہی کتاب ہذا کو شائع کر رہے ہیں۔

۵۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور منزلِ

مقصود تک پہنچائے ، اللہ تعالے جماعت المسلمین کو ترقی دے اور خدمت دین اسلام کی مزید توفیق عطا فرمائے ۔ آمین

شعبۂ نشر و اشاعت
جماعت المسلمین

نوٹ

برق صاحب کے خطوط کتاب کے آخر میں
ملاحظہ فرمائیے ۔

فہرست مندرجات کتاب تفہیم اسلام

نوٹ: ابواب کے عنوانات وہی ہیں جو برق صاحب کی کتاب "دو اسلام" میں ہیں

باب ا

حدیث میں تحریف کے اسباب

باب ۲

"تدوین حدیث"

باب ۳

"چند عجیب راوی اور صحابہؓ"

باب ۴

"کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق"

باب ۵

"حدیث پر ایک مکالمہ"

باب ۶

"تحریف احادیث کے اسباب"

باب ۷

مؤطا پر ایک نظر

باب ۸

"صحیح بخاری پر ایک نظر"

باب ۹

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر حدیث میں"

باب ۱۰

"حدیث میں نماز کی صورت"

باب ۱۱

"بہترین عمل"

باب ۱۲

"اللہ کی عادت"

باب ۱۳

"لفظ مغفرت کی تحقیق"

باب ۱۴

"مسئلہ شفاعت"

باب ۱۵

"قرآن سے متصادم احادیث"

باب ۱۶

"غلامی اور اسلام"

باب ۱۷

"تقدیر"

باب ۱۸

"متضاد احادیث"

باب ۱۹

"چند دلچسپ احادیث"

باب ۲۰

"صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا"

گروہ ایک جویا تھا علمِ نبی کا
لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا

نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذبِ خفی کا
کیا قافیہ تنگ ہر مُدّعی کا

کئے جرح و تعدیل کے وضع قانون

نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو
اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو

سُنا خازنِ علمِ دیں جس بشر کو
لیا اُس سے جا کر خبر اور اثر کو

پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر

دیا اور کو خود مزا اس کا چکھ کر

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا
مناقب کو چھانا مثالب کو تایا

مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا
ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا

طلسمِ ورع ہر مُقدّس کا توڑا

نہ مُلّا کو چھوڑا، نہ صُوفی کو چھوڑا

(حالیؔ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

چند روز ہوئے ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ صاحب کی کتاب "دو اسلام" دیکھنے میں آئی، پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر ہو کر اس قسم کی باتیں! ڈاکٹریٹ کی ڈگری وسیع مطالعہ اور گہرے علم و تحقیقات کے بعد ملا کرتی ہے، وسیع مطالعہ سے ذہن صاف ہو جاتا ہے اور غور و فکر کی عادت پیدا ہوتی ہے، ایسا آدمی جب کسی بات کو سنتا ہے تو بغیر تحقیق کے اس کو قبول نہیں کرتا اور بغیر غور و فکر کے اس کو رد نہیں کرتا، لیکن تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے صرف حدیث ہی کا نہیں بلکہ قرآن مجید کا مطالعہ بھی سرسری کیا، اس وجہ سے اُن کو بہت سی غلط فہمیاں ہو گئیں، کتاب "دو اسلام" ان کی غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے اور ہماری یہ کتاب اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی غلط فہمیوں کو دور فرمائے۔ آمین

برقؔ صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

مُلّا کی تعریف

"ملّا سے مراد متعصب، تنگ نظر، کم علم اور کوتہ اندیش واعظ اور امام مسجد ہے نہ کہ صحیح النظر عالم" (دو اسلام حاشیہ ص ۲۷۸)

ہم بھی اس کتاب میں لفظ "مُلّا" کو انہی معنوں میں استعمال کریں گے جن معنوں میں ڈاکٹر صاحب نے استعمال کیا ہے۔

عالم کی تعریف

ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم درحقیقت وہ ہے جو صحیح النظر ہو، قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کو راسخ فی العلم کہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب ایک اور جگہ رقم طراز ہیں

"بحمد اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گزرے تھے جنہوں نے ایسے تمام واقعات پر سخت تنقید کی، فجزاھم اللہ احسن الجزاء" (دو اسلام ص ۹۰)

ہم بھی اس کتاب میں جہاں کہیں عالم کا لفظ استعمال کریں گے تو انہی معنوں میں استعمال کریں گے جن معنوں میں ڈاکٹر صاحب نے استعمال کیا ہے۔

جماعت حقہ یعنی جماعت المسلمین

ڈاکٹر صاحب شاید ناواقف نہ ہوں کہ اس امت میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہی جو تمام خرافات، بدعات، موضوعات، مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم سے اسی طرح بیزار تھی جس طرح خود ڈاکٹر صاحب بیزار ہیں اور الحمدللہ ایسی جماعت اب بھی موجود ہے۔

ایک بات اور ذہن نشین کر لیجیے، یہ جماعت فرقہ کی حیثیت سے کبھی نمودار نہیں ہوئی، نہ اس نے اپنا کوئی فرقہ وارانہ امام بنایا جس کی وہ تقلید کرتی ہو، نہ فرقہ وارانہ کتابیں تصنیف کیں جو دوسرے فرقوں کے لیے ناقابل حجت ہوں، اس جماعت کا اصول وہی ہے جو صحابۂ کرام کا تھا، یعنی "قرآن و حدیث" پر عمل کرنا یا دوسرے لفظوں میں "اتباع رسول"، یہ جماعت انہی احادیث کو واجب العمل سمجھتی ہے جن کے متعلق برق صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ :-

"اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیماتِ قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔" (دو اسلام ص ۳۴۲)

"یہ تمام تفاصیل احادیث میں ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پہ ہم نازاں ہیں اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں۔" (دو اسلام ص ۳۴۳)

"اس میں کلام نہیں کہ حضور کے ان اوصاف جمیلہ کا چرچا صرف احادیث کی بدولت ہوا اور ہم حدیث کے اس گراں بہا ذخیرے پر ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔" (دو اسلام ص ۱۹۹)

برق صاحب! یہ جماعت خود ساختہ اسلام کو اتنا ہی بُرا سمجھتی ہے جتنا آپ، گھڑی ہوئی احادیث سے اتنا ہی بیزار ہے جتنا آپ، لہٰذا آپ یہ نہ سمجھیے کہ اس معاملہ میں آپ تنہا ہیں، بلکہ یہ پوری جماعت بھی آپ کے ساتھ ہے۔ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض صحیح احادیث کے متعلق آپ کو غلط فہمی ہو گئی جس کے ازالہ کے لئے یہ کتاب لکھی جا رہی ہے۔

آغاز ازالہ

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم ڈاکٹر صاحب کی غلط فہمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ڈاکٹر صاحب "دو اسلام" کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے، میں قبلہ والد صاحب کے ہمراہ امرتسر گیا، میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا، جہاں نہ بلند عمارات، نہ مصفا سڑکیں، نہ کاریں، نہ بجلی کے قمقمے اور نہ اس وضع کی دکانیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ لاکھوں کے سامان سے سجی ہوئی دکانیں اور بورڈ پر کہیں رام بھیجا سنت رام لکھا ہے، کہیں دنی چند اگروال .... ہال بازار کے اس سرے سے اُس سرے تک کسی مسلمان کی کوئی دکان نظر نہیں آئی۔

ہاں مسلمان ضرور نظر آئے، کوئی بوجھ اُٹھا رہا تھا، کوئی گدھے لاد رہا تھا۔ غیر مسلم کاروں اور فٹنوں پہ جا رہے تھے اور مسلمان اڑھائی من بوجھ کے نیچے دبا ہوا مشکل سے قدم اُٹھا رہا تھا۔۔۔" (دو اسلام ص۱۳)

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ہندوؤں کے پاس مال و دولت کی فراوانی اور مسلمانوں کو مفلوک الحال دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کو حیرت ہوئی کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ حدیث ہے "اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّطُلَّابُھَا کِلَابٌ" "یہ دنیا ایک مردار ہے، اور اس کے متلاشی کتے ہیں (دو اسلام ص۱۵) برق صاحب نے اس حدیث کا مطلب بھی بعض ملّاؤں سے دریافت کیا، لیکن تسلّی نہیں ہوئی، اور اس طرح احادیث کے متعلق ان کی غلط فہمیوں کا آغاز ہوا۔ غلط فہمی سے برق صاحب کا سب سے زیادہ اعتراض اسی روایت پہ ہے، لہٰذا اس غلط فہمی کا ازالہ تفصیل کے ساتھ درج ذیل ہے۔

جملہ معترضہ برق صاحب نے صرف امرتسر ہی کو دیکھا، اگر وہ کہیں دہلی، بمبئی، کلکتہ، حیدر آباد وغیرہ مشہور شہر دیکھتے تو انہیں ہندوؤں کے دوش بدوش اور ان کے ہم پلہ مسلمانوں کی بھی دکانیں نظر آتیں، بلکہ اگر وہ اس وقت پاکستان کے کسی بھی چھوٹے یا بڑے شہر کو دیکھیں تو مسلمانوں کی لاتعداد پر رونق دکانیں جگمگاتی نظر آئیں گی، حالانکہ ان مسلمانوں کا اسلام وہی اسلام ہے جو امرتسر کے ان مسلمانوں کا تھا جن کا ذکر برق صاحب نے کیا ہے۔

اشتباہ برق صاحب کو بڑی غلط فہمی ہوئی۔ ایسی کوئی حدیث نہیں جس کے یہ الفاظ ہوں۔ یہ کسی اور شخص کا قول ہے جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے قرآن و حدیث کی ترجمانی کرتا ہے۔

حق و باطل کا غلط معیار قبل اس کے کہ ہم قولِ مذکور کے صحیح مطلب کی وضاحت کریں یہ بہتر ہوگا کہ امرتسر میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہم اس سلسلہ میں انہیں قرآن مجید کی چند آیات کی سیر کرائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

۱۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ (القصص-۹)	ایک دن قارون اپنے سازوسامان اور کرّوفر کے ساتھ نکلا، تو ان لوگوں نے جو دنیا کے طالب تھے، کہا اے کاش جو مال و اسباب قارون کو دیا گیا ہے ہمیں بھی ملتا۔ واقعی یہ بڑا خوش قسمت ہے۔

۲۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ (القصص۔ ۸۰)

اور جو اہل علم تھے، انہوں نے کہا، تم پر افسوس ہے، جس شخص نے ایمان قبول کیا، اور نیک عمل کئے اس کے لیے تو اللہ کا ثواب بہتر ہے اور یہ چیز ان ہی کو ملتی ہے جو صابر ہیں۔

نتیجہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کا ذکر بُرائی کے ساتھ کیا، جو دنیا کے طالب تھے اور اُن لوگوں کو یعنی علماء کا خطاب دیا جن لوگوں نے اس کی طرف توجہ بھی نہیں کی بلکہ وہ صرف ایمان اور عمل صالح کے ثواب کے خواہاں رہے، آیت ۲ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ثواب ان ہی کے لوگوں کے پیش نظر ہوتا ہے جو صابر و قانع ہوتے ہیں اور دنیا کے حریص نہیں ہوتے۔ بہرحال آیات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ دنیا اچھی چیز نہیں اور اس کے طالب بھی اچھے نہیں۔

اس کے آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

۳۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (القصص۔ ۸۱)

پھر ہم نے قارون کو مع اس کے محل کے زمین میں دھنسا دیا۔

۴۔ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (القصص۔ ۸۲)

پھر کل جو لوگ قارون کے مثل بننے کی تمنا کرتے تھے، صبح کو کہنے لگے، افسوس یہ رزق تو اللہ اپنے جس بندے کو چاہتا ہے فراخی سے دیتا ہے، اگر اللہ کا احسان نہ ہوتا تو ہم بھی دھنسا دیئے جاتے، افسوس کہ کافروں کے لئے فلاح نہیں ہے۔

نتیجہ دنیاوی مال و دولت کے حریص کا انجام اچھا نہیں ہوتا، دنیا وی مال و دولت اگر کسی کے پاس زیادہ ہو اور مومنین کے پاس اس کی قلت ہو، تو یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اس مالدار سے خوش ہے اور فقراءِ مومنین سے ناراض ہے، قارون بہت مالدار تھا اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب اس کے مقابلہ میں تنگ حال تھے اور اللہ ان تنگ حال مسلمین ہی سے خوش تھا، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ضرور کوئی نہ کوئی خامی تھی جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے اصحاب تنگ حال تھے، کیا کوئی حدیثِ اسلام تھا جس نے انہیں اس درجہ پر پہنچایا تھا، برق صاحب امرتسر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مختلف حالات میں دیکھ کر آپ متعجب نہ ہوں، موسے

علیہ السلام اور ہارون بھی ایسے ہی مختلف حالات میں تھے، اس میں حیرت و استعجاب کا کون سا مقام ہے۔

برقی صاحب اب ذرا اوپر چلئے۔ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے صحابۂ کرام کی حالت ملاحظہ فرمائیے۔

۵۔ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ۝

(ھود ۔ ۲۷)

کافروں کے سرداروں نے نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا، ہم تو تم کو اپنے ہی جیسا آدمی سمجھتے ہیں، اور ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ تمہارے متبعین صرف وہی لوگ ہیں جو ہم میں سب سے زیادہ رذیل اور کم عقل ہیں اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تم کو ہم پر کسی قسم کی فوقیت حاصل نہیں، بس ہم تو یہی خیال کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نتیجہ برقی صاحب مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر جو نتیجہ آپ نے نکالا ہے، بالکل وہی نتیجہ نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے نکالا تھا، یہ کافر سردار تھے، صاحبِ فضل تھے اور نوح علیہ السلام کے صحابۂ کرام فاقہ کش اور کافروں کی نگاہ میں بے عقل سمجھے جاتے تھے، لہٰذا کافروں نے ان کو گمراہ سمجھا اور اپنے کو حق پر۔

خیر الامم کی حالت برقی صاحب اب ان مسلمین کی حالت ملاحظہ فرمائیے، جو خلاصۂ امم تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۶) وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ ۝

التوبۃ ۹۲

(اے رسول) جہاد میں نہ جانے کا ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جو آپ کے پاس آتے ہیں کہ آپ ان کو سواری دیں تو آپ کہہ دیتے ہیں، کہ میرے پاس تو کچھ نہیں جس پر میں تمہیں سوار کرسکوں، وہ لوگ واپس ہو جاتے ہیں اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

(۷) إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ

گناہ تو اُن لوگوں پر ہے جو باوجود مالدار

يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

(التوبة ۹۳)

ہونے کے جہاد پر نہ جانے کی اجازت مانگتے ہیں، یہ اس پر راضی ہیں، کہ زنانِ پس ماندہ کے ساتھ بیٹھے رہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر مہر لگا دی ہے وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

نتیجہ نہ صحابۂ کرام کے پاس خرچ کرنے کو مال تھا نہ اللہ کی زمین پر قائم ہونے والی سب سے بہتر حکومت کے پاس کچھ تھا کہ مسلمین کے لئے سامانِ جہاد مہیا کرتی، دنیا کی آنکھوں نے جس سے بہتر انسان نہ دیکھا ہو، وہ انسان، وہ مقدس ترین اللہ کا رسول اور مومنِ کامل یہ کہہ رہا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں، یہ کون سا اسلام تھا جس کے باعث وہ مقدس ترین انسان تنگ حال تھا، آج کل کے مسلمین تو حدیثی اسلام کی وجہ سے تنگ حال ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے متعلق کیا کہا جائے۔ پورا عرب فتح ہو چکا ہے لیکن تنگ حالی موجود ہے، برخلاف اس کے منافق مالدار تھے اور جہاد سے گریز کرتے تھے نتیجہ ظاہر ہے کہ دنیاوی عیش و راحت کی فراوانی سے حق و باطل میں امتیاز نہیں ہوتا۔

ہر رسول کے زمانہ میں کافر خوش حال تھے

مندرجہ ذیل آیات کو ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ○

(سبا۔ ۳۴)

ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا تو اس بستی کے خوشحال لوگوں نے کہا، کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم کو بھیجا گیا ہے۔

وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ○

(سبا۔ ۳۵)

اور کہا، کہ ہمارے پاس مال و اولاد کی کثرت ہے اور ہم کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○

(سبا۔ ۳۶)

اے رسول کہہ دیجئے کہ میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں مسلمین کی جو حالت بیان کی گئی ہے وہ ابتدائی دور کی ہے، لیکن جب انہوں نے اللہ کے راستہ میں قدم رکھا اور صبر و استقامت کو ملحوظ رکھا، تو پھر مالدار ہو گئے، یہ شبہ حقیقت پہ مبنی نہیں، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مسلمین کو مال و دولت کی فراوانی بخشی گئی، پھر بھی یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ موسٰے علیہ السلام اور ان کے اصحاب میں سے ہر شخص کو اتنا ہی مال مل گیا تھا جتنا قارون کو، بلکہ مؤمن ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب میں سے ہر شخص اتنا ہی مالدار ہو گیا تھا، جتنا اس زمانے کے یہودی تھے یا اسلامی حکومت اسی جاہ و حشمت کی مالک ہو گئی تھی، جو سلاطینِ رُوم اور ایران کے ہاں تھی، اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ مؤمن کی آخرت بھی اچھی اور اسی نسبت سے دنیا بھی اچھی، تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا تمام انسانوں کے مقابلہ میں اچھی ہونی چاہیئے تھی اور آپ کے پاس عیش و راحت، ساز و سامان کی اتنی فراوانی ہونی چاہیئے تھی کہ کسی انسان کو اتنی فراوانی میسر نہ ہوتی، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عُسرت کا جو نقشہ آیت بالا میں کھینچا گیا ہے، یہ ابتدا کی بات نہیں ہے بلکہ اس زمانہ کی بات ہے جب پورا عرب فتح ہو چکا تھا اور اسلامی فوجیں حدود عرب کو عبور کر کے تبوک پر یلغار کر رہی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں سے صرف ۱½ سال باقی رہ گیا تھا، اب اگر کوئی شخص اس معیار پر کہ مسلمین کے پاس دنیاوی سامان کی کمی ہے، مسلمین کو گمراہ سمجھ بیٹھتا اور عہدِ رسالت ہی میں اس کا انتقال ہو جاتا تو بتائیے کیا آپ کہہ سکتے تھے کہ اس کا معیارِ حق و باطل صحیح تھا، ہرگز نہیں، نوح علیہ السلام کی قوم کی گمراہی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے اُن کی گمراہی کا اصل سبب یہی معیار تھا لیکن کیا وہ قوم اس معاملہ میں حق بجانب تھی ؟ ہر زمانہ میں مسلمین کی اکثریت کافروں کی طرح مالدار نہ ہو سکی، نہ یہ حدیث کو ماننے کا نتیجہ اُس وقت تھا نہ اب ہے۔

دنیا کی مذمّت اور قرآن

کیونکہ برق صاحب کی غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ یہی غلط معیار ہے لہٰذا ہم بھی اس پر قدرے تفصیلی روشنی ڈال رہے ہیں آیاتِ بالا سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ دنیا ایک بے حقیقت شے ہے، انبیاء علیہم السلام کے پاس نہ ابتدائی دور میں اس کی فراوانی ہوئی نہ آخری دور میں۔

قارون کے قصہ میں اللہ تعالٰے نے دنیا کے طالبین کو اہل علم میں شمار نہیں کیا، بلکہ دنیا کو حقیر سمجھنے والوں کے لیے اہل علم کا لقب استعمال کیا، اس سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوا کہ دنیا اچھی چیز نہیں، اس کی مزید برائی کے لیے چند اور آیات ملاحظہ فرمائیں۔

۸۔ لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۔۔۔ شہروں میں کافروں کی آمد و رفت سے

فِی الْبِلَادِ ○ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ○

(آل عمران - ۱۹۶)

آپ دھوکہ میں نہ آجائیں یہ سازوسامان بہت تھوڑا ہے، پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے :-

۸ - وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الدُّنْیَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ

(التوبۃ - ۸۵)

اور کافروں کے اموال اور کافروں کی اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالے۔ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیاوی عذاب دینا چاہتا ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ ان کی جانیں ایسی حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

نتیجہ شہروں میں کافروں کا تجارت کی غرض سے آنا جانا اور ان کی ناجرانہ چہل پہل، ان کی فوجوں کا شہر در شہر مظاہرہ وجلوس، مال اور اولاد کی کثرت، ایک بے حقیقت شے ہے اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے حق اور ہی چیز ہے جس کا معیار اس دنیا کی زیب وزینت نہیں۔

۹ - وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَیْرٌ وَّاَبْقٰى ○

طٰهٰ

۱۳۱

کافروں کو جو مال ہم نے دے رکھا ہے اس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو، یہ محض دنیاوی جاہ وحشمت ہے تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں اور تمہارے رب کا رزق بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔

نتیجہ آیت سے ظاہر ہے کہ دنیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا بھی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، اگر یہ دنیا اچھی چیز ہوتی، تو اللہ تعالیٰ اس کی طمع سے کیوں روکتا اور مسلم کیوں کافروں کے مقابلہ میں دنیا سے محروم ہوتے، جب صحابۂ کرام جن کی ایمانی قوت کی مناسبت سے ان کی دنیا بھی اتنی اچھی ہونی چاہیئے تھی، کافروں کے مقابلہ میں پسماندہ تھے تو آج پسماندگی کا سبب حدیث کو قرار دینا کہاں تک صحیح ہے، اگر کوئی یہ کہہ دے کہ صحابۂ کرام کی محرومی کا سبب قرآن تھا، جس نے دنیا کی طرف نظر اٹھانے کی بھی ممانعت کر رکھی تھی تو آخر اس الزام کا کیا جواب ہوگا، کیا آپ انصاف سے کہہ سکتے ہیں کہ جو جواب قرآن مجید کی طرف سے دیا جائے گا، وہی جواب حدیث کی طرف سے نہیں دیا جا سکتا۔

جنگ احد میں مسلمین کی عارضی شکست کے اسباب بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ تم دنیا کی طرف مائل ہو گئے۔

ارشادِ باری ہے :-

۱۰- وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ (آل عمران-۱۵۲)

اللہ نے تو اپنا وعدہ سچا کر دکھایا کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قلع قمع کر رہے تھے، اسی اثناء میں تم نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور حکم کی تعمیل میں اختلاف کیا اور حسب دلخواہ فتح آجانے کے بعد نافرمانی کی، بات یہ ہے کہ تم میں سے بعض دنیا کے طالب ہیں اور بعض آخرت کے طالب ہیں، پھر اللہ نے تم کو کافروں سے روک لیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے۔

فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ (آل عمران ۱۵۳)

پھر تم کو غم پر غم پہنچایا۔

نتیجہ آیتِ بالا میں دنیا کے طالبین کی کتنی سخت مذمت ہے، کیا اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی طلب اچھی چیز ہے۔

ازواج مطہرات کے متعلق ارشادِ باری ہے :-

۱- لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (الاحزاب-۳۲)

اے نبی کی بیویو، کوئی عورت بھی تمہارے مثل نہیں (یعنی ہر عورت سے تمہارا مرتبہ بالا ہے۔)

یہ آیت ازواجِ مطہرات کی فضیلت کے لیے نصِّ قاطع ہے، مگر یہ فضیلت ہے کس سبب سے؟ دینی شغل اور انہماک، تقویٰ اور پاکیزگی کی وجہ سے، اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اسی نسبت سے ان کی دنیا بھی بہتر ہوتی، لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ان کو دنیا ملنا تو کجا، دنیا کی طلب سے بھی روکا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

۱۱- يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ

اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی بہار کی طالب ہو تو آؤ میں تم کو مال و متاع دے

أُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ (الاحزاب ۲۸)

کر اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔

۱۲- وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (الاحزاب ۲۹)

اور اگر تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور دار آخرت مطلوب ہے، تو پھر تم میں سے نیک کرداروں کے لئے اللہ نے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

نتیجہ دنیا اگر اچھی چیز ہوتی تو ازواج مطہرات کو اس سے کیوں روکا جاتا، ظاہر ہے کہ دنیا میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو ازواج مطہرات کے لئے ناپسند فرماتا ہے اور ان سے صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ یا تو دنیا لے لو اور رسول سے علیحدہ ہو جاؤ یا اللہ، رسول اور آخرت لے لو اور دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔

برق صاحب حدیث ہی کو الزام نہ دیجیئے، قرآن مجید کو غور سے پڑھیئے، جو بات وہاں ہے وہی یہاں ہے، کیا یہ آیت اس بات کی ترجمانی نہیں کرتی کہ مسلمین کے لئے آخرت اور کافروں کے لئے دنیا، مسلمین کو آخرت کی طرف نظر رکھنی چاہیئے اور دنیا کی طلب سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے، اللہ والوں کے لئے یہ جگہ عیش و راحت کی جگہ نہیں۔

۱۳- مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۝ أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (ھود:- ۱۵-۱۶)

جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کا طالب ہو تو ایسے لوگوں کو ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دے دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کوئی کمی نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کچھ نہیں سوائے آگ کے، جو کچھ عمل انہوں نے دنیا میں کئے تھے وہ سب ضائع ہو گئے اور جو کچھ وہ کرتے تھے، سب باطل تھا۔

۱۴- مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَّصِيبٍ ۝ (الشوریٰ ۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو، ہم اس کو اس میں سے دے دیں گے لیکن آخرت میں اس کا کچھ بھی حصہ نہیں ہو گا۔

نتیجہ آیاتِ بالا سے ثابت ہوا کہ ہر شخص کے لئے دنیا کی طلب مذموم ہے، برخلاف اس کے آخرت کی طلب محمود ہے، طالبِ دنیا کے لئے سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں، پھر بھی اگر دنیا مردار نہیں تو اور کیا ہے، اور اس کا طالب کتا نہیں تو پھر کیا ہے کہ آخرت میں اس کے لئے سوائے آگ کے کچھ نہیں، ایسا شخص تو کتے سے بھی بدتر ہے کہ دنیا کی طلب میں لگا ہوا ہے جس کا نتیجہ سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں، کیا یہ آیتیں قولِ زیرِ بحث کی تائید نہیں کرتیں ؟ کیا مسلمین کی زبوں حالی کی ذمہ دار یہ آیتیں تو نہیں ؟ برتق صاحب انصاف کیجیے۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔

دنیا کسے کہتے ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دنیاوی عیش و راحت کے سامان مؤمن کے لئے پیدا ہی نہیں کئے گئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان دنیاوی نعمتوں کا احسان کیوں جتایا ہے اور مال و دولت کو اپنا فضل کیوں قرار دیا ہے۔

یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے دنیا کی صرف ایک قسم سمجھ رکھی ہے حالانکہ دنیا کی دو قسمیں ہیں، مؤمن کی دنیا اور کافر کی دنیا۔ جہاں کہیں قرآن و حدیث میں دنیا کا لفظ آیا ہے اس سے کافر کی دنیا مراد ہے، قرآن مجید نے کافر کی دنیا کی چند خصوصیات بیان کی ہیں جو مندرجہ ذیل آیاتِ مبارکات میں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ (الجاثیہ-۲۴)

کافر کہتے ہیں، اس دنیا کی زندگی کے علاوہ اور کوئی زندگی نہیں، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو صرف زمانہ کی گردش سے موت آتی ہے اس کے متعلق ان کے پاس کوئی علم نہیں وہ محض گمان کرتے ہیں۔

نتیجہ منکرِ قیامت کی دنیا، حساب و کتاب سے بے خوفی کی دنیا ہے اور جب حساب و کتاب نہیں تو پھر ڈر ہی کس بات کا، خوب مزے اڑاؤ، ایسے آدمی کی دنیا اس مصرع کا مصداق ہوتی ہے

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

(۲) وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۝ (ابراھیم-۲،۳)

ان منکروں کے لئے بڑا سخت عذاب ہے جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی سے محبت کرتے ہیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝

بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی

(الاعلیٰ - ۱۶، ۱۷) رہنے والی۔

(۳) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ○ (محمد)

اور کافر مزے اڑا رہے ہیں اور اس طرح کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

نتیجہ جانور ہر جگہ منہ مارتے ہیں، ان کو حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی، نہ حساب و کتاب کا خوف ہوتا ہے، بالکل یہی حالت کافر کی ہے کہ وہ حلال و حرام میں کوئی تمیز نہیں کرتا، جو کچھ مل جائے اور جس طرح مل جائے سب ہضم کر لیتا ہے، آخرت سے بالکل بے خوف ہوتا ہے۔

(۴) وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (الانعام - ۳۲)

دنیا کی زندگی کچھ نہیں سوائے لہو و لعب کے اور آخرت تو انہی کے لئے ہے جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں، کیا ذرا سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟

(۵) اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○ (الحدید - ۲۰)

جان لو کہ دنیا کی زندگی لہو و لعب، زیب و زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں کثرت کی خواہش کا نام ہے، اس دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے پانی برسا، فصل اچھی ہوئی اور کسان اس کو دیکھ کر خوش ہوئے، لیکن پھر تم دیکھو گے کہ خشک ہو کر زرد ہو گئی اور پھر ریزہ ریزہ ہو گئی اور آخرت میں سخت عذاب بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضوان بھی اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سرمایہ ہے۔

(۶) اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○ (التکاثر - ۱، ۲)

زیادتی کی خواہش نے تم کو غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔

(۷) وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ○ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ○ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ○ كَلَّا

ہر عیب بیان کرنے والے اور غیبت کرنے والے کی خرابی ہے جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا، وہ یہ سمجھتا

لَيُنۢبَذَنَّ فِى الۡحُطَمَةِ ۝ (الھمزۃ ۱-۴)

ہے کہ یہ مال اُسے حیاتِ جاوداں بخشے گا، ہرگز نہیں، بلکہ (ایک وقت آنے والا ہے جب) وہ دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

(۸) وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ ۚ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (الکہف-۲۸)

اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ رکھو جو صبح و شام اپنے ربّ کی عبادت کرتے ہیں اور اللہ کی رضاء کے طالب ہیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دنیاوی زندگی کی زینت کے طلب گار بن جاؤ اور اُن سے کنارہ کشی کر لو۔

خلاصہ مندرجہ بالا آیات سے واضح ہوا کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں دنیا یہ ہے: لہو ولعب، نام و نمود، فخر و ریا، تکبّر اور اترانا، مال و دولت کی حرص، مال جمع کرنا اور ننانوے کے پھیر میں رہنا، مال کو اس طرح ہڑپ کر جانا جس طرح جانور ہڑپ کر جاتے ہیں، دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا، آخرت اور حساب وکتاب کا انکار کرنا، حلال و حرام کی تمیز کا اُٹھ جانا، مال و دولت کے حصول میں اس قدر انہماک ہونا کہ اللہ تعالےٰ اور اس کے احکام سے غفلت ہو جائے، اللہ والوں کو چھوڑ کر مال اور مالداروں کی طرف رغبت کرنا، فرائض کو ترک کرنا وغیرہ وغیرہ، اگر یہ دنیا مردار نہیں تو اور کیا ہے اور اس کے طالب کتّے نہیں تو اور کیا ہیں؟ یہی وہ دنیا ہے جس کو مردار کہا گیا ہے اور اس کے طالب کو کتّا، کاش برق صاحب دنیا کے اصطلاحی معنوں پر جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں غور کرتے تو کبھی غلط فہمی نہ پیدا ہوتی، اس مشہور مصرع میں کس خوبی سے ان اصطلاحی معنوں کو ادا کیا گیا ہے۔

"چیست دنیا؟ از الٰہ غافل بدن"

یعنی دنیا کیا چیز ہے؟ دنیا نام ہے اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا، اور اگر اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو تو پھر یہ دنیا مؤمن کی دنیا ہے اور یہ اصطلاحی دنیا سے علیحدہ ایک چیز ہے، اللہ تعالیٰ مسلمین کو اس اصطلاحی دنیا سے علیحدہ رہنے کی بار بار تاکید فرماتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ عَنۡ

اے ایمان والو، تمہارے مال اور تمہاری اولاد، تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دے

ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ ○ (المنافقون - ۹)

جو ایسا کرے گا تو ایسے ہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھائیں گے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ (تغابن - ۱۵)

اے ایمان والو، تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش کی چیزیں ہیں، اور اللہ کے پاس اجرِ عظیم ہے۔

یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ مال و اولاد کی محبت میں تم اللہ تعالٰی کو بھول جاؤ اور اجرِ عظیم سے محروم ہو جاؤ

پھر فرمایا

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (التغابن - ۱۶)

اور جو شخص نفسانی حرص و طمع سے محفوظ رہا تو ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

الغرض مومن کی دنیا یہ ہے کہ نہ دنیا کی فراوانی اور اس کے حصول میں انہماک اس کو اللہ تعالٰی سے غافل کرتا ہے اور نہ وہ اس کی حرص میں مبتلا ہوتا ہے، بلکہ وہ دنیاوی ساز و سامان کو آزمائش کی چیزیں سمجھتا ہے اور ان کو اس ہی طریقہ سے استعمال کرتا ہے جس طریقہ سے اللہ تعالٰی نے استعمال کرنے کا حکم دیا ہے، ایسے لوگوں کے متعلق ارشادِ باری ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ○ (النور ۳۷)

یہ ایسے لوگ ہیں، کہ تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ کے ذکر اور نماز ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔

مندرجہ بالا آیاتِ بیّنات سے یہ بات واضح ہو گئی، کہ دنیا کا لفظ جہاں کہیں قرآن و حدیث میں آتا ہے وہاں اس سے مراد وہ دنیا ہوتی ہے جس میں پھنس کر انسان اللہ تعالٰی کو بھول جاتا ہے، اور یہ بھی ثابت ہو گیا، کہ ایسی دنیا یقیناً مردار ہے، اور اس کے طالب کا ٹھکانہ سوائے آگ کے اور کہیں نہیں، اب ہم اس آیت کو پیش کرتے ہیں، جو قولِ زیرِ بحث کے بالکل موافق اور لفظاً مطابق ہے، اور گویا قولِ زیرِ بحث اس ہی آیت کی تفسیر ہے،

اللہ تعالٰی فرماتا ہے۔

(۹) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ

(اے رسول، ان لوگوں کو اس شخص کا حال

اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَکَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰکِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُکْهُ یَلْهَثْ

(الاعراف - ۱۷۵)

سنائیے، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں تھیں، لیکن اس نے ان سے روگردانی کی، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں کی جماعت میں داخل ہوگیا، اور اگر ہم چاہتے تو ان آیات کی بدولت اس کا مرتبہ بلند کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا، اور اپنی خواہش کی پیروی کی، پس اس کی مثال کتّے کے مانند ہے کہ اگر اس پر بوجھ رکھا جائے تو ہانپے اور اگر چھوڑ دیا جائے تو بھی ہانپے۔

کتّا ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے، خواہ راحت ہو یا تکلیف، اور کہیں کوئی کھانے کی چیز مل جائے تو پھر دوسرے کتّے کی شرکت اس کو گوارا نہیں ہوتی، اپنے ہم جنس کو دیکھ کر بھونکنے اور بھنبھوڑنے لگتا ہے، بالکل اسی طرح جب انسان کی بھی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلتا ہے، دنیا کی فراوانی ہو تو اور زیادہ ملنے کی حرص کرتا ہے۔ تنگ دستی اور افلاس ہو تو مال و دولت کے لئے تڑپتا ہے، چاہتا ہے کہ دنیا صرف میرے لئے ہو، تو اس کی یہ دنیا بمنزلہ مردار کے ہوتی ہے اور وہ مثل کتّے کے ہوتا ہے، اور یہ مثل اس پر صادق آتی ہے کہ دنیا مردار ہے، اور اس کے طالب کتّے ہیں۔

نتیجہ آیتِ بالا سے ثابت ہوا کہ احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کرنا "دنیا" ہے اور یہ دنیا اسی طرح حرام ہے، جس طرح مردار اور اس کے چاہنے والے مثل کتّوں کے ہیں۔

آخری گذارش غالباً اب قولِ زیرِ بحث کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہوگا، ان تمام مباحث میں ہم نے دنیا کے اصطلاحی معنوں کے لئے قرآن مجید کا حوالہ دیا ہے، اب ہم ان اصطلاحی معنوں کے ثبوت کے لئے ایک حدیث کا حوالہ دے کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں:۔

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ ذَاتَ یَوْمٍ عَلَی

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھ گئے اور ہم لوگ آپ کے گرد بیٹھ گئے،

الْمِنْبَرِ وَجَلَسْنَا حَوْلَهُ فَقَالَ
إِنِّي مِمَّا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ
بَعْدِي مَا يُفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ
زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزِينَتِهَا فَقَالَ
رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللهِ أَوَ يَأْتِي
الْخَيْرُ بِالشَّرِّ فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى
اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيلَ لَهُ مَا
شَأْنُكَ تُكَلِّمُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا يُكَلِّمُكَ فَرَأَيْنَا
أَنَّهُ يُنْزَلُ عَلَيْهِ قَالَ فَمَسَحَ عَنْهُ
الرُّحَضَاءَ فَقَالَ أَيْنَ السَّائِلُ وَكَأَنَّهُ
حَمِدَهُ فَقَالَ إِنَّهُ لَا يَأْتِي الْخَيْرُ بِالشَّرِّ
وَإِنَّ مِمَّا يُنْبِتُ الرَّبِيعُ يَقْتُلُ أَوْ
يُلِمُّ إِلَّا آكِلَةَ الْخَضْرَاءِ أَكَلَتْ
حَتَّى إِذَا امْتَدَّتْ خَاصِرَتَاهَا اسْتَقْبَلَتْ
عَيْنَ الشَّمْسِ فَثَلَطَتْ وَبَالَتْ وَرَتَعَتْ
وَإِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَنِعْمَ
صَاحِبُ الْمُسْلِمِ مَا أَعْطَى مِنْهُ الْمِسْكِينَ
وَالْيَتِيمَ وَابْنَ السَّبِيلِ أَوْ كَمَا قَالَ
النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنَّهُ مَنْ
يَأْخُذُهُ بِغَيْرِ حَقِّهِ كَالَّذِي يَأْكُلُ وَلَا
يَشْبَعُ وَيَكُونُ شَهِيدًا عَلَيْهِ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ (صحيح بخاری كتاب
الزكوٰة باب الصدقة على اليتامى)

آپ نے فرمایا مجھے اپنے بعد جن باتوں کا تم پر
خوف ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم پر دنیا کی
زیبائش اور مال و دولت کے دروازے کھول دیئے
جائیں گے، ایک شخص نے عرض کیا، اے اللہ کے
رسول کیا اچھی چیز بھی برائی پیدا کرتی ہے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، اس شخص سے کہا
گیا کہ تجھے کیا ہو گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے کلام کرتا ہے حالانکہ وہ تجھ سے کلام نہیں
فرماتے، پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی
ہے، پھر آپ نے پسینہ پونچھا اور فرمایا سائل کہاں
ہے؟ گویا آپ نے اس کے سوال کو پسند فرمایا پھر
آپ نے فرمایا، بے شک اچھی چیز برائی پیدا نہیں
کرتی، مگر فصل ربیع ایسی گھاس بھی پیدا کرتی ہے
جو مار ڈالتی ہے یا بیمار کر دیتی ہے، مگر اس سبزی
چرنے والے کو نقصان نہیں پہنچاتی جو چرے،
پھر جب اس کے دونوں کوکھ بھر جائیں تو وہ
سورج کے سامنے آجائے، پھر لید کرے اور
پیشاب کرے۔ اور اس کے بعد پھر چرنے لگے،
اور بے شک یہ مال ایک میٹھی سبزی ہے، پس
اس مسلم کا مال کتنا اچھا ہے جو اپنے مال سے
مسکین، یتیم اور مسافر کو دیتا رہتا ہے، اور بیشک
جو شخص اس مال کو ناجائز طریقہ سے لے گا۔ وہ
اس شخص کی طرح ہے کہ کھائے اور سیر نہ ہو، اور
وہ مال اس پر قیامت کے دن گواہ ہوگا۔

حدیث بالا سے ثابت ہوا کہ دنیا سے مراد مسلم کی دنیا نہیں جس کو وہ حلال طریقہ سے حاصل کرتا ہے، اس کا حریص نہیں ہوتا، اور پھر اس کے خرچ کرنے میں بخل نہیں کرتا، ہاں دنیا سے مراد وہ دنیا ہے جس کو حرص اور طمع کے ساتھ جائز ناجائز ہر طریقہ سے حاصل کیا جائے اور اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کیا جائے،

یہ ہے وہ دنیا جو مردار ہے، اور بے شک اس کے طالب کتے ہیں، غرض یہ کہ حدیث میں اس بات کی وضاحت ہے کہ لفظ دنیا کا اطلاق کس دنیا پہ ہوتا ہے، قرآن اور حدیث میں یہ لفظ ایک ہی اصطلاح میں استعمال ہوا ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ کاش برق صاحب قرآن و حدیث کا عمیق مطالعہ فرماتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں "میں مسلسل چودہ برس تک حصول علم کے لئے مختلف علماء و صوفیہ کے ہاں رہا، درس نظامی کی تکمیل کی، سینکڑوں واعظین کے وعظ سنے، بیسیوں دینی کتابیں پڑھیں اور بالآخر مجھے یقین ہو گیا کہ اسلامی تعلیمات کا ماحصل یہ ہے:" (دو اسلام صہ ۱۵)

اس کے بعد برق صاحب نے سلسلہ وار ان چیزوں کو شمار کیا ہے جن کو انہوں نے اسلامی تعلیمات کا ماحصل سمجھا تھا، ہم بھی ان چیزوں کو اسی سلسلہ سے بیان کر رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ اپنے معروضات بھی پیش کر رہے ہیں۔

غلط فہمی (۱) "فرائض خمسہ یعنی توحید کا اقرار اور صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کی بجا آوری"

ازالہ برق صاحب ان پانچوں چیزوں کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے، آخر اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

غلط فہمی (۲) "اذان کے بعد ادب سے کلمہ شریف پڑھنا"

ازالہ مؤذن کلمہ شریف پڑھتا ہے ہم بھی اُس کے ساتھ اپنے عہدِ توحید و رسالت کی تجدید کر لیتے ہیں، رہا ادب سے پڑھنا تو آخر اس میں کیا اعتراض ہے، برق صاحب بے ادبی کو تو آپ بھی پسند نہیں کریں گے۔

غلط فہمی (۳) "مختلف رسوم مثلاً جمعرات، چہلم، گیارہویں وغیرہ کو باقاعدگی سے ادا کرنا"

ازالہ واقعی یہ خرافات ہیں ہمیں آپ سے اتفاق ہے، صحیح حدیث کو ماننے والے ان بدعات سے کلیتہً بیزار ہیں۔

غلط فہمی (۴) "قرآن کی عبارت پڑھنا"

معلوم نہیں کہ اس میں کیا اعتراض ہے، اس لئے کہ تلاوت قرآن مجید کا حکم تو قرآن مجید میں موجود ہے، ارشاد ہے

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ "اس کتاب کی تلاوت کیجئے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔"
(عنکبوت۔ ۴۵)

ہاں اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ بے سمجھے اور بغیر علم و عمل کی نیت کے پڑھنا، تو پھر ہمیں بھی آپ سے اتفاق ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي أَقَلَّ جو شخص تین دن سے کم میں قرآن ختم

مِن ثَلٰثٍ (رواہ ابوداؤد والترمذی وسندہٗ صحیح۔ مرعاۃ شرح مشکوٰۃ جلد ۳ ص۳۶۹)   کرتا ہے، وہ کچھ نہیں سمجھتا۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا بھی یہی ہے کہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھا جائے، دیکھا برق صاحب حدیث بھی آپ کی تائید کرتی ہے۔

بہرحال برق صاحب اتنا آپ کو بھی تسلیم کر لینا چاہیئے کہ جو شخص قرآن کو بغیر سمجھے پڑھتا ہے وہ کچھ دیر ضرور اپنے آپ کو لغو کاموں سے بچا لیتا ہے اور اگر اُس کی یہ نیت بھی ہو تو پھر لامحالہ ایسا پڑھنا بھی کچھ نہ کچھ مفید ضرور ہوگا۔

غلط فہمی (۵) | "اللہ کے ذکر کو سب سے بڑا عمل سمجھنا"

ازالہ | اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (العنکبوت۔ ۴۵)   اور بے شک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔

لیجئے، جس چیز پر آپ کو اعتراض ہے وہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

غلط فہمی (۶) | "قرآن اور درود کے ختم کرانا"، "اُچھل اُچھل کر ہُو حق کا ورد کرنا"

"نجات کے لئے کسی مرشد کی بیعت کرنا"، "مردوں سے مرادیں مانگنا"

"مزاروں پر سجدے کرنا"، "غلیظ لباس کو پیغمبری لباس سمجھنا"

"سڑکوں اور بازاروں میں سب کے سامنے ڈھیلا کرنا"، "تعویذوں اور منتروں کو مشکل کشا سمجھنا"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب، نیز حاضر ناظر قرار دینا"

"کسی بیماری یا مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیئے مُلّاجی کی ضیافت کرنا"

"گناہ بخشوانے کے لیے قوالی سننا"، "ہر غیر مسلم کو ناپاک و نجس سمجھنا"

"امام ابوحنیفہ رح کی فقہ پر ایمان لانا"

ازالہ | برق صاحب ہمیں ان تمام باتوں میں آپ سے اتفاق ہے، احادیث صحیحہ ان کی تائید نہیں کرتیں، یہ تمام خرافات ہیں جو گھڑ لئے گئے ہیں، ہاں قرآن مجید کی رو سے مشرکین عقیدتاً نجس ضرور ہیں۔

غلط فہمی (۷) | "صحاح ستہ کو وحی سمجھنا"

ازالہ | صحاح ستہ میں چھ کتابیں ہیں۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم کو چھوڑ کر باقی کتابوں میں چند ضعیف احادیث بھی ہیں، پھر ان تمام کتابوں میں صحابہ اور ائمہ دین کے اقوال بھی ہیں، للذا یہ کہنا کہ جو کچھ صحاح ستہ میں ہے وحی ہے، صحیح نہیں۔ گویا اس صورت میں ہمیں آپ سے اتفاق ہے، لیکن ان کتابوں میں جو صحیح احادیث ہیں، ان کے متعلق ہم بلاخوف و جھجک بغیر کسی پس و پیش و احساس کمتری کے اعلان کرتے ہیں

کہ بے شک ان کا مفہوم و منشا وحیِ الٰہی ہے اور ان پہ ہمارا اسی طرح ایمان ہے جس طرح قرآن مجید پر وہ اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح قرآن مجید، ہماری موجودہ اصطلاح میں اس کا نام وحی خفی ہے اور یہی ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف کا نقطہ آغاز ہے، اس وحی خفی کے اثبات میں ارادہ تھا کہ آپ کی کتاب کے آخری باب کے سلسلہ ہم اپنی معروضات پیش کرتے اور آپ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے لیکن مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہید میں بھی کچھ لکھا جائے۔ وباللہ التوفیق، یہ بحث کئی عنوانات پر مشتمل ہے جو ذیل میں سلسلہ وار درج کیے جا رہے ہیں۔

کیا انبیاء سابقین پر کتابِ الٰہی کے علاوہ وحی نازل ہوئی۔

انبیاء سابقین پر کتابِ الٰہی کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی، اس کی چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

آدم علیہ السلام

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ (بقرۃ۔۳۲) — اے آدم فرشتوں کو ان کے نام بتا دو۔

پھر ارشاد فرمایا:۔

يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ الآیۃ۔ (البقرۃ۔۳۵) — اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، اور خوب کھاؤ، جہاں سے چاہے مگر اس درخت کے قریب نہ جانا۔

لیکن شیطان کے بہکانے سے انہوں نے اس درخت میں سے کھایا۔

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (طٰہٰ۔۱۲۱) — آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گئے۔

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (البقرۃ ۳۶۔۳۷) — آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، بے شک اللہ تواب اور رحیم ہے۔ ہم نے کہا تم سب یہاں سے اترو، پھر جب کبھی تمہارے پاس میری ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی وہ بے خوف اور بے غم ہوگا۔

آدم علیہ السلام جنت سے اتارے جاتے ہیں، اس وقت کتابِ ہدایت کے بھیجنے کا وعدہ کیا جاتا ہے گویا ابھی تک کتاب نہیں آئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے باتیں کرتا تھا حتیٰ کہ اس کتاب سے پہلے اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو چند کلمات بھی سکھائے تھے جن کے ذریعہ سے ان کی توبہ قبول ہوئی، لہٰذا

ثابت ہوا کہ کتاب اللہ کے علاوہ بھی آدم علیہ السلام پر وحی آتی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰى ۞ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ۔ (طٰہٰ ۱۱ و ۱۲)

جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے، تو ان کو پکارا گیا، اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، اپنی جوتیاں اتار دو۔

فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰى (طٰہٰ ۱۳)

سنو جو کچھ وحی کی جارہی ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ (طٰہٰ ۱۴)

میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

پھر اللہ تعالےٰ نے پوچھا:۔

وَمَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰى ۞ (طٰہٰ ۱۷)

اے موسیٰ تمہارے ہاتھ میں یہ کیا ہے۔

پھر عصا اور ید بیضا کے معجزات عطا ہوئے، پھر ارشاد ہوا،

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ (طٰہٰ ۲۴)

فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔

الغرض موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تبلیغ کرتے ہیں، جادوگروں سے مقابلہ ہوتا ہے، اس موقع پر پھر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (طٰہٰ۔ ۶۸)

ڈرو مت تم ہی غالب رہوگے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام وہاں سے ہجرت کرتے ہیں، فرعون غرق ہو جاتا ہے، موسیٰ علیہ السلام وادئ سینا میں تشریف لے آتے ہیں، پھر اس موقع پر ان کو کتاب دی جاتی ہے۔

ارشادِ باری ہے:۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا۔ (الاعراف۔ ۱۴۵)

اور ہم نے تختیوں میں ان کے لئے ہر قسم کے نصائح اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی اور حکم دیا کہ اس کو قوت کے ساتھ پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ ان اچھی باتوں پر عمل کرے۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس واپس آئے اور بچھڑا پوجنے کی وجہ سے ان پر اتنا غصہ آیا کہ وہ تختیاں زمین پر پٹخ دیں۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ (الاعراف۔ ۱۵۰)

اور تختیاں پٹخ دیں۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ (الاعراف ۱۵۴)

اور جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو تختیاں اٹھا لیں۔

برقی صاحب دیکھا آپ نے کتاب تو اب ملی ہے لیکن اس سے پہلے اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر بے شمار مرتبہ وحی کر چکا تھا، کتاب دینے کے بعد فرمایا "اسے مضبوطی سے پکڑو" اور تو اور کتاب جب نازل ہوئی تو ایسی کہ اس میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر طرح کی تفصیل تھی لیکن اس کے بعد بھی وحی جاری رہی، موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لے جاتے ہیں، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں، ایک بجلی آتی ہے اور سب مر جاتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے۔

عَذَابِيٓ أُصِيبُ بِهِۦ مَنْ أَشَآءُ ۖ وَرَحْمَتِى وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ (الاعراف۔۱۵۶)

میں اپنا عذاب پہنچاتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔

الغرض کتابِ الٰہی سے پہلے بھی وحی جاری ہے اور کتابِ الٰہی کے بعد بھی وحی جاری ہے۔

خلاصہ

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے مختلف مواقع پر گفتگو فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے، اے موسیٰ یہ مقدس وادی ہے، جوتے اُتار دو، یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے، اسے زمین پر ڈال دو، ڈرو نہیں، میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے، اس کو اٹھا لو، یہ پھر لاٹھی بن جائے گا، ہاتھ کو جیب میں ڈالو، فرعون کے پاس جاؤ، اُس سے نرمی سے بات کرنا، انہوں نے جواب دیا ڈر لگتا ہے کہیں وہ قتل نہ کر دے، دعا کی مجھے ایک وزیر چاہیئے، میری زبان صاف نہیں اس کی اصلاح فرمائیے، جواب ملا، اچھا یہ باتیں قبول ہیں وغیرہ وغیرہ، حکم ملا گائے کو ذبح کرو، قوم نے طرح طرح کے بے ہودہ سوالات کئے، اللہ تعالیٰ جواب دیتا رہا، غرض یہ کہ اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہیں، برقی صاحب انصاف سے بتائیے، کیا یہ سب باتیں اس کتابِ الٰہی میں موجود تھیں جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی،

یوسف علیہ السلام

ارشاد باری ہے:۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِۦ وَأَجْمَعُوٓا أَن يَجْعَلُوهُ فِى غَيَٰبَتِ ٱلْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (یوسف - ۱۵)

جب وہ یوسف علیہ السلام کو لے کر چلے اور اس بات پر اتفاق کیا کہ ان کو کنوئیں میں ڈال دیا جائے تو ہم نے یوسفؑ کو وحی بھیجی کہ ایک وقت آئے گا جب تم ان کو اس کام کی خبر دو گے اور وہ نہ سمجھتے ہوں گے۔

یوسف علیہ السلام ابھی بچے ہیں لیکن وحی آ رہی ہے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا (یوسف-۲۲) جب وہ جوان ہوئے تو ہم نے ان کو حکم اور علم دیا۔

سیاق سباق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انہیں کتاب نہیں دی گئی تھی ورنہ وہ مبلغ کی حیثیت سے سامنے آتے، اس کے بعد زنانِ مصر نے انہیں اپنی طرف مائل کرنا چاہا، انہوں نے انکار کیا جس کے نتیجہ میں وہ قید خانہ میں بھیج دئے گئے، قید خانہ میں تبلیغ شروع ہوتی ہے، اگر بالفرض حکم وعلم کے ملنے سے مراد کتابِ الٰہی کا ملنا ہے تو پھر کتاب سے پہلے بچپن میں وحی کا آنا ثابت ہے، گویا یوسف علیہ السلام پر کتابِ الٰہی کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔

دیگر انبیاء کرام سے اللہ تعالیٰ کی گفتگو

چند فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچتے ہیں، فرشتے بیان کرتے ہیں کہ وہ لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف عذابِ الٰہی کے ساتھ بھیجے گئے ہیں۔

آگے ارشاد باری ہے:۔

يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ؕ (ھود-۷۴) ابراہیمؑ قوم لوط کے بارے میں ہم سے جھگڑنے لگے،

اللہ تعالٰے نے جواب دیا اے ابراہیم

اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ (ھود-۷۶) اس بات کو جانے دو،

کیا ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے مجادلہ اور سوال وجواب صحفِ ابراہیم میں موجود تھا۔

زکریا علیہ السلام دعا کرتے ہیں، اے اللہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں مجھے فرزند عنایت فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، تمہارے ہاں لڑکا ہوگا جس کا نام یحیٰی ہوگا اور یہ نام پہلے کسی کا نہیں ہوا، پوچھا اے اللہ کیسے ہوگا، میں بوڑھا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے، جواب ملا یہ میرے لئے آسان ہے، عرض کیا اے اللہ اس کی نشانی مقرر فرما دے، جواب دیا اس کی نشانی یہ ہے کہ تین رات تک تم بات نہ کرو۔ (مریم ۳تا۱۰) کیا یہ باتیں حضرت زکریا علیہ السلام کی کتاب میں موجود تھیں۔

نتیجہ قرآن مجید کے محولہ بالا واقعات سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے پاس کتابِ الٰہی کے علاوہ بھی وحی آیا کرتی تھی پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سید المرسلین کے پاس سوا قرآن مجید کے دوسری وحی نہ آئے، ضرور آتی تھی ورنہ لازم آئے گا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں آپ اس نعمت سے محروم تھے، انبیاء سابقین سے اللہ تعالیٰ کی باتیں ہوتی تھیں، سوال وجواب ہوتے تھے، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے علاوہ کبھی اللہ تعالےٰ سے سوال کیا اور نہ کبھی جواب ملا، ضرور سوال وجواب ہوئے لیکن وہ قرآن مجید میں موجود نہیں، لہٰذا وہ دوسری وحی (حدیث) میں ہیں۔

(۲) حدیث اگر حجت ہے تو پھر اس کا منزل من اللہ ہونا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف)

اس چیز کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور اس کے علاوہ کسی ولی کا اتباع مت کرو۔

اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث حجت ہے اور اس کے بغیر قرآن مجید پر عمل کرنا ناممکن ہے تو پھر یقیناً حدیث وحی ہے کیونکہ آیت بالا کی رو سے صرف وحی کا اتباع لازم ہے اور غیر وحی کا اتباع حرام ہے۔

حدیث کے حجت ہونے کے دلائل

دلیل اوّل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور قوم کو خطاب کیا (اے قوم)

اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِیْ اِلَی الْعِبَادِ اَدْعُوْهُمْ اِلٰی اَنْ یَّعْبُدُوا اللّٰهَ لَا یُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّ اُنْزِلَ عَلَیَّ کِتَابًا

(مسند احمد، وسندہ صحیح، بلوغ الامانی جزء ۲ ص ۲۶۶)

میں اللہ کا رسول ہوں، مجھے اللہ نے بندوں کی طرف مبعوث کیا ہے کہ میں انہیں اس بات کی دعوت دوں کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ ذرا سا بھی شرک نہ کرو اور مجھ پر اللہ نے ایک کتاب نازل کی ہے۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا الفاظ حجت ہیں تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے، اگر یہ الفاظ حجت نہیں تو پھر لازم آئے گا کہ نہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، نہ قرآن مجید اللہ تعالےٰ کی کتاب ہے۔ آپ کی رسالت اور قرآن مجید پر ایمان لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ الفاظ حجت ہوں، جب تک یہ الفاظ حجت نہ ہوں قرآن مجید بھی حجت نہ ہوگا اور یہ الفاظ حدیث کے الفاظ ہیں لہٰذا حدیث کا حجت ہونا لازمی ہے۔

دلیل دوم

قرآنی الفاظ کی تشریح و توضیح اور آیات قرآنی سے استنباطِ مسائل آج کل بھی لوگ کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے، عہدِ رسالت میں بھی لازماً ایسا ہوا ہوگا اور یہ عقلاً محال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی دوسرا تشریح و استنباط کے فرائض انجام دے، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کام کو بھی انجام دیتے ہوں گے اور جب آپ کسی آیتِ قرآنی کی تفسیر کرتے ہوں گے تو کیا کسی کو اس کے تسلیم کرنے سے انکار کرنا جائز تھا؟ کیا وہ کہہ سکتا تھا کہ آپ کی بیان کردہ آیت صحیح اور آپ کی تفسیر غلط، بس آپ آیت سنا دیجئے، تفسیر ہم خود کرلیں گے، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا اور جب ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں حدیث کا حجت ہونا ظاہر ہے۔

ایک شبہ

یہاں بعض لوگوں کو ایک شبہ بھی پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ آپ کی تفسیر صرف آپ کی زندگی میں حجت تھی، آپ کے انتقال کے بعد آپ کے خلیفہ کی تفسیر حجت ہوگی کیونکہ وہی اس وقت مرکزِ ملت ہوگا اور تفسیر کا تعلق مرکزِ ملت سے ہے، منصبِ رسالت سے نہیں، یہ شبہ بذاتِ خود مضحکہ خیز ہے گویا رسالت کا منصب مرکزِ ملت کے منصب سے کم درجہ کا حامل ہے، یہ عقلاً اور شرعاً محال ہے اور اگر بالفرضِ محال یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ مرکزِ ملت کی تفسیر حجت ہوگی تو بہرحال قرآن مجید کے علاوہ ایک دوسری چیز حجت مانی گئی اور یہ یقیناً مرکزِ اوّلین یعنی رسول کی تشریح سے کم درجہ کی چیز ہوگی، جب یہ حجت ہوسکتی ہے تو مرکزِ اوّلین یعنی رسول کی تشریح کا حجت ہونا زیادہ قرینِ عقل ہے۔

دلیل سوم

رسول صاحبِ وحی ہوتا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اس کی حدیث وحی الٰہی ہوتی ہے لہٰذا آیت زیرِ بحث کی رو سے اس کا اتباع لازمی ہے اور اس طرح ہم کسی قسم کے شرک میں مبتلا نہیں ہوتے لیکن جو لوگ مرکزِ ملت کی تشریح کو حجتِ شرعی سمجھتے ہیں اور اس کی اتباع کو لازمی قرار دیتے ہیں وہ یہ بتائیں کہ آیا ان کی یہ تشریح وحی ہوتی ہے یا نہیں، اگر وہ یہ کہیں کہ وحی ہوتی ہے تو گویا ہر مرکزِ ملت یعنی خلیفہ صاحبِ وحی ہوا اور یہ باطل ہے، اور اگر وہ یہ کہیں کہ وحی نہیں ہوتی تو پھر آیت زیرِ بحث کی رو سے اس کا اتباع حرام ہے اور حرام کو حلال بلکہ فرض سمجھنا شرک اور کفر کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا قرآن مجید کی تشریح کے لئے صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ اس کی تشریح بھی وحی ہو ورنہ اُس کا اتباع حرام بلکہ شرک ہوگا اور وحی صرف رسول کے پاس آتی ہے، لہٰذا صرف رسول کی تشریح حجت ہوگی، کسی اور کی تشریح حجت نہیں ہوگی یعنی حدیثِ رسول حجتِ شرعیہ ہے، لہٰذا وحی ہے۔

دلیل چہارم

کیا قرآن خود مکتفی ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس کو سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت ہے اور یہ مسلمہ امر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں، خصوصاً اس صورت میں کہ اسلامی حکومت اس جگہ قائم ہو جہاں کی مادری زبان عربی نہ ہو اور مرکزِ ملت عربی سے ناآشنا ہو، ایسی صورت میں قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے عربی لغت

کی طرف رجوع کرنا ہو گا، پس ثابت ہوا کہ قرآن کفایت نہیں کرتا بلکہ اپنی تشریح کے لئے دوسری چیز کا محتاج ہے اور یہ حجّت ہے، اور جب یہ چیز حجّت ہے تو وہ چیز حجّت کیوں نہ ہو جو قرآن کی شرعی لغت ہے، یعنی حدیث، لغت میں کسی لفظ کی تشریح یا معنی کسی ایک آدمی یا چند آدمیوں کی طرف منسوب ہوتے ہیں وہ آدمی بھی معصوم نہیں ہوتے کہ ان سے غلطی نہ ہو، پھر اکثر وہ مجہول ہوتے ہیں، مزید برآں ان کے بیان کردہ معانی مؤلّفِ لغت تک سنداً نہیں پہنچتے، پھر لغت کا مؤلّف ضروری نہیں کہ صادق القول اور راسخ فی العلم ہو، اگر باوجود ان تمام عوارض کے لغت کے مندرجات حجّت ہوں تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ معصوم، الصّادق المصدوق، صاحبِ وحی، انسانِ کامل، معلوم ومعروف شخصیت کے بیان کردہ معانی جو صادق القول اور راسخین فی العلم نے باسند، باوثوق، معروف ومشہور، صادق القول، مسلّمہ استادوں سے حاصل کر کے جمع کئے ہوں، حجّت نہ ہوں پھر یہ افسوس اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے جبکہ ان معانی پر اُمّت کا عملاً اجماع ہو، وہ معانی مخبرِ صادق تک نقلاً بھی مشہور ومتواتر ہوں اور عملاً بھی مشہور ومتواتر ہوں، پھر بھی وہ تو حجّت نہ ہوں، اور حجّت ہو تو وہ لغت جو بالکل بے سند ہو، مزید برآں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مؤلّف مسلم، باشرع، باوقار عالم بھی نہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ متعصب، غیر مسلم یا کم علم ملّا ہو۔

دلیل پنجم

لغت زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہے لہٰذا کس لغت کو حجّت قرار دیا جائے اور کس کو نہیں اس مشکل کا حل سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ اُس لغت کو حجّت مانا جائے جو مہبطِ وحی نے بنائی اور وحی کے اوّلین مخاطبین نے سمجھی اور اُس وقت بولی جاتی تھی جب قرآن مجید اُتر رہا تھا۔

دلیل ششم

ہر فن اور ہر علم کی ایک اصطلاح ہوتی ہے، بعض اوقات لغت میں کچھ اور معنی ہوتے ہیں اور اصطلاح میں کچھ اور ایسی صورت میں اصطلاحی معنی ہی منشاءِ کلام کو سمجھنے کے لیے حجّت ہوتے ہیں، نہ کہ لغوی معنی، ایک شخص گو وہ کتنا ہی بڑا ادیب کیوں نہ ہو، علوم ریاضی، علومِ طبیعات، علومِ طب وغیرہ کی کتابوں کو نہیں سمجھ سکتا، اس لئے کہ وہ فنّی اصطلاحوں سے ناواقف ہوتا ہے، اس کے لئے لغت کا علم بے کار ہی نہیں ہو گا بلکہ مزید حیرانی کا موجب۔ قرآن مجید چونکہ علوم شرعیہ کا منبع ہے لہٰذا اس کی بھی کوئی نہ کوئی اصطلاح ہونی چاہیئے مثلاً زکوٰۃ کے لغوی معنی کچھ اور ہیں اور شرع میں کچھ اور، اور شرع میں وہی معنی معتبر ہیں جو کہ اصطلاحاً مشہور ومعروف ہیں اور اصطلاح بھی اس شخص کی مستند مانی جائے گی جس پر قرآن مجید نازل ہوا یا ان لوگوں کی جن کے زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا کیونکہ مُرورِ ایّام سے اصطلاح بھی بدل جایا کرتی ہے، الغرض حدیث، قرآن مجید کے اصطلاحی معنی بیان کرتی ہے لہٰذا تشریحِ قرآن مجید کے لئے وہی حجّت ہے اور بس۔

دلیل ہفتم

لغت میں ایک ہی لفظ کے دو دو، تین تین، چار چار بلکہ دس دس، بیس بیس معانی دیئے ہوتے ہیں، اگر قرآنی تشریح کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو قرآن مجید بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔ کوئی کچھ معنی کرے گا اور کوئی کچھ، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ الحاد کو پنپنے کا موقع ملے گا، اختلافات کا ایک سیلاب عظیم ہوگا اور اُمت مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی جیسا کہ من مانی تفسیر کرنے سے فی الواقع ہو چکا ہے اور مختلف فرقوں کا وجود اس کا عملی ثبوت ہے، ان فرقوں نے حدیث کا براہِ راست انکار کرنے کے بجائے اس کو ٹالنے کے لئے چور دروازے تلاش کئے، کبھی قرآن مجید کو بطورِ حجت پیش کیا اور اس کے معانی وہ اختیار کر لئے جو حدیث کے خلاف تھے اور پھر بطورِ فخر کہنے لگے کہ ہمارے قول کی دلیل قرآن مجید ہے، بھلا قرآن مجید کے مقابلہ میں حدیث کیسے مانی جائے گی، کبھی اپنی عقلِ ناقص کو معیار بنا کر حدیث کو خلافِ عقل سمجھ لیا اور اس طرح حدیث سے نجات حاصل کر لی، اس اختلاف اور الحاد کے سدّباب کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے ہر لفظ کے ایک معنی مقرر ہوں اور یہ کون کر سکتا ہے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایسی شخصیت ہیں جن پر سب جمع ہو سکتے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ حدیث حجت ہو اور قرآن مجید کی وہی تشریح قابلِ تسلیم ہو جو حدیث میں بیان کر دی گئی ہو، پس ثابت ہوا کہ حدیث حجت ہے، لہٰذا منزل من اللہ ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس مشکل کا حل بعض لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ مرکزِ ملت کی تشریح ہر شخص کو تسلیم کرنی ہوگی لہٰذا اختلاف و الحاد کا کوئی امکان نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جبری اتفاق ہوگا، اس سے ذہنی اختلاف دور نہ ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ ذہنی اختلاف عملاً پھوٹ پڑے اور بڑے بڑے فتنوں کا موجب بن جائے مثلاً خارجی اور سبائی تحریکیں اسی ذہنی اختلاف کا نتیجہ تھیں، دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ تاریخ اس بات کی تائید نہیں کرتی کہ مرکزِ ملت نے کوئی تشریح کی ہو اور کبھی اس کو چیلنج نہ کیا گیا ہو بلکہ بارہا ایسا ہوا ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے تاریخ کے طالب علم بخوبی واقف ہیں، تیسرے یہ کہ اگر ایک مرکزِ ملت اپنے زمانہ میں ایک آیت کے کچھ معنی کرے، دوسرا مرکزِ ملت کچھ اور، اور تیسرا مرکزِ ملت کچھ اور معنی کرے اور اسی طرح معنی بدلتے رہیں تو کیا یہ سب تشریحات صحیح مانی جائیں گی، کیا ہر تشریح کا لوحی من السماء ہوگی، کیا یہ تمام تشریحات "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کی مصداق نہ ہوں گی اور ایک غیر مسلم ان میں سے کون سی تشریح کو قرآنی تشریح خیال کرے گا۔ فرض کیجئے کہ ایک مرکزِ ملت پانچ وقت کی نماز فرض قرار دے اور دوسرا مرکزِ ملت تین وقت کی نماز فرض مانے تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دونوں تشریحات صحیح ہیں کوئی غلط نہیں، جیسا کہ تقلیدی مذاہب میں ہوا اور ہو رہا ہے، ایک ہی چیز ایک مذہب میں حلال، دوسرے

میں حرام، اور دونوں اپنے اپنے دائرہ میں حق پر، اب اگر کوئی حرام کھا رہا ہے تو کھاتا رہے، ہمیں بولنے کی کیا ضرورت، وہ ہمارے لئے حرام ہے لیکن اس کے لئے حلال ہے، اس کو نادانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، کتنا عجیب اور کس قدر مضحکہ خیز وہ سماں ہوگا جب ایک ہی زمانہ میں دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف مراکزِ ملت قائم ہو جائیں اور ہر ایک اپنی اپنی تشریح کرتا رہے، حلال و حرام کا فرق ہو، اختلافات بعیدہ ہوں، لیکن ہم پھر بھی یہی کہیں کہ سب ٹھیک ہیں۔

برقؔ صاحب ذرا غور فرمایئے وہ وقت کتنا عجیب ہوگا جب کوئی مرکزِ ملت کسی ایسے لفظ کی جو لغتِ اضداد سے ہو کوئی خاص تشریح کرے اور دوسرا مرکزِ ملت ایسی تشریح کرے جو پہلے کی ضد ہو۔ کیا یہ صورت ظہور پذیر نہیں ہو سکتی؟ ضرور ہو سکتی ہے، پھر کیا یہ صورت حق ہوگی؟ نہیں بالکل باطل ہوگی، عقلِ سلیم کسی ایک معنی اور اس کی ضد دونوں کو صحیح نہیں مان سکتی، لہٰذا مرکزِ ملت کے معانی حجت نہیں ہو سکتے اور نہ اُس سے اختلاف والحاد کا سدِّ باب ہو سکتا ہے۔ یہ مرکزِ ملت کا مفروضہ اصول ہی بالکل مضحکہ خیز ہے، کاش یہ لوگ غور کرتے۔

چوتھی بات اس سلسلہ میں یہ بھی غور طلب ہے کہ جب کوئی مرکزِ ملت ہی نہ ہو، جیسا کہ آج کل ہے، تو پھر اختلاف والحاد کو روکنے کی کیا صورت ہوگی، اختلاف اور الحاد کے سدِّ باب کے لیے کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیئے جو عارضی نہ ہو بلکہ مستقل اور دائمی ہو، مرکزِ ملت اول تو اس مرض کی دوا نہیں، اور پھر مستقل اور دائمی نہ ہونے کی وجہ سے اس کو علاج کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں، اس کا سدِّ باب وہی چیز کر سکتی ہے جو خود دائمی اور مستقل ہو، اور وہ سوائے حدیث کے اور کچھ نہیں، لہٰذا حدیث کے حجت ہونے میں کیا شبہ رہا، اور جب وہ حجت ہوئی، تو آیت زیرِ عنوان کی رو سے وحی ہوئی۔

دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید اپنی تشریح آپ کرتا ہے، لہٰذا ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں، لیکن یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، حقیقت اس کے خلاف ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ"۔ صلوٰۃ قائم کرو، صلوٰۃ کسے کہتے ہیں، اس کی تفصیل نہیں، قرآن مجید میں جب اس کی تشریح تلاش کرتے ہیں تو عجیب حیرانی ہوتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے "اُولٰٓئِكَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ" صابرین پر اللہ کی طرف سے صلوٰۃ ہوتی ہے اور رحمت۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے "وَصَلِّ عَلَیۡهِمۡ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ" ان پر صلوٰۃ بھیجئے، بے شک آپ کی صلوٰۃ ان کے لئے باعثِ سکون ہے، ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ نازل ہو رہی ہے، دوسری آیت میں بندے کو حکم ہو رہا ہے کہ صلوٰۃ نازل کرو، اب کوئی کیا سمجھے، ایک جگہ ارشاد ہے "اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ" دین قائم کرو، ہو سکتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی

دین کے ہوں اور اس آیت میں صلوٰۃ کی تشریح دین سے کی گئی ہو، پھر ارشاد ہوتا ہے "وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ"، وزن قائم کرو، لہٰذا صلوٰۃ کے معنی وزن کے بھی ہو سکتے ہیں، پھر ارشاد ہوتا ہے "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ"، یعنی دن کے دونوں اطراف اور کچھ رات کے وقت بھی صلوٰۃ قائم کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ ایسی چیز ہے جو مسلسل قائم نہ رکھی جائے بلکہ دن اور رات کے بعض اوقات میں قائم کی جائے "صلوٰۃ" کے معنی کولہے ہلانے کے بھی ہو سکتے ہیں، اس لحاظ سے اگر کوئی اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے معنی یہ کرے کہ "ناچ کی محفل قائم کرو" اور ثبوت میں یہ آیت پیش کرے "اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ"، (حدید - ۲۰) دنیا کی زندگی بس لہو ولعب ہی تو ہے اور پھر اس طرح استدلال کرے کہ جب دنیا کی زندگی لہو لعب ہی ہے تو دنیا میں محفلِ رقص وسرود قائم کرنا ہی "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" کا اصلی منشاء ہے تو بتایئے اس کی تردید کیسے ہو سکتی ہے۔

دوسری مثال اور دلیل ہشتم

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" زکوٰۃ دو، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :۔

یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ وَاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ۝ وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً وَکَانَ تَقِیًّا ۝
(مریم ۱۲، ۱۳)

اے یحیٰی کتاب کو قوت سے پکڑ لو اور ہم نے یحیٰی کو بچپن میں ہی حکم دے دیا تھا اور اپنی طرف سے مہربانی دی تھی، اور زکوٰۃ دی تھی، اور وہ متقی تھے۔

اس دوسری آیت میں زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی کے ہیں، تو پہلی آیت کے معنی ہوئے "پاکیزگی دو" اور یہ معنی سراسر باطل ہیں، اور اگر پہلی آیت میں زکوٰۃ سے مراد ٹیکس ہے تو دوسری آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالےٰ حضرت یحیٰی علیہ السلام کو ٹیکس دیتا تھا، اور یہ بالکل مضحکہ خیز ہے۔

ان دونوں مثالوں سے واضح ہوا کہ قرآن مجید اکثر مقامات میں تشریح اصطلاحی کا محتاج ہے، یعنی ایک استاد کی ضرورت ہے جو اسے پڑھائے اور اس کے مشکل مقامات کو حل کرے اور وہ استاد سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کون ہو سکتا ہے کیونکہ یہ منصب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالےٰ نے دیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :۔

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔
(الجمعۃ ۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اُمیّوں میں ایک رسول مبعوث کیا جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اب اگر پڑھانے میں تشریح شامل نہیں ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلاوت کر دینا کافی تھا لیکن محض تلاوت پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ تلاوت کا منصب بتانے کے بعد تعلیم کا منصب بھی بتایا گیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں، لہٰذا آپ کی تشریح بھی من جانب اللہ ہونی چاہیئے اور یہی وہ چیز ہے جس کو وحیِ خفی کہا جاتا ہے، اب اس کے حجت ہونے میں کیا شبہ رہ گیا۔

دلیل نہم

قرآن مجید کی بہت سی آیات بالکل ناقابلِ عمل ہیں، جب تک ان کی وہ تشریح تسلیم نہ کی جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے مثلاً اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

(۱) اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ۔ حج کے چند مہینے معلوم ہیں۔

(البقرۃ۔ ۱۹۷)

. . . .

یہ مہینے کون سے ہیں؟ قرآن مجید اس سلسلہ میں خاموش ہے، ان مہینوں کے ناموں کا تذکرہ تو احادیث ہی میں ملتا ہے، غرض یہ کہ بغیر حدیث کے یہ آیت ناقابلِ عمل ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۲) اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (التوبۃ۔ ۳۶)

اللہ کے نزدیک آسمان وزمین کی پیدائش کے دن سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہ ہے دین قیّم۔

آیتِ مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین بارہ مہینوں اور چار محترم مہینوں پر مشتمل ہے لیکن قرآن مجید ان چار محترم مہینوں کے ناموں کے سلسلہ میں خاموش ہے، بتائیے کن مہینوں کو حرمت والے مہینے سمجھا جائے، اگر یہ کہا جائے کہ رواج کے مطابق مان لیا جائے تو یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ کفار تو ان مہینوں کو بدل دیا کرتے تھے، جیسا کہ خود قرآن مجید نے بتایا ہے:۔

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ۔ (التوبۃ۔ ۳۷)

یعنی مہینوں کا آگے پیچھے کر لینا کفر میں زیادتی ہے۔

اب اگر ہم ان مہینوں کو رواج کے مطابق مان لیں تو پھر مہینوں کا تقرر کفار کے ہاتھ میں ہوگا، نہ رسول کے ہاتھ میں، نہ مرکزِ ملت کے ہاتھ میں، جس مہینہ کو کافر حرمت والا کہہ دیں، بس ہم بھی اس کی حرمت کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ (البقرۃ۔ ۱۹۴)

اگر کفار کسی مہینے کی حرمت کریں تو تم بھی حرمت کرو۔ ادب کی چیزیں ایک دوسرے کا بدلہ ہیں۔

گویا قرآن مجید کی آیت کفار کی محتاج ہوئی، جو عمل کفار کا وہی قرآن مجید کا منشاء۔

اللہ تعالٰے فرماتا ہے:۔

(۳) وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ — معلوم شدہ دنوں میں اللہ کے نام کا ذکر کریں۔

(الحج۔ ۲۸)

قرآن مجید پھر ساکت ہے، کہ ان ایام کی تشریح کرے، اب بتایئے اس پر کس طرح عمل ہو۔

(۴) حروف مقطعات کیوں واقع ہوئے ہیں، ان کی تشریح سے قرآن مجید خاموش ہے اور جو لوگ ان حروف کی تشریح قرآن مجید سے کرتے ہیں، وہ سوائے تُک بندی کے اور کچھ نہیں۔

اللہ تعالٰے فرماتا ہے:۔

(۵) وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ○ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ ○ (الصّٰفّٰت ۱۶۴) — اور ہم میں سے ہر ایک کا مقام مقرر ہے اور ہم صف باندھنے والے ہیں۔

معلوم نہیں ان آیات کا متکلّم کون ہے، پوری سورت پڑھ جایئے، کہیں اس جملہ کا متکلّم نہیں ملے گا۔

اللہ تعالٰی فرماتا ہے۔

(۶) وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ۔ — اللہ کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔

(البقرۃ۔ ۹۶)

معلوم نہیں حج کیا چیز ہے، عمرہ کیا چیز ہے، اور ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

اللہ تعالٰے فرماتا ہے۔

(۷) وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ۔ — ہم نہیں نازل ہوتے مگر آپ کے ربّ کے حکم سے۔

(مریم۔ ۶۴)

بظاہر اس آیت میں متکلّم اللہ تعالٰے ہے کیونکہ اس سے اوپر کی آیات میں مسلسل جمع متکلّم کا صیغہ ہے جو اللہ تعالٰے نے اپنے لئے استعمال کیا ہے، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالٰے نازل نہیں ہوتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ربّ کے حکم سے، گویا اللہ تعالٰے کا بھی کوئی حاکم ہے جس کے حکم سے وہ نازل ہوتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

غرض یہ کہ اس قسم کی بیسیوں گتھیاں ہیں، اُن کو کون سُلجھائے۔ اگر یہ کام مرکزِ ملّت کے سپرد کر دیا جائے تو مختلف ادوار میں، بلکہ ایک ہی زمانہ کے مختلف مراکز میں حج کے مختلف مہینے ہوں گے، ایّامِ معلومات مختلف ہوں گے، حروفِ مقطعات کی مختلف تشریحات ہوں گی، ایک ہی آیت کے مختلف متکلّم مان لئے جائیں گے، مسلم خواہ کچھ بھی کہیں، غیر مسلم تو ان مختلف تشریحات کو دیکھ کر ہنسنے کے سوا اور کیا کرے

گا، ان گتھیوں کا بس ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کو حل کریں، لہٰذا حدیث حجت ہوئی اور آیت زیرِ عنوان کی رو سے وحی ہوئی۔

دلیل دہم

قرآن مجید کی متعدد آیات پر عمل کرنا ممکن نہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۱) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ (البقرۃ۔ ۱۵۰)

اور جہاں کہیں سے آپ نکلیں، اپنے منہ کو مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیا کریں اور جہاں کہیں بھی تم ہو، اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف کر لیا کرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر وقت ہر حال میں منہ کعبہ کی طرف رہنا چاہیئے، کیا یہ ممکن ہے؟ آخر یہ حکم کس وقت کے لئے ہے؟ کون بتائے، کس طرح اس پر عمل ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۲) وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ۔ (البقرۃ۔ ۲۸۲)

جب تم خرید و فروخت کیا کرو، تو گواہ کر لیا کرو۔

بتائیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کے خریدتے وقت ہر دکان دار و خریدار گواہ کر لیا کریں، کیا یہ حکمِ قرآنی ممکن العمل ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۳) يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ (الاعراف۔ ۳۱)

اے بنی آدم، ہر نماز کے وقت اپنی زینت کی چیزیں پہن لیا کرو۔

اس آیت پر کس طرح عمل کیا جائے؟ زینت تو لباس بھی ہے، زیورات بھی ہیں، کیا اس آیت کی رو سے عورتوں کو زیورات پہن کر نماز پڑھنی چاہیئے؟

غرض کہ اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جو ناقابلِ عمل ہیں جب تک ان کے معنی اور ان کا موقع و محل متعیّن نہ ہو ان پر عمل نہیں ہو سکتا اور یہ چیزیں کون متعیّن کر سکتا ہے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، لہٰذا حدیث حجت ہوئی اور آیت زیرِ عنوان کی رو سے وحی ہوئی۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

مندرجہ بالا دس دلائل سے ثابت ہوا کہ حدیث حجت ہے، لہٰذا آیت زیرِ عنوان کی رو سے وحی ہے، ورنہ غیر وحی کا اتباع لازم آئے گا اور یہ آیت کے خلاف ہے۔

(۳) حدیث کے وحی خفی ہونے کا ثبوت قرآن مجید سے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

(۱) مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (الحشر-۵)

جو درخت تم نے کاٹے یا چھوڑ دئے یہ سب اللہ کے حکم سے تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ درخت اللہ تعالےٰ کے حکم سے کاٹے گئے تھے لیکن وہ حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن مجید کے علاوہ کوئی وحی تھی جس کے ذریعہ حکم بھیجا گیا تھا۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۲) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ (البقرۃ-۱۴۳)

اور اس قبلہ کو جس پر آپ اس زمنت میں یعنی بیت المقدس کو، ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں کون رسول کی اتباع کرتا ہے۔

بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کا حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں، لہٰذا وہ حکم بذریعہ وحی خفی تھا، واضح ہو کہ اس آیت میں قبلہ سے مراد بیت المقدس ہے کیونکہ اس سے آگے ارشاد ہے "فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا" ہم عنقریب اُس قبلہ کی طرف آپ کو موڑ دیں گے جس قبلہ کی آپ کو خواہش ہے یعنی کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۳) وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ (التحریم-۳)

اور جب نبی نے ایک بات پوشیدہ طور پر اپنی ایک بیوی سے کہی تو اس بیوی نے اس بات کو ظاہر کر دیا، اللہ نے نبی کو اس افشاءِ راز سے مطلع کر دیا تو نبی نے بعض بات جتادی اور بعض بات سے چشم پوشی کی، پس جب نبی نے اس بیوی سے اس بات کا ذکر کیا تو بی بی نے پوچھا، آپ کو کس نے خبر دی ؟ نبی نے کہا مجھے علیم وخبیر نے خبر دی۔

قرآن مجید میں کہیں نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو مطلع کیا کہ فلاں بی بی نے تمہارا راز ظاہر کر دیا، پھر علیم وخبیر اللہ نے کس طرح خبر دی، ظاہر ہے کہ وحی خفی یعنی حدیث کے ذریعہ۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۴) اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ

جس زمنت اے نبی تم مؤمنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں ۔۔۔۔۔

الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝

(آل عمران :- ۱۲۴، ۱۲۵)

رب تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے بلکہ اگر تم صبر کروگے اور پرہیزگاری اختیار کروگے، اور کافر پورے جوش و خروش سے تم پر حملہ آور ہوں گے تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان دار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

یہ خبر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے پہلے صحابہ کو دی تھی اور جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے جنگ کے بعد ان آیات میں کیا ہے، قرآن مجید میں کہاں ہے؟ آخر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تین ہزار بلکہ پانچ ہزار فرشتوں سے مدد فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۵) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ

(المجادلۃ :- ۸)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشی سے منع کر دیا گیا تھا لیکن وہ اب بھی وہی کام کر رہے ہیں جس کی ممانعت کی گئی تھی اور وہ برابر گناہ، ظلم و زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی کرتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے سرگوشی سے منع کیا گیا ہوگا لیکن ممانعت کا حکم قرآن مجید میں اس آیت کے بعد ہے، پس ثابت ہوا کہ پہلے بذریعہ وحی خفی منع کیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۶) حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

(البقرۃ :- ۲۳۸ - ۲۳۹)

نمازوں کی حفاظت کرو، خصوصاً درمیانی نماز کی، اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہوا کرو، اگر تم کو خوف ہو تو پھر نماز پیدل یا سواری پر ہی پڑھ لو، لیکن جب امن ہو جائے تو پھر اسی طریقہ سے اللہ کا ذکر کرو جس طریقہ سے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے اور جس طریقہ کو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ نماز پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ مقرر ہے جو بحالتِ جنگ معاف ہے۔ بحالتِ امن اسی طریقہ سے نماز پڑھنی چاہیئے، اس طریقہ کی تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا

ہے لیکن قرآن مجید میں یہ طریقہ کہیں مذکور نہیں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سکھایا اور حدیث کے ذریعہ سکھایا جو بذریعہ وحی نازل ہوئی۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۷) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (الجمعة:۔ ۹)

اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن نماز کے لئے تم کو بلایا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف جلدی سے آجایا کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو۔

آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کے لئے بلایا جاتا تھا لیکن اس بلانے کا کیا طریقہ تھا، یہ بلانا کس کے حکم سے مقرر ہوا تھا، قرآن مجید اس سلسلہ میں خاموش ہے۔ پھر جمعہ کی نماز کا اہتمام علاوہ اور دنوں کے کوئی خاص درجہ رکھتا تھا، پھر جمعہ کی نماز کا کوئی خاص وقت بھی مقرر ہوگا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر وقت تیار رہیں، جب بلایا جائے چلے آئیں، خواہ دن میں کئی مرتبہ بلایا جائے، یہ سب چیزیں اس آیت کے نزول سے پہلے مقرر ہو چکی تھیں لیکن قرآن مجید اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر یہ تمام کام بذریعہ وحی خفی یعنی بذریعہ حدیث مقرر ہوئے تھے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۸) فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (النساء:۔ ۱۱)

اگر دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کو دو تہائی ترکہ ملے گا۔

آیت سے ظاہر نہیں ہوتا کہ کن حالات میں ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا، لہٰذا لازمی ہے کہ ان حالات کا علم بذریعہ وحی خفی دیا گیا ہو، اسی طرح اس آیت میں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ تقسیم کے بعد باقی ترکہ کا کیا کیا جائے، آخر اس کا بھی کوئی مصرف ہونا چاہیے، یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے ضائع ہونے دیا جائے یا یوں ہی چھوڑ دیا جائے، لہٰذا اس کے متعلق بھی کوئی ہدایت ہونی چاہیئے لیکن وہ ہدایت بھی قرآن مجید میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہدایت حدیث میں ہوگی، لہٰذا حدیث وحی ہوئی۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۹) فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ (البقرۃ:۔ ۱۸۷)

اب تم رمضان کی راتوں میں عورتوں سے مل سکتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پہلے رمضان کی راتوں میں عورتوں سے ملنا منع تھا، لیکن ممانعت کا حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں، لہٰذا یہ حکم بذریعہ وحی خفی نازل ہوا تھا، لہٰذا حدیث وحی خفی ہوئی۔

(۴) حدیث بھی منزل من اللہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:۔

(۱) وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ
(النساء: ۱۴۰)

اور اللہ تعالےٰ تم پر کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کے ساتھ کفر اور استہزاء ہوتا ہوا سنو، تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو، جب تک وہ کوئی اور بات نہ کریں، اگر تم ان کے پاس بیٹھ گئے تو پھر تم بھی ان ہی کے مثل ہو گئے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے یہ حکم نازل ہو چکا تھا کہ آیات کا مذاق اڑانے والوں کے پاس مت بیٹھو، لیکن وہ حکم قرآن مجید میں نہیں اور جو حکم قرآن مجید میں ہے اس کا مضمون اور اندازِ تخاطب یہ نہیں ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے، لہٰذا وہ حکم بذریعہ وحی خفی نازل ہوا تھا، اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کتاب سے مراد صرف قرآن مجید ہی نہیں بلکہ حدیث بھی ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۲) وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ○
(النساء: ۱۱۳)

اور اللہ نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اور حکمت نازل فرمائی اور وہ باتیں بتائیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

اس آیت میں اگر کتاب سے مراد قرآن مجید ہے تو حکمت سے مراد سوائے حدیث کے اور کیا ہے۔ اگر حکمت سے بھی قرآن مجید ہی مراد ہے تو متعدد مقامات پر کتاب و حکمت کی تکرار بے فائدہ ہے، پس ثابت ہوا کہ حکمت سے مراد حدیث ہے اور یہ کہ حدیث بھی منزّل من اللہ ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۳) أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم (رسول کی اطاعت سے) منہ پھیرو گے تو اس کے ذمہ صرف وہ ہے جو اس پر لازم کر دیا گیا ہے اور تمہارے ذمہ وہ چیز ہے جو تم پر لازم کر دی گئی ہے اور اگر تم رسول

(النور:۔ ۵۴) کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤ گے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ

(البقرۃ:۔ ۱۲۰)

اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی حقیقت میں ہدایت ہے۔

یہ ہدایت کس طرح آتی ہے،

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (البقرۃ:۔ ۳۸)

میری طرف سے وقتاً فوقتاً ہدایت آتی رہے گی پس جن لوگوں نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ بے خوف اور بے غم ہوں گے۔

پہلی آیت سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہدایت ہے، اور دوسری اور تیسری آیات سے ثابت ہوا کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہتی ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام منزّل من اللہ ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ رسول کی اطاعت صرف قرآن مجید کی اطاعت ہے، اس کے علاوہ نہیں بلکہ مطلق اطاعت کا حکم دیا، لہٰذا قرآن مجید اور غیر قرآن مجید ہر قسم کی اطاعت اس میں شامل ہے۔

غلط فہمی اسلامی تعلیمات کے ماحصل کے سلسلہ میں برق صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں۔

(۲۰) "تمام علوم جدیدہ مثلاً طبیعات، ریاضیات، اقتصادیات، تعمیرات وغیرہ کو کفر خیال کرنا۔"

(۲۱) "غور وفکر اور اجتہاد و استنباط کو گناہ قرار دینا۔"

(۲۲) "صرف کلمہ پڑھ کر بہشت میں پہنچ جانا۔"

(۲۳) "ہر مشکل کا علاج عمل اور محنت سے نہیں، بلکہ دعاؤں سے کرنا۔" (دو اسلام صفحہ ۱۶)

ازالہ برق صاحب یہ کسی مُلّا ہی نے کہا ہوگا، البتہ بعض حالات میں یہ باتیں صحیح بھی ہیں

غلط فہمی برق صاحب پھر تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"میں سارا قرآن پڑھ گیا اور کہیں بھی محض دعا یا تعویذ کا کوئی صلہ نہ دیکھا، کہیں بھی زبانی خوشامد کا اجر زمردیں محلات، لاکھ لاکھ حوروں اور حجوں کی شکل میں نہ پایا، یہاں میرے کانوں نے صرف تلواروں کی جھنکار سُنی، اور میری آنکھوں نے غازیوں کے وہ جھرمٹ دیکھے جو شہادت کی لازوال دولت حاصل کرنے کے لئے جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود رہے تھے۔" (دو اسلام صفحہ ۱۹)

ازالہ برق صاحب جو کچھ آپ نے قرآن مجید میں دیکھا، یہ سب کچھ حدیث میں بھی ہے، ہم کہاں تک فضائل جہاد کی احادیث نقل کریں، احادیث کے دفتر اس سے پُر ہیں، براہِ کرم آپ صرف مشکوٰۃ شریف ہی سے ابواب فضائل الجہاد نکال کر پڑھیں تو آپ کو اس سلسلہ میں قرآن مجید سے بہت زیادہ مواد ملے گا۔

اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی "میں نے سوچا کہ حدیث و قرآن کی بتائی راہوں میں اتنا فرق کیوں ہے اور راہیں بھی ایسی کہ کسی مقام پر آپس میں نہیں ملتیں، احادیث کی تاریخ پڑھی تو مجھ پر منکشف ہوا کہ کہیں تو اعدائے اسلام نے توہین اسلام کے لئے، اور کہیں ہمارے علماء نے قرآن کے تیغ و سنان والے اسلام سے بچنے کے لئے تقریباً چودہ لاکھ احادیث وضع کر رکھی ہیں۔ جہاں ایک ایک دعا کا صلہ لاکھ لاکھ جنت دیا ہوا ہے" (دو اسلام صفحہ ۲)

ازالہ برق صاحب قرآن و حدیث کی راہوں میں تو فرق نہیں ہے، ہاں قرآن مجید اور خود تراشیدہ اسلام میں فرق ضرور ہے اور یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ذمّہ دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس قسم کی احادیث وضع کیں، ملاّ کی تو میں کہتا نہیں، مگر برق صاحب کیا علماء کے ہاں ان احادیث کی کوئی وقعت ہے، ہرگز نہیں، علماء کے ہاں تو جہاد اس ہی درجہ پر ہے، جہاں آپ اسے سمجھتے ہیں صحیح احادیث میں اس کے فضائل بے شمار ہیں اور قیامت تک اس کو باقی رکھا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لَنْ یَّبْرَحَ هٰذَا الدِّیْنُ قَائِمًا یُّقَاتِلُ عَلَیْهِ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ (صحیح مسلم)	یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمین کی ایک جماعت قیامت تک اس دین کی خاطر لڑتی رہے گی۔

ہاں برق صاحب یہ چودہ لاکھ کی تعداد آپ نے بہت زیادہ لکھ دی، اس پر مزید غور فرمایئے گا۔

اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "اور ساتھ ہی یقین ہو گیا کہ اسلام دو ہیں، ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے اور دوسرا وضعی احادیث کا اسلام" (دو اسلام صفحہ ۲)

ازالہ برق صاحب ہمیں آپ سے اتفاق ہے۔ یہ خود تراشیدہ اسلام واقعی اصلی اسلام سے علیحدہ ایک چیز ہے اور اس کی بنیاد متعدد وضعی احادیث پر رکھی گئی ہے اور بعد ازاں بدعات و خرافات پر، لیکن ایک وہ اسلام ہے جس کی بنیاد صحیح احادیث پر ہے، وہ وہی اسلام ہے جو قرآن مجید نے

بتایا ہے، بے شک آپ وضعی احادیث کے اسلام کو نہ مانیں، لیکن صحیح احادیث کے اسلام کو مان لینے میں تو آپ کو تامل نہیں ہونا چاہیئے اور غالباً نہیں ہوگا کیونکہ آپ نے خود ہی آخری باب کا عنوان ”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا“ مقرر کیا ہے، لہٰذا ہمیں آپ سے اختلاف ہی کب ہے، ہاں چند غلط فہمیاں آپ کو ہو گئی ہیں جن کا ازالہ انشاءاللہ آئندہ صفحات میں کر دیا جائے گا۔

یہاں تک تمہید کا جواب تھا، اب ہم اصل کتاب کا جواب شروع کرتے ہیں۔ ہم اللہ تعالےٰ سے توفیق طلب کرتے ہیں اور آپ سے انصاف کے خواہاں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

"حدیث میں تحریف"

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"وضعی احادیث اقوال رسول کے ساتھ یوں غلط ملط ہو چکی ہیں کہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو رہا ہے ۔" (دو اسلام ص۳۷ ملخصاً)

ازالہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر :- ۹)

ہم نے یہ نصیحت نازل فرمائی ہے ، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں ۔

یہ تو ہم تمہید کے جواب میں ثابت کر آئے ہیں کہ حدیث وحی ہے اور اس کا اتباع لازمی ہے ، للہذا اس کی حفاظت بھی اللہ تعالےٰ کے ذمہ ہے ، بے شک اللہ تعالےٰ نے اس کی حفاظت کی ، حفاظت کے اسباب مہیا کیے جن کے ذریعہ صحیح احادیث کو محفوظ کر دیا گیا اور موضوعات کو چھانٹ کر الگ کر دیا گیا ، ایک طرف اگر تحریف کا عمل جاری تھا ، تو دوسری طرف تخلیص کا عمل بھی جاری تھا ، حق کو باطل سے علیحدہ کر دیا گیا اور جس بات کو آپ ناممکن سمجھ رہے ہیں ، وہ ممکن ہو گئی اور اس کو آپ نے خود تسلیم کیا ہے ۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی حدیث صحیح موجود ہی نہیں ۔"

اس سے ذرا آگے تحریر فرماتے ہیں :-

"دوم کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو ، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں ۔"
(دو اسلام ص۳۴۱)

پھر تحریر فرماتے ہیں :-

"اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پہ ہم نازاں ہیں" (دو اسلام ص۳۴۲)

برق صاحب آپ کے اس اعتراف کے بعد اب کوئی ضرورت اس امر کی باقی نہیں رہتی کہ تخلیص احادیث کی تاریخ پیش کی جائے، اور یہ ثابت کیا جائے کہ دودھ الگ اور پانی الگ کر دیا گیا، تاہم اس سلسلہ میں چند معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

حدیث کی حفاظت

حدیث کی حفاظت دو طرح سے ہوئی۔

(۱) عملاً اور (۲) نقلاً

جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، اس پر ہر زمانے میں عمل ہوتا رہا، اور ہر زمانے میں وہ پڑھی جاتی رہی اور پڑھائی جاتی رہی، مثلاً حدیث میں ہے کہ نماز پانچ وقت کی فرض ہے' ظہر کی چار رکعت ہیں، مغرب کی تین رکعت ہیں، ہر رکعت میں ایک رکوع، اس کے بعد دو سجدے ہیں' سال میں دو عیدیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی بے شمار حدیثیں ہیں، جو ہر زمانہ میں بچہ بچہ کی زبان پر تھیں اور اگر زبان سے بیان نہ بھی ہوئیں تو کم از کم ذہن میں اور عمل میں ہر ایک کے موجود تھیں، تواتر کے ساتھ ان پر عمل ہو رہا تھا اور تواتر کے ساتھ نقل کی جا رہی تھیں، ان احادیث کی صحت قطعی ہے اور ان کا تواتر قرآن مجید کے تواتر سے بھی زیادہ وسیع ہے،

قرآن مجید کی آیات چند علماء اور حفاظ کی حفاظت میں تھیں لیکن یہ احادیث ہر عالم اور جاہل، مرد عورت، چھوٹے اور بڑے کے عمل میں آرہی تھیں اور ان کے ذہن میں محفوظ تھیں، پھر نقل کے اعتبار سے بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے، فرض کیجئے ایک محدث نے ایک حدیث بیان کی اور اپنے ہزارہا شاگردوں کو املاء کرائی، پھر اس محدث کے ہم عصر سینکڑوں محدثین نے بھی اپنے اپنے ہزارہا تلامذہ کو وہ حدیث املاء کرائی، ذرا حساب لگا کر دیکھیے، ایک ہی حدیث کو ایک ہی زمانہ میں لاکھوں نے حاصل کیا اور اس کو محفوظ کیا، لہٰذا بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر بے شمار احادیث ایسی ہیں جن کی صحت قرآن مجید کی آیات کی طرح قطعی ہے، غرض کہ عملاً اور علماً مفہوم حدیث کی حفاظت ہو رہی تھی اور ساتھ ساتھ حفظ و کتابت کے ذریعہ الفاظِ حدیث کی حفاظت کا بھی انتظام ہو رہا تھا، لاکھوں آدمی حدیث کو حفظ بھی کر رہے تھے اور ضبطِ تحریر میں بھی لا رہے تھے، پھر ہر حدیث کو پرکھنے کے لئے فنون بھی ترتیب دئیے جا رہے تھے تاکہ کہیں کوئی شوشہ اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث کو پرکھنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے، یعنی فن اسماء الرجال کے ذریعہ

حدیث کی سند میں جو راوی آتے ہیں، ان کی جانچ پڑتال، پس اگر راوی جانچ پڑتال سے ثقہ ثابت ہو جائیں تو حدیث صحیح ہو جائے گی، حالانکہ یہ ان کی لاعلمی ہے، حدیث کو پرکھنے کے فنون کی تعداد تقریباً سو ہے اور ہر فن کی ایک مستقل حیثیت ہے اور ہر فن پر مستقل تحریری مواد ہمارے پاس موجود ہے، جب ان تمام معیاروں سے کوئی حدیث بے داغ ثابت ہو جائے تو اس کو صحیح کہا جاتا ہے جن لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا کہ بس سند ہی ایک ذریعہ ہے، وہ اس دھوکہ میں بھی پڑ گئے کہ کسی شخص نے کوئی حدیث گھڑ دی اور دو چار ثقہ آدمیوں کے نام بطور سند کے اس گھڑے ہوئے متن کے ساتھ لگا دئے، لہٰذا حدیث صحیح ہو گئی، ان کو یہ نہیں معلوم کہ اس طرح سند لگا دینے سے حدیث صحیح نہیں ہو گی، قطع نظر دوسرے فنون کے وہ تو فن اسماء الرجال کے معیار پر بھی پوری نہیں اترے گی مثلاً ایک شخص سلمی کوئی حدیث گھڑ لیتا ہے اور سند یہ لگا دیتا ہے کہ مجھ سے امام مالک نے بیان کیا ان سے امام نافع نے ان سے عبداللہ بن عمر نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ . . . یہ سند اگرچہ اصح الاسانید اور سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) ہے لیکن حدیث کی صحت کے لئے کافی نہیں اس لئے کہ سلمی کی وجہ سے اس حدیث کی تصحیح میں تامل ہو گا۔ سلمی سے اوپر کی سند بے شک بہت اعلیٰ اور معتبر ہے لیکن پوری سند میں یہ بات نہیں لہٰذا حدیث پایۂ اعتبار سے گر جائے گی اور محض اوپر کی سند اس کی صحت کے لئے کافی نہ ہو گی۔ اب حدیث کی صحت کے لئے سلمی کا حال معلوم کرنا ہو گا۔ اگر حالات نہ مل سکے تو وہ مجہول ہو گا اور اس کی روایت کا اعتبار نہیں ہو گا اور اگر حالات مل گئے تو یا تو وہ صادق ہو گا یا کاذب، اگر کاذب ہوا تو اس کی حدیث کا انکار کر دیا جائے گا اور وہ حدیث جھوٹی ہو گی اور تمام محدثین نے اگر دھوکہ کھا کر اس کو صادق کہہ دیا اگرچہ یہ ناممکن ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی واضع حدیث کو تمام محدثین نے صادق کہا ہو لیکن پھر بھی اگر بالفرض محال ایسا ہو جائے تو پھر دوسرے عیوب کی تلاش ہو گی۔ مثلاً حافظہ کی خرابی، وہم، مبالغہ آمیزی، متن اور تشریحی الفاظ کا خلط ملط کرنا، تدلیس وغیرہ وغیرہ اگر ان میں سے ایک بھی عیب پایا گیا تو اس حدیث کا اعتبار نہیں ہو گا۔ اب اگر ان تمام جرحوں سے وہ بچ گیا اور تمام محدثین نے غلطی سے بالاتفاق اس کو ہر لحاظ سے ثقہ کہہ دیا (اگرچہ یہ ناممکن ہے اور نہ ایسا ہوا ہے کہ کسی وہمی، بدحافظہ کو محدثین نے ثقہ کہا ہو) تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے کیا امام مالک کے دوسرے شاگرد بھی اسے بیان کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر بیان کرتے ہیں تب تو خیر وہ حدیث دوسری سند سے ثابت ہو جائے گی اور اگر دوسرے شاگرد بیان نہیں کرتے بلکہ وہ سلمی کے خلاف روایت کرتے ہیں تو سلمی کی روایت کردہ حدیث شاذ ہو گی اور صحت کے درجہ سے گر جائے گی اور اگر سلمی کی بیان کردہ حدیث کا مضمون بالکل نیا ہو گا تو پھر وہ ہر حالت میں غریب ہو گی اور یہ بھی ایک قسم کی کمی ہی ہے۔ بہرحال سلمی کی بیان کردہ حدیث ہرگز صحت کے درجہ تک نہ پہنچے گی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ابتدائی منازل ہی میں وہ ضعیف ثابت ہو جائے گی، مزید براں سلمی جیسے جھوٹے آدمی کے لئے یہ کتنا مشکل ہو گا کہ وہ اپنی پوری زندگی تقویٰ و طہارت

اور خلوص کے ساتھ گزارے اور اگر یہ مشکل کام اس نے انجام دے بھی لیا تو بھی محدثین کے جنگل سے نکلنا اس کے لئے بہت مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ محدثین کی گرفت سے وہ لوگ بھی نہ بچ سکے جو صالح تھے، لیکن نیک نیتی سے حدیث میں تحریف کر دیا کرتے تھے، یہ لوگ بھی باوجود اپنے زہد و تقویٰ کے محدثین کو دھوکہ نہ دے سکے، غرض یہ کہ محدثین نے جس حدیث کو صحیح کہا، وہ حقیقت میں قطعی الصحت ہے اس لئے کہ شبہ اور شکوک کے تمام منازل کو اس نے عبور کر کے ہی مقامِ صحت کو حاصل کیا ہے، جو لوگ اب بھی صحیح حدیث کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ فنِ حدیث سے ناآشنا ہیں اور ان تفا[illegible]ں کا انہیں علم نہیں ہے اگر ان فنون کو عام کر دیا جائے تو انشاء اللہ تمام شکوک دور ہو جائیں گے اور محدثین کے کارناموں کی یہ لوگ بھی اسی طرح داد دیں گے جس طرح بعض غیر مسلم یورپین محققین نے دی ہے، الغرض ان معروضات کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بس جو شخص چاہے حدیث گھڑ دے اور اس کے ساتھ ایک سند لگا دے، وہ حدیث صحیح ہو جائے گی اور نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ معاملہ اس قدر الجھ چکا تھا کہ اس کو سلجھانا انسانی دسترس سے باہر تھا۔

برق صاحب! صحیح احادیث اور موضوع احادیث کا معاملہ بڑا صاف تھا، صحیح کو موضوع سے بڑی آسانی سے الگ کر دیا گیا، واضعین کے نام محدثین کو معلوم تھے وہ نام آیا اور حدیث کو موضوع سمجھ لیا گیا، بڑے بڑے علامہ اور مؤرخین جن کے نام کے ساتھ عوام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ محدثین کے ہاں وضاعین اور کذابین کی فہرست میں شامل ہیں، وہ نہ کسی کے علم سے دھوکہ کھا سکے، نہ کسی کے زہد و تقویٰ سے ان کو مغالطہ ہوا۔ محدثین کی اصل محنت تو اس کام میں صرف ہوئی کہ جو حدیث درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی وہ حدیث من وعن محفوظ ہے یا نہیں، گھڑی ہوئی احادیث کے سلسلہ میں انہیں کوئی دشواری پیش ہی نہیں آئی، لہٰذا تحریف کا شبہ بے بنیاد ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"صحابہ کی تمام تر توجہ قیام سلطنت، نشر اسلام اور تعمیر ملت پر صرف ہو رہی تھی (ص۳۳)

جواب

برق صاحب! گویا آپ کا یہ مطلب ہے کہ صحابہ کرام نے حفاظتِ حدیث کے سلسلہ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ یہ خیال بھی غلط فہمی پر مبنی ہے، قبل اس کے کہ ہم صحابہ کرامؓ کی جدوجہد کے متعلق کچھ عرض کریں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حفاظت کی طرف توجہ دی، مندرجہ ذیل حدیثیں ملاحظہ فرمائیے:۔

رسول اللہ صَلَّی اللہ علیہ وسلم اور احادیث کی حفاظت

(۱) قبیلہ عبدالقیس کے لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو بہت سے امورِ دین کی تعلیم دی، پھر فرمایا:۔

اِحْفَظُوْهُنَّ وَاَخْبِرُوْا بِهِنَّ مَنْ وَرَاءَكُمْ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

ان احکام کی حفاظت کرنا، اور اپنے پیچھے والوں کو بھی اس سے مطلع کر دینا۔

(۲) حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں :۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْاَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا (صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نصیحت کرنے کے لئے چند دن مقرر کر رکھے تھے، ہماری پریشانی کو ناپسند کرتے ہوئے (روزانہ وعظ نہیں فرماتے تھے)

(۳) حضرت انسؓ فرماتے ہیں :۔

اِنَّهٗ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ (صحیح بخارے کتاب العلم)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مسئلہ بیان فرماتے تو تین مرتبہ اس کو دہراتے یہاں تک کہ وہ مسئلہ سمجھ میں آجاتا۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند احادیث بیان کرنے کے بعد فرمایا :۔

لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰى اَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ اَوْعٰى لَهٗ مِنْهُ (صحیح بخارے کتاب العلم)

حاضر کو چاہیئے کہ غائب کو میری باتیں پہنچا دے، اس لئے کہ شاید حاضر ایسے شخص کو پہنچا دے جو اس سے زیادہ اس کو محفوظ کر سکے۔

متعدد صحابہؓ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے (کتب حدیث ملاحظہ فرمائیں) یہ پیشینگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ محدثین نے صحابہ کرام سے احادیث کو اخذ کیا، اور ان کو بالکل محفوظ کر دیا۔

(۵) یمن کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا :۔

اِبْعَثْ مَعَنَا رَجُلًا يُعَلِّمُنَا السُّنَّةَ وَالْاِسْلَامَ فَبَعَثَ اَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ (صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابۃ)

ہمارے ساتھ کسی آدمی کو بھیج دیجئے جو ہمیں سنت اور اسلام کی تعلیم دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو بھیج دیا۔

(۶) مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی تعلیم کے لئے کچھ دن مقرر کر رکھے تھے، ایک عورت آئی اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول :۔

ذَهَبَ الرِّجَالُ بِحَدِيْثِكَ فَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ نَّفْسِكَ يَوْمًا نَّاْتِيْكَ فِيْهِ تُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ قَالَ اجْتَمِعْنَ

یعنی مرد تو آپ کی احادیث حاصل کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے لئے بھی کوئی دن مقرر فرما دیجئے تاکہ اس دن ہم آپ کی خدمت میں

يَوْمَ كَذَا أَوْ كَذَا — حاضر ہوجایا کریں اور جو باتیں اللہ نے آپ کو سکھائی ہیں، وہ باتیں آپ ہمیں بھی سکھایا کریں، آپ نے فرمایا، فلاں فلاں دن جمع ہوجایا کرو۔

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ وروی البخاری نحوہ فی کتاب العلم)

کتابت احادیث

احادیث کی تعلیم اور اس کی حفاظت کے اہتمام کے ساتھ ساتھ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث کو لکھوایا تھا۔ مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے :۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں :۔

كَتَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابَ الصَّدَقَةِ (رواہ ابوداؤد فی کتاب الزکوٰۃ ورواتہ ثقات کلہ شواھد۔) — یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ تحریر فرمائی تھی۔

(۲) ابوراشد الحرانی فرماتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے میرے سامنے ایک کتاب رکھی اور فرمایا

هٰذَا مَا كَتَبَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ الترمذی فی ابواب الدعوات وحسنہ) — یعنی یہ وہ کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھ کر مجھ کو دی تھی۔

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :

وُجِدَ فِيْ قَائِمِ سَيْفِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابَانِ (رواہ الدارقطنی فی کتاب الحدود ورواتہ حسان، التعلیق المغنی ص ۳۴۳) — یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار کے قبضہ میں دو نوشتہ ملے تھے (ان میں مختلف ہدایات مندرج تھیں)

(۴) موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں :۔

عِنْدَنَا كِتَابُ مُعَاذٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ الدارقطنی فی کتاب الزکوٰۃ ورواتہ ثقات، تقریب) — ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو حضرت معاذ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھی تھی۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس کتاب کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے ساتھ بھیجی تھی منگوایا، اور اُس کو پڑھوا کر سنا (نصب الرایہ کتاب الزکوٰۃ جلد ۲ ص ۳۵۲)

(۵) ایک تحریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ جہینہ کو بھیجی تھی، جس میں مختلف احکام درج تھے (رواہ

ابوداؤد فی کتاب اللباس ورواتہ ثقات)

(۶) حضرت جابرؓ کہتے ہیں :-

کَتَبَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی کُلِّ بَطْنٍ عُقُوْلَہٗ ثُمَّ کَتَبَ اَنَّہٗ لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَتَوَالٰی مَوْلٰی رَجُلٍ مُسْلِمٍ بِغَیْرِ اِذْنِہٖ ثُمَّ اُخْبِرْتُ اَنَّہٗ لَعَنَ فِیْ صَحِیْفَتِہٖ مَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ

(صحیح مسلم، کتاب العتق)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا تھا کہ دیت عصبہ کے ذمہ واجب الادا ہے، پھر یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ کسی مسلم کو جائز نہیں کہ کسی دوسرے مسلم کے مولیٰ کو بغیر اس کی اجازت کے اپنا مولیٰ بنالے پھر مجھے خبر دی گئی کہ آپ نے اس کتاب میں اس کام کے کرنے والے پر لعنت فرمائی۔

(۷) امام طاؤس فرماتے ہیں :-

عِنْدَنَا فِیْ کِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَفِی الْاَنْفِ اِذَا قُطِعَ مَارِنُہٗ مِائَۃٌ مِّنَ الْاِبِلِ (نیل الاوطار جز، ص۳۹ بحوالہ کتاب الامّ شافعی ـ سکت علیہ الشوکانی)

ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ناک کا اگلا نرم حصہ کٹ جائے تو دیت میں سو اونٹ دینے ہوں گے۔

(۸) اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اِلٰی اَھْلِ الْیَمَنِ کِتَابًا فِیْہِ الْفَرَائِضُ وَالسُّنَنُ وَالدِّیَاتُ وَبَعَثَ بِہٖ عَمْرَو بْنَ حَزْمٍ

(نسائی جلد۲ ص۲۱۸ وسندہ صحیح نیل الاوطار جز، ص۱۷)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو اہل یمن کے لئے ایک کتاب بھی لکھ کر مرحمت فرمائی تھی جس میں فرائض، سنن اور دیات کے مسائل تحریر تھے۔

مشہور تابعی امام زہری فرماتے ہیں :-

"میں نے وہ کتاب پڑھی اور وہ کتاب ابوبکر بن حزم کے پاس تھی (نسائی ۲، ص ۲۱۸)۔

پھر امام زہری نے اس کتاب کا مضمون بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو نسائی)

حضرت سعید بن مسیب نے بھی اس کتاب کو پڑھا تھا اور اس کے مضمون کو نقل کیا ہے۔ (نسائی جلد ۲ ص ۲۱۸)۔

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کتاب کی صحت کی شہادت دی ہے (نیل الاوطار جز، ص ۱۷)

امام یعقوب فرماتے ہیں :-

لَا اَعْلَمُ فِیْ جَمِیْعِ الْکُتُبِ الْمَنْقُوْلَۃِ

جتنی کتابیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

كِتَابًا اَصَحَّ مِنْ كِتَابِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ هٰذَا فَاِنَّ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالتَّابِعِيْنَ يَرْجِعُوْنَ اِلَيْهِ وَيَدَعُوْنَ رَاْيَهُمْ (نیل الاوطار جزء ۲ صہ ۱۶)	سے منقول یعنی مکتوب چلی آرہی ہیں ان میں میرے علم کے مطابق کوئی کتاب عمرو بن حزم کی اس کتاب سے زیادہ صحیح نہیں کیونکہ صحابۂ کرام اور تابعین عظام اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنی رایوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

امام یعقوب کے بیان سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی کتابیں بہت تھیں اور سب صحیح تھیں لیکن ان کے علم کے مطابق سب سے زیادہ صحیح کتاب عمرو بن حزم کی کتاب تھی، کیونکہ تواتر اور شہرت کا جو درجہ اس کو حاصل تھا، وہ کسی کتاب کو نہ تھا، امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں:۔

هٰذَا كِتَابٌ مَشْهُوْرٌ عِنْدَ اَهْلِ السِّيَرِ مَعْرُوْفٌ مَافِيْهِ عِنْدَ اَهْلِ الْعِلْمِ (نیل الاوطار)	یہ کتاب اہل سیر کے نزدیک مشہور ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے۔

(۹) امام محمد بن مسلم فرماتے ہیں:۔

هٰذِهٖ نُسْخَةُ كِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِىْ كَتَبَهٗ فِى الصَّدَقَةِ وَهِىَ عِنْدَ اٰلِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رض	یہ اس کتاب کا ایک نسخہ ہے جو کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کے متعلق لکھوائی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کتاب حضرت عمرؓ کے خاندان کے پاس تھی۔

پھر فرماتے ہیں:۔

اَقْرَاَنِيْهَا سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَوَعَيْتُهَا عَلٰى وَجْهِهَا وَهِىَ الَّتِىْ اِنْتَسَخَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ وَسَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ (ابوداؤد ج۱ صہ ۲۲۴ دارقطنی صہ ۲۰۹، رواتہ ثقات، تقریب)	یہ کتاب حضرت عمرؓ کے پوتے حضرت سالم نے مجھے پڑھائی تھی اور میں نے اس کو پوری طرح محفوظ کر لیا ہے۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس کتاب کو حضرت عمرؓ کے پوتوں سالم اور عبداللہ سے لے کر لکھوایا تھا پھر اس کے بعد امام محمد بن مسلم نے اس کا مضمون بیان کیا ہے جو کتب حدیث میں مذکور ہے۔

(۱۰) سوید بن غفلہ فرماتے ہیں:۔

قَدِمَ عَلَيْنَا مُصَدِّقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَاْتُ فِىْ كِتَابِهٖ لَا	یعنی ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تحصیل دار آیا، میں نے اس کی کتاب میں

يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ (دار قطنی ص۲۰۰ و ابوداؤد ج ۱ ص۲۲۹ سکت علیہ ابوداؤد) — پڑھ کر زکوٰۃ کے خوف سے متفرق مال جمع نہ کیا جائے اور مجتمع مال کو متفرق نہ کیا جائے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحصیل داروں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب ہوتی تھی جس میں تحصیلِ زکوٰۃ کے احکام درج ہوتے تھے۔

(۱۱) متعدد صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احادیث لکھوایا کرتے تھے، عبداللہ بن عمروؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

بَيْنَمَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَكْتُبُ إِذْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الْمَدِيْنَتَيْنِ تُفْتَحُ أَوَّلًا قُسْطُنْطِيْنِيَّةُ أَوْ رُوْمِيَّةُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بَلْ مَدِيْنَةُ هِرَقْلَ أَوَّلًا (دارمی ص۱۲۶ و رجالہ ثقات از حسان، تقریب) — ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے، اس حالت میں آپ سے پوچھا گیا، کون سا شہر پہلے فتح ہوگا قسطنطنیہ یا رومیہ؟ آپ نے فرمایا ہرقل کا شہر سب سے پہلے فتح ہوگا۔

کیا اب بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں فرمایا، مندرجہ بالا حوالہ جات سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی بہت سی کتابیں لکھوائیں، کچھ مدینہ منورہ میں رہیں، کچھ آپ نے گورنروں کے ہمراہ مختلف ممالک کو روانہ فرمائیں، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفسِ نفیس حدیث کی حفاظت کا انتظام اور اہتمام فرمایا، اور صحابہ کرامؓ کو بھی حکم دیا کہ احادیث کو قلم بند کر لو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو احادیث لکھنے کا حکم دیا۔

ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۱) اُكْتُبُوْا لِأَبِي شَاهٍ (صحیح بخاری جزاول ص۲۱ صحیح مسلم ج ۱ ص۴۳۹) — یہ احادیث ابوشاہ رضی اللہ عنہ کو لکھ کر دے دو۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اُكْتُبْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ (ابوداؤد ج ۱ ص۱۵۸، و رجالہ ثقات، تقریب) — احادیث لکھا کرو، قسم اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس منہ سے حق کے سوا دوسری بات نہیں نکلتی۔

حدیث کی حفاظت کرنے والے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی حفاظت کا حکم ہی نہیں دیا بلکہ حفاظت کرنے والے کے لئے دعاء بھی فرمائی ،

آپؐ نے فرمایا :۔

نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا

(رواہ الشافعی وابو داؤد وابن حبان والترمذی وصححہ)

اللہ اس بندے کو تر و تازہ رکھے جو میرے اقوال سنے ، پھر ان کو حفظ کرے اور محفوظ کرے اور دوسروں تک پہنچا دے ۔

اس حدیث کو متعدد صحابہ نے روایت کیا ہے (کتب حدیث) ان ہی احادیث کی تعمیل میں صحابۂ کرام اور دیگر محدثین نے احادیث کو حفظ کیا ، پھر ان کو مکتوب کر کے محفوظ کر لیا ، پھر ان کو دوسروں تک پہنچا دیا ، یہی وہ سلسلہ ہے جو مؤلفین صحاح تک قائم رہا ، بلکہ آج تک قائم ہے اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا ۔

"صحابۂ کرامؓ کا حدیث کی حفاظت کرنا"

حضرت ابوبکرؓ کی کتاب

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَتَبَ لَهُ هٰذَا الْكِتَابَ لَمَّا وَجَّهَهُ إِلَى الْبَحْرَيْنِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هٰذِهِ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِي فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَالَّتِي أَمَرَ اللّٰهُ بِهَا رَسُوْلَهُ

(صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ان کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک نوشت لکھ کر دی جس کا مضمون یہ تھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یہ زکوٰۃ کے فرائض ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمین پر فرض کیا ہے اور ان ہی کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے ۔

حدیث کے راوی حماد بن سلمہ کہتے ہیں :۔

أَخَذْتُ هٰذَا الْكِتَابَ مِنْ ثُمَامَةَ (نسائی کتاب الزکوٰۃ ورواتہ ثقات ، تقریب)

میں نے یہ کتاب حضرت انسؓ کے پوتے ثمامہ سے حاصل کی تھی ۔

حضرت عمرؓ کی کتاب

حضرت عمرؓ نے بھی زکوٰۃ کے متعلق ایک کتاب تحریر فرمائی تھی۔

محمد انصاری فرماتے ہیں:۔

اِنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِیْزِ حِیْنَ اسْتُخْلِفَ اَرْسَلَ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ یَلْتَمِسُ عَھْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الصَّدَقَاتِ فَوَجَدَہٗ عِنْدَ اٰلِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ کِتَابَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ فِی الصَّدَقَاتِ وَوَجَدَ عِنْدَ اٰلِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ کِتَابَ عُمَرَ اِلٰی عُمَّالِہٖ فِی الصَّدَقَاتِ بِمِثْلِ کِتَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ فَاَمَرَ عُمَرُ ابْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ عُمَّالَہٗ عَلَی الصَّدَقَاتِ اَنْ یَّاْخُذُوْا بِمَا فِیْ ذٰیْنِکَ الْکِتَابَیْنِ فَکَانَ فِیْھِمَا الخ

(دارقطنی ص۲۰۹ و رواتہ ثقات او صدق)

جب حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو مدینہ بھیج کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب الصدقہ تلاش کرائی وہ کتاب عمرو بن حزم کے خاندان کے پاس ملی۔ یہ وہ کتاب تھی جو آپ نے عمرو بن حزم کو لکھ کر مرحمت فرمائی تھی اور حضرت عمرؓ کی کتاب حضرت عمرؓ کے خاندان کے پاس ملی، ان دونوں کتابوں کا مضمون ایک ہی تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے حکم دیا کہ ان کتابوں کے مطابق صدقات وصول کئے جائیں، پھر محمد انصاری نے ان کتابوں کا مضمون بیان کیا جو کتبِ حدیث میں محفوظ ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں:۔

اِنَّہٗ قَرَاَ کِتَابَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِی الصَّدَقَۃِ (موطا امام مالک ص۱۰۹)

میں نے حضرت عمرؓ کی کتاب پڑھی (اس کا مضمون یہ ہے)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حضرت عمرؓ کی دوسری تحریر

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ کَتَبَ مَعِیْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِلٰی اَبِیْ عُبَیْدَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ مَوْلٰی مَنْ لَّا مَوْلٰی لَہٗ وَالْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَہٗ رواہ الترمذی

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو امامہؓ کے ہمراہ حضرت ابو عبیدہؓ کو یہ لکھ کر روانہ فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس شخص کا وارث اللہ اور اس کا رسول ہے، جس کا کوئی وارث نہ ہو اور ماموں وارث

فی ابواب الفرائض وحسنہ)

ہے اس شخص کا، جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

حضرت عمرؓ کی تیسری تحریر

كَتَبَ عُمَرُ إِلَى عُتْبَةَ بْنِ فَرْقَدٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْحَرِيْرِ إِلَّا هٰكَذَا إِصْبَعَيْنِ

(صحیح مسلم، کتاب اللباس)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حریر پہننے سے منع فرمایا ہے۔ البتہ دو انگل (کے حاشیہ تک) کی اجازت دی ہے۔

حضرت عمرؓ کا چوتھا نوشتہ

ورثہ کے متعلق ایک مقدمہ پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

مَا أَحْرَزَ الْوَلَدُ وَالْوَالِدُ فَهُوَ لِعَصَبَتِهِ مَنْ كَانَ قَالَ فَكَتَبَ لَهُ كِتَابًا فِيْهِ شَهَادَةُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ وَرَجُلٍ آخَرَ

(ابوداؤد)

جو مال بیٹا یا باپ جمع کرے وہ اس کے عصبہ کے لئے ہے خواہ وہ کوئی ہو پھر حضرت عمرؓ نے اس فیصلہ کو لکھ کر دے دیا اور اس پر بطور شہادت عبدالرحمٰن بن عوف، زید بن ثابت اور ایک اور آدمی کے دستخط کرائے۔

پھر خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں مقدمہ پیش ہوا۔

فَقَضٰى لَنَا بِكِتَابِ عُمَرَ رض

(ابوداؤد، کتاب الفرائض ورجالہ ثقات تقریب)

تو عبدالملک نے حضرت عمرؓ کی اس کتاب کے مطابق فیصلہ فرمایا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کی حفاظت کی۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كَتَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابَ الصَّدَقَةِ.... فَعَمِلَ بِهَا أَبُوْ بَكْرٍ حَتّٰى قُبِضَ ثُمَّ عَمِلَ بِهَا عُمَرُ حَتّٰى قُبِضَ

(ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۶، رواتہ ثقات)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ لکھوائی تھی.... اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی وفات تک عمل کرتے رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی وفات تک عمل کرتے رہے۔

حضرت عمرؓ کا حدیث کی حفاظت اور تعلیم کا اہتمام کرنا

إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَطَبَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ .... قَالَ اللّٰهُمَّ إِنِّيْ أُشْهِدُكَ عَلٰى أُمَرَاءِ الْأَمْصَارِ وَإِنِّيْ إِنَّمَا بَعَثْتُهُمْ عَلَيْهِمْ لِيَعْدِلُوْا عَلَيْهِمْ وَلِيُعَلِّمُوا النَّاسَ دِيْنَهُمْ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب نہی من اکل ثوماً [illegible])

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں ارشاد فرمایا! اے اللہ میں شہروں کے امراء پر تجھ کو گواہ کرتا ہوں، میں نے ان کو لوگوں پر صرف اس لئے امیر مقرر کیا ہے کہ وہ ان میں عدل قائم کریں اور ان لوگوں کو دین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی تعلیم دیں۔

حضرت عمرؓ خود بھی وقتاً فوقتاً سنت کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً ایک مرتبہ مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا:۔

...أَقْبِلُوْا عَلَيَّ بِوُجُوْهِكُمْ أُصَلِّيْ بِكُمْ صَلٰوةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّتِيْ كَانَ يُصَلِّيْ وَيَأْمُرُ بِهَا فَقَامَ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ وَرَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى حَاذٰى بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ ثُمَّ كَبَّرَ ثُمَّ رَكَعَ وَكَذٰلِكَ حِيْنَ رَفَعَ فَقَالَ الْقَوْمُ هٰكَذَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ بِنَا (خلافیات للامام البیهقی وسنده صحیح تسهیل القاری جلد ۳ ص [illegible])

میری طرف منہ کرو میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نماز پڑھ کر بتاؤں جس طرح کہ آپ پڑھتے تھے اور جس طرح پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے پس حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھایا پھر تکبیر کہی، پھر رکوع کیا اور جب رکوع سے اُٹھے تب بھی اسی طرح رفع یدین کیا، تمام صحابہؓ نے فرمایا، اسی طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں نماز پڑھایا کرتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کی کتاب

عَنِ ابْنِ الْحَنَفِيَّةِ قَالَ أَرْسَلَنِيْ أَبِيْ خُذْ هٰذَا الْكِتَابَ فَاذْهَبْ إِلٰى عُثْمَانَ فَإِنَّ فِيْهِ أَمْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الصَّدَقَةِ

حضرت علیؓ نے اپنے لڑکے محمد بن حنفیہ سے فرمایا، اس کتاب کو عثمانؓ کے پاس لے جاؤ اور ان سے اس پر عمل کے لئے کہو کیونکہ اس میں صدقہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام مندرج ہیں۔

جب وہ اس کتاب کو لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا :-

اَغْنِهَا عَنَّا — میں اس سے مستغنی ہوں یعنی میرے پاس یہ احکام موجود ہیں۔

(صحیح بخاری، کتاب الجہاد)

حضرت عثمانؓ کا سنت کی تعلیم کا اہتمام کرنا

اِنَّ عُثْمَانَ تَوَضَّأَ بِالْمَقَاعِدِ فَقَالَ اَلَا اُرِيْكُمْ وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا (صحیح مسلم)

حضرت عثمان نے مقاعد میں لوگوں سے کہا، کیا میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو نہ بتاؤں؟ پس انہوں نے وضو کیا اور ہر عضو کو تین تین مرتبہ دھویا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کو تبلیغ سنت کا کتنا جوش تھا کہ باوجود بارِ خلافت کے وضو تک کی سنتوں کی تعلیم دیتے تھے۔

حضرت علیؓ کی کتاب

حضرت علیؓ فرماتے ہیں :-

مَا عِنْدَنَا شَيْءٌ اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ وَهٰذِهِ الصَّحِيْفَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (صحیح بخاری، کتاب الحج وصحیح مسلم)

ہمارے پاس کوئی چیز نہیں سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفہ کے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں۔

اس کتاب میں حضرت علیؓ نے بہت سے احکام تحریر کئے تھے اور یہی وہ کتاب تھی جس کو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیجا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں (اس کتاب کا ذکر صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر گزر چکا ہے)

حضرت علیؓ کا حدیث کی حفاظت کا حکم دینا

حضرت علیؓ فرماتے ہیں :-

تَذَاكَرُوْا هٰذَا الْحَدِيْثَ وَتَزَاوَرُوْا فَاِنَّكُمْ اِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا يَدْرُسْ (رواہ الدارمی جزء اول صفحہ ۱۵ ورواتہ ثقات، تقریب)

حدیث کا مذاکرہ کرتے رہا کرو، ایک دوسرے سے ملتے رہا کرو ورنہ حدیث محو ہو جائے گی۔

بلکہ حضرت علیؓ خود بھی سنتوں کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً ایک مرتبہ وضو کیا، ہر عضو کو تین تین مرتبہ

دھویا اور پھر فرمایا :-

اَحْبَبْتُ اَنْ اُرِیَکُمْ کَیْفَ کَانَ طُھُوْرُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (رواہ الترمذی وقال حدیث علی احسن شیئ فی ھذا الباب واصح)

میں چاہتا تھا کہ تمہیں بتاؤں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح وضو کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضؓ کی شہرہ آفاق کتاب

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے حدیث کی ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام صادقہ تھا، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں :-

مَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَدٌ اَکْثَرَ حَدِیْثًا عَنْہُ مِنِّیْ اِلَّا مَا کَانَ مِنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو فَاِنَّہٗ کَانَ یَکْتُبُ وَلَا اَکْتُبُ (صحیح بخاری)

صحابہ کرامؓ میں سے کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث بیان نہیں کرتا، سوائے عبداللہ بن عمروؓ کے، اس لئے کہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

یہی وہ عبداللہ ہیں جن سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "لکھا کرو اس زبان سے سوائے حق کے دوسری بات نہیں نکلتی، (ابو داؤد۔ کتاب العلم جلد ۲ ص۱۵۸ و رجالہ ثقات تقریب) یہی وہ کتاب ہے جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی اور ان کے پرپوتے عمرو بن شعیب سے محدثین نے اس کو اخذ کیا اور ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی کتاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں تو حضرت ابوہریرہؓ احادیث نہیں لکھتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں، ابن وہب کی روایت میں ہے، ایک تابعی کہتے ہیں :-

فَاَخَذَ بِیَدِیْ اِلٰی بَیْتِہٖ فَاَرَانَا کُتُبًا مِنْ حَدِیْثِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَالَ ھٰذَا ھُوَ مَکْتُوْبٌ عِنْدِیْ (رواہ ابن وھب وسکت علیہ الحافظ فتح الباری ۱۳ ص۲۱۷ وجامع بیان العلم جزء اول ص ۷۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھے احادیث کی کتابیں دکھائیں اور فرمایا کہ یہ میرے پاس کتابی شکل میں بھی موجود ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک کتاب اپنے شاگرد ہمام کے لئے مرتب کی تھی، جو صحیفہ ہمام کے نام

سے مشہور ہے (اور اب چھپ چکی ہے)۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک تالیف ان کے شاگرد بشیر بن نہیک نے مرتب کی تھی۔ بشیر کہتے ہیں، کہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے جو کچھ سنتا تھا، لکھ لیتا تھا، جب میں نے ان سے رخصت ہونا چاہا تو

اَتَيْتُهٗ بِكِتَابِهٖ فَقَرَأْتُهٗ عَلَيْهِ وَقُلْتُ لَهٗ هٰذَا مَا سَمِعْتُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ

(دارمی جزاول ص۶۸ ورجالہ ثقات متفق علیہ)

میں ان کے پاس ان کی (لکھائی ہوئی) کتاب لایا اور ان کو پڑھ کر سنائی اور ان سے کہا یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے آپ سے سُنی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا "ہاں"

حضرت سمرہ بن جندبؓ کی حدیث کی کتاب

حضرت سمرہؓ نے بھی ایک کتاب تحریر فرمائی تھی، حضرت امام حسن بصری کے پاس وہ کتاب تھی۔

اِنَّمَا يُحَدِّثُ عَنْ صَحِيْفَةِ سَمُرَةَ رض

(ترمذی، ابواب البیوع ج ۱ ص۲۴۳ وسندہ صحیح)

اور وہ حضرت سمرہؓ کی کتاب سے حدیث سنایا کرتے تھے۔

حضرت سعد بن عبادہؓ کی کتاب

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی، ان کے بیٹے فرماتے ہیں:-

وَجَدْنَا فِيْ كِتَابِ سَعْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ

(رواہ الترمذی فی ابواب الاحکام وحسنہ)

ہم نے سعد رضی اللہ عنہ کی کتاب میں یہ لکھا ہوا دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا حدیث کی تعلیم کا اہتمام کرنا

قَيَّدَ ابْنُ عَبَّاسٍ عِكْرِمَةَ عَلٰى تَعْلِيْمِ الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَنِ وَالْفَرَائِضِ (رواہ ابن سعد فی الطبقات ثم ابونعیم فی الحلیۃ ورواہ البخاری تعلیقاً فی کتاب "ما یذکر فی الاشخاص والخصومۃ" وسکت علیہ الحافظ فتح الباری جزء ۵ ص۴۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عکرمہ کو قرآن وحدیث اور فرائض سکھانے کے لئے روک رکھا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور احادیث کی حفاظت کا اہتمام

حضرت انسؓ اپنے بیٹوں سے فرمایا کرتے تھے :-

يَابَنِيَّ قَيِّدُوْا هٰذَا الْعِلْمَ (دارمی ص۱۲۸ جز اول ورواۃ ثقات، تقریب)

اے میرے بچو! اس علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔

حضرت انسؓ نے ایک مرتبہ ایک حدیث سُنی، انہیں وہ بہت اچھی معلوم ہوئی، انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا :-

اُكْتُبْهُ، فَكَتَبَهُ (صحیح مسلم کتاب الایمان باب من لقی اللہ با الایمان وھو غیر شاك فیہ دخل الجنۃ)

اس حدیث کو لکھ لو، انہوں نے اس حدیث کو لکھ لیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی کتاب

حضرت جابرؓ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی :

سلیمان تیمی کہتے ہیں :-

ذَهَبُوْا بِصَحِيْفَةِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اِلَى الْحَسَنِ الْبَصَرِيِّ فَاَخَذَهَا (ترمذی ابواب البیوع ورواۃ ثقات، تقریب)

لوگ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی کتاب کو امام حسن بصری کے پاس لے گئے تو انہوں نے اس کو یاد کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور کتابت احادیث

سلیمان بن موسیٰ کہتے ہیں :-

اَنَّهٗ رَاٰى نَافِعًا مَوْلَى ابْنِ عُمَرَ يُمْلِيْ عِلْمَهٗ وَيَكْتُبُ بَيْنَ يَدَيْهِ (رواہ الدارمی ص۱۲۸ الخ ورواۃ ثقات او صدوق)

انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام نافع کو دیکھا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ اپنا علم لکھوا رہے تھے اور وہ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے۔

حضرت براء بن عازبؓ اور حفاظت حدیث کا اہتمام

حضرت براء بن عازب کے پاس بیٹھ کر لوگ ان کی احادیث کو لکھا کرتے تھے (دارمی ص۱۲۸

و رجالہ ثقات۔ تقریب)

حضرت رافع بن خدیج رضؓ کی کتاب

نافع کہتے ہیں کہ مروان نے خطبہ دیا اور اس میں مکّہ کے حرم ہونے کا ذکر کیا تو حضرت رافع بن خدیج نے ان کو پکار کر کہا، کیا بات ہے کہ مکّہ کی حرمت کا تم نے ذکر کیا اور مدینہ کا ذکر نہیں کیا، پھر فرمایا :-

وَقَدْ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَابَیْنَ لَابَتَیْهَا وَذٰلِكَ عِنْدَنَا فِیْ اَدِیْمٍ خَوْلَانِیٍّ اِنْ شِئْتَ اَقْرَأْتُكَ (صحیح مسلم باب فضل المدینۃ ج ۱ ص ۴۴۰ مطبوعہ مصر)

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سنگستانوں کے درمیانی علاقہ کو حرم قرار دیا ہے اور یہ حکم میرے پاس خولانی چمڑے پر لکھا ہوا ہے اگر تم چاہو تو پڑھ کر سناؤں۔

صحابہ کی ایک کثیر تعداد احادیث کو قلمبند کیا کرتی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

بَیْنَمَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَکْتُبُ اِذْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْمَدِیْنَتَیْنِ تُفْتَحُ اَوَّلًا قُسْطُنْطِیْنِیَّۃُ اَوْ رُوْمِیَّۃُ الخ (دارمی ص ۱۲۶ و رواتہ ثقات او صدق، تقریب)

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے، اسی اثناء میں آپ سے پوچھا گیا، کون سا شہر پہلے فتح ہوگا؟ قسطنطنیہ یا رومیہ؟ آپؐ نے فرمایا ہرقل کا شہر یعنی قسطنطنیہ۔

نوٹ :- ہم نے اوپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی بعض کتابوں کا ذکر کیا اور بہت سی کتابوں کا ذکر چھوڑ دیا، محض اس لئے کہ ہمیں ان کی سندوں کی جانچ پڑتال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ہم نے اس کتاب میں سند کی جانچ پڑتال کرکے روایتیں نقل کی ہیں، کوئی ضعیف روایت نقل نہیں کی۔

نتیجہ مندرجہ بالا بیان سے ثابت ہوا کہ خلفائے راشدین نے حدیث کی حفاظت کا اہتمام کیا، اور کتابیں لکھیں، اسی طرح دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی کتابیں لکھیں، احادیث املاء کرائیں، تو پھر یہ کہنا کہ صحابہ کرام کے احادیث نہ جمع کرنے کی فلاں فلاں وجوہ تھیں، خود بخود غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

غلط فہمی برقی صاحب نے آگے چل کر تحریر فرمایا ہے کہ :-
صحابہ کرامؓ کے احادیث جمع نہ کرنے کی بڑی بڑی دو وجوہ تھیں، اوّل، وہ قرآن کی

موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے، صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ جب رحلت سے پہلے حضور پُرنور نے فرمایا کہ "لاؤ قلم، دوات اور کاغذ، میں تمہیں ایک چیز لکھ کر دے جاؤں کہ میرے بعد تمہاری گمراہی کا کوئی امکان باقی نہ رہے،" تو حضرت عمر بن الخطاب جھٹ بول اُٹھے، ہمیں کسی مزید تحریر کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ "حسبنا کتاب اللہ" ہمارے پاس کتاب الٰہی موجود ہے جس میں انسانی فلاح و نجات کے مکمل گر درج ہیں اور یہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے" (دو اسلام ص۳۷-۳۸)

ازالہ اس کا جواب کئی طرح سے ہے، اوّل یہ کہ گزشتہ اوراق میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے بلکہ خاص طور پر حضرت عمرؓ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام کیا، خود تعلیم دی، دوسروں کو تعلیم پر مامور فرمایا، خود احادیث کو ضبط تحریر میں لائے، دوسروں سے لکھوایا، حتیٰ کہ ان کے یہ نوشتے محدثین نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان کو اپنی کتابوں میں نقل کیا، اگر وہ صرف قرآن مجید کو کافی سمجھتے تھے، تو حفاظتِ احادیث کا یہ اہتمام بے سود ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ وہ احادیث کو بھی ماخذِ دین سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے قرآن مجید کے ساتھ اس کی بھی تعلیم دیا کرتے تھے اور تحریر کرتے تھے، لہٰذا حدیث تحریر نہ کرنے کی یہ وجہ خود بخود باطل ہو جاتی ہے۔

دوم۔ یہ جملہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ، یعنی کتاب الٰہی ہمارے لئے کافی ہے، حضرت عمرؓ کا قول ہے نہ کہ تمام صحابہ کا، اکثر صحابہؓ نے اس سے اتفاق نہیں کیا، بلکہ حدیث کے الفاظ ہیں "أَكْثَرُوا اللَّغْوَ وَالِاخْتِلَافَ" یعنی صحابۂ کرام حضرت عمرؓ کے اس کہنے پر خاموش نہیں ہوئے بلکہ بڑی گڑبڑ ہوئی اور شدید اختلاف کیا (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بعد کیا ہوا، حدیث کے الفاظ میں سنیئے "ذَهَبُوا يَرُدُّونَ عَلَيْهِ" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار پوچھتے رہے (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ظاہر ہے کہ اختلاف رائے کے باوجود صحابہؓ نے آپ کو تحریر لکھوانا یاد دلایا اور بار بار یاد دلایا تو یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آپس میں اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ لکھنا ضروری ہے یا کم از کم اکثریت کا فیصلہ یہی تھا اور اقلیت نے خاموشی اختیار کر لی، لہٰذا "حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ" کی تردید خود صحابہ کرام نے کر دی اور حضرت عمرؓ کو خاموش ہونا پڑا، صحابہ کرام کے فیصلہ کے خلاف اب بھی اس قول کو دلیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

سوم۔ یہ جملہ "حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ" حضرت عمرؓ کا قول ہے، جہاں تک ہم سمجھتے ہیں حضرت عمرؓ کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ "حدیث" قابلِ حجت نہیں اور اگر حضرت عمرؓ کے متعلق یہ فرض کر لیا جائے کہ ان کے نزدیک حدیث حجت نہیں تھی تو یہ ان کی ذاتی رائے تھی جس سے انہوں نے رجوع کر لیا اور حدیث کی حفاظت اور تعلیم کا انتظام کیا، حدیث کی کتابیں لکھیں، حدیث کی اشاعت کی، ان تمام باتوں کا ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے، ذیل میں چند روایات مزید پیش کی جا رہی ہیں جن سے ثابت ہو گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حدیث کو

حجت سمجھتے تھے۔

(۱) حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ سے اپنا حصہ طلب کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا:۔

لَسْتُ تَارِكًا شَيْئًا كَانَ	میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑوں گا: جو
يَعْمَلُ بِهِ إِلَّا عَمِلْتُ بِهِ فَإِنِّي أَخْشَى	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے بلکہ
إِنْ تَرَكْتُ شَيْئًا مِنْ أَمْرِهِ	میں اُسی پر عمل کروں گا کیونکہ مجھے ڈر ہے
أَنْ أَزِيغَ	کہ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
(صحیح بخاری، کتاب	امر میں سے کسی بھی چیز کو چھوڑ دوں گا تو گمراہ
الجہاد)	ہو جاؤں گا۔

حضرت ابوبکرؓ کے ان الفاظ کو پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے، شانِ صدیقی ملاحظہ فرمایئے، سنت چھوڑنے سے صاف انکار ہے، سنت چھوڑنے سے ڈرتے ہیں، کہ کہیں گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں، حضرت ابوبکرؓ کے اس قول و فعل کو حضرت عمرؓ کے الفاظ میں سنیئے، حضرت عمرؓ نے اسی مقدمہ کے سلسلہ میں اپنی خلافت کے دور میں فرمایا تھا:۔

فَعَمِلَ فِيهَا بِمَا عَمِلَ رَسُولُ اللّٰهِ	ابوبکر نے اس معاملہ میں وہی عمل کیا جو رسول
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُ	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے بے شک اللہ
فِيهَا لَصَادِقٌ بَارٌّ رَاشِدٌ تَابِعٌ	جانتا ہے کہ اس معاملہ میں ابوبکر یقیناً
لِلْحَقِّ	سچے، نیک کام کرنے والے، ہدایت یافتہ اور
(صحیح بخاری، کتاب الجہاد)	حق کے تابع تھے۔

گویا حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے قول کی تائید کر دی کہ سنتِ رسول کو نہ چھوڑنے والا ہی تابع للحق اور ہدایت پانے والا ہے اور اس میں ذرا سی بھی کمی کرنے والا گمراہ ہے، پھر حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:۔

أَعْمَلُ فِيهَا بِمَا عَمِلَ رَسُولُ	میں بھی اس طرح عمل کروں گا جس طرح
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کیا
عَمِلَ فِيهَا أَبُو بَكْرٍ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ	تھا اور جس طرح ابوبکرؓ نے عمل کیا تھا اور
إِنِّي فِيهَا لَصَادِقٌ بَارٌّ رَاشِدٌ	اللہ جانتا ہے کہ میں اس معاملہ میں یقیناً
تَابِعٌ لِلْحَقِّ	سچا، نیک عمل کرنے والا، ہدایت یاب اور حق
(صحیح بخاری، کتاب الجہاد)	کا تابع ہوں۔

اس جملہ میں حضرت عمرؓ نے واضح کر دیا کہ اتباعِ حق اور نیکی یہی ہے کہ سنتِ رسول پر چلا جائے، یہی سچائی

ہے اور یہی ہدایت ہے، پھر حضرت عمرؓ فریقین کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد ابواب فرض الخمس)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔

حضرت عمرؓ نے علی الاعلان تمام صحابہؓ کی موجودگی میں وہ حدیث پڑھ دی جو بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہے اور اس کو علی الاعلان بطور حجت شرعیہ پیش کیا، نہ فریق مقدم حضرت علیؓ نے اس کی تردید کی، نہ فریق ثانی حضرت عباسؓ نے اس کی تردید کی، نہ صحابہؓ کے مجمع میں سے کوئی آواز اٹھی کہ یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے، قرآن مجید کی رُو سے بلا استثنا ہر شخص کا ورثہ تقسیم ہونا چاہیئے، قرآن مجید میں اس قسم کی کوئی تخصیص نہیں ہے، للٰذا یہ حدیث حجت نہیں" تمام صحابہؓ نہ یہ کہ صرف خاموش ہی رہے بلکہ اس حدیث کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں، اس حدیث کو پیش کرنے والے وہی فاروق اعظم ہیں جن کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا تھا "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" یہ وہی فاروق اعظم ہیں کہ حدیث کو حجت میں پیش فرما رہے ہیں، اور ایسی حالت میں پیش فرما رہے ہیں کہ بظاہر وہ قرآن مجید کی آیت کے بھی خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے جملہ "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" کا مطلب کچھ اور تھا، یہ مطلب نہ تھا جو آج کل لیا جا رہا ہے، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا :۔

فَوَاللّٰہِ الَّذِیْ بِاِذْنِہٖ تَقُوْمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ لَا اَقْضِیْ فِیْہِمَا قَضَاءً غَیْرَ ذٰلِکَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)	قسم اس ذات پاک کی جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں، میں قیامت تک اس فیصلہ کے علاوہ کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

ملاحظہ فرمائیے، کس طرح قسم کھا کر وہ اپنی پیش کردہ حدیث کے خلاف فیصلہ کرنے سے اپنے عجز کا اظہار فرما رہے ہیں بلکہ وہ تو یہاں تک عقیدہ رکھتے ہیں کہ قیامت تک فیصلۂ نبوی علی حالہٖ قائم رہنا ضروری ہے، اسے کسی حالت میں بدلا نہیں جا سکتا، اگر صرف قرآن مجید کافی تھا تو وہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے کیوں مجبور تھے، کیوں اس کو ہدایت سمجھتے تھے، غور کیجئے اور انصاف فرمائیے۔

(۲) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ :۔

وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَعْلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ وَلَوْ لَا اَنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِسْتَلَمَکَ مَا اسْتَلَمْتُکَ فَاسْتَلَمَہٗ (صحیح بخاری، کتاب المناسک)	اللہ کی قسم میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی بوسہ نہ دیتا، پھر حضرت عمرؓ نے اس کو بوسہ دیا۔

حجرِ اسود کو بوسہ دینا بظاہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن حضرت عمرؓ اس معمولی سی سنت کو بھی چھوڑنا گوارا نہیں کرتے۔

(۳) حضرت عمرؓ نے رمل کے متعلق فرمایا ہے:-

فَمَالَنَا وَلِلرَّمَلِ إِنَّمَا كُنَّا رَايَنَا بِهِ الْمُشْرِكِينَ وَقَدْ اَهْلَكَهُمُ اللهُ ثُمَّ قَالَ شَيْءٌ صَنَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَا نُحِبُّ اَنْ نَتْرُكَهُ (صحیح بخاری، کتاب الحج باب الرمل)

رمل کرنے کی اب ہمیں کیا ضرورت ہے یہ تو ہم نے مشرکین پر اپنی قوت کے اظہار کے لئے کیا تھا اور اب مشرکین کو اللہ تعالےٰ نے ہلاک کر دیا، پھر فرمایا لیکن جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے ہم اس کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔

دیکھا آپ نے حضرت عمرؓ کس قدر سنت کے دلدادہ ہیں کہ اس سنت پر بھی عمل کر رہے ہیں جس کا مقصد فوت ہو چکا ہے۔

(۴) حج تمتع کے متعلق جب آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا:-

إِنْ نَأْخُذْ بِكِتَابِ اللهِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُنَا بِالتَّمَامِ وَإِنْ نَأْخُذْ بِسُنَّةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَحِلَّ حَتَّى بَلَغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ (صحیح بخاری، کتاب الحج باب الذبح قبل الحلق)

اگر ہم کتاب اللہ کو ماخذ تسلیم کریں تو وہ ہمیں حج اور عمرہ پورا کرنے کا حکم دیتی ہے اور اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ماخذ تسلیم کریں تو بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام نہیں کھولا جب تک قربانی نہیں کی۔

حضرت عمرؓ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں کو بطور حجت پیش کیا، اگر کتاب اللہ کو کافی سمجھتے، تو صرف کتاب اللہ کو پیش کر دینا کافی تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ سنت کو بھی حجت میں شامل کیا، ان کے جواب سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے کہ اگر ان کو حج تمتع کے متعلق جواز کی حدیث معلوم ہوتی تو وہ یقیناً اس کو تسلیم کرتے، اگرچہ وہ بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتی، انہوں نے حج تمتع سے صرف اس لئے انکار کیا کہ ان کے علم میں سنت سے اس کا ثبوت نہیں تھا، اگر ثبوت مل جاتا تو وہ کبھی انکار نہ کرتے، جیسا کہ دوسرے صحابہ نے جب حدیث ان کو مل گئی تو حج تمتع کو تسلیم کر لیا، کسی صحابی نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو قرآن مجید کے خلاف ہے، لہٰذا حجت نہیں، اس روایت سے ثابت ہوا کہ صحابہ حدیث کو بھی ماخذِ قانون سمجھتے تھے۔

(۵) مانعین زکوٰۃ سے جب حضرت ابوبکرؓ نے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ ہی تھے جنہوں نے اس کی

مخالفت کی اور حجت میں حدیث پیش کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا، آپ کیسے ان سے لڑ سکتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں،
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ فَمَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ	یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ پڑھیں، پس جس
اِلَّا اللہُ عَصَمَ مِنِّیْ مَالَہٗ	نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا تو اس نے مجھ سے اپنے
وَنَفْسَہٗ اِلَّا بِحَقِّہٖ وَحِسَابُہٗ	مال اور اپنی جان کو بچا لیا مگر اس کے حق کے
عَلَی اللہِ	ساتھ اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی حدیث کے آخری حصہ " اِلَّا بِحَقِّہٖ "سے استدلال کیا اور فرمایا:-

فَاِنَّ الزَّکٰوۃَ حَقُّ الْمَالِ — بے شک زکوٰۃ مال کا حق ہے۔

لہٰذا حدیث ہی کی رُو سے حق کے لئے لڑنا جائز ہے، حضرت عمر فرماتے ہیں:-

فَعَرَفْتُ اَنَّہُ الْحَقُّ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) — پھر میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے۔

یعنی حضرت عمرؓ نے " اِلَّا بِحَقِّہٖ "سے استدلال کرنے کو صحیح مانا، غرض یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اور "حسبنا کتاب اللہ" کے قائل یعنی فاروق اعظم نے بھی حدیث کو حجت مانا اور اسی کے مطابق عمل کیا، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کو کافی سمجھ کر قرآن مجید کی کوئی آیت نہ پڑھی؟ کیوں قتال کے خلاف آیتِ قرآنی کو پیش نہ فرمایا۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ محض قرآن مجید کافی نہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حدیث بھی اسی طرح ماخذِ قانون ہے جس طرح قرآن مجید، یہی وجہ ہے کہ وہ بے دھڑک حدیث کو بطور حجت کے پیش کر دیا کرتے تھے اور ایسی حدیث کو بھی پیش کر دیا کرتے تھے جو بظاہر قرآن مجید سے ٹکراتی تھی، مثلاً یہی حدیث سورۂ توبہ کی ان آیات کے خلاف ہے جن میں کفار سے جنگ بند کرنے کا حکم اس وقت ہے جب وہ ایمان لے آئیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، حضرت عمرؓ کی پیش کردہ حدیث میں نماز اور زکوٰۃ کا کوئی ذکر نہیں، لیکن پھر بھی وہ اس حدیث کو پیش کرنے میں تامل نہیں کرتے، پھر حضرت ابوبکرؓ کی حالت ملاحظہ فرمائیے، وہ سورہ توبہ کی آیت پیش نہیں کرتے بلکہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو حجتِ شرعیہ کے طور پر پیش کرنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ نے حدیث ہی کی بنا پر ایک رائے قائم کی اور پھر حدیث ہی کی بنا پر اپنی اس رائے کو غلط سمجھا اور اس سے رجوع کر لیا۔

(۶) مطلقہ عورت کی رہائش اور نفقہ کے متعلق حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:-

لَا نَتْرُكُ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (صحیح مسلم)

ہم اللہ کی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے۔

(۷) حضرت مسورؓ فرماتے ہیں :۔

اِسْتَشَارَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِيْ اِمْلَاصِ الْمَرْأَةِ فَقَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ شَهِدْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى فِيْهِ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ فَقَالَ عُمَرُ اِئْتِنِيْ بِمَنْ يَشْهَدُ مَعَكَ قَالَ فَشَهِدَ لَهٗ مُحَمَّدُ بْنُ مُسْلَمَةَ

(صحیح مسلم باب دیۃ الجنین)

حضرت عمرؓ نے عورت کے پیٹ کے بچہ کو گرا دینے کی دیت کے سلسلہ میں مشورہ کیا۔ حضرت مغیرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری موجودگی میں بطور دیت ایک غلام یا لونڈی مقرر کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، کوئی اور آدمی پیش کرو جو تمہارے ساتھ گواہی دے۔ الغرض حضرت محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی۔

مندرجہ بالا حدیث سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ حدیث پر صرف عمل ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی حفاظت اور توثیق کا بھی خیال رکھتے تھے، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا :۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَوْ لَمْ اَسْمَعْ بِهٰذَا لَقَضَيْنَا بِغَيْرِ هٰذَا

اللہ اکبر، میں یہ حدیث نہ سنتا تو اس کے خلاف فیصلہ کر دیتا۔

(ابوداؤد، کتاب الدیات درجالہ ثقات، تقریب)

یعنی حضرت عمرؓ لاعلمی میں بھی حدیث کے خلاف فیصلہ کرنے کو برا سمجھتے تھے۔

(۸) ایک دن حضرت عمرؓ نے خطبہ میں فرمایا :۔

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ اٰيَةُ الرَّجْمِ فَقَرَاْنَاهَا وَوَعَيْنَاهَا وَعَقَلْنَاهَا رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهٗ فَاَخْشٰى اِنْ طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ اَنْ يَّقُوْلَ قَائِلٌ وَاللّٰهِ مَا نَجِدُ اٰيَةَ الرَّجْمِ فِيْ كِتَابِ

بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اور آپؐ پر شریعت نازل فرمائی۔ اس میں رجم کا حکم بھی ہے۔ ہم نے اس کو پڑھا ہے اور یاد کیا ہے، اور سمجھ لیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں امتدادِ زمانہ کے باعث کوئی کہنے والا یہ نہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں رجم کا حکم نہیں ہے۔ پس لوگ اللہ تعالیٰ کے

اللہِ فَیَضِلُّوْا بِتَرْکِ فَرِیْضَۃٍ اَنْزَلَھَا اللّٰہُ وَ الرَّجْمُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ حَقٌّ عَلٰی مَنْ زَنیٰ اِذَا اُحْصِنَ (صحیح بخاری باب رجم الحبلی وصحیح مسلم باب رجم الثیب)

نازل کردہ فریضہ کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں اور بے شک رجم کتاب اللہ میں ثابت ہے اس شخص کے لئے جو شادی شدہ ہو کر زنا کرے۔

حضرت عمرؓ حکم رجم کو نازل شدہ مان رہے ہیں اور اس کو کتاب اللہ میں قائم اور ثابت سمجھ رہے ہیں حالانکہ رجم کا حکم قرآن مجید میں نہیں ہے بلکہ حدیث میں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک قرآن مجید ہی کتاب اللہ اور منزّل من اللہ نہیں ہے بلکہ حدیث بھی کتاب اللہ اور منزّل من اللہ ہے۔ یہاں بھی حضرت عمرؓ اس حدیث کو حجت تسلیم کر رہے ہیں جو بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہے بلکہ تمام صحابہؓ اس کو تسلیم کر رہے ہیں، کوئی ایک بھی اس کی حجت سے انکار نہیں کرتا۔ اس اثر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" سے حضرت عمرؓ کی مراد قرآن اور حدیث تھی، یعنی شریعت الٰہیہ جو منزّل من اللہ ہے۔

(۹) حضرت عمرؓ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے کہ اتنے میں ایک مہاجر صحابی تشریف لائے حضرت عمرؓ نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا — کہنے لگے کہ میں نے دفعتاً اذان سنی اور فوراً وضو کر کے چلا آیا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

وَالْوُضُوْءَ اَیْضًا وَقَدْ عَلِمْتَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَاْمُرُ بِالْغُسْلِ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

صرف وضو کر کے آنا بھی غلطی ہے جبکہ تمہیں یقیناً یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے حدیث کو بطور حجت پیش فرمایا اور تمام صحابہ نے اسے تسلیم کیا، کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ حکم نبوی عارضی تھا، اب نہانا ضروری نہیں، پھر حضرت عمرؓ خود مرکز ملت تھے چاہتے تو خود حکم دے دیتے کہ نہا کر آیا کرو، لیکن نہیں وہ اپنے حکم کو حجت شرعیہ نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا اُس چیز کو پیش کیا جو حقیقتاً حجت شرعیہ تھی۔

(۱۰) حارث کہتے ہیں، میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اگر عورت نحر کے دن طواف کر لے اور پھر اس کو حیض شروع ہو جائے تو کیا کرے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آخری کام بیت اللہ کا طواف ہونا چاہیئے، حارث نے کہا یہی فتویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

اَرِبْتَ عَنْ یَدَیْکَ سَاَلْتَنِیْ عَنْ شَیْءٍ

تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں تو نے مجھ سے ایسی بات

سَأَلْتُ عَنْہُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَکِیْمَا اُخَالِفُ (ابوداود، کتاب الحج ورجالہ ثقات، تقریب)

پوچھی جس کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ چکا تھا۔ کیا میں فیصلہ نبوی کے خلاف کہہ سکتا ہوں۔

(۱۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ وہ خزانہ جو کعبہ کے اندر مدفون ہے، نکال کر تقسیم کر دیں، ایک شخص نے کہا، آپ ایسا نہیں کر سکتے، کہنے لگے کیوں؟ اس نے کہا:

لَمْ یَفْعَلْہُ صَاحِبَاكَ قَالَ هُمَا الْمَرْآنِ یُقْتَدٰی بِهِمَا (صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ وکتاب المناسك)

تمہارے دونوں ساتھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ نے ایسا نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ان دونوں کی پیروی کی جاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں بھی سنّتِ نبوی کو حکم مانا اور اپنے ارادہ سے باز رہے، انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اب میں مرکزِ ملّت ہوں، جو چاہوں کروں۔

(۱۲) ایک عورت اپنے پوتے کی میراث میں سے حصّہ لینے آئی،

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:-

مَالَكِ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ وَمَا عَلِمْتُ لَكِ فِیْ سُنَّۃِ نَبِیِّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَیْئًا

نہ کتاب اللہ میں تمہارا کوئی حصہ مقرّر ہے اور نہ میرے علم کے مطابق سنّت نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہارا کوئی حصّہ مقرر ہے۔

اس کے بعد فرمایا، تم پھر آنا، میں لوگوں سے پوچھوں گا، پس انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا۔ حضرت مغیرہؓ اور حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصّہ دیا تھا۔ یہ حدیث سُننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اس کو چھٹا حصّہ دے دیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے پاس متوفّی کی نانی میراث مانگنے آئی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

مَا اَنَا بِزَائِدٍ فِی الْفَرَائِضِ وَلٰكِنْ ذٰلِكَ السُّدُسُ فَاِنِ اجْتَمَعْتُمَا فَهُوَ بَیْنَكُمَا. (رواہ ابوداؤد والترمذی وصحح واللفظ لابی داؤد)

میں مقررہ حصّہ میں زیادتی نہیں کر سکتا۔ دادی یا نانی کا چھٹا حصّہ ہے، اگر دونوں موجود ہوں تو چھٹا حصّہ دونوں میں تقسیم ہوگا۔

نانی یا دادی کا حصّہ قرآن مجید میں نہیں ہے، صرف حدیث میں ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ

تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اس مقرّرہ حصّہ میں زیادتی نہیں کرسکتا، یعنی جو کچھ حدیث میں ہے، وہی حجّت ہے، اسی پر عمل ہوگا۔ مرکزِ ملّت کو سنت رسول کے بدلنے یا اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حدیث کو حجّتِ شرعیہ سمجھتے تھے۔

(۱۳) حضرت سعید فرماتے ہیں:۔

كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ الدِّيَةُ لِلْعَاقِلَةِ وَلَا تَرِثُ الْمَرْأَةُ مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا شَيْئًا حَتّٰى قَالَ لَهُ الضَّحَّاكُ بْنُ سُفْيَانَ كَتَبَ إِلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ وَرِّثْ امْرَأَةَ أَشْيَمَ الضِّبَابِيِّ مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا فَرَجَعَ عُمَرُ (رواه ابوداؤد فی کتاب الفرائض ورواه الترمذی وصححه)

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ دیت عاقلہ کے ذمّہ ہے اور بیوہ کو اس میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں تک کہ حضرت ضحاکؓ نے ان سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لکھ کر بھیجا تھا کہ اشیم کی بیوی کو بھی دیت میں سے حصّہ دیا جائے تو حضرت عمرؓ نے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا۔

(۱۴) لَمْ يَكُنْ عُمَرُ أَخَذَ الْجِزْيَةَ مِنَ الْمَجُوْسِ حَتّٰى شَهِدَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَهَا مِنْ مَجُوْسِ هَجَرَ (صحیح بخاری کتاب فرض الخمس، باب الجزیۃ)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجوس سے جزیہ نہیں لیتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے شہادت دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے جزیہ لیا تھا۔

قرآن مجید میں صرف اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا حکم ہے۔ حضرت عمرؓ اس پر عمل کرتے تھے، مجوس سے جزیہ لینے کا حکم قرآن مجید میں نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے بھی جزیہ لیا۔ بظاہر یہ حدیث بھی قرآن مجید کے خلاف تھی لیکن حضرت عمرؓ نے بغیر کسی پس و پیش کے اس کو قبول کیا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک حدیث حجّتِ شرعیہ ہے، خواہ وہ قرآن مجید کے موافق ہو یا بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہو۔

(۱۵) ایک پاگل عورت نے زنا کیا، حضرت عمرؓ نے حکم دیا، اس کو سنگسار کر دو، حضرت علیؓ ادھر سے گزرے، پوچھا کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا، یہ مجنون عورت ہے، اس نے زنا کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، اس کو واپس لے چلو، پھر حضرت عمرؓ کے پاس

آئے اور کہا:-

يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ الْقَلَمَ رُفِعَ عَنْ ثَلَاثَةٍ عَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَبْرَأَ وَعَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَعْقِلَ قَالَ بَلَى قَالَ فَمَا بَالُ هٰذِهِ تُرْجَمُ قَالَ لَا شَيْءَ قَالَ فَأَرْسِلْهَا قَالَ فَأَرْسَلَهَا قَالَ فَجَعَلَ يُكَبِّرُ

(ابوداؤد، کتاب الحدود، ورجالہ ثقات، تقریب)

یعنی اے امیرالمومنین! آپ کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین آدمی مرفوع القلم ہیں۔ مجنون، جب تک تندرست نہ ہو، سونے والا جب تک نہ جاگے۔ اور بچہ جب تک سمجھ دار یعنی بالغ نہ ہو، حضرت عمرؓ نے فرمایا! مجھے معلوم ہے، حضرت علیؓ نے کہا پھر کس لئے اس کو سنگسار کیا جا رہا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا "کوئی وجہ نہیں" حضرت علی نے کہا، پھر اس کو چھوڑ دیجئے حضرت عمر نے اس کو چھوڑ دیا اور اللہ اکبر کہا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں حدیث کو حجّت جانتے تھے اور مرکزِ ملّت کو اس کا تابع سمجھتے تھے۔

(۱۷) عمرو بن میمون کہتے ہیں:-

كُنَّا وُقُوفًا بِجَمْعٍ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِنَّ الْمُشْرِكِينَ كَانُوا لَا يُفِيضُونَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَكَانُوا يَقُولُونَ أَشْرِقْ ثَبِيرُ وَإِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَالَفَهُمْ فَأَفَاضَ عُمَرُ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ

رواہ الترمذی فی کتاب الحج وصححہ

ہم مزدلفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا! "بے شک مشرکین مزدلفہ سے واپس نہ ہوتے تھے جب تک سورج نہ نکل آئے، وہ کہتے تھے کہ اے ثبیر روشن ہو جا! اور تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی" (یہ کہہ کر) حضرت عمرؓ مزدلفہ سے طلوع شمس سے پہلے چل دیئے۔

اس مسئلہ میں بھی حضرت عمرؓ نے سنّت پر عمل کیا۔

(۱۸) یعلی بن اُمیہ کہتے ہیں:-

قُلْتُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ لَيْسَ

میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ

عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَقَدْ اَمِنَ النَّاسُ فَقَالَ عُمَرُ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) عَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ مِنْهُ فَسَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ (صحیح مسلم، باب صلاۃ المسافرین)

فرماتا ہے: "تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم نماز میں کمی کرو جب تمہیں یہ خوف ہو کہ کافر تم کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے"، لیکن اب تو بالکل امن ہے۔ اب نماز میں قصر کیوں کیا جائے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس چیز سے تمہیں تعجب ہوا ہے، مجھے بھی تعجب ہوا تھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، آپ نے فرمایا یہ اللہ کا احسان ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے پس اُس کے احسان کو قبول کرو (یعنی امن وامان کے سفر میں بھی قصر کرتے رہا کرو)

امن کی حالت میں قصر کرنا بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہے لیکن حضرت عمرؓ بغیر چون وچرا اُسے تسلیم کرتے ہیں اور اُسے تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ ایسی حدیث کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔

(۱۹) مالک بن اوس کہتے ہیں۔ میں نے کہا "کون مجھے سونے کے بدلے درہم دے گا؟" حضرت طلحہؓ نے فرمایا، ہمیں اپنا سونا دکھاؤ، پھر جب ہمارا خادم آجائے تو تم آنا، ہم تم کو چاندی دے دیں گے، حضرت عمرؓ وہاں موجود تھے، آپ نے فرمایا:-

كَلَّا وَاللّٰهِ لَتُعْطِيَنَّهٗ وَرِقَهٗ اَوْ لَتَرُدَّنَّ اِلَيْهِ ذَهَبَهٗ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْوَرِقُ بِالذَّهَبِ رِبًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ الخ (صحیح مسلم، کتاب البیوع)

ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا، یا تو اس کو چاندی دو ورنہ سونا واپس کر دو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چاندی سونے کے بدلے سود ہے، اگر نقد نہ ہو۔

الغرض اس قسم کی بیسیوں روایتیں ہیں، جن سے حضرت عمرؓ کا حدیث پر عمل کرنا اور حدیث کو حجت ماننا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت عمرؓ کا "حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ" کہنے سے یہ مطلب تھا کہ حدیث حجت نہیں، صرف قرآن مجید کافی ہے، ایک ایسی بات ہے جس کے لئے کوئی شہادت نظر نہیں آتی بلکہ جو کچھ حضرت عمرؓ سے بتواتر ثابت ہے وہ اس کے خلاف ہے۔

....

غلط فہمی | برقی صاحب آگے جاکر تحریر کرتے ہیں "یہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے"، حضرت فاروق کا یہ جملہ رسالت پناہ کے حضور میں جسارت بے جا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ مجبور تھے (دو اسلام ص۳۸)

ازالہ | حدیث زیر بحث، حدیث قرطاس کے نام سے مشہور ہے، عموماً لوگوں کو اس میں بہت سے اشکال ہیں لہٰذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل مطلب کو تفصیل سے واضح کر دیا جائے،

حدیث قرطاس | ابن عباس فرماتے ہیں :۔

لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ قَالَ ائْتُونِي بِكِتَابٍ أَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا (صحیح بخاری، کتاب العلم)	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض نے شدّت اختیار کی تو آپ نے فرمایا ایک کاغذ لاؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں)۔

اس کے بعد فرمایا :۔

لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا — پھر تم نہیں بھولو گے۔

یعنی ہو سکتا ہے کہ ویسے تم میری وصیّت کو بھول جاؤ لیکن تحریری وصیّت کے بعد تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس فرمان کے بعد ایک مکالمہ شروع ہو جاتا ہے جس کے بعض فقرے مختلف سندوں میں بیان ہوئے ہیں اور بعض بالکل محذوف ہیں،

حضرت عمرؓ نے حاضرین سے کہا :۔

إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَهُ الْوَجَعُ	اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درد کی شدت ہے)،

بہتر یہ ہے کہ اس وقت آپ کو تکلیف نہ دی جائے۔

پھر کہنے لگے :۔

وَعِنْدَكُمُ الْقُرْآنُ (صحیح بخاری، باب مرض النبیؐ) اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے۔

یعنی قرآن مجید کی موجودگی میں آپ کو کیوں تکلیف دی جائے، بظاہر ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی میں حدیث کی ضرورت نہیں، لہٰذا حضرت عمرؓ نے یا تو لوگوں کے اعتراض پر یا خود ہی یہ کہا عِنْدَنَا كِتَابُ اللّٰهِ حَسْبُنَا ہمارے پاس اللہ کی شریعت ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے (کیونکہ کتاب اللہ میں قرآن مجید اور حدیث دونوں شامل ہیں اور حضرت عمرؓ اسی کے قائل تھے، جیسا کہ حدیث رجم میں اوپر گزر چکا ہے لہٰذا حضرت عمرؓ نے اپنے جملہ کو صحیح کر لیا)۔

حدیث میں حضرت عمرؓ کے دو جملے متصل بیان ہوئے۔ ایک "تمہارے پاس قرآن ہے"

دوسرا " ہمارے پاس کتاب اللہ ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے" اگر یہ دونوں جملے حضرت عمرؓ نے یکے بعد دیگرے کہے تھے تو عبارت میں بڑا نقص پیدا ہو جائے گا، پہلے جملہ میں ضمیر مخاطب، دوسرے میں ضمیر متکلم، پھر دونوں جملے مل کر عجیب اور بے جوڑ سی عبارت پیدا کرتے ہیں، للہٰذا لازمی ہے کہ دونوں جملے بہ یک وقت نہ کہے گئے ہوں بلکہ کچھ وقفہ کے بعد، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ یا تو وہ خود بخود سمجھ گئے ہوں کہ پہلا جملہ محلِّ اعتراض ہے یا کسی نے اعتراض کیا ہو جیسا کہ اسی حدیث میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے الفاظ پر کافی اختلاف ہوا، غرض یہ کہ وجہ کوئی بھی ہو انہوں نے اپنے جملہ کی تصحیح کرلی، مزید برآں جب قرآن مجید کا نام لیا تو اس کے ساتھ "کافی" کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن جب کتاب اللہ کہا تو کافی ہونے کی صراحت کردی۔ حضرت عمرؓ کے ان الفاظ پر بھی کافی اختلاف ہوا، لوگ خاموش نہیں ہوئے بلکہ

فَاخْتَلَفُوْا وَكَثُرَ اللَّغَطُ فَمِنْهُمْ مَنْ	اختلافِ رائے ہوا اور بہت شور ہونے لگا۔
يَقُوْلُ قَرِّبُوْا يَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا وَ	بعض کہنے لگے کہ قلم دوات لے آؤ تاکہ آپ
مِنْهُمْ مَنْ يَقُوْلُ غَيْرَ ذٰلِكَ	وصیت تحریر کر دیں بعض اس کے علاوہ کوئی
(صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم)	اور بات کہنے لگے۔

مثلاً اس وقت ہی ایسی کیا ضرورت ہے کہ آپ کو تکلیف دی جائے وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ کہ مختلف باتیں کہی گئی ہوں گی جن کو حضرت ابن عباسؓ نے نظر انداز کر دیا۔ حدیث کے آئندہ آنے والے الفاظ اس بات کے متقاضی ہیں کہ لوگ تحریر کے کام کو ملتوی کرانا چاہتے تھے تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو، جب فوری تحریر کی موافقت کرنے والوں نے اصرار کیا تو اس کو ملتوی کرنے والوں نے دریافت کیا "مَا شَأْنُهٗ أَهَجَرَ اِسْتَفْهِمُوْهُ" (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم) (آخر اسی وقت لکھوانا کیوں ضروری ہے) آخر آپ کا کیا حال ہے؟ کیا آپ دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں؟ آپ ہی سے پوچھ لو (یعنی اگر آپ وفات پانے والے ہیں تو خیر اسی وقت لکھوا لیا جائے ورنہ پھر دیکھا جائے گا) غرض یہ کہ سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ آپ سے دریافت کیا جائے " فَذَهَبُوْا يَرُدُّوْنَ عَلَيْهِ (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی لوگ آپ سے پوچھنے لگے یا آپ کے سامنے اس سوال کو پیش کرنے لگے، اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم دوات لانے کا حکم احتیاطاً اور مشورۃً دیا تھا، اگر یہ حکم ضروری ہوتا تو ضرور آپ دوبارہ ارشاد فرماتے اور صحابہ میں مشورہ اور اختلاف نہ ہوتا، حکم دے کر آپ نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی بلکہ جب خود صحابہ کرامؓ نے بار بار پوچھا تو فرمایا "دَعُوْنِيْ" مجھے چھوڑ دو یعنی مجھ سے لکھوانے کا تقاضا مت کرو بلکہ اس وقت تو تم مجھے متوجہ بھی مت کرو۔

فَالَّذِيْ اَنَا فِيْهِ خَيْرٌ مِّمَّا	کیونکہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس حالت

تَدۡعُوۡنِیۡ اِلَیۡہِ (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم) — سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بُلا رہے ہو۔

(یعنی جو قربِ الٰہی اس وقت مجھے حاصل ہے وہ میرے لئے تمہاری طرف متوجّہ ہونے سے بہتر ہے، رہ گیا وصیّت تحریر کرانا، تو زبانی ہی سن لو) "وَاَوْصَاھُمۡ بِثَلَاثٍ" پھر آپ نے صحابہ کو تین وصیتیں کیں پھر فرمایا:

قُوۡمُوۡا عَنِّیۡ وَلَا یَنۡبَغِیۡ عِنۡدِیَ التَّنَازُعُ (صحیح بخاری، کتاب العلم) — اچھا اب میرے پاس سے چلے جاؤ، اور یاد رکھو کہ میرے پاس تم کو اختلاف نہیں کرنا چاہیئے۔

دو شبہے اور ان کا ازالہ

(۱) مندرجہ بالا تشریح میں ہم نے "لَا تَضِلُّوۡا بَعۡدَہٗ" کے معنی کئے ہیں "اس کے بعد تم نہ بھولو گے"، یعنی تَضِلُّوۡا کے معنی کئے ہیں "تم بھولو گے" حالانکہ عام طور پر "تَضِلُّوۡا" کے معنی "تم گمراہ ہو گے" کئے جاتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاسۡتَشۡہِدُوۡا شَہِیۡدَیۡنِ مِنۡ رِّجَالِکُمۡ فَاِنۡ لَّمۡ یَکُوۡنَا رَجُلَیۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّہَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰھُمَا فَتُذَکِّرَ اِحۡدٰھُمَا الۡاُخۡرٰی (البقرۃ:- ۲۸۲) — لین دین کے معاملہ میں تحریر کرتے وقت مسلم مردوں میں سے دو گواہ کر لیا کرو، اگر دو مرد نہ ہوں تو اُن گواہوں میں سے جن سے تم راضی ہو، ایک مرد اور دو عورتیں گواہ کر لیا کرو۔ اس لئے کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اُسے یاد دلا دے۔

آیت مذکورہ میں "تَضِلَّ" کے معنی بھولنے کے کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ اس جگہ یہی مناسب ہیں۔ اسی طرح حدیث زیرِ بحث میں بھی بھول ہی کے معنی مناسب ہیں کیونکہ مکمّل شریعت کی موجودگی میں گمراہی کے معنی مناسب نہیں، ہاں بعض احکام کو بھولا جا سکتا ہے، اسی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تحریر کرنے کا ذکر فرمایا۔ اس واقعہ سے آپ کا مقصد ان وصایا کی اہمیت کو بتانا تھا اور اس طرح ان کی حفاظت مقصود تھی، آیت اور حدیث میں ایک اور مناسبت بھی ہے، وہ یہ کہ دونوں جگہ تحریر کے ذکر میں لفظ "ضلالت" کا استعمال ہوا ہے،

تحریر کا مقصد محض بھول کا دفعیہ ہوتا ہے۔ لہذا "ضلالت" کے معنی بھول جانا ہی ہر دو جگہ مناسب ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہم نے کتاب اللہ کے معنی "اللہ کی شریعت" کئے ہیں۔ حالانکہ عام طور سے کتاب اللہ سے قرآن مجید مراد لیا جاتا ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں:۔

وجہ اوّل۔ خود اسی حدیث میں حضرت عمرؓ نے پہلے "عِنْدَكُمُ الْقُرْاٰنُ" کہا تھا۔ پھر "عِنْدَنَا كِتَابُ اللّٰهِ" کہا (صحیح بخاری کتاب العلم) اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ حضرت عمرؓ کو پہلے جملہ سے غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے قرآن کی جگہ کتاب اللہ کہہ دیا۔

وجہ دوم:۔ خود حضرت عمرؓ نے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ حدیثِ رجم کو کتاب اللہ کہا ہے۔

وجہ سوم:۔ حضرت عمرؓ کی ساری زندگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ حدیث کو بھی حجت سمجھتے تھے۔ لہذا "حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ" سے صرف قرآن مجید مراد لینا، خود متکلم یعنی حضرت عمرؓ کی منشاء کے خلاف ہے۔

حدیث کو کتاب اللہ کہا جاتا ہے

حدیث کو کتاب اللہ کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث اس پر کھلی دلیل ہے۔

دو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فیصلہ کے لئے حاضر ہوئے۔

فَقَالَ اَحَدُهُمَا اِقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللّٰهِ وَقَالَ الْاٰخَرُ اَجَلْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللّٰهِ

ایک نے کہا کتاب اللہ سے ہمارا فیصلہ کیجئے۔ دوسرے نے کہا ہاں یا رسول اللہ، کتاب اللہ سے ہمارا فیصلہ کیجئے۔

مقدّمہ سننے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَمَا وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَاَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ

قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ضرور تمہارا فیصلہ کتاب اللہ سے کروں گا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:۔

اَمَّا ابْنُكَ فَعَلَيْهِ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ وَاَمَّا اَنْتَ يَا اُنَيْسُ فَاغْدُ عَلَى امْرَاَةٍ فَاِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمْتُ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

تیرے بیٹے کو سو دُرّے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے گا۔ اور اے انیس، تم اس عورت کے پاس جاؤ۔ اگر وہ زنا کا اقرار کرے تو اس کو رجم کر دو اس نے اقرار کیا اور انہوں نے اسے سنگسار کر دیا۔

یہ سزا جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ کتاب اللہ سے مراد یہاں حدیث ہے۔

کتاب اللہ کا اطلاق نہ صرف قرآن مجید اور نہ صرف حدیث بلکہ پوری شریعت پر بھی ہوتا

ہے اور یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے، ارشاد باری ہے:۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى	اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا بنایا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ	ہوا ہو بلکہ یہ قرآن پہلے صحیفوں کی تصدیق کرتا ہے اور
بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا	کتاب کی تفصیل کرتا ہے جس کے رب العالمین کی
رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس: ۳۷)	طرف سے ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اس آیت میں اگر کتاب سے قرآن مجید مراد لیا جائے، تو معنی یہ ہوں گے کہ قرآن قرآن کی تفصیل کرتا ہے اور یہ کسی طرح صحیح نہیں، صحیح معنی یہ ہیں کہ شریعت کی تفصیل کرتا ہے احکام شریعت کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتا ہے۔ اس روایت سے ثابت ہوا کہ کتاب اللہ کے معنی شریعت الٰہیہ کے بھی ہیں اور جب قرآن و حدیث اور حضرت عمرؓ کے قول سے یہ ثابت ہو چکا کہ حدیث بھی کتاب اللہ ہے تو پھر "حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ" سے حدیث کی مخالفت ثابت نہیں ہوتی۔

یہاں تک صحابۂ کرام کے حدیث جمع نہ کرنے کی پہلی مفروضہ وجہ کا جواب تھا اب دوسری وجہ سنیئے اور جواب ملاحظہ فرمایئے:۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

دوم۔ حضور نے حدیث لکھنے سے روک دیا تھا۔ ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآن کے بغیر میرا اور کوئی قول قلمبند نہ کرو اور اگر کوئی شخص ایسا کوئی قول لکھ چکا ہو تو اسے مٹا دے۔ یہ صحیح مسلم (دو اسلام ص ۳۹)

جواب

برق صاحب نے خود ہی اس ممانعت کی دو وجہیں لکھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں اول یہ کہ کہیں غلطی سے احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں اور درحقیقت یہی اس کی اصل وجہ ہے اور یہی صحیح ہے۔

غلط فہمی

(۲) اس کے بعد برق صاحب اس حکم امتناعی کی دوسری وجہ لکھتے ہیں:۔

دوم۔ خود رسول کریم کی زندگی میں ان کے اقوال محرف ہو چکے تھے (دو اسلام ص ۳۹)

جواب

یہ وجہ قطعاً صحیح نہیں، اولاً اس لئے کہ کسی روایت میں یہ منقول نہیں کہ خود آپ کی زندگی میں آپ کی احادیث محرف ہو چکی تھیں۔

ثانیاً، پہلی وجہ جو اوپر بیان ہوئی وہ صحیح ہے لہٰذا یہ وجہ باطل ہے۔

ثالثاً۔ یہ وجہ عقلاً بھی محال ہے۔ کسی شخص کے اقوال میں تحریف یا اختلاف اس وقت رونما ہوتا ہے جب وہ موجود نہ ہو اور جب وہ موجود ہو تو تحریف کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا، اس لئے کہ یہ فوراً گرفت میں آنے والی بات ہے اور کہنے والا خود اس کی تکذیب کر سکتا ہے اور جب ہاتھ میں حکومت

ہو تو پھر سزا بھی دے سکتا ہے، اسی طرح اختلافِ لفظی یا معنوی کا وقوع بھی محال ہے اور اگر بالفرض محال ایسا ہو بھی جائے تو اس اختلاف کو فوراً رفع بھی کیا جا سکتا ہے، غرض کہ قائل کی زندگی میں اس کے قول کے مفہوم میں جو اختلاف پیدا ہو گا وہ عارضی ہو گا، دائمی نہیں، لہٰذا برق صاحب کا یہ کہنا کہ خود آپ کی زندگی میں آپ کے اقوال محرّف ہو چکے تھے، عقلاً و نقلاً کسی طرح صحیح نہیں۔

غلط فہمی اس کے بعد برق صاحب لکھتے ہیں:۔

فرض کرو، ایک محفل میں چھ آدمی گھنٹہ بھر گفتگو کرتے رہے کیا یہ ممکن ہے کہ اختتام مجلس تک وہ تمام گفتگو بالفاظہ دہرا سکیں! ناممکن ہے" (دو اسلام ص۳۹)

جواب برق صاحب جو چیز آپ کے لئے ناممکن ہے، ضروری نہیں کہ وہ ہر شخص کے لئے ناممکن ہو۔ اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک دفعہ کتاب پڑھی اور پوری کتاب یاد ہو گئی مثلاً امام شافعیؒ امام بخاریؒ، امام ابن تیمیہ وغیرہ محدثین کے حافظہ کے متعدد واقعات ہیں، بخوف طوالت نظر انداز کر رہا ہوں، براہِ کرم اپنے حافظہ کے پیمانہ سے دوسرے لوگوں کے حافظہ کی پیمائش نہ کیجئے پھر عام گفتگو کو درس و تدریس سے کیا نسبت! درس و تدریس میں سننے والا سنتا اس لئے ہے کہ اس کو محفوظ رکھے، پھر عام درس و تدریس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ سے کیا نسبت! صحابہ کرام بڑے شوق سے ارشاداتِ نبوی کو سنتے تھے بلکہ عورتیں تک درخواست کرتی تھیں کہ ہمارے لئے بھی کوئی دن مقرر کر دیا جائے اور ان کی درخواست پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دن مقرر کر دئے تھے (صحیح بخاری کتاب العلم) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے تھے۔ صحابہ کرام آپ سے سوال بھی نہیں کرتے تھے اس لئے کہ قرآن مجید میں اس کی ممانعت تھی، حضرت انسؓ کہتے ہیں، ہم کو قرآن مجید میں سوال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا لہٰذا ہم اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ کوئی سمجھ دار دیہاتی آ کر سوال کرے (صحیح بخاری کتاب العلم) ایسے حالات میں ارشادات کی قلت ہو گی اور جتنی قلت ہو گی اتنی ہی حفاظت زیادہ ہو گی، پھر صحابہ کرام نے آپ کے ارشادات کے جستہ جستہ فقرے بیان کئے ہیں نہ کہ مسلسل ڈھائی گھنٹہ کی تقریر اور جستہ جستہ اہم فقروں کا یاد کر لینا کیا مشکل ہے، پھر مسائل کی نوعیت اور بھی مختلف ہے اس لئے کہ مسئلہ سنتے ہی یاد ہو جاتا ہے۔ پھر اگر کسی سائل کے جواب میں بیان کیا جائے تو کم از کم سائل کو تو وہ حفظ ہو ہی جائے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل تقریر کے عادی نہیں تھے، متوسط خطبہ دیا کرتے تھے (صحیح مسلم) پھر اکثر اوقات ایک ایک بات

تین تین مرتبہ دہرایا کرتے تھے (صحیح بخاری کتاب العلم) بھلا ان حالات میں ایک مخلص دین سیکھنے والے کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ ارشاداتِ عالیہ کو حفظ کر سکے، یہ ایک فطری چیز ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

غلط فہمی اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک واقعہ کو پچاس آدمی دیکھتے ہیں۔ اگر آپ ان کے پاس علیحدہ علیحدہ جا کر اس واقعہ کی تفصیل قلم بند کریں تو آپ کو ان تفاصیل میں کافی اختلافات نظر آئیں گے" (دو اسلام صـ۳۹)

جواب بات یہاں یہ نہیں ہے جو برق صاحب نے لکھی ہے۔ یہاں تو بات یہ ہے کہ حدیث کو پچاس آدمی سنتے ہیں اور پچاس کے پچاس ایک ہی مفہوم روایت کرتے ہیں اور اگر بالفرضِ محال ایک دو آدمی غلطی کر بھی جائیں تو اکثریت کے مقابلہ میں ان کی بات قابل رد ہو گی۔

غلط فہمی پھر برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

اگر چھ ماہ یا سال بھر بعد انہی لوگوں کے پاس جا کر اس واقعہ کی تفصیل دوبارہ قلم بند کریں تو اختلاف اور نمایاں ہو گا (دو اسلام صـ۴۰)

جواب حدیث کے سلسلہ میں یہ بات بھی صحیح نہیں اس کی آزمائش بھی ہو چکی ہے سال سال بھر بعد راویوں سے بغیر ان کے علم کے ان کی بیان کردہ احادیث کو دہروایا گیا اور سر مو فرق نہیں آیا، برق صاحب علم حدیث کا مطالعہ کیجئے۔ محدثین کے حالات کو غور سے پڑھیئے، پھر برق صاحب احادیث کو واقعات سے تشبیہ دینا بھی تو صحیح نہیں، احادیث مسائل ہیں اور مسائل کا یاد کر لینا اور ان کے بیان پر متفق ہونا کوئی مشکل نہیں اگر کسی حدیث میں کوئی واقعہ بھی مذکور ہو تو واقعہ اصل چیز نہ ہو گی بلکہ وہ مسئلہ جو اس واقعہ کے اختتام پر بصورتِ حدیث واقع ہو گا، اصل چیز ہو گی اور صرف اس مسئلہ کی حفاظت کافی ہو گی نہ کہ پورے واقعہ کی۔ واقعہ کی نوعیت بالکل شانِ نزول کی سی ہو گی، جس طرح شانِ نزول کی عدم حفاظت سے آیاتِ قرآنی مشکوک نہیں ہوتیں، اسی طرح اگر کسی واقعہ کی تفصیل پوری طرح محفوظ نہ ہو تو اصل مسئلہ مشکوک نہ ہو گا۔

غلط فہمی پھر برق صاحب فرماتے ہیں:۔

"مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تفصیل یوں بدلتی جائیں گی کہ ان کا تعلق حقیقت سے بالکل منقطع ہو جائے گا"

(دو اسلام صـ۴۰)

جواب حدیث کے سلسلہ میں یہ بات بھی صحیح نہیں، صحابۂ کرام اور بعد کے محدثین نے احادیث قلم بند کرلی تھیں، ان پر عمل کرتے تھے، درس وتدریس جاری تھا لہٰذا تفصیل کا بدلنا ناممکن ہے اور اگر بالفرض محال بدل بھی جائے تو وہ مضطرب المتن کہلائیں گی اور ضعیف سمجھی جائیں گی لیکن اس ضعیف کی وجہ سے جو صحیح ہوں گی، ان پر اس ضعف کا کیا اثر پڑے گا، ضعیف کو رد کیا جائے گا، نہ کہ صحیح کو، برق صاحب پھر گزارش کرتا ہوں کہ فنون حدیث کا گہرا مطالعہ کیجئے۔ جب کوئی حدیث محدثین کے نزدیک صحیح ہوتی ہے تو وہ ان تمام شکوک سے بالاتر ہوتی ہے جو آپ وارد کر رہے ہیں بلکہ ان سے بہت زیادہ معیاری اور مزعومہ شکوک کو عبور کرتی ہوتی درجۂ صحت کو پہنچتی ہے۔

مزید غلط فہمی اور اس کا ازالہ پھر برق صاحب نے مسٹر محمد علی جناح کی تقاریر کی مثال دی ہے یہ مثال بھی صحیح نہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ایک لیڈر کے اقوال میں زمین و آسمان کا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک لفظ بیش قیمت قانون اور شریعت اسلامیہ کا ماخذ ہے، علم وعمل کا سرمایہ اور توشہ آخرت ہے لیڈر کے اقوال کو یہ اہمیت حاصل نہیں پھر کہاں تین تین گھنٹہ کی تقریر اور کہاں معلم کتاب وحکمت، مزکی و مدثر کی تعلیم اور تدریس، دونوں میں بعد المشرقین ہے نبی کی بات اس لئے سنی جاتی ہے کہ یاد رکھی جائے عمل کیا جائے، عمل کرایا جائے، لیڈر کی بات کو یہ مقام کہاں حاصل ہے۔ اس کی تقریر سے الا ماشاء اللہ کوئی فیض حاصل نہیں کرتا نہ اسے حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے، پھر نبی کی مجلس ایک تربیت گاہ ہوتی ہے، جہاں صبح وشام بلکہ ہر وقت ہر شخص کے اعمال و اقوال پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ اس کو مبلغ بنایا جاتا ہے اور دیگر مقامات پر بھی بھیجا جاتا ہے، لیڈر کی تقریریں لفاظی اور سحر بیانی ہوتی ہے وہ جذبات سے کھیلتا ہوا کچھ کا کچھ کہتا چلا جاتا ہے، اس کے بعض بیان اور بعض مفروضے بالکل سیاسی حربے ہوتے ہیں، برخلاف اس کے نبی کی ہر بات حقائق پر مبنی ہوتی ہے، وہاں نہ لفاظی ہوتی ہے نہ سحر بیانی، وہ جچتے اور جامع فقرے استعمال کرتا ہے جو قلوب میں پیوست ہو جاتے ہیں اور جوارح سے عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، بھلا کہاں لیڈر اور کہاں نبی، برق صاحب کچھ تو غور کرکے لکھا ہوتا۔

غلط فہمی پھر برق صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت فاروق کے زمانہ میں عراق کا قرآن حجاز سے مختلف ہوگیا

تھا... حضرت فاروق نے اس کا علاج یہ کیا کہ قرآن کے کافی نسخے لکھوا کر قلمرو کے مختلف حصوں میں بھیج دئے" (دو اسلام ص۴۰)

جواب اس واقعہ کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف صحیح نہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں پیش آیا تھا،

غلط فہمی اسی سلسلہ میں برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"صحابہ کرام عشقِ خدا میں ڈوبے ہوئے تھے... اگر ان عاشقانِ خدا کو قرآن کی آیات بھول گئی تھیں تو حدیث کے بھولنے پر انہیں کون ملامت کر سکتا تھا" (دو اسلام ص۴۱)

جواب صحابہؓ کا قرآن مجید کی آیات بھلا دینا خلافِ واقعہ ہے اور صحیح نہیں معلوم نہیں برق صاحب کس حوالہ سے ایسا لکھ رہے ہیں، ہاں اختلافِ لب و لہجہ ضرور واقع ہوا تھا اور یہ اور چیز ہے، بھلا دینا اور چیز ہے، پھر روایت زیر بحث میں جو اختلاف مذکور ہے وہ صحابہ کے متعلق نہیں ہے بلکہ عام لوگوں کا اختلاف مراد ہے، برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی، صحابہ نہ آیات بھولے نہ احادیث، اگر انفرادی طور پر بھول ہو بھی جاتے تو اکثریت کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں، احادیث کے سلسلہ میں انفرادی بھول کا تدارک کر لیا گیا ہے۔

غلط فہمی اس کے بعد برق صاحب تحریر فرماتے:۔
"حضور کا مقصد بھی یہی تھا، کہ قرآن حکیم کے بغیر کوئی اور کتابِ ہدایت باقی نہ رہے" (دو اسلام ص۴۱)

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ مقصد نہیں تھا نہ اس کا آپ نے کوئی ثبوت دیا، بلکہ اس کے خلاف ثبوت ملتا ہے، سنیئے۔

۱ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خُطْبَةِ حَجَّةِ الْوَدَاعِ.. اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ قَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ (مستدرک حاکم ج۱ ص۹۳)

ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا۔ اے لوگو! میں تم میں ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اس کو پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت۔

۲۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ

اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنّی قَد
تَرَکتُ فِیکُم شَیئَینِ لَن تَضِلّوا
بَعدَہُما کِتابَ اللہِ وَسُنَّتِی

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم میں
دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ان کے
ہوتے ہوئے تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔
اللہ کی کتاب اور میری سنت۔

(مستدرک حاکم ج ۱ صـ۹۳ وسکت علیہما صاحب المرعاۃ جلد اوّل صـ۴۳)

عَن مِقدامٍ عَن رَسولِ اللہِ صلی اللہ
علیہ وسلم قالَ اَلا اِنّی اُوتِیتُ
القُرآنَ وَمِثلَہٗ مَعَہٗ اَلا یُوشِكُ رَجُلٌ
شَبعانُ عَلٰی اَرِیکَتِہٖ یَقُولُ عَلَیکُم بِھٰذَا
القُرآنِ فَما وَجَدتُم فِیہِ مِن حَلالٍ فَاَحِلُّوہُ
وَما وَجَدتُم فِیہِ مِن حَرامٍ فَحَرِّمُوہُ وَاِنَّ ما
حَرَّمَ رَسُولُ اللہِ کَما حَرَّمَ اللہُ اَلا لا یَحِلُّ
لَکُمُ الحِمارُ الاَھلِیُّ (رواہ احمد وابو داؤد
والدارمی وابن ماجۃ وسندہٗ صحیح مرعاۃ ج ۱ صـ۱۵۶)

مقدام کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا مجھے قرآن دیا گیا ہے
اور اس کے ساتھ اسی کی مثل ایک اور چیز
بھی دی گئی ہے۔ خبردار عنقریب ایک
پیٹ بھرا شخص چھپر کھٹ پر بیٹھ کر کہے گا
کہ بس قرآن کو لازم سمجھو۔ جو اس میں حلال
ہے اس کو حلال مانو اور جو اس میں حرام
ہے اس کو حرام مانو حالانکہ جو رسول اللہ نے حرام کیا
وہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا۔ خبردار تمہارے
لئے شہری گدھا حلال نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا اُلفِیَنَّ اَحَدَکُم مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِیکَتِہٖ
یَاتِیہِ الاَمرُ مِن اَمرِی مِمّا اَمَرتُ
بِہٖ اَو نَھَیتُ عَنہُ فَیَقُولُ لا نَدرِی
ما وَجَدنا فِی کِتابِ اللہِ اتَّبَعناہُ
(رواہ احمد وابو داؤد والترمذی وسندہٗ
حسن، مرعاۃ شرح مشکوٰۃ جلد ۱ صـ۱۵۵)

میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ اپنے چھپر کھٹ
پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو، جب میرا کوئی
حکم اس کو پہنچے یا میری ممانعت اس کو
پہنچے تو وہ کہے ہم نہیں جانتے، ہم تو جو
کچھ کتاب اللہ تعالےٰ میں ہے اسی کا اتباع
کرتے ہیں۔

عرباض بن ساریہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اَیَحسَبُ اَحَدُکُم مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِیکَتِہٖ
یَظُنُّ اَنَّ اللہَ لَم یُحَرِّم شَیئًا اِلّا ما
فِی ھٰذَا القُرآنِ اَلا وَاِنّی وَاللہِ قَد
اَمَرتُ وَوَعَظتُ وَنَھَیتُ عَن اَشیاءَ
اِنَّہا لَمِثلُ القُرآنِ اَو اَکثَرُ

کیا تم میں کوئی شخص چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے
ہوئے یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کوئی
چیز حرام نہیں کی سوائے اس کے جو قرآن
میں ہے۔ خبردار اللہ کی قسم میں نے حکم
دئے ہیں اور نصیحت کی ہے اور بہت

(رواہ ابوداؤد وفی سندہ اشعث وثقہ ابوداؤد وابن حبان وقال الحافظ ھو مقبول۔ مرعاۃ شرح مشکوٰۃ جلد اول ص ۱۵۰)

کی چیزوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور یہ احکام تعداد میں قرآن حکیم کے مثل ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"حضرت صدیق رضؓ اور حضرت فاروق رضؓ نے احادیث اس لئے جمع نہیں کیں کہ اقوالِ رسول میں تحریف ہو چکی تھی" (دو اسلام ص ۴۲)

جواب برق صاحب! اس جملہ کو تحریر کرتے وقت آپ نے کچھ غور بھی فرمایا کہ آخر تحریف کرنے والے کون تھے۔ اس لئے کہ حضرت صدیق رضؓ یا حضرت عمر فاروق رضؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی راوی تو تھا ہی نہیں، پھر تحریف کرنے والے صدیق رضؓ اور فاروق رضؓ ہی ہو سکتے ہیں اور بالفرض محال چند حدیثیں ایسی ہوتیں جو دوسرے صحابی سے سن کر قلم بند کرتے تو کیا اس صحابی نے تحریف کی تھی۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت صدیق رضؓ کے مجموعہ سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کون سا مجموعہ ہو سکتا تھا لیکن ایک صبح اٹھ کر اسے جلا دیا" (دو اسلام ص ۴۲)

جواب برق صاحب کو اعتراف ہے کہ یہ مجموعہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تھا لیکن پھر بھی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اسے جلا دیا۔ برق صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ کیوں جلا دیا۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ برق صاحب کا منشا وہی ہے کہ احادیث میں تحریف ہو چکی تھی لہٰذا حضرت صدیق اکبر رضؓ اس کی صحت پر مطمئن نہیں تھے، لیکن یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ تحریف کرنے والے تھے کون؟ کیا پانچ سو احادیث بھی ایسی نہ تھیں جن کو وہ خود براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوں، کیا ان روایات میں کوئی سلسلۂ اسانید تھا جس میں کذاب اور وضاع راویوں کی بھرمار تھی؟ کیا حضرت صدیق رضؓ کو صحابہ کرام میں کوئی صادق القول راوی دستیاب نہ ہو سکا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ برق صاحب کیسے اس بے سروپا، خلافِ قیاس و عقل روایت کو اپنے ثبوت میں پیش فرما رہے ہیں۔

۲:۔ یہ روایت جس طرح عقلاً باطل ہے نقلاً بھی باطل اور سرتاپا جھوٹ ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی علی بن صالح مستور و مجہول الحال ہے (تقریب) دوسرا راوی محمد بن موسیٰ

ہے جس کے متعلق امام دارقطنی فرماتے ہیں" قوی نہیں" (لسان المیزان) تیسرا راوی موسیٰ بن عبداللہ ہے جس کے متعلق امام بخاری فرماتے ہیں" فیہ نظر" الغرض سنداً یہ روایت صحیح نہیں، برق صاحب کو بڑی غلط فہمی ہوئی کہ ایسی جھوٹی روایت کو اپنے ثبوت میں پیش کر دیا۔

پھر برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "حضرت فاروقؓ کے متعلق مذکور ہے کہ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کا اسوہ لکھوانے کا ارادہ کیا۔ مہینہ بھر استخارہ کرتے رہے اور پھر فرمایا" تم سے پہلے ایسی قومیں گزر چکی ہیں جنہوں نے کتابیں لکھیں، اور خدائی کتاب کو چھوڑ کر انہی پہ جھک پڑیں۔ خدا کی قسم میں قرآن کے راستہ میں کسی اور کتاب کو قطعاً نہیں آنے دوں گا"

(دو اسلام صہ ۴۲-۴۳)

حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کردہ قول کے آخری حصہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

ازالہ وانی واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشیء ابداً (دو اسلام صہ ۴۳) برق صاحب نے اس کا ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ" میں کتاب اللہ میں کسی چیز کی آمیزش نہیں کروں گا" اور اس کے تو سب ہی قائل ہیں کہ متنِ قرآن مجید میں ملاوٹ ممنوع ہے بہرحال ترجمہ کچھ بھی ہو یہ روایت ہی باطل ہے۔ سنداً غیر متصل اور منقطع ہے (برق اسلام صہ ۹۳) لہذا ایسی جھوٹی روایت سے مدعا ثابت نہیں ہوگا، یہاں کھرا سکہ چلتا ہے کھوٹا سکہ" نہیں چلتا۔

پھر برق صاحب فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی جب حضرت صدیقؓ مسندِ خلافت پر جلوہ آرا ہوئے تو آپ نے ایک دن ایک مجمعِ عام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا" تم لوگ آج احادیث میں اختلاف رکھتے ہو۔۔۔ آئندہ یہ اختلاف بڑھتا جائے گا اس لئے تم آنحضرتؐ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو اور اگر کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے پاس قرآن ہے، جو اس نے جائز قرار دیا ہے اسے جائز اور جسے ناجائز قرار دیا ہے اسے ناجائز سمجھو"

(دو اسلام صہ ۴۳)

ازالہ برق صاحب یہ روایت بھی جھوٹی ہے اس کی سند منقطع ہے متصل نہیں توجیہ النظر میں ہے" واما الروایۃ عن ابی بکر الصدیق فمن قطعہ لا تصلح" یعنی اس روایت کا سلسلہ سند منقطع ہے لہذا صحیح نہیں (برق اسلام صہ ۳۱) برق صاحب ایسی ضعیف روایتیں آپ کیوں پیش فرماتے ہیں دیکھئے حضرت ابوبکر صدیق سے تو صحیح سند سے یہ

مروی ہے جو درج ذیل ہے ۔

حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں :۔

لَسْتُ تَارِكًا شَيْئًا كَانَ رَسُوْلُ اللهِ
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْمَلُ بِهٖ اِلَّا عَمِلْتُ
بِهٖ فَاِنِّيْ اَخْشٰى اِنْ تَرَكْتُ شَيْئًا مِّنْ
اَمْرِهٖ اَنْ اَزِيْغَ
(صحیح بخاری کتاب الجہاد)

میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑ سکتا جو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے کیونکہ
میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں کوئی چیز بھی آپؐ
کے قول وفعل میں سے چھوڑ دوں گا تو گمراہ
ہو جاؤں گا ۔

اور وہ چھوڑ بھی کیسے سکتے تھے جب کہ وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ اللہ کا فرمان ہے ۔ حضرت ابو بکرؓ اپنی کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں :۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هٰذِهٖ
فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِيْ فَرَضَ رَسُوْلُ
اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ
وَالَّتِيْ اَمَرَ اللهُ بِهَا رَسُوْلَهٗ فَمَنْ سُئِلَهَا
مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ عَلٰى وَجْهِهَا فَلْيُعْطِهَا
وَمَنْ سُئِلَ فَوْقَهَا فَلَا يُعْطِ
(صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ زکوٰۃ کے یہ وہ
فرائض ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے مسلمین پر فرض کیا ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ
نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا
پس جس سے اس کے مطابق مانگا جائے تو
اسے دے دینا چاہیئے اور جس سے اس سے
زیادہ مانگا جائے تو وہ زیادہ نہ دے ۔

یہ ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی کتاب کا تمہیدی بیان ۔ اس کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے فرائض بیان کئے ہیں ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس تمہیدی بیان سے ثابت ہوا کہ :۔

۱:۔ جو کچھ حدیث میں ہے اسی کے موافق عمل کیا جائے ۔

۲:۔ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض کیا ہے وہ من جانب اللہ فرض ہے ۔ گویا، حدیث بھی من جانب اللہ نازل ہوئی ہے ۔

۳:۔ اگر کوئی حاکم حدیث کی مقرر کردہ شرح سے زیادہ مانگے تو نہ دیا جائے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرح کو اپنی رعایا پر فرض نہیں فرمایا بلکہ مسلمین پر مقرر فرمایا ہے یعنی حدیث کے احکام وقتی نہیں ۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانہ میں بھی اس کو نافذ کیا اور آئندہ کے لئے بھی ہدایت چھوڑ گئے کہ اس سے زیادہ مانگا جائے تو نہ دیا جائے ۔ یعنی حاکم وقت مختار نہیں ہے کہ اس میں حالات زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی کر سکے ۔ یہ ہیں ابو بکر صدیقؓ اور یہ ہے ان کا بیان ان کی اپنی کتاب میں ۔

غلط فہمی اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

ایک مرتبہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ سے فرمایا "گھر جاؤ اور احادیث کا تمام ذخیرہ اٹھا لاؤ۔ جب یہ ذخیرہ جمع ہوگیا تو آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے جلا دیا۔"

(دو اسلام صد ۴۳-۴۴)

ازالہ یہ روایت بھی منقطع ہے، متصل نہیں (برق اسلام صد ۹۵) یہ روایت نہ سنداً صحیح ہے اور نہ عقلاً۔ سنداً اس لئے کہ منقطع ہے، عقلاً اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود حدیث کی کتاب لکھوائی جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی۔ امام مالک نے اس کتاب کو خود پڑھا تھا (موطا امام مالک) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کی نقل کرا کر اس پر عمل کرایا تھا (دار قطنی) اس کتاب کا مفصل حال اوپر گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ کے پاس بھی کتابیں تھیں۔ ان کا تذکرہ بھی اوپر گذر چکا ہے۔ یہ کتابیں ان کی اولاد کے پاس باقی رہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی کتاب صادقہ بڑی مشہور و معروف کتاب ہے جو ان کے پڑپوتے پڑھایا کرتے تھے۔ تفصیل کے لئے گزشتہ صفحات ملاحظہ ہوں۔ اگر سب کتابیں جلا دی گئی تھیں تو یہ کتابیں کہاں سے آ گئی تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو اپنی خلافت کے زمانہ میں اپنی کتاب کا مظاہرہ مجمع عام میں فرمایا کرتے تھے اور اس کا مضمون سنایا کرتے تھے (صحیح بخاری) لہذا یہ جلانے کی روایت کسی دشمنِ اسلام کی گھڑی ہوئی ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اور دیگر صحابہ ہی کی یہ کتابیں ہیں جن کو امام بخاری وغیرہ نے اپنی کتابوں میں جمع کر دیا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"وہ صحابہ جن کی دیانت اور سچائی پر کچھ بھروسہ کیا جاسکتا تھا فوت ہو چکے تھے اور بعد میں آ گئے تھے۔ ہم جیسے لوگ، امام حسین کے قاتل، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باغی، کعبہ ڈھا دینے والے، حاکم شرابی، امراء راشی، غنی عیاش، فقیر پست کردار، کیا ایسے ماحول (امیہ کا دور) میں کسی حدیث کا اصلی حالت میں رہنا ممکن تھا؟"

(دو اسلام صد ۴۴-۴۵)

ازالہ برق صاحب کا خیال ہے کہ محدثین یہی لوگ تھے افسوس! نہ محدثین کا ان لوگوں سے کوئی تعلق تھا اور نہ وہ ان کی روایتوں کو قابلِ اعتماد سمجھتے تھے۔ اگر کوئی راوی کسی روایت میں آ بھی گیا تو اس روایت سے بیزاری کا اظہار کیا گیا، اسے منکر کہا گیا۔ پھر برق صاحب نے خلافتِ بنوامیہ کا جو نقشہ کھینچا ہے سرتاپا لغو ہے۔ سنداً بالکل نامعتبر ہے۔ اس کی حیثیت محض سیاسی فریب سے زیادہ نہیں جو بنوامیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے وضع کیا

گیا تھا۔ برق صاحب کچھ تو تحقیق کر لیا ہوتا۔ پھر برق صاحب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ بنوامیہ کا دور صحابہ کے فوت ہو جانے کے بعد شروع ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ بنوامیّہ کا دور صحابہ کے دور میں گذرا (اس سلسلہ میں ہماری کتاب "صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین" ملاحظہ فرمائیں تو مناسب ہوگا)۔

غلط فہمی برق صاحب فرماتے ہیں:۔
"بعض صحابہ سے بھی اخلاقی لغزشیں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ بخاری میں مذکور ہے کہ ایک صحابی روزے کی حالت میں جماع کر بیٹھے تھے"۔
(دو اسلام صہ۴۵)

جواب برق صاحب لغزش اور چیز ہے اور قصداً جھوٹ بولنا اور چیز ہے۔ لغزش ایک ہنگامی چیز ہوتی ہے اور ایسے وقت سرزد ہوتی ہے کہ دل و دماغ ساتھ نہیں دیتا، عقل بے کار ہو جاتی ہے لیکن جھوٹ بولتے وقت کسی ایسی چیز کا غلبہ نہیں ہوتا، پھر لغزش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا کرنے سے کیا نسبت! کسی صحابی پر اس قسم کی تہمت نہیں ہے، نہ ایسا ہوا نہ ایسا ہو سکنا قرینِ قیاس ہے۔ پھر دو ایک صحابیوں کی منفرد لغزش سے تمام صحابہ کیسے ناقابلِ اعتماد ہو گئے۔

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں:۔
"رحلتِ رسولؐ کے بعد بعض مرتد ہو گئے اور بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا"۔ (دو اسلام صہ۴۵)

جواب برق صاحب! یہ صحابہ نہیں تھے بلکہ عہدِ رسالت کے وہ لوگ تھے جنہوں نے فتوحاتِ اسلامی سے خائف ہو کر کلمہ پڑھ لیا تھا اور ابھی ایمان نے قلوب میں جگہ نہیں پکڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور یہ مال کے بندے دوسری طرف جھک گئے۔ ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

غلط فہمی برق صاحب فرماتے ہیں:۔
"حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کی جنگ میں دونوں طرف صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد تھی اور ظاہر ہے کہ دونوں راستی پر نہیں ہو سکتے تھے، ان حالات میں بالکل ممکن ہے کہ کسی صحابی نے عمداً حدیث کے الفاظ بدل دئیے ہوں"۔
(دو اسلام صہ۴۵)

جواب برق صاحب! اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ صحابہ کرام ایسے بددیانت تھے تو پھر اللہ ہی حافظ ہے، نہ اسلام پہلے تھا اور نہ اب ہے، شکایت ہی بے کار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے بھی، اللہ نے کتاب بھی نازل فرمائی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جماعت تیار کی وہ بددیانت تھی۔ یہ جماعت جب اپنے رسولؐ پر افترا پردازی سے نہ چوکتی تھی تو ظاہر ہے کہ دوسرے معاملات میں اور بھی زیادہ بددیانت ہوگی۔ ایسی حالت میں ان لوگوں کی بات بھی کافی وزنی ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ بعض صحابہ نے قرآن میں تحریف کر کے سترہ ہزار آیتوں میں سے صرف ۶۶۶۶ آیتیں باقی رکھیں (اصول کافی مترجم بنام الشافی جلد ۲ کتاب فضل القرآن باب ۱۴ از النوادر ص ۶۳۲ مطبوعہ آفسٹ پریس کراچی) لہذا قرآن ناقابلِ اعتماد ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ صحابہ آپس میں لڑتے تھے، جھوٹ بولتے تھے، آیات اور احادیث گھڑتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مزکی اور معلمِ حکمت بنا کر بھیجے گئے تھے وہ دنیا سے قطعاً ناکام گئے العیاذ باللہ۔

برق صاحب سنیئے! حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علیؓ میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ چند سبائی منافقین کا بلوہ تھا۔ صحابہ ہرگز بلوہ میں شریک نہیں ہوئے بلکہ فوراً بلوہ کو روک دیا گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا جنگ کرنا از سرتا پا لغو ہے۔ سنداً بالکل غیر معتبر ہے۔ مورخین نے بغیر جرح و تعدیل کے اس کو نقل کیا ہے اور ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے پھر صحابہ کا لڑنا قرآن مجید کے بھی خلاف ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:۔ ۲۹)	صحابہ کفار پر سخت ہیں اور آپس میں بڑے رحیم ہیں۔

پھر بددیانتی کا الزام بھی غلط ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا (الفتح:۔ ۲۶)	"اللہ نے ان کے ساتھ پر ہیزگاری کی بات کو لازم کر دیا ہے اور وہ اس کے حقدار ہیں اور اہل بھی"۔

یہ ہیں وہ صحابہ جن سے اللہ تعالےٰ نے راضی ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔ کیا ایسے لوگ بددیانت ہو سکتے ہیں؟

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"دوسو پچاس برس تک یہ حدیثیں کروڑوں زبانوں پر جاری رہیں ہر نیک و بد کے پاس پہنچیں، الفاظ بدلے، مفہوم بدلا، اضافے ہوئے"
(دو اسلام ص ۴۵)

جواب برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ احادیث دوسو پچاس برس بعد لکھی گئیں، حالانکہ یہ قطعاً صحیح نہیں۔ صحابہ کرام کی کتابوں کا حال اوپر گذر چکا ہے، پھر تابعین کے دور میں تو بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کا صحیفہ جو ان کے شاگرد ہمام کے نام سے مشہور ہے چھپ چکا ہے، حضرت امام مالک کی کتاب بھی موجود ہے جو تقریباً سو سال بعد لکھی گئی۔ اس کی اکثر روایتوں میں یہ دو راوی ہیں: نافع اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ بتایئے ان میں سے کون سے راوی نیک ہیں اور کون سے بد؟ موطا میں دوسری مشہور سند یہ ہے۔ امام محمدؒ بن شہاب، سالم بن عبداللہؒ، عبداللہ بن عمرؓ۔ ہے کوئی راوی جس کو ان میں سے بد کہا جائے؟ حضرت عائشہؓ کی سند میں یہ دو راوی ہیں۔ ہشام بن عروہ اور عروہ بن زبیر۔ حضرت انسؓ کی روایت میں صرف امام زہری راوی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی سند میں امام ابوالزناد اور امام اعرج ہیں۔ حضرت عمرؓ کی حدیث کی سند میں امام زہری اور حضرت سعید بن مسیب ہیں۔ غرض یہ کہ اس قسم کی صدہا سندیں ہیں جن میں صحابی اور امام مالک کے درمیان ایک یا دو راوی ہیں اور سب زبردست امام ہیں۔ امام مالک سے یہ کتاب بڑے بڑے ائمہ نے نقل کی اور ان سے امام بخاری نے نقل کر لی۔ بتایئے جھوٹ، تحریف اور غلط بیانی کہاں سے داخل ہوئی؟

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں:۔
"ان مشتبہ، گوش بریدہ اور خود تراشیدہ احادیث کا سیلاب عظیم جب حضرت امام بخاری کے دور میں داخل ہوا تو آپ نے چھ لاکھ احادیث میں سے جو آپ کو یاد تھیں صرف ۲۷۰۵ انتخاب کیں اور باقی تمام کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا"
(دو اسلام ص ۴۵-۴۶)

جواب برق صاحب کی عبارت کا خلاصہ یہ ہوا کہ:۔
۱: امام بخاری نے خود تراشیدہ احادیث میں سے احادیث کا انتخاب کیا؛
۲:۔ امام بخاری سے پہلے حدیث کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ انہوں نے احادیث کو زبانی حاصل کیا تھا۔

یہ دونوں باتیں قطعاً صحیح نہیں، جواب سلسلہ وار ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ امام بخاری فرماتے ہیں :۔

مَا اَدْخَلْتُ فِیْ کِتَابِی الْجَامِعِ اِلَّا مَا صَحَّ وَتَرَکْتُ کَثِیْرًا مِنَ الصِّحَاحِ حَتّٰی لَا یَطُوْلَ الْکِتَابُ
(مقدمہ ابن صلاح وغیرہ)

میں نے اپنی جامع میں کوئی ایسی حدیث نقل نہیں کی جو صحیح نہ ہو اور بہت سی صحیح احادیث کو کتاب کی طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا۔

اس قول سے معلوم ہوا کہ جو احادیث امام بخاریؒ نے چھوڑ دیں ان میں بھی بہت سی حدیثیں صحیح تھیں

امام بخاری فرماتے ہیں :۔

اَحْفَظُ مِائَۃَ اَلْفِ حَدِیْثٍ صَحِیْحٍ
(مقدمہ ابن صلاح)

مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث یاد ہیں ۔

عینی لکھتے ہیں :۔

نُقِلَ عَنِ الْبُخَارِیِّ اَنَّہٗ صَنَّفَ کِتَابًا اَوْرَدَ فِیْہِ مِائَۃَ اَلْفِ حَدِیْثٍ صَحِیْحٍ
(نصرۃ الباری ص۳۵ بحوالہ عمدۃ القاری)

امام بخاری نے ایک کتاب ایسی بھی لکھی تھی جس میں ایک لاکھ صحیح حدیثیں تھیں ۔

غرض یہ کہ امام بخاریؒ نے ایک لاکھ صحیح احادیث یعنی ایک لاکھ صحیح سندوں میں سے کم و بیش صرف سات ہزار صحیح سندیں نقل کیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سندیں غایت درجہ کی صحیح تھیں جو صحیح سندوں میں سے چھانٹ کر لکھی گئیں نہ کہ خود تراشیدہ احادیث میں سے چھانٹ کر لکھی گئیں۔ محدثین کی اصطلاح میں ہر سند کو حدیث کہتے ہیں لہذا ایک لاکھ احادیث سے مراد ایک لاکھ سندیں ہیں نہ کہ ایک لاکھ متن، برق صاحب کی تحریر کے مطابق صحیح بخاری میں ۷۲۷۵ احادیث ہیں یعنی ۷۲۷۵ سندیں ہیں نہ کہ متن۔ متن تو تقریباً اس تعداد کا نصف ہیں۔ ایک ہی حدیث امام بخاریؒ کو متعدد اسناد سے پہنچی۔ ان میں سے جو بہترین سند تھی اس کو انہوں نے اپنی جامع میں نقل کیا۔

امام بخاریؒ کے دور سے پہلے بے شمار کتابیں لکھی جا چکی تھیں

۲۔ الف ۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ " نو سال کی عمر میں عبداللہ بن مبارک اور وکیع وغیرہ کی کتب حدیث میں نے حفظ کر لی تھیں " (نصرۃ الباری ص۱۴ بحوالہ مقدمہ فتح الباری)

ب ۔ امام بخاریؒ کے استاد امام داخلی حدیث پڑھا رہے تھے کہ سند میں ایک راوی کا

نام غلط لے دیا۔ امام بخاریؒ نے شیخ کو متوجہ کیا۔ شیخ نے اپنی کتاب دیکھی اور فرمایا تم نے صحیح کہا۔
(نصرۃ الباری صـ۴۶)

ج ۔ امام بخاری کے استاد اسماعیل بن ابی اویسؒ کی کتاب سے امام بخاریؒ نے چند احادیث کا انتخاب کر لیا تو ان منتخب احادیث کو امام اسماعیل نے لکھ لیا اور اُن پر یہ الفاظ لکھے۔

"یہ وہ حدیثیں ہیں جن کو محمد بن اسماعیل (بخاری) نے میری حدیثوں میں سے منتخب کر لیا ہے۔"
(نصرۃ الباری صـ۴۷)

د ۔ امام بخاری کے استاد شیخ عبداللہ بن یوسف نے امام بخاری سے فرمایا تھا۔

اُنْظُرْ فِیْ کُتُبِیْ وَاخْبِرْ بِمَا فِیْهَا مِنَ السَّقَطِ (نصرۃ الباری صـ۴۸) آپ میری کتابوں کو دیکھئے اور اس میں جو کچھ لغزشیں ہوں ان سے مطلع فرمائیے۔

ﮨ ۔ امام بخاری کے استاد شیخ محمد بن سلامؒ نے بھی فرمایا تھا۔

اُنْظُرْ فِیْ کُتُبِیْ فَمَا وَجَدْتَ فِیْهَا مِنْ خَطَاءٍ فَاضْرِبْ عَلَیْهِ (نصرۃ الباری) میری کتب کو دیکھئے اور جہاں خطا ہو گئی ہو وہاں نشان لگا دیجئے۔

الغرض جب امام بخاری نے ہوش سنبھالا تو بے شمار کتب حدیث تھیں مثلاً صحیفہ ابو ہریرہؓ، المشہور بہ صحیفہ ہمام بن منبہ، صحیفہ صادقہ مولفہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ، صحیفہ معمر، موطا امام مالک، موطا امام محمد، کتاب الآثار، کتاب الخراج، مسند شافعی، کتاب الام، مسند امام احمد، مسند اسحاق بن راہویہ، سنن ابن القطان، کتب وکیع، کتب عبداللہ بن مبارک، مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، کتب علی بن مدینی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں اکثر کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور آج بھی موجود ہیں اور آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں لہٰذا یہ کہنا کہ امام بخاریؒ سے پہلے احادیث مکتوب نہ تھیں قطعاً صحیح نہیں۔

فللہ الحمد

برق صاحب فرماتے ہیں :۔

غلط فہمی | "امام بخاری اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تقریباً اڑھائی سو سال کا طویل زمانہ حائل تھا" (دو اسلام صـ۴۶)

جواب | اس جملہ سے صرف یہی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ ڈھائی سو سال تک احادیث قلمبند نہیں ہوئی تھیں غیر محفوظ تھیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہر دور میں حدیث کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ان بے شمار کتب حدیث، ائمہ حدیث اور اہتمام درس وتدریس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ڈھائی سو سال کا طویل زمانہ پاٹ دیا گیا اور مختلف ائمہ دین اور کتب کے ذریعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام بخاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھے حدیث

نقل کر رہے ہیں۔ جس طرح آج ہم صحیح بخاری پڑھتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا امام بخاری درس دے رہے ہیں محض اس لئے کہ یہ گیارہ بارہ سو سال کا زمانہ صحیح بخاری کے راویوں سے پٹا ہوا ہے اور صحیح بخاری اپنے مصنف تک متواتر ہے۔

غلط فہمی برق صاحب فرماتے ہیں:۔
"چھ لاکھ حدیث، ہر حدیث کے کم از کم چھ چھ راوی یعنی چھتیس لاکھ راوی، جن میں سے تیس بتیس لاکھ لازماً مر چکے ہوں گے، نہ ان کے حالات محفوظ، نہ انہیں کوئی جاننے والا موجود۔ امام بخاری کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس کے تمام راوی سچے تھے"
(دو اسلام ص ۴۶)

جواب برق صاحب! آپ نے غالباً صحیح بخاری کا غور سے مطالعہ نہیں فرمایا، صحیح بخاری کی سند میں کم سے کم تین راوی ہوتے ہیں نہ کہ چھ اور یہ حدیثیں ثلاثیاتِ بخاری کہلاتی ہیں۔ اگر آپ زیادہ سے زیادہ چھ چھ راوی کہتے تو بھی غنیمت تھا۔ اس لئے کہ چند حدیثوں میں چھ چھ راوی ہیں لیکن اکثر سندوں میں چار سے زیادہ راوی نہیں ہیں۔

برق صاحب کو دوسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ ان کے خیال میں ایک راوی سے ایک ہی حدیث منقول ہے لہذا چھ لاکھ حدیثوں میں ۳۶ لاکھ راوی ہو گئے حالانکہ یہ بھی قطعاً غلط ہے۔ ایک راوی سے دس دس، بیس بیس، سو سو بلکہ ہزار ہزار احادیث مروی ہیں۔ لہذا راویوں کی تعداد چند ہزار سے زائد نہیں اور پھر ان میں سے صحیح بخاری کی اسناد کے راوی چند سو سے زائد نہیں لہذا اس قلیل تعداد راویوں کے حالات کا مفصل تذکرہ ملنا اور اس کا محفوظ ہونا کچھ مشکل امر نہیں، پھر اگر بالفرض محال کسی راوی کا حال معلوم نہ ہو تو وہ مجہول الحال ہوگا اس کی روایت صحیح بخاری میں آنے ہی کیوں لگی۔ لہذا صحیح بخاری کی احادیث پر یہ اعتراض کالعدم ہے۔

فللہ الحمد

تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ امام بخاری کو ان راویوں کے حالات کیسے پہنچے جب کہ وہ مر چکے تھے، سنئے! ان کے حالات کا علم اس طرح ہوا جس طرح حدیث کا علم ہوا، جس طرح حدیث ان تک سنداً پہنچی، اسی طرح راوی کے ہم عصر علماء کی جرح و تعدیل بھی سنداً ساتھ ساتھ پہنچی، آخر اس میں اشکال ہی کیا ہے۔ امام بخاری نے اپنے اساتذہ کو خود دیکھا تھا۔ ان استادوں نے اپنے اساتذہ کا حال بیان کیا۔ ان استادوں نے اپنے اساتذہ کا حال بیان کیا اور اس طرح ہر زمانہ کے راویوں کا حال امام بخاری تک سنداً پہنچ گیا، پھر جس طرح حدیث کی

کتابیں امام بخاری سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں۔ جرح و تعدیل کی کتابیں بھی تصنیف ہو چکی تھیں۔ اسماء الرجال کا فن باقاعدہ منضبط ہو چکا تھا اور یہ سب تحریری مواد تھا جو امام بخاری کے سامنے موجود تھا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"علاوہ ازیں ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص بھی تھا کہ وہ کسی کردار پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے عادی نہیں تھے، ہمیشہ حسنِ ظن سے کام لیتے تھے اور مبالغہ آمیز مدح سرائی پر اتر آتے تھے۔ اس وقت ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ میرے سامنے پڑا ہے جس میں ہزارہا بڑے بڑے راویان و حفاظِ حدیث کے حالات مرقوم ہیں۔ میں ایک ہی دور کے چند راوی لے کر ذہبی کی زبانی ان کی کہانی سناتا ہوں، جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ہمارے بزرگوں کا انداز کردار نویسی میں کیا تھا؟"
(دو اسلام صہ ۴۶-۴۷)

ازالہ برق صاحب! آپ کو پھر غلط فہمی ہو گئی، امام ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ، اسماء الرجال کی کتاب نہیں ہے بلکہ بقول آپ کے بڑے بڑے راویان و حفاظِ حدیث کے حالات پر مشتمل ہے، یہ لوگ آئمہ دین تھے، مرجع انام تھے، متقی تھے، حافظ تھے اور ضابط تھے۔ اگر آپ کو جرح دیکھنی ہو تو انہی امام ذہبی کی کتاب 'میزان الاعتدال' ملاحظہ فرمایئے، کتاب آپ وہ دیکھتے ہیں جس میں حفاظ کا حال ہے تو جرح آپ کو وہاں کیسے ملے گی۔ وہ کتاب تذکرۃ الضعفا نہیں کہ وہاں آپ کو جرح مل سکے۔ رہا یہ کہ مبالغہ آمیزی تو یہ سوانح نگار کا قصور نہیں ہے بلکہ انہوں نے ہر واقعہ کو سند کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اب جس کا قول ہے اس کا مبالغہ ہے، پہلے سند کو دیکھئے کہ صحیح ہے یا نہیں، پھر قائل کو دیکھئے کون ہے۔ اگر ہر طرح سے وہ ثابت ہو جائے تو بے شک وہ مدح ممدوح کے حق میں صحیح ہوگی۔ اس میں امام ذہبی کا کوئی قصور نہیں۔ سند پیش کر کے وہ بری الذمہ ہو گئے، پھر انہی حفاظ میں سے اگر کسی پر جرح ہے تو وہ بھی امام ذہبی نے میزان میں نقل کر دی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔ جرح و تعدیل کے لئے وہی کتاب مخصوص ہے اور تاریخی حالات کے لئے تذکرہ۔

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں:۔
"علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب کے متعلق لکھتے ہیں آپ رات دن میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے، اگر سونے، کھانے، ضروری حاجات اور وضو

کیلئے کم از کم آٹھ گھنٹے الگ کر لئے جائیں تو باقی سولہ گھنٹے بچتے ہیں۔ اگر ہر رکعت پر اوسطاً دو منٹ صرف ہوں تو یہ تینتیس گھنٹے اور بیس منٹ بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سولہ گھنٹوں میں تینتیس گھنٹوں کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔"

(دو اسلام ص۴۷)

ازالہ برق صاحب یہ صحیح ہے کہ یہ مبالغہ ہے مگر مغالطہ آپ کو بھی ہوا، وہ یہ کہ اوسطاً ہر رکعت پر ایک منٹ شمار کرتے تو یہ آپ کے حساب سے بھی سولہ سترہ گھنٹے میں ہو سکتا تھا اور پھر یہ ممکن تھا۔ بلاوجہ آپ نے ۲ منٹ فی رکعت حساب میں لگا کر اس کو ناممکن بنا دیا۔

غلط فہمی چند اکابر کے متعلق تذکرۃ الحفاظ سے مدحیہ جملے نقل فرمانے کے بعد برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"دیکھا آپ نے سوانح نویسی کا انداز، یہ سب محدثین ہم عصر تھے، ذہبی ہر ایک کو بے مثال، سب سے بڑا عالم، سردار قرار دے گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زمانہ اور تقریباً ایک ہی ملک کے سب لوگ بے نظیر و بے مثال نہیں ہو سکتے۔"

(دو اسلام ص۹)

ازالہ برق صاحب! آپ کو پھر غلط فہمی ہو گئی۔ امام ذہبی نے یہ کہاں لکھا ہے کہ سب لوگ بے نظیر و بے مثال تھے، ہاں چند محدثین کے متعلق بے نظیر یا بے مثال کے لفظ ضرور استعمال کئے ہیں مگر یہ قصیدہ گوئی امام ذہبی کی نہیں ہے بلکہ وہ دوسرے اماموں کے اقوال نقل کر رہے ہیں۔ کسی امام نے شعبی کو سب سے بڑا عالم کہہ دیا اور کسی نے امام عطاء کو۔ یہ تضاد نہیں ہے حقیقت صرف اتنی ہے کہ امام شعبی اور امام عطاء دونوں بہت بڑے عالم ہیں، کسی کے نزدیک کوئی زیادہ ہے، کسی کے نزدیک کوئی زیادہ ہے۔ ہر ایک کا اپنا اندازہ ہے، اگر ایک ہی شخص کے یہ جملے ہوتے تو تضاد کا شبہ ہو سکتا تھا حالانکہ ہونا اس وقت بھی نہیں چاہئے تھا۔ اس لئے کہ جب دو عالم برابر درجے کے ہوں تو پھر کسی ایک کے متعلق زیادہ بڑا ہونے کا فیصلہ مشکل ہوتا ہے اور ایسی ہی حالت میں دونوں کو سب سے بڑا عالم کہہ دیا جاتا ہے۔

فللہ الحمد

اچھا برق صاحب قرآن مجید کی ایک آیت سنئے۔

ارشاد باری ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا — کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ

تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی (المائدہ ۵: ۸) نہ کرے کہ تم ناانصافی کرو۔ بلکہ انصاف ہی کرو۔ یہی تقوے کے زیادہ قریب ہے۔

برق صاحب کیا اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناانصافی بھی تقویٰ کے قریب ہے لیکن انصاف زیادہ قریب ہے ہرگز نہیں تو پھر اقرب کا صیغہ جو استعمال ہوا اس کی کیا تاویل ہو گی۔ اقرب تفضیل بعض یا تفضیل کُل کا صیغہ ہے لیکن یہاں تفضیل کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اسی طرح کسی عالم کے متعلق اَعلم کا لفظ تفضیل کل کا مفہوم ادا نہیں کرتا بلکہ اس سے اس کے علم کی عظمت مراد ہوتی ہے۔ کاش ان معنوں میں اگر آپ ان مدح سرائیوں کا مطالعہ فرماتے تب بھی کوئی غلط فہمی نہ ہوتی۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

امام مالک نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ حدیث لکھی، نو سو اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر درس دینا شروع کر دیا۔ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ایک دن حدیث پڑھا رہے تھے کہ بچھو کپڑوں میں گھس گیا۔ اس نے سولہ مرتبہ امام صاحب کو کاٹا لیکن امام صاحب نے درس ختم کر کے ہی اس کی طرف توجہ دی ...؟

اتنا لکھنے کے بعد برق صاحب فرماتے ہیں:۔

"نو سو اساتذہ سے پڑھا بھی اور پھر سترہ برس میں فارغ التحصیل بھی ہو گئے، کوئی پوچھے کہ اس زمانہ میں نو سو اساتذہ عرب میں جمع کہاں سے ہو گئے تھے؟ اگر بالفرض ہو ہی گئے تھے تو یہ نہ بتایا کہ امام مالک ہر استاد کے پاس کتنا عرصہ رہے تھے، اگر ایک استاد کے پاس صرف ایک مہینہ بھی بسر کیا تھا تو بھی ان کا زمانہ تعلیم پچھتر برس بنتا ہے۔" (دو اسلام ص۵۰)

ازالہ برق صاحب کو پھر غلط فہمی ہوئی۔ آپ اس خیال میں ہیں کہ ہر استاد کے پاس جانے کے لئے علیحدہ زمانہ مقرر تھا حالانکہ ایسا نہیں، ایک ہی مہینہ میں مختلف استادوں کے پاس حاضری دی جا سکتی تھی۔ بلکہ ایک ہی دن کے مختلف اوقات میں مختلف استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا جا سکتا تھا پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر استاد کے پاس کم از کم ایک مہینہ ہی صرف ہوا، ہو سکتا ہے کہ بعض کے پاس صرف ایک دن یا صرف ایک گھنٹہ ہی صرف ہوا ہو بلکہ اگر کسی استاد سے صرف ایک ہی حدیث سنی ہوئی تو صرف چند منٹ ہی صرف

ہو نے ہوں گے۔ پھر نو سو اساتذہ کا ایک جگہ جمع ہونا ضروری نہیں، ایک ہی شہر میں متعدد استاد ہوتے تھے اور ان کے پاس سفر کر کے جانا کوئی مشکل نہ تھا، پھر نو سو اساتذہ کا ایک جگہ جمع ہونا بھی ناممکن نہیں مثلاً حج کے موقعہ پر ہزارہا شیوخ جمع ہوتے تھے اور اگر اس وقت ان کی صحبت سے کوئی شخص فیضیاب ہو جائے اور کئی سال ایسا ہوتا رہے تو اس کے استادوں کی تعداد کا ہزاروں تک پہنچ جانا کیا مشکل ہے۔

برق صاحب پھر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی | بچھو کاٹنے کا گھوڑ بھی قابل داد ہے (دو اسلام صفحہ ۱۵)

ازالہ | امام مالک رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ حدیث نبوی کا جو احترام ان کے قلب میں جاگزیں تھا یہ واقعہ اس احترام کی زندہ مثال ہے۔ مبالغہ کے علاوہ اس میں قابل اعتراض کوئی بات نہیں۔

غلط فہمی | تو یہ تھے وہ سوانح نگار جن کی تحریرات کو ہم وحی سمجھ کر بعض راویوں کو سچا اور بعض کو جھوٹا قرار دیتے تھے اور پھر ان سچے راویوں کی احادیث ایک کتاب میں جمع کر کے ان کا نام رکھ دیتے تھے "صحیح بخاری صحیح مسلم"۔ (دو اسلام صفحہ ۱۵)

ازالہ | برق صاحب کو پھر غلط فہمی ہوئی سوانح نگاروں کی یہ مبالغہ آمیز تعریفیں محدثین کے فن جرح و تعدیل پر اثر انداز نہ ہوئیں۔ کسی شخص کا صادق، عابد، متقی، عالم ہونا اور بات ہے اور ثقہ ہونا اور بات ہے۔ اگر یہ تمام محاسن بھی ایک شخص میں جمع ہو جائیں، تب بھی ضروری نہیں کہ وہ شخص ثقہ ہو اور اگر ثقہ ہو بھی جائے تب بھی لازمی نہیں کہ اس کی روایت کردہ تمام احادیث صحیح ہوں غلطی کا امکان موجود ہے، غلطی پر گرفت کرنا یہ ایک مستقل فن ہے جس کی بنیاد پر احادیث کو صحیح یا ضعیف کہا جاتا ہے کسی شخص کا امام وقت ہونا محدثین کو مرعوب نہیں کرتا۔ بہت سے اہل زہد اور اہل خیر حضرات کی غلط بیانی پر محدثین نے گرفت کی غرض یہ کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر پکڑ کی گئی اور اس طرح احادیث کی تنقیح عمل میں آئی۔

برق صاحب فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی | حضرت عبد اللہ بن یسار فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت علیؓ نے تمام

صحابہ کو جمع کر کے حکم دیا کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد ہر شخص پہلا کام یہ کرے کہ اپنے ذخیرہ احادیث کو جلا ڈالے (دو اسلام صـ۵۱)

ازالہ برق صاحب نے اس اثر کا مطلب نہیں سمجھا۔ عربی عبارت میں اصل الفاظ "احادیث علماء ہم" یعنی علماء کی باتیں ہیں یعنی حضرت علیؓ نے علماء کے فتوے اور اقوال کو جلانے کا حکم دیا نہ کہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ احادیث علماء کو احادیث رسول آپ نے کیسے سمجھ لیا۔

۲:۔ دوم یہ کہ حضرت علیؓ تو خود احادیث لکھتے تھے، ان کے صحیفہ کا ذکر صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر گزر چکا ہے لہذا عقلاً یہ روایت باطل ہے۔

۳:۔ قطع نظر اصل مفہوم کے یہ روایت بالکل جھوٹ اور سرتا پا کذب ہے، اس کی سند میں جابر جعفی کذاب ہے۔

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں:۔
"ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ابی بن کعبؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو روایت احادیث کی بنا پر پیٹنے پر تل گئے اور اس جرم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابو درداؓ جیسے عظیم المرتبت اصحاب کو قید کر دیا تھا۔" (دو اسلام صـ۵۱)

ازالہ حضرت ابی ابن کعبؓ والے واقعہ کے راوی ابن عیینہ ہیں۔ انہوں نے صحابہ کرامؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ (تذکرۃ الحفاظ) لہذا یہ روایت منقطع اور ناقابل اعتبار ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ وغیرہ کی روایت کے متعلق علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:۔

هُوَ فِي نَفْسِهِ ظَاهِرُ الْكِذْبِ	اس کا جھوٹ ہونا بالکل ظاہر ہے
(کتاب الاحکام فی اصول الاحکام)	

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
(عبداللہ بن مسعودؓ) کہا کرتے تھے "جب تمہیں حصول علم کی ضرورت پیش آئے تو قرآن پڑھو، اس لئے کہ اس میں اوّلین و آخرین کا علم موجود ہے۔" (دو اسلام صـ۵۲)

ازالہ برق صاحب اگر آپ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ابن مسعودؓ حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے تو یہ قطعاً صحیح نہیں، وہ تو فرمایا کرتے تھے:۔

لَوْ تَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ لَضَلَلْتُمْ	اگر تم اپنے نبیؐ کی سنت چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔
(صحیح مسلم)	

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں :-

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَّمَنَا سُنَنَ الْھُدٰی (صحیح مسلم)	بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سننِ ہدیٰ کی تعلیم دی ۔

بلکہ ابن مسعودؓ تو یہاں تک عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام سنتیں من جانب اللہ ہیں، وہ فرماتے ہیں :-

اِنَّ اللّٰہَ شَرَعَ لِنَبِیِّکُمْ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُنَنَ الْھُدٰی (صحیح مسلم باب صلوۃ الجماعۃ)	بے شک اللہ تعالےٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سننِ ہدیٰ مقرر فرمائی تھیں،

بلکہ ابن مسعودؓ کا تو یہ عالم تھا کہ وہ حدیث کو کتاب اللہ سمجھتے تھے۔ امّ یعقوب، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئیں اور کہا :-

بَلَغَنِیْ عَنْکَ اَنَّکَ لَعَنْتَ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَیِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰہِ	مجھے خبر ملی ہے کہ تم گودنے والی، گدوانے والی چہرہ پر سے بال اکھیڑنے والی، خوبصورتی کے لئے دانتوں پر سوہن کرنے والی، اللہ تعالےٰ کی پیدائش میں تغیر کرنے والی عورت پر لعنت کرتے ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا :-

وَمَا لِیْ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ ۔	میں کیوں نہ اس پر لعنت کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو اور وہ کتاب اللہ میں بھی موجود ہو۔

اس عورت نے کہا :-

لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَیْنَ لَوْحَیِ الْمُصْحَفِ فَمَا وَجَدْتُّہٗ	میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مگر اس میں یہ چیز مجھے نہیں ملی ۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا :-

لَئِنْ کُنْتِ قَرَأْتِیْہِ لَقَدْ وَجَدْتِّیْہِ قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا	اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو تمہیں یہ بات مل جاتی ۔ اللہ عزّ وجل فرماتا ہے "جو حکم رسول دے، اس پر عمل کرو اور جس کام سے منع کرے اس سے باز رہو" ۔

اس عورت نے کہا تمہاری بیوی میں بھی یہ بات موجود ہے ۔ انہوں نے کہا جاؤ اور دیکھو، وہ گئیں لیکن ان کو ان کی بیوی میں اس قسم کی کوئی بات نظر نہیں آئی ۔ پھر واپس آئیں اور

کہا مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ابن مسعودؓ نے کہا:۔

اَمَا لَوْ كَانَ ذٰلِكَ لَمْ نُجَامِعْهَا (صحیح بخاری، صحیح مسلم باب تحریم فعل الواصلۃ) — اگر ایسا ہوتا تو ہم اس کو اپنے ساتھ کیسے رکھ سکتے تھے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ابن مسعودؓ تو ہر حدیث کو کتاب اللہ سمجھتے تھے اور اس پر سختی سے عمل کرتے اور عمل کراتے تھے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "ایک شخص نے ابی بن کعبؓ سے کہا مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ فرمایا کتاب اللہ کو ہاتھ میں لو اور صرف اسی کے فیصلوں پر عمل کرو"۔ (دو اسلام صد ۵۳)

ازالہ اوّلاً حضرت ابی بن کعبؓ کا مطلب وہ نہیں جو برق صاحب سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید تو خود اتباعِ رسولؐ، اسوۂ رسولؐ اور اطاعتِ رسولؐ کی طرف دعوت دیتا ہے، بلکہ یہاں تک فرماتا ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ (النساء:۔ ۶۵) — آپ کے رب کی قسم لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک آپ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں۔

لہٰذا صرف کتاب اللہ کو پکڑ لینے کے یہ معنی ہوئے کہ جو کچھ کتاب اللہ میں ہے اس پر عمل کیا جائے اور کتاب اللہ میں فیصلۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ماننے کا حکم موجود ہے لہٰذا بنیادی طور پر کتاب اللہ کافی ہے اور اس کی رو سے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع لازمی ہے۔

ثانیاً:۔ ابی بن کعبؓ کی اصل عبارت میں لفظ "صرف" نہیں ہے۔

ثالثاً:۔ کتاب اللہ سے مراد صرف قرآن مجید ہی نہیں ہوتا بلکہ قرآن مجید اور حدیث دونوں ہوتے ہیں اور یہ گذشتہ اوراق میں ثابت کیا جا چکا ہے اور حضرت ابن مسعود کی حدیث مذکورہ بالا بھی اس پر شاہد ہے، لہٰذا حضرت ابی بن کعبؓ کے الفاظ سے حجیتِ حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ وہ احادیث کو حجت سمجھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "حضرت عبداللہ بن عباس سینکڑوں احادیث کے راوی ہیں لیکن علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ رحلتِ رسولؐ کے وقت آپ کی عمر صرف ۱۳ برس کی تھی، تیرہ برس کا بچہ بے حد غیر ذمہ دار ہوتا ہے، اسے کیا خبر کہ نبیؑ دنیا میں کیوں آتا ہے، اس کے اقوال کو کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اگر ان اقوال میں ردّ و بدل

کردیا جائے تو کیا قبائح پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح کے غیر ذمہ دار بچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اسناد کی کوئی کڑی قائم نہ کرنا اور خود انہیں عاقل، بالغ اور ثقہ سمجھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ روایت کے قابل قرار دینا درست نہیں۔"
(دو اسلام صد ۵۳)

ازالہ برق صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ نبی دنیا میں ایک عظیم الشان مقصد کے لئے آتا ہے۔ اس کے اقوال کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اگر ان اقوال میں ردو بدل کر دیا جائے تو بڑے بڑے قبائح پیدا ہوتے ہیں۔ برق صاحب جب بات یہ ہے تو نبی کے اقوال لازماً دین ہونے چاہئیں ورنہ اہمیت ختم ہو جائے گی اور ردّ و بدل سے قبائح پیدا نہیں ہوں گے۔

برق صاحب تیرہ سال کا بچہ اس زمانہ میں جب کہ حافظہ کا قحط ہے چھ چھ، سات سات مضامین میں میٹرک کا امتحان پاس کر سکتا ہے۔ ریاضی، سائنس وغیرہ کے بڑے بڑے دقیق مسئلے اور مشکل سوالات حل کر سکتا ہے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں پڑھ کر امتحان دے سکتا ہے بلکہ چھ سات سال کی عمر میں پورا قرآن حفظ کر سکتا ہے تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحبت یافتہ تیرہ سال کا بچہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو حفظ کر سکے۔ یہ بتا سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح وضو کرتے تھے، کس طرح نماز پڑھتے تھے، کس طرح دوسرے کام کرتے تھے، یہ تو بہت آسان بات ہے، اس پر تعجب کیوں ہے، یہ تو وہ بچہ ہے جس کی قدر و منزلت کے فاروق اعظمؓ معترف تھے، مشیرِ خاص کی حیثیت سے ارکانِ شوریٰ میں جگہ دیتے تھے۔ لوگوں نے اعتراض بھی کیا تو حضرت عمرؓ نے عملاً اس بچہ کی علمی قابلیت کو ان پر ثابت کر دیا۔ تمام لوگوں کا امتحان لیا لیکن کوئی صحابی صحیح جواب نہ دے سکا، صحیح جواب دیا تو صرف تیرہ سالہ بچہ نے، جہاں ان بزرگوں کی سمجھ کی رسائی نہ ہو سکی۔ وہاں اس بچہ کے فہم کی رسائی ہوئی اور وہ معترض بھی معترف ہو گئے۔ ملاحظہ فرمائیے، صحیح بخاری تفسیر اذا جاء نصر اللہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے تحصیلِ علم میں کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زیادتیٔ علم کے لئے دعا کی۔ وہ صحابہ کے گھر خود جاتے اور احادیث ان سے حاصل کرتے تھے اور پھر ان ہی سے روایت کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی روایت میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

فللہ الحمد

برق صاحب تحریر کرتے ہیں:-

غلط فہمی "ایک مرتبہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت معاویہ کے دربار میں گئے۔ امیر نے احادیث کی فرمائش کی۔ آپ نے چند احادیث سنائیں اور منشی دربار کے ساتھ لکھتا گیا۔ آپ نے وہ کاغذ لے کر چیر ڈالا اور فرمایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا۔" (دو اسلام ص۵۳)

ازالہ اس روایت کو مطلب بن عبد اللہ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کیا ہے، مطلب کا حضرت زیدؓ سے سماع ثابت نہیں (المراسیل لابن ابی حاتم) لہٰذا یہ روایت منقطع ہے اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

غلط فہمی اسود بن ہلال کہتے ہیں کہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک بیاض یا کتاب لے کر گیا۔ جس میں کچھ احادیث درج تھیں، آپ نے پانی منگوا کر پہلے اس کتاب کو دھویا اور پھر جلا دیا (دو اسلام ص۵۴)

ازالہ احادیث سے مراد یہاں کہانیاں یا علماء کے اقوال ہیں کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ اسی روایت میں آگے فرماتے ہیں کہ اہل کتاب اسی لئے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ مزید برآں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ احادیث رسول اللہ کو بھی کتاب اللہ کہتے تھے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ثابت کیا جا چکا ہے لہٰذا اس روایت میں احادیث سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نہیں ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر کرتے ہیں:۔

"ضحاک بن مزاحم فرمایا کرتے تھے وہ زمانہ جلد آ رہا ہے، جب احادیث کی کثرت ہو جائے گی۔ لوگ کتاب الٰہی کو ترک کر دیں گے۔ مکڑیاں اس پر جالے تنیں گی۔" (دو اسلام ص۵۴)

ازالہ برق صاحب آج تک تو ایسا ہوا نہیں، سنئے یہ روایت سر تا پا جھوٹ ہے، بہتان عظیم ہے، اس کی سند میں سیف بن ہارون برجمی ضعیف، متروک الروایات ہے۔ امام ابن حبان کہتے ہیں۔ یہ جھوٹی روایتیں نقل کرتا ہے۔ دوسرا راوی احمد بن ہارون کذاب ہے (برق اسلام ص۹۲)

غلط فہمی برق صاحب نے ص۵۵ پر ابن مسعودؓ کا وہ واقعہ دوبارہ نقل فرمایا ہے جس میں ہے کہ انہوں نے احادیث کو دھو ڈالا تھا۔

ازالہ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے مزید برآں یہ روایت مشکوک ہے۔ اس کی سند میں دو راوی مدلس ہیں اور وہ عن سے روایت کرتے ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔
"جریر بن عبدالحمید کہتے ہیں کہ منصور، مغیرہ اور الاعمش جیسے محدثین کتابتِ حدیث کو گناہ سمجھتے تھے۔" (ص۵۵)

ازالہ یہ روایت بھی بالکل جھوٹی ہے اس کی سند میں عمر بن محمد جمحی مجہول ہے کسی کتاب میں اس کا ترجمہ نہیں ہے (برق اسلام ص۱۰۱)

غلط فہمی "قرظہ بن کعب کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم عراق کو روانہ ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ مقام صرار تک ہمارے ساتھ آئے۔ وہاں نماز ادا کی پھر فرمایا دیکھو میں ایک نہایت اہم بات کہنے کے لئے تمہارے ہمراہ یہاں آیا ہوں اور وہ یہ کہ عراق کی سرزمین سے تلاوتِ قرآن کی سُریلی آوازیں یوں اُٹھ رہی ہے جیسے چھتّے کے اردگرد شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ خدا کے لئے انہیں احادیث میں پھنسا کر قرآن سے دُور نہ پھینکنا" (دو اسلام ص۵۶)

ازالہ یہ روایت ضعیف ہے اس کی سند منقطع ہے۔ شعبی نے اس کو قرظہ سے روایت کیا ہے اور ان دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی (برق اسلام ص۳۶)

۲ :۔ عقلاً بھی یہ محال ہے اس لئے کہ عراقی برائے نام مسلم تھے، نہ انہیں قرآن مجید سے محبت تھی نہ حدیث سے۔ وہ تو فتنہ پرور اور دین کے دشمن تھے۔ (ملاحظہ ہو کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔
"رحلتِ حضورؐ سے صرف تین برس پہلے حضرت ابوہریرہؓ مشرف باسلام ہوئے تھے لیکن روایاتِ احادیث میں سب سے بازی لے گئے۔"
(دو اسلام ص۵۶)

ازالہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس کا جواب انہوں نے خود دے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "مہاجرین و انصار اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور میں ہمہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا لہٰذا جو کچھ وہ نہ سن سکے، میں نے سُن لیا" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق برق صاحب لکھتے ہیں :۔

غلط فہمی ایک مرتبہ پٹے بھی لیکن روایت سے باز نہ آئے، واقعہ یوں ہے کہ آپ رسول اکرم صلعم کے ہاں تشریف لے گئے، حضورؐ نے فرمایا کہ ابوہریرہؓ جا اور ہر اس شخص کو جنت کی بشارت دے دے جس نے زبان سے لا الٰہ کہہ دیا ہو۔ ابوہریرہ باہر نکلے تو سب سے پہلے حضرت عمر بن الخطاب سے ملاقات ہوئی اور یہ بشارت سنائی۔ عمرؓ نے ابوہریرہ کو ایک زور کا تھپڑ رسید کیا۔ ابوہریرہ روتے ہوئے دربارِ رسالت میں پہنچے۔ پیچھے پیچھے عمرؓ بھی پہنچ گئے۔ حضور نے پوچھا اسے کیوں پیٹا ہے، کہا کیا آپ نے صرف لا الٰہ کہنے پر جنت کی بشارت دی ہے۔ فرمایا ہاں۔ عمرؓ نے کہا ازراہ نوازش ایسا نہ کیجئے ورنہ تمام لوگ اعمال ترک کر دیں گے فخلھم یعملون (آپ لوگوں کو کام کرنے دیں) حضورؐ نے فرمایا تو بہت اچھا، لوگوں کو کہہ دو کہ کام کریں (دو اسلام ص۵۶-۵۷)

ازالہ برق صاحب اصل واقعہ تو اس طرح نہیں، جس طرح آپ نے نقل فرمایا ہے۔ آپ نے صحیح مسلم کا حوالہ دیا ہے اور اسی سے میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ سے فرمایا :-

مَنْ يَّشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ	جو شخص اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم و معبود نہیں اور اس پر اسے دلی یقین ہو تو اس کو جنت کی بشارت دے دو۔
(صحیح مسلم)	

یعنی صرف زبان سے کہنا کافی نہیں بلکہ دلی یقین ہونا بھی شرط ہے برق صاحب اس حدیث کا یہ ٹکڑا بالکل قرآن مجید کے مطابق ہے، قرآن مجید میں ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝	جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اسی پر جمے رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں نہ ڈرو، نہ غم کرو اور تم کو خوشخبری ہو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔
(حٰمٓ السجدة :- ۳۰)	

لہٰذا برق صاحب کا یہ فرمانا کہ "کتنی دلچسپ حدیث ہے صرف دو لفظ لا الٰہ منہ سے نکالو اور جنت لے لو، نہ صوم و صلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جنگ میں لہو بہانے کی حاجت" (دو اسلام ص۵۷) دراصل قرآن مجید پر اعتراض ہے کیونکہ قرآن مجید میں بھی یہی ہے کہ صرف دو لفظ

"رَبُّنَا اللہ" منہ سے نکالو اور جنت لے لو۔ آیت میں جو کلمہ ثُمَّ اسْتَقَامُوا ہے وہ بالکل حدیث کے الفاظ "مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ" کے قائم مقام ہے یعنی دل میں یہ چیز بیٹھ گئی کہ اللہ ہی الٰہ ہے دوسرا کوئی الٰہ نہیں تو پھر جنت مل گئی۔ استقامت اور ایمانِ قلبی یہی وہ چیزیں ہیں جو خود اعمال کی طرف دعوت دیتی ہیں اور ان ہی چیزوں کی موجودگی میں عمل کا موجود ہونا لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا نہ حدیث میں عمل کی نفی ہے نہ آیت میں۔ ہاں غلط فہمی ہو سکتی ہے۔

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو اس خوشخبری کا اعلان کرنے کے لئے روانہ کیا۔ حضرت ابوہریرہ روانہ ہوئے تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے وہ بشارت سنائی۔ حضرت عمرؓ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا، جس سے وہ گر پڑے پھر فرمایا، اے ابوہریرہ واپس چلو۔

برق صاحب نے ان الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ پٹ گئے حالانکہ سینہ پر ہاتھ مارنے کی غرض مارنا نہیں تھا بلکہ واپس چلنے کے لئے تنبیہہ تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس قوت کو برداشت نہ کر سکے کیونکہ اکثر اوقات بھوکا رہنے کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ انہوں نے فاقہ کشی اور اس کی وجہ سے اکثر اوقات خود بخود گر جانے کو خود ہی بیان کیا ہے (کتب حدیث) حضرت عمرؓ کی نیت ان کو گرانے یا زدوکوب کرنے کی نہ تھی اور اسی وجہ سے دربارِ رسالت میں اس بات پر جواب طلب نہ ہوا نہ قصاص لیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن مجید میں مذکور ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک تھپڑ مار کر ایک قبطی کو قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی نیت قتل کرنے کی نہ تھی لیکن یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تھپڑ کی تاب نہ لا سکا اور مر گیا اور اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ حضرت عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ کو احادیث کی روایت پر مارا کرتے تھے تو یہ قصور حضرت عمرؓ کا ہو سکتا ہے نہ کہ حضرت ابوہریرہؓ کا۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے اس حدیث کی روایت پر مارا جو حقیقتاً صحیح تھی اور صحیح بات پر مارنا، مارنے والے کا قصور ہوتا ہے نہ کہ بیان کرنے والے کا، لیکن برق صاحب اس کو حضرت ابوہریرہ کے قصور کے اثبات میں نقل فرما رہے ہیں اور یہی غلط فہمی ہے۔

الغرض حضرت ابوہریرہؓ واپس ہوئے اور حضرت عمرؓ کی شکایت کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، اے عمرؓ! تم نے انہیں کیوں مارا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ، کیا آپ نے بشارت کا اعلان کرنے کے لئے ابوہریرہؓ کو بھیجا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا، ایسا نہ کیجئے مجھے ڈر

ہے کہ کہیں لوگ اس پر بھروسہ نہ کرلیں۔ آپ انہیں چھوڑ دیجئے تاکہ عمل کرتے رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا انہیں چھوڑ دو (صحیح مسلم)

یہ حدیث حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ دونوں نے سُنی لیکن ان میں سے کسی نے نہ نماز چھوڑی نہ جہاد، اس لئے کہ وہ اس حدیث کی صداقت کے ساتھ اس کی منشاء سے بھی واقف تھے بلکہ اسی مضمون کی حدیث متعدد صحابہ سے مروی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ تارک الصلوٰۃ تھا اور نہ تارک الجہاد۔ ان کو اس حدیث نے غلط فہمی میں مبتلا نہ کیا تھا بلکہ وہ اس کی رمز سے واقف تھے۔ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی اور وہی غلط فہمی ہوئی جس کا اندیشہ حضرت عمرؓ کو ہوا تھا حضرت عمرؓ نے اس غلط فہمی کو دُور کرنے کی سعی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مشورہ کو قبول فرما کر اصل غلط فہمی کے انسداد کے لئے اشاعتِ عام سے روک دیا تاکہ نااہل اور نافہم لوگ گمراہ نہ ہو جائیں۔

غلط فہمی اس حدیث پر مزید اعتراض کرتے ہوئے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔ "مذہب کے معاملہ میں حضرت فاروق سرورِ کائنات کی راہنمائی فرما رہے ہیں۔" (دو اسلام ص۵۷)

ازالہ برق صاحب ہر کام کی ایک مصلحت ہوا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو۔ اس حدیث کی اشاعت اور پھر اس کی روک تھام میں کیا مصلحت تھی۔ اللہ ہی جانتا ہے۔ مشورہ آپ نے اس لئے قبول فرمایا کہ اس کی مصلحت کو آپ بھی جانتے تھے۔ مشورہ کو قبول کرنے سے ایک چھوڑ، دو دینی سنتوں کا قائم کرنا مقصود تھا۔

۱:۔ اگر کسی خبر کی اشاعت سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا اور اس کی وجہ سے گمراہ ہونے کا خوف ہو تو اس خبر کی اشاعت خلاف سنت ہو گی۔

۲:۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی کم درجہ کا آدمی بھی کوئی شخص صحیح مشورہ دے تو اس کے مشورہ کو قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرنا چاہیئے اور اگر ایسے موقع پر کوئی شخص صحیح مشورہ قبول نہ کرے تو وہ سنت کا مخالف ہو گا بلکہ اس کا یہ فعل تکبّر اور ہٹ دھرمی کی تعریف میں آئے گا۔

غرض یہ کہ کم از کم دو سبق تو ہمیں اس حدیث سے ملتے ہیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حدیث کو بیان ہی نہ کرتے تو نہ یہ حدیث علماء راسخین کو ملتی نہ یہ اسباق حاصل ہوتے۔

اب رہا یہ اعتراض کہ حضرت عمرؓ جس نتیجہ پر پہنچے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔ یہ بھی صحیح نہیں، ہم یہ نہیں کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کو نہ جانتے

تھے لیکن مشورہ کی سنت کو قائم کرنا بھی ضروری تھا اور یہ معاملہ اسی طرح مقدر تھا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اس کی مثال قرآن مجید سے سنیئے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں کیا ہے لیکن پھر بھی پوچھتا ہے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ۔ اے موسیٰ! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

(طٰهٰ:۱۷)

یہاں موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کہلوانا مقصود تھا اس سے اللہ تعالیٰ کی لاعلمی ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اس میں کوئی مصلحت ضرور تھی جس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے ہمیں اختیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں دخل دیں اور اس کی مصلحتوں کی بے ضرورت چھان بین کریں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید کی مزید چند آیات درج ذیل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے اس قصہ میں ہے کہ حضرت خضر نے ایک معصوم بچے کو قتل کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بطور اعتراض فرمایا:۔

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا۔	یہ آپ نے کیا کیا کہ ایک معصوم لڑکے کو بغیر کسی قصاص کے قتل کر دیا۔ یہ تو آپ نے بہت ہی برا کیا
(الکھف:۷۴)	

انہوں نے اس اعتراض کا جو کچھ جواب دیا اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں سنیئے۔

وَاَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ اَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا۔	اور اس لڑکے کو اس لئے قتل کیا گیا کہ اس کے ماں باپ مؤمن تھے۔ پس ہم ڈرے کہ وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا نہ کر دے۔
(الکھف:۸۰)	

دنیا میں سینکڑوں ماں باپ اپنے بچوں کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ ان کی خاطر ان کی اولاد کو قتل نہیں کراتا۔ پھر اس بچہ کو کیوں قتل کرایا؟ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالےٰ کی مصلحت اللہ تعالےٰ ہی جانتا ہے۔ ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی۔ حدیث زیر بحث کی اشاعت کو حضرت عمرؓ کے مشورہ سے روکنا منظور تھا اور لڑکے کو پیدا کر کے ہی قتل کرانا مقدر تھا۔ مصلحت وہ جانے ہم تو یہ کہتے ہیں "اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا"

مندرجہ بالا آیات تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور ہمارے ظاہری اعتراض کی وضاحت کیلئے پیش کی تھیں۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ مشورہ قبول فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰهٰ، ۲۴) — اے موسیٰ فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکشی میں مبتلا ہے

موسیٰ علیہ السلام مشورہ دیتے ہیں۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ (طٰهٰ ۲۹ تا ۳۲) — اے اللہ میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اور مجھے اس کے ذریعہ قوت عطا فرما اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے۔

بلکہ موسیٰ علیہ السلام یہاں تک کہہ گئے۔

وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ (الشعراء، ۱۳) — میرا سینہ تنگ ہوتا ہے میری زبان بھی رکتی ہے اس لئے ہارون کو بھی منصب رسالت دے دے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (طٰهٰ) — اے موسیٰ تمہاری دعا قبول کی گئی۔

ان آیات کو پڑھنے کے بعد کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہیں تھا کہ یہ کام تنہا موسیٰ علیہ السلام کے بس کا نہیں۔ اس میں ہارون علیہ السلام کی وزارت اور رسالت کی بھی ضرورت ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے توجہ دلائی اور مشورہ دیا تو اللہ تعالیٰ کو بھی خیال آیا کہ ہاں ٹھیک ہے ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ یقیناً ہم ایسا نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت کو اللہ ہی جانتا ہے کہ ہارون علیہ السلام کو رسول بنانا، موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ پر کیوں موقوف تھا اور حدیث زیر بحث کی اشاعت کو حضرت عمرؓ کے مشورہ سے روکنا کیوں ضروری تھا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے صحیح مشورہ کو قبول فرما لیتا ہے تو نبی پر کیا اعتراض ہے اگر وہ اپنے ایک امتی کے مشورے کو قبول فرما لے۔ لاعلمی کا اعتراض نہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے نہ اس کے رسولؐ پر۔

خلاصہ حدیث زیر بحث پیش کر کے برق صاحب کا نتیجہ نکالنا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو حدیث بیان کرنے پر مارا تھا کسی طرح صحیح نہیں، نہ یہ صحیح ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عمرؓ کے خوف سے حدیث بیان نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حضرت عمرؓ تو خود حدیث کے متلاشی رہتے تھے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ حضرت عمرؓ کی موجودگی میں، بقول

برق صاحب "اکڑ کر اور چھاتی تان کر" (دو اسلام ص۵۲) احادیث بیان کرتے تھے، سنیئے:۔

أُتِيَ عُمَرُ بِامْرَأَةٍ تَشِمُ فَقَالَ أُنْشِدُكُمْ بِاللّٰهِ هَلْ سَمِعَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ فَقُمْتُ فَقُلْتُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَنَا سَمِعْتُهُ قَالَ فَمَا سَمِعْتَهُ قُلْتُ سَمِعْتُهُ يَقُولُ لَا تَشِمْنَ وَلَا تَسْتَوْشِمْنَ ٥

(نسائی۔ کتاب الزینۃ جلد دوم ص۲۳۵، وروا تہ ثقات، تقریب)

حضرت عمرؓ کے پاس ایک عورت لائی گئی جو بدن گودتی تھی ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا تم میں کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں کچھ سنا ہے ۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں میں کھڑا ہوگیا اور میں نے کہا، اے امیرالمومنین ! میں نے سنا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے کیا سنا ہے ؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا۔ آپؐ کو یہ فرماتے سنا ہے نہ گودا جائے نہ گدوایا جائے ۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ اس قسم کی احادیث تراشا کرتے تھے بلکہ یہ ہے کہ یار لوگ گھڑ کر ان کے نام جڑ دیتے تھے (دو اسلام ص۵۷-۵۸)

ازالہ یہ یار لوگ کون تھے؟ اگر واقعی یہ یار لوگ تھے تو محدثین نے ان کو گرفت میں لے لیا اور ان کی پوری قلعی کھول دی ہے اور اگر یہ ائمہ دین تھے تو اعتراض ہی کیا ہے ؟

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابوہریرہؓ خود بھی روایت میں قدرے غیر محتاط واقع ہوئے ہوں علامہ ذہبی نے ان کا یہ فقرہ نقل کیا ہے ۔ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے ایسی ایسی احادیث بیان کی ہیں کہ اگر عمرؓ بن خطاب کے زمانے میں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹ ڈالتے ۔ کیوں پیٹ ڈالتے ؟ سرورِ کائنات کا اسوہ بیان کرنے پر، کیا کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے، نہیں، بلکہ مشتبہ احادیث کی روایت پر (دو اسلام ص۵۸)

ازالہ یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ قدرے غیر محتاط تھے ۔ ان کو تمام احادیث حفظ تھیں اور پھر ان کو لکھ بھی رکھا تھا (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)۔ وہ حدیث سناتے تھے اور پھر بتاتے تھے کہ دیکھو یہ اسی طرح میرے پاس لکھی ہوئی بھی ہے

لہذا یہ کہنا کہ وہ قدرے غیر محتاط تھے۔ قطعاً صحیح نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

لو کنت احدث فی زمان عمر مثل ما احدثکم لضربنی بمخفقة (برق اسلام ص۳۶)	اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کثرت سے حدیث روایت کرتا جتنی اب کرتا ہوں تو وہ مجھے دُرّے سے مارتے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ بموجب فرمان نبوی[1] کثرت روایت سے روکتے تھے، اس لئے کہ سننے والے کو یاد نہیں رہتیں۔ نہ یہ کہ مطلقاً حدیث کی روایت سے روکتے تھے۔ یہ تو کسی طرح صحیح نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ یا دیگر صحابی مشتبہ احادیث روایت کرتے تھے، مشتبہ کہنے کی آخر کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے آخر صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی اور راوی تھے جن کی وجہ سے روایتیں مشتبہ تھیں۔ ہرگز نہیں یہ چیز عقلاً محال ہے۔ لہذا حضرت عمرؓ کا مشتبہ حدیثوں کی بناء پر تشدد کرنا صحیح نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ کسی شخص میں یہ جرأت پیدا نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جو چاہے منسوب کرے اور اسی وجہ سے وہ صحابہ کے ساتھ بھی سختی کرتے تھے تاکہ منافقین یا اور لوگوں کو افتراء کا موقع کا نہ ملے اور وہ عبرت پکڑیں اور یہ سب کچھ حدیث کی تخلیص کے لئے تھا نہ کہ حدیث دشمنی کی خاطر۔ اس کی مثال کے لئے مندرجہ ذیل واقعہ ملاحظہ ہو (اس واقعہ کو برق صاحب نے بھی اعتراضات ص۴۵ پر نقل فرمایا ہے)

حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت عمرؓ کے مکان پر گئے۔ تین دفعہ سلام کیا لیکن اجازت نہ ملی تو واپس چلے آئے۔ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے اس لئے اجازت نہ دے سکے۔ جب کام سے فارغ ہوئے تو کہا بلاؤ۔ حضرت ابوموسیٰ کو واپس بلایا گیا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے واپس چلے جانے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

اِذَا اسْتَأْذَنَ اَحَدُکُمْ ثَلَاثًا فَلَمْ یُؤْذَنْ لَہٗ فَلْیَرْجِعْ،،	جب تم میں سے کوئی تین دفعہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے، تو واپس چلا جائے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

اَقِمْ عَلَیْہِ الْبَیِّنَةَ وَاِلَّا اَوْجَعْتُکَ	اس پر گواہ پیش کرو ورنہ تمہیں سزا دونگا

---

[1] حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

اِیَّاکُمْ وَکَثْرَةَ الْحَدِیْثِ عَنِّیْ۔ رواہ احمد وسندہ صحیح بلوغ الامانی جزء ۱ ص۱۶۹ کثرت کے ساتھ حدیث بیان کرنے سے بچو

حضرت ابو موسیٰؓ وہاں سے پریشان حالت میں انصار کی ایک مجلس میں پہنچے اور ان سے اس کی تصدیق چاہی۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا، ان کے ساتھ ہماری قوم کا سب سے چھوٹا آدمی جائے گا (مطلب حضرت ابی بن کعبؓ کا یہ تھا کہ بچہ بچہ کو یہ حدیث حفظ ہے اس میں تعجب کی کون سی بات ہے) الغرض حضرت ابو سعید خدریؓ ان کے ساتھ آئے اور گواہی دی۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے بطور افسوس فرمایا:۔

خَفِيَ عَلَيَّ هٰذَا مِنْ أَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلْهَانِيْ عَنْهُ الصَّفْقُ بِالْأَسْوَاقِ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم مجھ پر پوشیدہ رہا، مجھے اس سے بازاروں میں خرید و فروخت نے غافل رکھا۔

حضرت ابی بن کعبؓ نے اسی موقع پر حضرت عمرؓ سے کہا۔ یہ حدیث میں نے بھی سنی ہے۔ پھر فرمایا اے ابن خطاب:۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ عَذَابًا عَلٰى أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر عذاب نہ بنو۔

حضرت عمرؓ نے معذرتاً فرمایا:۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ إِنَّمَا سَمِعْتُ شَيْئًا فَأَحْبَبْتُ أَنْ أَتَثَبَّتَ (صحیح مسلم باب الاستیذان) لَا أَكُوْنُ عَذَابًا عَلٰى أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ابوداؤد و رواتہ ثقات تتقر یب)	سبحان اللہ! میری نیت سختی کی نہیں تھی) میں نے ایک حدیث سنی تھی تو میں نے چاہا اس کی تصدیق بھی ہو جائے۔ میں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سخت نہیں ہوں۔

یعنی میری منشا کچھ اور ہی ہے۔ حضرت عمرؓ کی منشا کیا تھی۔ وہ حضرت عمرؓ ہی کے الفاظ میں سنیئے۔ حضرت عمرؓ نے اسی موقعہ پر حضرت ابو موسیٰ سے معذرتاً اور ان کی دلجوئی کی خاطر فرمایا تھا:۔

إِنِّيْ لَمْ أَتَّهِمْكَ وَلٰكِنَّ الْحَدِيْثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَدِيْدٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَلٰكِنْ خَشِيْتُ أَنْ يَتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ابوداؤد کتاب الادب)	(اے ابو موسیٰ) میں تم پر تہمت نہیں لگاتا (کہ تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط منسوب کرتے ہو) بلکہ بات یہ ہے کہ آپ کی حدیث بیان کرنا بڑا اہم مسئلہ اور بڑی بھاری بات ہے۔ (میں نے تو تم پر سختی کرنے کی دھمکی اس لئے دی تھی کہ) مجھے یہ

وروات بهما لا باس خوف ہوا کہ کہیں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات بنا کر منسوب نہ کرنے لگیں۔
بهما)

یعنی لوگ عبرت پکڑیں کہ صحابۂ کرام پر اس معاملہ میں سختی ہوتی ہے تو ہمارا نہ معلوم کیا ہوگا، کیا سزا ملے گی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کیوں سختی کرتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس لئے کہ جو بھی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہو وہ پورے طریقہ سے ثابت شدہ اور قطعی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی ڈھیل کی بنا پر ہر کس و ناکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات منسوب کر دے اور اسے یہ خیال و ڈر بھی نہ ہو کہ گواہی کی ضرورت پیش آئے گی اور ثبوت مہیا کرنا پڑے گا۔ اس حدیث کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک کسی شخص کو حدیث بنانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ لہذا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں گھڑی ہوئی حدیث کا وجود یا مشتبہ احادیث کا پایا جانا محض وہم ہے اور بعد میں بلکہ بہت بعد میں جن لوگوں نے حدیثیں بنائیں وہ بچ کر نہیں نکل سکے۔ فنِ حدیث نے پوری طرح ان کا تعاقب کیا اور ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ برق صاحب یہ ہیں صحیح و معتبر احادیث جن کو اوپر نقل کیا گیا، اور یہ ہے حضرت عمرؓ کا طرز اور اہتمامِ تحفظِ حدیث۔ ہم تو صحیح احادیث پیش کر کے آپ کی غلط فہمی کو دور کرتے ہیں اور آپ محض تاریخی اقتباسات پیش کرتے رہتے ہیں جن کا کوئی اعتبار نہیں جیسا کہ ہم نے پہلے ہر روایت کو موضوع یا نامعتبر ثابت کر دیا۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی احادیث کے مقابلہ میں تذکرۃ الحفاظ یا اسی قسم کی دوسری کتابوں کی روایات پیش کرنا جن کی سند میں مفتری و مجہول راوی ہوں کسی طرح زیبا نہیں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ حضرت ابوہریرہ نے (بشرطیکہ یہ قول ان کا تسلیم کر لیا جائے) کیوں یہ گمان کیا کہ حضرت عمرؓ مجھے مارتے، اس لئے کہ ان کے سامنے یہ واقعہ موجود تھا اور وہ ڈرتے تھے کہ کہیں حدیث بیان کروں اور گواہ نہ ملے تو ممکن ہے کہ سزا ملے حالانکہ حضرت عمرؓ کا منشا مارنا نہیں تھا بلکہ حدیث کی حفاظت کے لئے لوگوں کو ہوشیار کرنا تھا جیسا کہ حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت ابوموسیٰؓ کو جو مذکورہ بالا جوابات انہوں نے دئے ان سے ظاہر ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارے موجودہ علما میں ایک دو خرابیاں بھی ہیں اوّل کہ ملکۂ تنقید سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح و غلط میں تمیز نہیں کر سکتے۔ دوم۔ وہ اسلاف پرستی اور اندھی تقلید کے امراض میں مبتلا ہیں" (دو اسلام صہ ۵۹)

ازالہ

یہ صحیح نہیں کہ ملکۂ تنقید سے علماء بالکل بے بہرہ ہیں ماضی قریب میں ایسے لوگ گذر چکے ہیں جن کو فنِ تنقید میں کافی مہارت تھی اور بہت سے علماء اب

بھی موجود ہیں جو سندوں پر ناقدانہ نظر ڈال سکتے ہیں بلکہ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ برق صاحب کو ان کا علم نہ ہو۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ ہمارے تمام علماء اسلاف پرستی اور اندھی تقلید کے امراض میں مبتلا ہیں بلکہ ایسے بہت سے علماء موجود ہیں جو اندھی تقلید سے کلیۃً بیزار ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"شیخ عبدالحق دہلوی لاکھ چلائیں کہ صحاح میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے۔"

(دو اسلام صہ ۵۹)

ازالہ یہ کس نے کہا ہے کہ صحاح میں صرف احادیث ہیں، نہیں بلکہ دوسروں کے اقوال بھی ہیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ صحیح احادیث کے متن میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے، یہ قطعاً صحیح نہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"علامہ ابن حجر ہزار کہیں کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث جھوٹی ہیں۔"

(دو اسلام صہ ۵۹)

ازالہ یہ بالکل غلط ہے، علامہ ابن حجر نے یہ کہیں نہیں کہا، جس شخص نے ایسی عبارت نقل کی ہے، اس نے یا تو دھوکہ دیا ہے یا دھوکہ کھایا ہے۔ ابن حجر کا حاشا وکلا ایسا کوئی قول نہیں، ابن حجر تو صحیح بخاری کی ہر حدیث کو قطعی الصحت سمجھتے ہیں۔ (فیض الباری شرح صحیح بخاری جلد اوّل صہ ۴۵)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

شیخ حمید الدین فراہی بے شک کہتے پھریں۔ میں نے صحاح میں ایسی احادیث دیکھیں جو قرآن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ ہم اس عقیدہ سے پناہ مانگتے ہیں کہ کلام رسول کلامِ خدا کو منسوخ کر سکتا ہے (دو اسلام صہ ۶۰)

ازالہ فراہی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ قطعاً صحیح نہیں۔ وہ حدیث کو سمجھے ہی نہیں اور اسی لئے انہوں نے اس کو قرآن مجید کے خلاف سمجھا۔ پھر فراہی صاحب نہ خود محدث ہیں نہ صحیح العقیدہ، لہٰذا ان کا قول ساقط الاعتبار ہے۔ صحاح میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں جو قرآن مجید کے خلاف ہو یا قرآن مجید کی کسی آیت کو منسوخ کرتی ہو، مزید برآں فراہی صاحب کا اللہ تعالیٰ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو علیحدہ سمجھنا بھی غلطی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی اصل میں اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے لہٰذا حکم رسول سے حکمِ الٰہی کا منسوخ ہونا بعید از

عقل نہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

غلط فہمی ایک مرتبہ صحابۂ کرام نے رسول اللہ سے التجا کی حدثنا کوئی حدیث بیان فرمایئے تو جھٹ یہ آیت نازل ہوئی اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا ——— اللہ نے قرآن نازل کیا ہے اور یہی بہترین حدیث ہے دوبارہ کہا حَدِّثْنَا شَیْئًا دُوْنَ الْقُرْاٰنِ (قرآن کے بغیر کوئی اور بات سنایئے) تو سورۂ یوسف اترنے لگی۔ (دو اسلام ص ۶۰)

ازالہ برق صاحب نے پورے الفاظ نقل نہیں کئے۔ پورے الفاظ اس طرح ہیں۔

حَدِّثْنَا فَوْقَ الْحَدِیْثِ وَدُوْنَ الْقُرْاٰنِ یعنی حدیث و قرآن کے علاوہ کچھ سنایئے (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۶۷) ان الفاظ کے ہوتے ہوئے اعتراض کالعدم ہے۔

۲:۔ مزید برآں "حَدِّثْنَا" کا ترجمہ یہ کرنا کہ حدیث بیان کیجئے صحیح نہیں، ہاں حَدِّثْنَا سے مراد یہ ہے کہ کوئی قصہ کہانی سنایئے اور یہ چیز صراحتاً بیان ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت سعدؓ کی روایت میں ہے :۔

لَوْ قَصَصْتَ عَلَیْنَا کاش آپ ہمیں کوئی کہانی سناتے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے :۔

لَوْ قَصَصْتَ عَلَیْنَا (تفسیر ابن کثیر) کاش آپ ہمیں کوئی قصہ سناتے

۳:۔ یہ قصہ نامعتبر ہے اس لئے کہ سورۂ یوسف مکی ہے اور مکی زندگی میں قصے کہانیوں کا مطالبہ بعید از قیاس نہیں۔ اس زمانہ میں تو توحید اور شرک کے درمیان ہنگامہ خیز کشمکش جاری تھی، کسے ہوش تھا کہ توحید کے علاوہ کسی اور چیز کی معلومات کا مطالبہ کرتا۔

رفاعہ بن رافع کہتے ہیں کہ میں نے یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ ہی میں سنی تھی۔ میں مکہ میں اسلام لایا۔ لوگ مجھے دیوانہ کہنے لگے (مستدرک حاکم ملخصاً و سندہ جید۔ تفسیر احسن التفاسیر) مزید برآں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ کہانی کا مطالبہ کرنا نہ صحابۂ کرام کو زیب دیتا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان ہے۔

۴:۔ اس قصہ کے نامعتبر ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ سورۂ یوسف بعض لوگوں کے کسی سوال کے جواب میں نازل ہوئی، نہ کہ قصہ کہانی سنانے کی درخواست پر۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :۔

لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِہٖٓ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ ۝ (یوسف ۔ ۷) یوسف اور انکے بھائیوں کے قصہ میں سوال کرنے والوں کے لئے یقیناً بہت سی (عبرت کی) نشانیاں ہیں

برق صاحب نے سورۂ یوسف کا جو شانِ نزول نقل کیا ہے وہ قرآن مجید کے بیان کردہ شانِ نزول کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابلِ اعتبار ہے۔

غلط فہمی برق صاحب نے حضرت سفیان ثوری، امام سفیان بن عیینہ اور بکر بن حماد شاعر کے اقوال نقل کئے ہیں جن کا مضمون واحد ہے اور وہ یہ ہے کہ "حدیث اچھی چیز نہیں اگر اچھی چیز ہوتی تو اچھی چیزوں کی طرح کم ہوتی جاتی، لیکن یہ تو بڑھ رہی ہے لہٰذا بری چیز ہے۔" (دو اسلام ملخصاً ص۱۱)

ازالہ ۱:۔ حضرت سفیان ثوری کی طرف جو قول منسوب ہے وہ بالکل کذب و افتراء ہے اس کی سند میں اسحاق بن ابراہیم بن نعمان مجہول ہے دوسرا راوی محمد بن علی بن مروان بھی مجہول ہے۔ تیسرا راوی علی بن جمیل رقی کذاب ہے جو جھوٹی روایتیں نقل کیا کرتا تھا (برق اسلام ص۹۰) سفیان ثوری سے حدیث اور اصحاب الحدیث کی تعریف میں متعدد اور باسند اقوال منقول ہیں جن کا نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ تفصیل کے لئے برق اسلام ملاحظہ فرمائیں۔ سفیان ثوری بہت بڑے محدث ہیں اور حدیث ہی کی وجہ سے ان کی عزت ہے۔

۲:۔ امام سفیان بن عیینہ کی طرف جو قول منسوب ہے وہ بھی کذب و افتراء ہے۔ اس کی سند میں محمد بن سلیمان بن ابی الشریف اور زکریا قطان مجہول غیر معتبر ہیں اور محمد بن موسیٰ کئی ہیں معلوم نہیں یہ کون سے ہیں گویا سلسلۂ رُواۃ ہی واہی تباہی ہے (برق اسلام ص۹۱)۔ دوسرے یہ کہ حضرت سفیان بن عیینہ بھی بہت بڑے محدث ہیں اور حدیث کے ائمہ میں سے ہیں۔

۳:۔ بکر بن حماد شاعر کے قول کی ہمیں پرواہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ (الشعراء آیۃ ۲۲۴، ۲۲۵)

شعراء کی پیروی کرنے والے گمراہ ہیں، کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ شعراء ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

اس آیت کی روشنی میں شعراء کی بات ماننے والے گمراہ ہوتے ہیں للہٰذا ہمیں بکر بن حماد کے قول سے دور رہنا چاہیئے۔ پھر یہ قول کہ "خیر کم ہوتی جاتی ہے اور برائی بڑھتی رہتی ہے" کلیتہً صحیح نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ (بنی اسرآئیل۔ ۸۱)

اور کہہ دیجیئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کے لئے ہے۔

جو خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نازل ہوئی وہ بڑھتے بڑھتے کمال کو پہنچ گئی، صحابۂ کرام کے ایمان کا زیادہ ہوتے رہنا خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔ بشیر بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے ابو خالد الاحمر الکوفی (وفات ۱۹۰ھ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایسا زمانہ بھی آرہا ہے کہ لوگ قرآن شریف کو ایک طرف رکھ دیں

گے اور احادیث کی تلاش میں نکل پڑیں گے۔" (دو اسلام صد ۶۲)

ازالہ یہ قول بھی نامعتبر ہے، اس کی سند میں دو راوی مخدوش ہیں۔ ایک عبداللہ بن محمد بن عبدالمومن جن کا ضبطِ تحریر بہت کمزور تھا (تاریخ اندلس للامام ابن الفرضی جلد اوّل صد ۲۸۸) دوسرے راوی عبدالباقی بن قانع ہیں۔ یہ آخر میں مختلط ہو گئے تھے معلوم نہیں عبداللہ بن محمد نے یہ روایت ان سے کب سنی تھی۔

غلط فہمی آگے چل کر برق صاحب اوراد و وظائف اور اللہ کے ذکر کے فضائل پر اعتراض کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں

"جو شخص دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ کا ورد کرے گا اس کی تمام سیاہ کاریاں معاف ہو جائیں گی خواہ وہ سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ ہوں۔" (دو اسلام صد ۶۳)

ازالہ اس غلط فہمی کے کئی جواب ہیں۔

پہلا جواب اللہ تعالے فرماتا ہے :-

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذّٰریٰت ۴۹) ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے ہیں

یعنی نر اور مادہ، اچھے اور برے، اگر زہر پیدا کیا ہے تو ساتھ ہی تریاق بھی پیدا کیا ہے۔ اگر ضرر رساں جراثیم پیدا کئے ہیں تو ساتھ ہی ان کی مدافعت کرنے والے اور ان کو فنا کرنے والے جراثیم بھی پیدا کئے ہیں۔ کروڑوں نقصان رساں جراثیم ہمارے جسم پر ہر لحظہ حملہ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمارے جسم کے نفع بخش جراثیم ان کو پسپا کر کے ہلاک کر دیتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ضرر رساں جراثیم کا غلبہ ہوتا ہے اور ہم بیمار ہو جاتے ہیں پھر ان ضرر رساں جراثیم کے غلبہ کو توڑنے کے لئے دوا استعمال کرنی پڑتی ہے، غرض یہ کہ ساری کائنات میں یہی چیز کار فرما ہے۔ ایک ضد دوسری ضد کو فنا کر دیتی ہے۔ یہی حال خیر و شر کا ہے کبھی شر کا غلبہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے :-

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم :- ۳۰)	لوگوں کی بد عملی کی وجہ سے بحر و بر میں فساد کا غلبہ ہو گیا۔

اسی طرح حدیث میں ہے، حضرت حذیفہؓ پوچھتے ہیں :-

إِنَّا كُنَّا فِي جَاهِلِيَّةٍ وَشَرٍّ فَجَاءَنَا اللهُ بِهٰذَا الْخَيْرِ فَهَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ قَالَ نَعَمْ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)	(اے اللہ کے رسولؐ) ہم جاہلیت اور شر میں تھے پھر اللہ نے یہ خیر بھیج دی تو کیا اس خیر کے بعد بھی شر ہو گا فرمایا "ہاں"۔

اور کبھی خیر کا غلبہ ہوتا ہے جیسا کہ حدیث بالا میں ہے اور جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ہے :-

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (بنی اسرائیل :- ۸۱)	کہہ دیجئے حق آگیا، باطل مٹ گیا۔

بالکل یہی حالت گناہ و ثواب کی ہے، گناہ بھی ہوتے رہتے ہیں اور نیکیاں بھی ہوتی رہتی ہیں اور ان دونوں کا تصادم بھی ہوتا رہتا ہے، کبھی برائیوں کا غلبہ ہوجاتا ہے نیکیاں مغلوب ہوجاتی ہیں اور کبھی نیکیاں غالب ہوتی ہیں اور برائیاں مغلوب ہوجاتی ہیں۔ نیکی اور بدی ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک دوسرے کی فنا کا سبب، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک گناہ سارے نیک اعمال ختم کردیتا ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر:۔ ۶۵)

اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے سارے اعمال ضائع کردیئے جائیں گے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ (حجرات:۔ ۲)

اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے بلند آواز سے بات کرتے ہو، رسولؐ سے اس طرح بات نہ کیا کرو (کہیں ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (محمد:۔ ۳۳)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع مت کرو۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور سے بولنا اور اللہ اور رسول کی نافرمانی سارے نیک اعمال کا خاتمہ کردیتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے:۔

مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ (صحیح بخاری)

جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی، اس کا عمل ضائع ہوگیا۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

إِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ (رواہ ابو داؤد فی کتاب الادب ورواتہ ثقات او صدوق تقریب)

بے شک حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔

مندرجہ بالا آیات و احادیث سے ثابت ہوا کہ بعض گناہ تمام نیکیوں کو برباد کردیتے ہیں۔

بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ جو خاص قسم کی نیکیوں کو برباد کردیتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى (البقرۃ:۔ ۲۶۴)

احسان اور اذیت سے اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو۔

مطلب یہ کہ جو شخص کسی کو کچھ خیرات دے اور پھر اس پر احسان بھی رکھے یا اس خیرات کی وجہ سے خیرات لینے والے کو کسی قسم کی تکلیف پہنچائے تو اس کا خیرات کرنا اس کے لئے مفید نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی خیرات ضائع کر دی جائے گی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ احسان اور اذیت سے صدقات کالعدم ہو جاتے ہیں۔

جس طرح گناہ نیکیوں کو ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح نیکیاں بھی گناہوں کو فنا کرتی رہتی ہیں جیسا کہ برق صاحب کی وارد کردہ حدیث میں ہے اور یہ چیز قرآن مجید سے ثابت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (الاحزاب:۔ ۷۱)	اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچی بات کہو اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کر دے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔

اس آیت میں صرف اللہ سے ڈر کر سچ کہہ دینے کو مغفرتِ ذنوب کا سبب بنا دیا۔

نیکیاں گناہوں کو فنا کر دیتی ہیں قرآن کا اٹل قانون

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (هود:۔ ۱۱۴)	بے شک نیکیاں برائیوں کو فنا کر دیتی ہیں۔

دوسری آیت:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ (البقرة:۔ ۲۷۱)	اگر تم علانیہ خیرات کرو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر فقراء کو دو تو یہ بہتر ہے اور اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔

تیسری آیت:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (الانفال:۔ ۲۹)	اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرو تو اللہ تمہارے لئے ایک فرقان مقرر کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تم کو بخش دے گا بے شک اللہ بڑے فضل والا ہے۔

چوتھی آیت:۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ	اور جو لوگ ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے

عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ (العنکبوت:۔ ۷)

رہے ہم ان کے گناہ معاف کر دیں گے ۔

پانچویں آیت :۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ (الاحقاف:۔ ۱۶)

ہم مسلمین کے نیک کاموں کو قبول کرتے ہیں اور گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں (اور یہی لوگ) جنت والوں میں (سے) ہیں ۔

چھٹی آیت :۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ (الصف:۔ ۱۱، ۱۲)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اللہ کے راستہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اللہ تعالےٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمہیں جنت میں داخل کر دے گا ۔

ساتویں آیت :۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝ (الطلاق:۔ ۵)

اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا اور اس کو بہت بڑا اجر دے گا ۔

آٹھویں آیت :۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًاۢ بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النمل:۔ ۱۱)

مگر جس نے گناہ کیا اور گناہ کے بعد اسے نیکی سے بدل دیا تو میں معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں ۔

گناہ کون سے مُعاف ہوتے ہیں

حدیث مذکور میں جن گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہے وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں صغیرہ گناہ ہیں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (النجم:۔ ۳۲)

جو لوگ بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں سوائے اس کے کچھ چھوٹے چھوٹے گناہ سرزد ہو جائیں تو بے شک آپ کا رب بڑی وسیع مغفرت والا ہے ۔

دوسری جگہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے:۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (النسآء:۳۱)	اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہے تو اللہ تعالٰی تمہارے سب گناہ معاف کر دے گا۔

دیکھئے اس آیت میں تمام گناہوں کی مغفرت کا بیان ہے خواہ وہ سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ ہوں، پھر یہ کہ ان آیات میں صرف بڑے گناہوں سے بچنے کو صغائر کی مغفرت کا سبب بتایا ہے اور جہاں بڑے گناہوں سے بچ کر کوئی نیکی بھی کر لی جائے مثلاً روزانہ سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہٖ پڑھ لیا جائے تو کیا تعجب ہے کہ تمام صغیرہ گناہ معاف ہو جائیں۔ غالباً اب حدیث کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا، قرآن مجید تو بغیر نیکی کے سب گناہ معاف کرنے کی خوشخبری سناتا ہے، حدیث میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہے یعنی تسبیح و تحمید اگر حدیث پر اعتراض ہو سکتا ہے تو قرآن مجید پر نعوذ باللہ اس سے زیادہ اعتراض ہونے کی گنجائش ہے لیکن یہ صرف غلط فہمی ہوتی ہے حقیقت کچھ اور ہے اور قرآن و حدیث کو صحیح طور پر نہ سمجھنا ہی ایسی غلط فہمیوں کا باعث ہوا کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

پانچوں نمازیں جمعہ اور رمضان درمیانی عرصہ کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔

اِذَا اجْتَنَبَ الْكَبَائِرَ (صحیح مسلم کتاب الطہارۃ)	بشرطیکہ بڑے گناہوں سے بچا جائے

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اگر بڑے گناہوں سے بچا جائے تو مذکورہ بالا نیکیاں خود بخود چھوٹے چھوٹے گناہوں کو فنا کر دیتی ہیں پس قرآن و حدیث سے ثابت ہوا کہ بعض نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں اور وہ گناہ بڑے گناہ نہیں ہوتے بلکہ صغائر ہوتے ہیں لہٰذا حدیث پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ کالعدم ہے۔

بغیر نیکی کے گناہ معاف ہونا

اوپر ہم ایک آیت نقل کر چکے ہیں کہ صرف کبائر سے پرہیز ہی تمام خطاؤں کو معاف کرنے کا سبب بن جاتا ہے یہی نہیں بلکہ اللہ تعالٰی ویسے ہی بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور معافی کے لئے کوئی سبب بھی بیان نہیں کرتا۔

ارشاد باری ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ	جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال ہی کے سبب سے پہنچتی ہے اور اللہ تو بہت

كَثِيْرٍ ه (الشوریٰ ۳۰) سے گناہ معاف کر دیتا ہے۔
یعنی وہ مصیبت کا سبب نہیں بنتے بلکہ ویسے ہی معاف ہو جاتے ہیں۔

گناہ کی مغفرت عقل کی کسوٹی پر

اگر شبہ ہو کہ معمولی نیکی سے اتنے گناہوں کی مغفرت کیسے ہو سکتی ہے تو یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایک ہی گناہ سارے اعمال کے حبوط کا سبب بن سکتا ہے اور ایک ہی نیکی ساری چھوٹی چھوٹی بداعمالیوں کے خاتمہ کا سبب بن سکتی ہے جیسا کہ اوپر قرآن و حدیث کی تصریحات گذر چکی ہیں اور یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جاری و ساری ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اس کی تائید میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ انجیکشن کے چند قطرات کروڑوں مضر رساں جراثیم کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ یہ انجیکشن کے ان قطرات کی قوت ہے جو ان جراثیم کو ختم کر دیتی ہے۔ یہاں مقدار کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کا دار و مدار قوت پر ہوتا ہے۔ انجیکشنوں کی مختلف قوتیں ہوتی ہیں اور ان قوتوں پر ہی ان کے اثر کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اگرچہ مقدار میں تقریباً سب انجیکشن برابر ہوتے ہیں لیکن اثر و نفوذ کے لحاظ سے برابر نہیں ہوتے۔ کیمیائی تجربہ گاہ میں جب کسی محلول کی قوت کی پیمائش کی جاتی ہے تو بعض مرتبہ تیزاب کا ایک قطرہ الکلی کے بہت بڑے محلول کے اثر کو زائل کر دیتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہاں قطرہ کی مقدار کارفرما نہیں ہوتی بلکہ اس قطرہ کی قوت کارفرما ہوتی ہے جو بڑی مقدار کے محلول کی طاقت کو فنا کر دیتی ہے۔ ظاہر میں انسانوں کو یہ ایک عجیب چیز معلوم ہو گی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اسی طرح ایٹمی قوت کو ملاحظہ کیجیے۔ ایٹم کتنا چھوٹا ذرہ ہوتا ہے لیکن کتنی بڑی بڑی قوتوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ یہاں بھی مقدار ہیچ نظر آتی ہے اور وہ قوت جو اس ذرہ میں پنہاں ہے کارفرما ہوتی ہے۔ ہماری ظاہری نظر میں یہ چیزیں عجوبہ ہیں حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اسی طرح کسی نیکی میں کتنی قوت پنہاں ہے اسے کون جانتا ہے۔ اس کا علم تو اللہ تعالےٰ ہی کو ہے۔

مزید توضیح

ہومیو پیتھی کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے۔ ایک گولی جس میں ذرا سا دوا کا اثر ہوتا ہے کتنی طاقت رکھتی ہے اور جتنی دوا کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے اسی قدر قوت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ دوا کئی کئی سال تک اپنا اثر بھی رکھتی ہے اور نقصان رساں اثرات کو زائل کرتی رہتی ہے۔ یہاں بھی دوا کی قوت کارفرما ہے مقدار کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر سو گولیاں بھی بیک وقت کھالی جائیں تو [illegible]

اثر ایک گولی کے مقابلہ میں کچھ بھی زیادہ نہ ہوگا۔ دوا کی معمولی سی مقدار بڑے بڑے مخالف امراض کا مقابلہ کرتی ہے اور ان کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ یہی حال نیکی کا ہے۔ یہاں نیکی کی مقدار نہیں دیکھی جاتی بلکہ وہ قوتِ خلوص اور قوتِ ایمانی دیکھی جاتی ہے جو اس نیکی کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ جب یہ قوتِ خلوص اور قوتِ پنہاں زیادہ ہوتی ہے تو معمولی سی نیکی گناہوں کی کثیر تعداد کو زائل کر دیتی ہے۔ اس قوتِ پنہاں کا جاننے والا اور اس قوتِ خلوص کا ناپنے والا اللہ تعالیٰ ہے، ہم ان قوتوں کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

قرآن مجید اور برق صاحب کا اعتراض

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا	جو شخص نیکی کرے گا تو اس کو دس گنا ثواب
وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى	لے گا اور جو شخص برائی کرے گا تو برائی کا گناہ
اِلَّا مِثْلَهَا (الانعام :۔ ۱۶۰)	اسی کے مثل ہوگا۔

اب بتائیے کیا قرآن مجید پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ نیکی کے ساتھ یہ رعایت کیوں ہے؟ دوسری جگہ ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا	جو شخص اللہ کو قرض حسنہ دے گا
حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا	تو اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا
كَثِیْرَةً (البقرۃ :۔ ۲۴۵)	ثواب دے گا۔

اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس کے نزدیک "کثیر" کتنا ہوگا بہرحال نیکی کم اور ثواب بہت زیادہ اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ظلم نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ	بے شک اللہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ اگر نیکی
تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا (النسآء :۔ ۴۰)	ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا کر دیگا۔

قرآن مجید کی ان آیات سے ثابت ہوا کہ نیکی کئی گنا ہو جاتی ہے اور بدی صرف ایک ہی رہتی ہے اب جب کہ نیکی کی قوت کا یہ عالم ہے کہ اپنے سے کئی گنا ہو جاتی ہے تو پھر گناہ کی کیا حقیقت کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ ایک ہی نیکی جب لاکھ گنا ہو جائے تو گیا وہ ہزارہا گناہوں کا مقابلہ نہ کر سکے گی اور اگر نیکیوں کی یہی فراوانی رہی تو گناہ اگرچہ سمندر کے جھاگ سے زیادہ ہوں فنا ہو جائیں گے، اس لئے کہ نیکیاں گناہوں سے کئی گنا زیادہ ہوں گی۔ غالباً اب حدیث کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا۔ اب رہی یہ بات کہ ایسا کب ہوتا ہے تو اس کے لئے کچھ شرائط ہوتے ہیں۔ دوا کے خواص کا بیان کر دینا اور بات ہے

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان خواص کا ظہور ہمیشہ ہو۔ دوا کے اثر کے لئے چند شرائط ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعا کے اثر کے لئے بھی چند شرائط ہوتے ہیں۔ جب وہ شرائط پورے ہوتے ہیں تو دعا اپنا کام کرتی ہے۔ حدیثِ مذکور میں دعا کی خاصیت مذکور ہے۔ یہ نہیں کہ ہمیشہ ہر حالت میں ایسا ہوتا ہے، خاصیت کا ہونا اور بات ہے اثر کا ہونا اور بات ہے۔ یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ شرائط پورے ہوئے یا نہیں۔ وہ دعا مقبول ہوئی یا نہیں۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں وضو سے تمام گناہوں کی معافی کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:۔

وَلَا تَغْتَرُّوا (صحیح بخاری کتاب الرقاق) (اس بشارت سے) دھوکا مت کھانا۔

اب جو شخص احادیث سے بخوبی واقف ہے وہ دھوکا نہیں کھاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ایسی چیزوں کو عوام کے سامنے بیان کرنے سے روک دیا ہے تاکہ وہ غلط فہمی کی وجہ سے گمراہ نہ ہو جائیں۔

۲:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ (البقرۃ:۔۵۸)

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ اس شہر میں جاؤ اور بافراغت کھاؤ پیو لیکن دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور حطۃ کہنا، ہم تمہارے سارے گناہ معاف کر دیں گے۔

"سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا" اور "حطۃ" کہنا اتنی معمولی سی نیکی سے سارے گناہ معاف کرنے کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔ اب وہ گناہ خواہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں، خواہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں یا اس سے بھی زیادہ، اور پھر گناہ بھی کیسے کیسے۔ اللہ کی پناہ، ان کے گناہوں کے تذکرہ سے قرآن مجید معمور ہے بہرحال تمام گناہوں کے معاف کر دینے کا وعدہ ہے اور کتنی سی بات پر کہ ایک مرتبہ جھک کر حطۃ پڑھ لینا۔ بتائیے اگر ایک مرتبہ حطۃ پڑھنے سے بنی اسرائیل کے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ نا انصافی کرے گا کہ اگر ہم "استغفر اللہ" پڑھیں تو ہمارے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا۔ ضرور کرے گا وہ ظلم نہیں کرتا۔ قرآن تو اتنی اتنی سی نیکیوں سے سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے تو اگر حدیث میں اس قسم کی باتیں پائی جائیں تو تعجب کی آخر کون سی بات ہے۔ جب قرآن مجید پر اعتراض نہیں تو حدیث پر اعتراض کیوں؟

خلاصہ تحریر بالا میں ان تمام احادیث کا جواب ہے جن میں معمولی سی نیکی پر بہت زیادہ ثواب کی بشارت دی گئی ہے اور محض اس بنا پر کہ معمولی سی نیکی پر اتنا اجر نہیں مل سکتا، حدیث کو موضوع کہہ دینا صحیح نہیں اور یہ معیار ہی باطل ہے سطحی نظر سے حدیث کا مطالعہ غلط فہمی اور

گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے ورنہ حقیقت بین نگاہیں اس کے رموز کو پالیتی ہیں۔ سطحی نظر سے تو قرآن مجید کا مطالعہ بھی گمراہ کن ہو سکتا ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا" (البقرۃ ۲۶) اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے ذریعہ بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے تو کیا قرآن مجید ذریعہ گمراہی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں لیکن بہرحال ظاہری معنوں سے تو یہی نکلتا ہے اور یہ بڑا زبردست اعتراض بن سکتا ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "ابی الدرداء (صحابی) کہتے ہیں آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل جس سے تمہارے مدارج بہت بلند ہو جائیں، کون سا ہے؟ ایسا عمل جو سونے اور چاندی کی قربانی اور جہاد سے بھی بہتر ہو۔ وہ جہاد جس میں تم دشمن کا سر کاٹتے ہو اور وہ تمہارا۔ لوگوں نے کہا فرمائیے۔ کہا "اللہ کا ذکر" ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ حدیث کی دنیا میں مؤطا کا درجہ کتنا بلند ہے۔ اس بلند کتاب میں اس حدیث کو پڑھنے کے بعد کسی کو کیا پڑی کہ وہ ملک وملت کی حفاظت یا اپنی مستورات کی عزت وعفت بچانے کے لئے سر دیتا پھرے، وہ غلام رہے یا آزاد اس کی بلا سے، ساری دنیا جنت کے لئے مرتی ہے اور یہ نعمت اس کو زبانی یادِ خدا سے مل سکتی ہے، پھر وہ خواہ مخواہ دکھ کیوں اٹھائے" (دو اسلام صد ۶۳-۶۴)

ازالہ اس حدیث کا عام جواب تو اوپر گزر ہی چکا ہے تاہم مزید تشفی کے لئے ہم کچھ عرض کئے دیتے ہیں۔ اس حدیث میں "ذکر اللہ" کو تمام اعمال سے افضل بتایا گیا ہے اور یہ بالکل قرآن مجید کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ، اور درحقیقت اللہ کا ذکر سب سے بڑا عمل ہے۔ اب اگر اس آیت میں ذکر سے مراد تسبیح وتحمید ہے تو پھر حدیث پر کیا اعتراض ہے اور اگر کچھ اور مطلب ہے تو پھر جو اس آیت کا مطلب ہے وہی حدیث کا بھی ہوگا، بہرحال اعتراض کا کوئی موقع نہیں اور اگر ذکر اللہ میں تبلیغ دین بھی شامل ہے تو پھر یہ حقیقت ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ اور جنگ وجدال کی اسکے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں۔ جنگ وجدال میں ایک ہنگامی کوفت اور محض جسمانی تکالیف ہوتی ہے لیکن تبلیغ میں ایسے ایسے کٹھن مرحلے آتے ہیں کہ جنگ اس کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتی ہے، تبلیغ میں ان روحانی وجسمانی صدمات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ جنگیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور

پھر وہ صدمات مسلسل ہوتے ہیں۔ آناً فاناً میں ختم ہونے والے نہیں۔ جنگ کی نوبت بھی اس تبلیغ کے پیچھے پیچھے آتی ہے۔ بغیر تبلیغ کے حزب اللہ کہاں سے آئے گا جو میدانِ کارزار میں سر دھڑ کی بازی لگائے۔ پس ثابت ہوا کہ تبلیغ جنگ فی سبیل اللہ سے افضل ہے اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بھی صدیقین کو شہداء پر مقدم کیا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
امام داؤد طائی سے کسی نے پوچھا کہ آپ احادیث کی روایت کیوں نہیں کیا کرتے؟ فرمایا، میں بچوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتا۔" (دو اسلام صـ ۶۴)

ازالہ اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ طلبا حدیث میں ان کی غلطیاں پکڑتے تھے اور وہ اس سے بچنا چاہتے تھے اور یہ عبارت خود ان سے مروی ہے جو اس کے آگے ہے کہ "جب اس راستہ میں میری غلطیاں نکلیں تو پھر غلط راستہ پر چلنا مجھے پسند نہیں" (برق اسلام صـ ۶۴) لہذا اس قول میں کوئی اعتراض تو ہے نہیں تاہم یہ بات واضح کر دینی مناسب ہے کہ یہ روایت بھی جھوٹ و افتراء ہے۔ اس کی سند میں تین راوی مجہول ہیں (۱) اسحٰق بن ابراہیم بن نعمان (۲) محمد بن علی بن مروان (۳) ابو عبدالرحمٰن الضریر (برق اسلام صـ ۶۳)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
ایک مرتبہ چند طلبۂ حدیث حضرت فضیل بن عیاض کے ہاں درس لینے کے لئے آئے۔ آپ نے انہیں ان الفاظ میں ڈانٹ پلائی۔ تم لوگوں نے اللہ کی کتاب کو ضائع کر دیا ہے، اگر تم کتابِ الٰہی کی تلاش کرتے تو اس میں تمہیں شفا مل جاتی۔" (دو اسلام صـ ۶۵-۶۴)

ازالہ یہ روایت بھی ناقابلِ اعتبار ہے، اس کی سند میں دو راوی ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ایک راوی احمد بن منذر ہیں ہے یہ مجہول ہے (برق اسلام صـ ۶۴) دوسرا راوی ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمٰن ہے یہ مجہول الحال ہے (بغیۃ الملتمس وجذوۃ المقتبس)۔

مزید براں اس نامعتبر روایت میں بھی حدیث پر کوئی اعتراض نہیں۔ برق صاحب نے فضیل بن عیاض کی پوری عبارت نقل نہیں فرمائی۔ اگر وہ پوری عبارت نقل فرما دیتے تو اعتراض خود بخود کالعدم ہو جاتا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
سفیان ثوری کا قول ہے "انا فی الحدیث منذ ستین سنۃ وودِدت انی خرجت منہ کفافا لا علی ولا لی" میں گزشتہ ساٹھ برس سے حدیث کی دلدل میں پھنسا

ہوا ہوں اور اب اس سے اس حالت میں نکلنا چاہتا ہوں کہ اس کے فائدہ اور نقصان
سے دو سے محفوظ رہوں، (دو اسلام صـ ۶۶)

ازالہ یہ روایت معناً بالکل صحیح ہے۔ برق صاحب نے جو ترجمہ اس کا کیا ہے وہ صحیح نہیں
صحیح مطلب اس کا یہ ہے کہ میں ساٹھ برس سے حدیث کی درس و تدریس میں مشغول
ہوں اور یہ کام اتنا مشکل ہے کہ اگر برابر سرابر ہی چھوٹ جاؤں اور اللہ تعالےٰ کے ہاں کوئی پکڑ نہ ہو
تو بھی غنیمت ہے گویا سفیان ثوری حدیث کی عظمت بیان کر رہے ہیں اور برق صاحب نے غلط فہمی
سے ترجمہ کر کے اس کا منشا کچھ سے کچھ بنا دیا۔

غلط فہمی برق صاحب یموت بن المزرع کا مندرجہ ذیل قول نقل کرتے ہیں:۔
"اذا رأیت شیخا یعدو فاعلم ان اصحاب الحدیث خلفہ جب تم کسی
عالم کو سرپٹ بھاگتا دیکھو تو سمجھ لو کہ طلبۂ حدیث اس کا پیچھا کر رہے ہیں "
(دو اسلام صـ ۶۶)

ازالہ اس قول کا اصل مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی شیخ الحدیث کو جاتے دیکھو تو سمجھ لو کہ طلبۂ
حدیث بھی اس کے پیچھے ہوں گے یعنی شیوخ الحدیث کی یہ شان ہے کہ ہمیشہ ان کے پیچھے
طلباء حدیث کا جمگھٹ ہوتا ہے وہ کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔

اگر وہی مطلب لیا جائے جو برق صاحب نے لیا ہے یعنی علماء درس حدیث سے گھبرا کر بھاگا کرتے
تھے لیکن طلبا ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے اور تنگ کرتے تھے تو آخر اس میں اعتراض ہی کیا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"محمد بن سلام حضرت فاروق کے اس قول کے راوی ہیں کہ میں نے حدیث
سے بہتر کوئی علم اور اہلحدیث سے زیادہ ذلیل کوئی مخلوق نہیں دیکھی" (دو اسلام صـ ۶۶ ـ ۶۷)

ازالہ قولِ مذکور حضرت عمرؓ کا نہیں ہے بلکہ عمرو بن الحارث کا ہے (جامع بیان العلم لابن
عبد البر ج ۲ صـ ۱۳۰) برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے عمرو بن الحارث کو عمر
بن الخطابؓ سمجھ لیا۔

پھر عمرو بن حارث سے بھی یہ قول صحیح سند سے ثابت نہیں، محمد بن سلام نے اس کو عمرو بن الحارث
سے روایت کیا ہے۔ عمرو بن حارث سے محمد بن سلام کی ملاقات ثابت نہیں لہٰذا یہ روایت منقطع
اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"سفیان بن عیینہ، شعبہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے

کہا "خدا میرے دشمن کو محدث بنادے"۔ ایک اور موقعہ پر فرمایا "کاش علمِ حدیث میرے سر پر شیشوں کا ایک ٹوکرا ہوتا جو گر کر چور چور ہو جاتا"۔ (دو اسلام صـ ۶۷)

ازالہ یہ اقوال بھی بہتان ہیں' ان کی سند میں علی بن سعید رازی مجروح ہے۔ (برق اسلام صـ ۷۷)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

ایک دفعہ چند طلباء حدیث سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا "تم میری آنکھ کی جلن ہو" اور ساتھ ہی کہا "اگر آج عمر بن خطاب زندہ ہوتے اور ہم سب کو دیکھ پاتے تو مار مار کر ہمارا بستر بگاڑ دیتے"۔ (دو اسلام صـ ۶۷)

ازالہ یہ بھی کذب و بہتان ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی مسلمہ بن قاسم ہیں جو ضعیف العقل تھے (لسان المیزان) دوسرے راوی احمد بن عیسیٰ ہیں جو غیر معروف ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

امام شعبہ نے فرمایا ایک زمانہ تھا کہ میں اصحابِ حدیث سے مل کر خوش ہوتا تھا لیکن آج لیس شیٔ ابغض الی من ان اری واحدا منهم " میرے ہاں سب سے زیادہ قابلِ نفرت یہی لوگ ہیں"۔ (دو اسلام صـ ۶۷ - ۶۸)

ازالہ اس کی سند میں ایک راوی احمد بن الفضل منکر الروایت ہے، دوسرا راوی محمد بن عبداللہ الدورقی جھوٹا ہے (برق اسلام صـ ۷۷) لہٰذا یہ روایت بالکل باطل ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

ایک مرتبہ چند طلبہ امام شعبہ کے پاس درس حدیث لینے کے لئے آئے آپ نے کڑک کر فرمایا "یہ حدیث تمہیں اللہ کے ذکر سے روکتی ہے کیا تم باز نہیں آؤ گے"۔ (دو اسلام صـ ۶۸)

ازالہ امام شعبہ کے مذکورہ بالا قول میں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ جو شخص حدیث کی طلب میں نماز وغیرہ سے غافل ہو جائے اسے کون اچھا کہے گا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"ایک مرتبہ امام اعمش نے طلبہ حدیث سے کہا۔ مجھے حدیث حنظل سے بھی زیادہ کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ تم جس شخص کے قریب جاتے ہو اسے جھوٹ بولنے (یعنی احادیث پڑھنے) کی ترغیب دیتے ہو"۔ (دو اسلام صـ ۶۸)

ازالہ امام اعمش کے اصل الفاظ یہ ہیں :۔

لَقَدْ رددتموہ حتی صارفی حلقی	تم نے اس بات کو رد کر کے میرے حلق
امرّ من العلقم ما عطفتم علی	کو اندرائن سے بھی زیادہ تلخ بنا دیا ہے تم
احد الا حملتموہ علی الکذب	جس شخص کا رخ کرتے ہو اسے جھوٹ بولوا
(برق اسلام صہ ۱۲۵)	کر ہی چھوڑتے ہو۔

اس کی سند میں احمد بن فضل منکر الحدیث ہے (جامع بیان العلم جلد ۲ صہ ۱۳۳) لہٰذا یہ روایت جھوٹی ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔
سعید القطان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ "یہ صوفی و زاہد لوگ احادیث کے معاملہ میں سب سے بڑے جھوٹے واقع ہوئے ہیں" (دو اسلام صہ ۶۹)

ازالہ یہ تو فن حدیث کی خوبی ہے کہ اس نے ان صوفی اور زاہد لوگوں کو بھی نہ چھوڑا۔ ان کے زہد نے محدثین کو مرعوب نہیں کیا۔ یہ لوگ زہد و تقویٰ کی وجہ سے مرجع انام ہوتے تھے۔ اور ان کی طرف مشکل سے تحریف کا گمان ہو سکتا تھا لہٰذا یہ لوگ دین کے لئے بڑے خطرناک ہو سکتے تھے، لیکن محدثین نے ان کا پردہ چاک کر دیا اور حدیث کو تحریف سے بچا لیا۔

غلط فہمی ابوبکر بن عیاش نے فرمایا تھا :۔
"خدا کی قسم مجھے فساق سے اتنا خطرہ محسوس نہیں ہوتا جتنا اہلحدیث سے۔"
(دو اسلام صہ ۶۹)

ازالہ یہ دراصل مغیرہ کا قول ہے اس کا راوی اسحٰق بن ابراہیم بن النعمان ہے جو غیر معروف ہے اس کا ترجمہ نہیں ملتا لہٰذا یہ روایت بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔
امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ تین قسم کی احادیث میں بُری طرح تحریف ہو چکی ہے پیش گوئیاں جنگیں اور تفسیری احادیث۔ (دو اسلام صہ ۶۹)

ازالہ یہ قول تو کسی طرح ہمارے مخالف نہیں، یہ تو فنِ حدیث اور تدوینِ حدیث کی تائید کرتا ہے، محدثین نے مفسرین اور مؤرخین کی بیان کردہ احادیث کو ذرا بھی وقعت نہیں دی، بلکہ ان کو فنِ حدیث سے پرکھا تو معلوم ہوا کہ اس میں اکثر محرف اور موضوع ہیں۔ محدثین کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوئے بلکہ احادیثِ صحیحہ کی تخلیص میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

باب اوّل کا خلاصہ

اس باب میں ائمہ دین کے جو اقوال برق صاحب نے نقل فرمائے ہیں ان میں سے اکثر گھڑے ہوئے اور ان پر بہتان ہیں اور جو صحیح ہیں ان کی وضاحت اوپر کر دی گئی ہے۔ برق صاحب نے ان موضوع اقوال کو صحیح سمجھا تھا اس لئے نقل فرمایا بہرحال یہ برق صاحب بھی مانتے ہیں کہ یہ اقوال احادیثِ صحیحہ کی مخالفت میں نہیں ہیں بلکہ احادیثِ موضوعہ کے متعلق ہیں مثلاً تمہید میں صؔ۲ پر وہ لکھتے ہیں:۔
"اسلام دو ہیں ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے اور دوسرا وضعی احادیث کا اسلام"
اور پہلے باب میں صؔ۵۹ پر لکھتے ہیں "حاشا و کلا مجھے حدیث سے بغض نہیں بلکہ ان انسانی اقوال سے ضد ہے جنہیں یہودیوں، زندیقوں اور ہمارے فرقہ باز راہنماؤں نے تراش کر مہبط وحی صلعم کی طرف اس لئے منسوب کر دیا تھا کہ خدا، رسول اور قرآن کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہ رہے" برق صاحب ہم نے تو ان اقوال کو صحیح نہیں مانا اور اگر آپ صحیح مانتے ہیں اور اس سے گھڑی ہوئی احادیث مراد لیتے ہیں تو خیر ہمارا اس میں حرج بھی کیا ہے۔ صحیح احادیث کو تو آپ بھی مانتے ہیں بلکہ آپ کی کتاب کے آخری باب کا عنوان ہی ہے "صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا" الغرض صحیح احادیث اور موضوع احادیث کے متعلق تو ہمارا آپ کا ایک ہی عقیدہ ہے لہٰذا ہم میں اور آپ میں اختلاف ہی کہاں ہے۔ محدثین نے یہی کارنامہ انجام دیا اور ہر قسم کے کھوٹ سے صحیح احادیث کی تخلیص کر دی اور یہودیوں، زندیقوں اور فرقہ باز راہنماؤں نے جو حدیثیں وضع کی تھیں ان کی حقیقت کو واشگاف کر دیا۔ فللّٰہ الحمد۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ۲

تدوینِ حدیث

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی صحابہ کرامؓ جمع احادیث کے خلاف تھے (دو اسلام ص۳۷)

ازالہ صحابہ کرام جمع احادیث کے خلاف نہیں تھے۔ مفصل جواب باب اوّل میں دیا جا چکا ہے اور متعدد صحابہ کرام کے صحائف کا تذکرہ بھی اسی باب میں کر دیا گیا ہے۔ وہیں ملاحظہ فرمائیں، اتنا تو برق صاحب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ تین صحابہ کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں۔

وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

صحابہ کرام میں سے صرف تین بزرگ یعنی انس بن مالکؓ، ابو ہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ ایسے نظر آتے ہیں جن کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں (دو اسلام ص۳۷)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی ابو داؤد میں یہ حدیث ملتی ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اکرم صلعم سے دریافت کیا کہ "کیا میں آپ کے اقوال لکھ سکتا ہوں" تو حضور نے فرمایا "نعم انی لا اقول الا حقا" بیشک لکھ لیا کرو، اس لئے کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں، حیرت ہے کہ جس ہستی نے کتابت احادیث سے منع فرمایا تھا (مسلم) اور جس کے جلیل القدر جانشین آپ کے ارشاد کی تعمیل میں نہ صرف اپنے مجموعے بلکہ ہر صحابی کے مجموعے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر فنا کرتے رہے۔ اسی ہستی نے عبداللہ بن عمرؓ کو کتابت

کی اجازت کیسے دیدی، مزید حیرت اس امر پر کہ جب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے احادیث جلانے کا حکم دیا تھا تو ابن عمرؓ نے کیوں تعمیل نہ کی، کیا قرآن کی رو سے اولی الامر کی اطاعت فرض نہیں یا تو ہم یہ تسلیم کریں کہ صحیح مسلم کی حدیث جھوٹی ہے اور یا ابن عمرؓ کو رسول خدا اور خلفائے اسلام کی حکم عدولی کا ملزم ٹھہرائیں۔ حضور کے خلفاء کے عمل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث صحیح ہے اور اگر مسلم کی حدیث کو صحیح قرار دیں تو ابوداؤد والی حدیث وضعی ثابت ہوتی ہے اور اس لئے ابن عمرؓ پر جمع احادیث کا الزام غلط ہے۔" (دو اسلام صفحہ ۱۷۱)

ازالہ قرآن مجید میں ہے:۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل:۔ ۹۵)	آپ کہہ دیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے یعنی رہتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے ۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ فرشتہ رسول بن کر نہیں آتا، اب مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمایئے ۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (الحج:۔ ۷۵)	اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول کو منتخب فرماتا ہے ۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا (فاطر:۔ ۱)	سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو رسول بنانے والا ہے ۔

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر نہیں آیا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ پہلی آیت صحیح ہے اور اگر وہ صحیح ہے تو غلط فہمی سے کہا جا سکتا ہے کہ آخری دو آیتیں صحیح نہیں، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تینوں آیات صحیح ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے ہر ایک ثابت و سچی ہے، بالکل یہی حالت ان ہر دو احادیث کی ہے جن کو برق صاحب نے بطور تضاد پیش کر کے ایک کو سچی اور ایک کو جھوٹی کہا ہے، حالانکہ اگر وہ اس حدیث کو سچی کہتے جس کو انہوں نے جھوٹی کہا ہے تو زیادہ مناسب تھا اس لئے کہ مسلمین کی متواتر تاریخ اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ احادیث ہر زمانہ میں لکھی جاتی رہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت احادیث سے منع نہیں فرمایا تھا بلکہ قرآن مجید کے ساتھ ملا کر لکھنے سے منع فرمایا تھا (مفصل جواب کے لئے باب اوّل ملاحظہ فرمائیں)، باب اوّل میں یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ صحابہ کرام

کے احادیث جلانے کی روایت موضوع یعنی بناوٹی ہے)

قرآن مجید کی رُو سے اولوا الامر کی اطاعت بے شک فرض ہے لیکن اختلاف کی حالت میں قرآن مجید ہی حکم دیتا ہے کہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو یعنی غلط بات میں اولوا الامر کی اطاعت فرض نہیں، اللہ ہی نے حکم دیا ہے طَاعَةٌ مَّعْرُوفَةٌ (النور ۵۳) یعنی معروف بات ہی میں اطاعت کی جائے اور صحیفہ جلانے کا حکم غیر معروف بات تھی لہٰذا تعمیل نہ کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں، پھر یہ بھی غلط ہے کہ اولوا الامر میں سے کسی نے احادیث جلانے کا حکم دیا ہو، یہ روایت ہی جعلی ہے تو اولوا الامر کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

ابن عمرو پر جمع احادیث کا الزام غلط ہے اور خود ہی اس سے پہلے تحریر فرما چکے ہیں کہ تین بزرگوں کے پاس احادیث محفوظ تھیں ان تین بزرگوں میں انہوں نے ابن عمرو کا نام بھی شامل کیا ہے۔ معلوم نہیں دونوں باتوں میں سے کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط، برق صاحب کا پہلا کلام تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ابن عمرو کا صحیفہ صادقہ مشہور ہے جو ان کے پڑپوتے تک منتقل ہوتا ہوا محدثین کو ملا۔ ان کے پڑپوتے عمرو بن شعیب اس صحیفہ کو سامنے رکھ کر احادیث بیان کرتے تھے۔ اس صحیفہ کا ذکر متواتر ہے اور اس کا انکار غلط فہمی ہے یا لاعلمی۔

خلاصہ صحیح مسلم کی حدیث سے قرآن و حدیث کو یکجا لکھنے کی ممانعت ہے، اور سنن ابوداؤد کی حدیث میں احادیث کو علیحدہ لکھنے کی اجازت، لہٰذا دونوں میں کوئی تضاد نہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ مزید برآں کتابتِ حدیث کی احادیث متواتر ہیں اور اس لحاظ سے قطعی الصحت ہیں۔

انتباہ دو اسلام میں غالباً کتابت کی غلطی سے بار بار "ابن عمرؓ" طبع ہو گیا ہے حالانکہ صحیح "ابن عمروؓ" ہے۔

غلط فہمی ترمذی کے مجموعہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق لکھا ہے آپ احادیث لکھ لیا کرتے تھے لیکن صحیح بخاری میں خود ابوہریرہؓ کی یہ روایت موجود ہے کہ "تمام صحابہ میں صرف عبداللہ بن عمر کی روایات مجھ سے زیادہ تھیں اس لئے کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھا کرتا تھا"

چونکہ امام بخاری کی صحیح، ترمذی سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اس لئے ترمذی کے بیان کو ہم صحیح قرار نہیں دے سکتے (دو اسلام ص۱۷)

ازالہ برق صاحب نے صحیح بخاری کی روایت کو ابو ہریرہ کی کتابت حدیث کی روایت کے خلاف سمجھا ہے حالانکہ دونوں روایتوں میں مختلف زمانوں کا ذکر ہے۔
عبداللہ بن عمروؓ عہدِ رسالت میں لکھا کرتے تھے اور ابو ہریرہؓ عہدِ رسالت میں نہیں لکھتے تھے۔ یہ ہے بخاری کی روایت کا مفہوم، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابو ہریرہؓ بھی لکھنے لگے تھے۔ یہ ہے دوسری روایت کا مفہوم (حضرت ابو ہریرہؓ کی تحریر کردہ کتب احادیث کی مفصل معلومات کے لئے باب اوّل ملاحظہ فرمائیں)
برق صاحب کی عبارتوں میں یہاں بھی تعناد ہے برق صاحب پہلے لکھ چکے ہیں کہ ابو ہریرہؓ کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں، اور یہاں فرماتے ہیں کہ ترمذی کے بیان کو ہم صحیح قرار نہیں دے سکتے یعنی ابو ہریرہؓ احادیث نہیں لکھتے تھے معلوم نہیں، یہ صحیح و غلط کی آمیزش ان کی کتاب میں کس طرح آ گئی۔ غالباً غلط فہمی اور عدم تحقیق کی بنا پر ایسا ہوا ہے۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس احادیث محفوظ و مکتوب تھیں جیسا کہ برق صاحب نے صت پر تسلیم کیا ہے۔
حضرت انسؓ کے متعلق برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "آپ سرورِ کائنات صلعم کے خادمِ خاص تھے اور عمر میں بہت چھوٹے، یعنی جب حضور مدینہ میں تشریف لائے تھے تو انسؓ کی عمر صرف ساڑھے نو برس تھی اور رحلتِ رسول کے وقت قریباً بیس برس۔ اپنے ارد گرد نظر ڈال کر دیکھئے اور اندازہ لگایئے کہ کیا کوئی لڑکا اٹھارہ انیس برس کی عمر تک کسی قسم کی کوئی ذمہ داری محسوس کر سکتا ہے؟ حضرت انسؓ کا کام تھا حرمِ نبوی اور ذاتِ نبوی کی خدمت، دن کا بیشتر حصہ خرید و فروخت، لین دین، جھاڑ پھونک میں گذر جاتا تھا، کچھ فرصت ملتی تو قرآن شریف یاد کیا کرتے تھے۔ وہ ارشاداتِ نبوی ضرور سنتے ہوں گے لیکن لڑکپن کا زمانہ تھا۔ انہیں کیا پڑی تھی کہ ہر ارشاد اور ہر واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد کرتے پھرتے، واقعہ سامنے آیا اور گذر گیا، کچھ یاد رہا اور کچھ بھول گیا، کوئی بات کان سے ٹکرائی اور پھر کام میں لگ گئے لیکن جب حضور کی رحلت کے بعد لوگ قرآن کو چھوڑ کر احادیث کے پیچھے پڑ گئے اور راویانِ حدیث کی منزلت بڑھ گئی تو آپ نے بھی بھولے بسرے واقعات اور گوش گذشتہ ارشادات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ممکن ہے کوئی ارشاد بالفاظہٖ یاد رہا ہو اور بعض دیگر کا خاکہ خود مکمل کر لیا ہو" (دو اسلام ص۲۰)
اس کا جواب برق صاحب نے خود آگے چل کر دے دیا ہے برق صاحب فرماتے ہیں:۔

ازالہ گزشتہ ۴۷ برس میں مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو رنگ آمیزی، مبالغہ اور دیگر سخن گسترانہ عیوب سے پاک ہو، میں خود ان عیوب سے مبرا نہیں اور

آج کہ میری عمر ۷۴ سے کچھ اوپر ہو چکی ہے۔ علم کی کئی منازل طے کر چکا ہوں، متانت، حقیقت اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں، پھر بھی داستان سرائی مبالغہ اور رنگ آمیزی سے پوری طرح نہیں بچ سکا (دو اسلام صہ ۱۲۱)

الغرض حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق برق صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا، اس میں عبارت آرائی اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں نہ کوئی خرید و فروخت ہوتی تھی نہ لین دین، نہ جھاڑ پھونک، آپ کی زندگی بہت سادہ تھی، نہ آپ تاجر تھے نہ ساہوکار، نہ آپ کے پاس کوئی محل تھا جس کی جھاڑ پھونک کے لئے کافی وقت درکار ہوتا۔ برق صاحب صحابہ کرام کے متعلق اس قسم کی عبارت مناسب نہیں، آپ اپنے زمانہ کے نوجوانوں پر عہد رسالت کے نوجوانوں کو قیاس نہ کیجئے۔ اگر مقابلہ ہی کرنا ہے تو ان کی شانِ اسلام اور قوتِ ایمان کا مقابلہ ہماری شان اسلام اور قوتِ ایمان سے کیجئے پھر دیکھئے کتنا بڑا فرق نظر آئے گا اور اس وقت آپ کو محسوس ہو گا کہ ان نوجوانوں کے ایمان کے مقابلہ میں ہمارے بڑے سے بڑے بزرگ عالم، باعمل، متقی، پرہیزگار کا ایمان ہیچ ہے۔ آپ کی یہ عبارت "یاد کرتے پھرتے" کس قدر نامناسب ہے آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ "انہیں کیا پڑی تھی کہ یاد کرتے" پھر "انہیں کیا پڑی تھی" یہ جملہ بھی ایک صحابی جلیل کے متعلق قطعاً نازیبا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا وہ علوم دینی سے بے پرواہ تھے۔ دینی علوم کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں تھی کہ صحبتِ رسول میں رہ کر اسے حاصل کرتے، پھر یہ واقعہ کے بھی خلاف ہے انہوں نے احادیث یاد ہی نہیں کیں بلکہ ان کو محفوظ تک کر لیا تھا۔

جیسا کہ برق صاحب نے اپنی کتاب کے صہ ۔ پر خود بھی تسلیم کیا ہے کہ انس رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں۔

برق صاحب! آپ ہمیں اندازہ لگانے کی دعوت دیتے ہیں لیکن آپ بھی تو اندازہ لگائیے، اس زمانہ میں جب کہ لوگوں کی قوتِ حافظہ بہت کم ہو گئی ہے بیس سال کی عمر میں ایم اے اور ایم ایس سی پاس کرنے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ایف اے اور بی اے کرنے والوں کی تعداد شمار سے باہر ہے لیکن اس عہدِ مبارک میں جب کہ حافظے بہت قوی تھے، بیس سال کی عمر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اپنے محبوب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو محفوظ کرنا اتنا بعید ہے کہ آج اس پر تعجب ہی کا اظہار نہیں ہو رہا بلکہ اسے ناممکن سمجھا جا رہا ہے۔

غلط فہمی

"بہر حال جو احادیث آپ (حضرت انس رضی اللہ عنہ) سے مروی ہیں ان کی تعداد ۱۲۸۶ ہے جن میں سے ۱۶۸ کی صحت پر آئمہ حدیث کا اتفاق ہے اور باقی ۱۱۱۸ کو ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے۔ امام بخاری نے ان متفقہ احادیث میں سے صرف ۸۳ نقل کی ہیں۔ مسلم

نے ۱۷ اور باقی کو مشکوک سمجھ کر نظر انداز کر دیا" (دو اسلام ص۴۲)

اس ضمن میں برق صاحب کو دو غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔

ازالہ اوّل :۔ برق صاحب کا خیال ہے کہ جو احادیث مشکوک ہیں ان میں شک کی وجہ خود حضرت انسؓ ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں، جن احادیث کی صحت مشکوک ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ حضرت انسؓ نے غلط احادیث بیان کیں، حاشا وکلا ضعف کی وجہ نیچے کے راوی ہیں نہ کہ حضرت انسؓ۔

دوم :۔ برق صاحب کی دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ انہوں نے حضرت انسؓ کی صحیح احادیث کی تعداد ۱۶۸ بتائی ہے حالانکہ یہ ان احادیث کی تعداد ہے جو بخاری اور مسلم میں مشترک ہیں۔

اصل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

لَهُ اَلْفٌ وَمِائَتَا حَدِيْثٍ وَسِتَّةٌ وَّ ثَمَانُوْنَ اِتَّفَقَا عَلٰى مِائَةٍ وَثَمَانِيَةٍ وَسِتِّيْنَ وَانْفَرَدَ الْبُخَارِيُّ بِثَلَاثَةٍ وَثَمَانِيْنَ وَمُسْلِمٌ بِاِحْدٰى وَسَبْعِيْنَ (حاشیہ نسائی رحیمی دہلی ج ۱ ص۲۵)	حضرت انسؓ کی روایت کردہ احادیث کی تعداد ۱۲۸۶ ہے جن میں سے ۱۶۸ بخاری و مسلم کی متفق علیہ احادیث ہیں، ۸۳ صرف بخاری میں ہیں اور ۷۱ صرف مسلم میں۔

اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ امام بخاری نے ۱۶۸ میں سے ۸۳ نقل نہیں کیں بلکہ ۱۶۸ + ۸۳ = ۲۵۱ نقل کی ہیں۔ اسی طرح امام مسلم نے ۱۶۸ + ۷۱ = ۲۳۹، گویا صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی احادیث کی تعداد ۱۶۸ + ۸۳ + ۷۱ = ۳۲۲ ہے۔ پھر امام بخاری و امام مسلم نے جن احادیث کو اپنی کتاب میں درج نہیں کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ سب مشکوک ہیں بلکہ اس کی دو بڑی وجہیں حسب ذیل ہیں:۔

اوّل :۔ بعض احادیث صحیح ہوتی ہیں لیکن امام بخاریؒ و امام مسلمؒ کے سخت شرائط کی متحمل نہیں ہوتیں۔

دوم :۔ بعض احادیث کو کتاب کی طوالت کے خیال سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں :۔

وَتَرَكْتُ كَثِيْرًا مِّنَ الصِّحَاحِ حَتّٰى لَا يَطُوْلَ الْكِتَابُ	میں نے کتاب کے طویل ہو جانے کے خیال سے بہت سی صحیح احادیث کو چھوڑ دیا

(نصرۃ الباری ص۷ بحوالہ مقدمہ فتح الباری و مقدمہ ابن صلاح وغیرھما)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

غلط فہمی

"اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد آپ کی بعض احادیث بدستور محلِ نظر ہیں۔ مثلاً عتبان بن مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضور سے التماس کی کہ وہ میرے گھر میں آکر نماز پڑھیں، آپ نے یہ التجا قبول فرمائی۔ آپ کے ہمراہ چند صحابہ بھی تشریف لائے، صحابہ نے منافقین کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ کہنے لگے کتنا اچھا ہو اگر حضورؐ مالک بن دخشم (منافق) کی ہلاکت کی دعا کریں، حضور نے فرمایا کیا وہ کلمہ نہیں پڑھتا؟ صحابہ نے کہا، زبان سے تو پڑھتا ہے لیکن اس کا دل بے ایمان ہے۔ فرمایا جو شخص کلمہ پڑھتا ہے وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث عجیب معلوم ہوئی چنانچہ میں نے اپنے بیٹے کو کہا کہ لکھ لے اور اس نے لکھ لی (صحیح مسلم کتاب الایمان)

" اگر ابن دخشم واقعی منافق تھا اور اتنے صحابہ کی شہادت کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور خود حضورؐ نے بھی اس کی تردید نہیں فرمائی تو پھر اس کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" (دو اسلام صـ۲ـ۳۔۲۷)

ازالہ

برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی کاش وہ حدیث کا گہرا مطالعہ کرتے، حدیث میں تو موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے منافق ہونے کی تردید فرمائی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

فَقَالَ بَعْضُهُمْ ذٰلِكَ مُنَافِقٌ لَّا يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُلْ ذٰلِكَ اَلَا تَرَاهُ قَدْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يُرِيْدُ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ قَالَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّا نَرٰى وَجْهَهٗ وَنَصِيْحَتَهٗ اِلَى الْمُنَافِقِيْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ

ایک شخص نے کہا مالک بن دخشم منافق ہے، اللہ اور رسول سے محبت نہیں کرتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ مت کہو کیا تم کو نہیں معلوم کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھا ہے۔ (آپ کا یہ جملہ اس کے نفاق کی صریح تردید ہے کیونکہ منافق کا کلمہ پڑھنا اللہ کی خوشنودی کے لئے نہیں ہوتا) اس شخص نے کہا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے (یعنی ہم نے تو اپنے علم کی بنا پر کہا تھا اور وہ یہ کہ) ہم دیکھتے ہیں کہ وہ منافقین سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی خیر خواہی کرتا ہے۔

اِلَّا اللّٰہُ یَبْتَغِی بِذٰلِکَ وَجْہَ اللّٰہِ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کو خوش کرنے کے لئے لاالٰہ الا اللہ کہا

صحیح بخاری باب المساجد فی البیوت ۔ وہ دوزخ پر حرام ہے (یعنی صرف ظاہری باتوں سے اس کے قلبی ایمان کی نفی نہیں ہوسکتی)

الغرض حضرت انسؓ کی یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

دوسری غلط فہمی برق صاحب کو یہ ہوئی کہ وہ حضرت انسؓ کو اس حدیث کا براہِ راست راوی سمجھ بیٹھے حالانکہ انہوں نے خود یہ روایت عتبان بن مالک سے سنی تھی۔

تیسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ انہوں نے "اَعْجَبَتْنِی" کے معنی "مجھے عجیب معلوم ہوئی" کئے حالانکہ اس کے صحیح معنی یہ ہیں "مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی، مجھے بہت پسند آئی"۔

انتباہ حضرت انسؓ نے اپنے بیٹے سے کہا "اس حدیث کو لکھ لو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں احادیث لکھی جاتی تھیں اور وہ اپنے بیٹوں کو لکھنے کا حکم دیتے تھے (تفصیل کے لئے بابِ اوّل ملاحظہ فرمایئے)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی ایک اور حدیث ملاحظہ ہو۔ "انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسولِ کریمؐ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ آپکے پاس جبریل آیا، آپ کو پکڑا، زمین پر گرایا، سینہ چیر کر دل نکالا، پھر دل کو چیرا، اور ایک ٹکڑے کے متعلق کہا کہ یہ شیطان والا حصّہ ہے، اس حصہ کو سونے کے طشت میں آبِ زمزم سے دھویا، پھر دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑ کر دوبارہ سینہ میں رکھ دیا" یہ حدیث کئی طرح سے مشکوک ہے۔

اوّل جب بچپن میں حضور بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے تو حضرت انسؓ کہاں تھے؟ آپ ایک ایسے واقعہ کے عینی شاہد بنے ہوئے ہیں جو آپ کی پیدائش سے قریباً چھتیس برس پہلے ہوا تھا (دو اسلام صفحہ ۲۷)

ازالہ حضرت انسؓ نے یہ کہاں کہا ہے کہ میں اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا۔ آخر یہ کن الفاظ کا ترجمہ یا مفہوم ہے، انہوں نے اس واقعہ کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو یا کسی صحابی سے سنا ہو، ہر دو صورت میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "دل کے دو حصے ہیں۔۔۔ دل ایک پمپ ہے۔۔۔ یہ صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو ہاتھ پاؤں کی طرح لذت والم کا احساس نہیں کرتا۔

نہ ہی وہ خیر و شر کا محرک، تمام افکار، جذبات، خیالات اور تصوّر کا مرکز دماغ ہے۔ خیر و شر کی تحریک یہیں پیدا ہوتی ہے اور ارادے یہیں بندھتے ہیں۔ اگر جبریل کا مقصد منبعِ شر کو مٹانا تھا تو دماغ کو چیرتا نہ کہ دل کو ۔۔۔ اور دماغ کا مسکن کھوپڑی ہے نہ کہ سینہ" (دو اسلام صـ ۷۵-۷۶)

ازالہ ڈاکٹر سید محمد جمیل اور محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں :۔

"دل انسانی جسم میں سرمایہ حیات ہے اگر کسی چوٹ کی وجہ سے دل کی حرکت بند ہوجائے تو فوراً موت واقع ہوجاتی ہے" (علم الابدان صـ ۱۹۲)

ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دل کی حرکت بند ہوجائے اور انسان زندہ رہے اور اس کا دماغ رنج و الم، غصہ و گھبراہٹ وغیرہ کا احساس کرتا رہے، ہاں ایسا ہوتا ہے کہ دماغ بے کار ہو جائے لیکن دل اپنا کام کرتا رہے اور انسان ایک عرصہ تک زندہ رہے۔

قرآن مجید کی تائید

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرۃ :۔ ۹۷)

(اے رسول) کہہ دیجئے کون شخص جبریل کا دشمن ہوسکتا ہے کیونکہ جبریل تو وہ ہے جس نے یہ قرآن آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے

بتائیے جب تمام افکار، جذبات، خیالات اور تصورات کا مرکز دماغ ہے تو قرآن مجید کا نزول دماغ پر ہونا چاہیئے تھا نہ کہ دل پر۔ جب دل کو لذت و الم کا احساس نہیں ہوتا، نہ وہ خیر و شر کا محرک ہے اور محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے تو اس پر قرآن مجید کا نزول کیا معنی رکھتا ہے۔ جو اعتراض حدیث پر تھا وہی قرآن مجید پر ہوگا۔ ہاں اگر تاویل کرکے آیت میں دل کے معنی دماغ کئے جائیں تو پھر انصافاً بتلائیے، کیا اس قسم کی تاویل حدیث میں نہیں ہوسکتی لیکن اس تاویل سے حقیقت کو نہیں بدلا جاسکتا کیونکہ دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت ہے۔

ارشاد باری ہے :۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (آل عمران ۱۱۹)

بے شک اللہ سینہ کی پوشیدہ باتوں سے خوب واقف ہے

ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے :۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ٥ (النمل :۔ ۷۴)

اور بے شک آپ کا رب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جس چیز کو یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں

اس قسم کی آیات قرآن مجید میں بیسیوں مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ افکار اور خیالات کا مرکز سینہ ہے۔ اب بتائیے سینہ میں دل ہے یا دماغ؟ ظاہر ہے کہ سینہ میں تو دل ہی ہے، تو پھر مرکزِ خیال دل ہوا نہ کہ دماغ، کیونکہ دماغ تو کھوپڑی میں ہے۔
ایک اور آیت سنیئے :-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (الاعراف ۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں لیکن وہ ان کے ذریعہ سمجھتے نہیں۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ افکار و تفقہ کا مرکز دل ہے نہ کہ دماغ۔ قرآن مجید میں اس قسم کی آیات بار بار آئی ہیں لیکن کہیں بھی دماغ کا لفظ استعمال نہیں ہوا پھر اس دل کی جگہ بھی اللہ تعالےٰ نے اتنے واضح طریقہ پر متعین فرما دی کہ جس سے تمام تاویلات کا سدِّباب ہو گیا۔ سنیئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَّعْقِلُونَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُونَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُوْرِ (الحج :- ۴۶)

تو کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر و سیاحت نہیں کی کہ ان کے دل ایسے ہوتے کہ ان کے ذریعہ سمجھتے یا کان ایسے ہوتے جن سے سنتے کیونکہ (نہ سمجھنے والوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں۔

کتنی واضح آیت ہے اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ عقل و افکار کا مرکز دل ہے نہ کہ دماغ اور یہ کہ دل سینہ میں ہے نہ کہ کھوپڑی میں۔ اس آیت کی موجودگی میں حدیث پر اعتراض لایعنی ہے۔ کیا ان آیات کو پڑھ کر نعوذ باللہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ، رسول اور جبریل ہر سہ دل و دماغ کی ساخت اور ان کے اعمال سے ناآشنا تھے، ہرگز نہیں۔ درحقیقت بات یہی ہے اور قرآن مجید و احادیث کی روشنی میں ہمارا ایمان بھی یہی ہے کہ دل ہی عقل و سمجھ، جذبات و تصورات کا مرکز ہے جدید سائنس نے جو کچھ کہا ہے اس پر ہمارا ایمان نہیں۔ اس یقینی علم کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں کیونکہ بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ سائنس کی دنیا میں اصول بنے اور بگڑے۔ ایک عرصہ تک تسلیم کئے گئے اور پھر مسترد کر دیئے گئے۔ اگر سائنس کا بیان صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ دماغ محض ذریعہ اور آلہ ہے جس طرح کان، آنکھ، ناک دماغ کے لئے آلات کا کام دیتے ہیں بالکل اسی طرح دماغ دل کے لئے آلہ کا کام کرتا ہے۔ دماغ کے ذریعہ احساسات دل کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور دل کے اندر جو روحانی قوت موجود ہوتی ہے وہ ان کا

ادراک کرتی ہے۔ اگر بظاہر دل ایک لوتھڑا ہے تو دماغ بھی بظاہر ایک گودے کے سوا اور کچھ نہیں اگر وہ ادراک نہیں کرسکتا تو یہ کیسے کرسکتا ہے، اور اگر یہ کرسکتا ہے تو اس کے کرنے پر تعجب کیوں ؟ دل کی روحانی قوت دماغی آلات پر حکومت کرتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے دل کو تمام اعضاء کا بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے ہوسکتا ہے مستقبل قریب میں سائنس کے ذریعہ اس سلسلہ میں مزید انکشافات ہوں اور اصل حقیقت سامنے آجائے۔ سائنس کے مزعومات سے فوراً مرعوب ہوجانا شکست خوردہ ذہنیت ہے، سائنس تو خود سرگردانی کے عالم میں پھر پھرا کر بالآخر شریعت کی مطابقت کرتی ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

حدیث مذکور اور مزید غلط فہمیاں

اس حدیث پر برق صاحب نے تین مادی اعتراض کئے ہیں ان کا جواب اتنا ہی کافی ہے کہ "فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ" (بروج - ۱۶) "اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ روحانی باتوں کو مادی ترازو میں تولنا کوئی مناسب فعل نہیں بہرحال برق صاحب کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ "جب خطا کاری کی استعداد ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محروم کردیا گیا تو پھر آپ کی تقدس مآب زندگی کوئی قابل فخر چیز نہیں"۔ ہم کہتے ہیں کہ حدیث میں جس چیز کو شیطان کا حصہ بتایا گیا ہے اس کو واپس دل میں نہ لانے کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا اعتراض کالعدم ہے۔ اب ذرا قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے، ارشاد باری ہے:۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۔ (یوسف:۔ ۲۴)	اور بے شک اس عورت نے (یوسف علیہ السلام) سے بدفعلی کا ارادہ کیا تھا اور اگر وہ رب کی برہان کو نہ دیکھتے تو وہ بھی اس عورت سے بدفعلی کا ارادہ کرلیتے۔ یہ اس لئے ہوا کہ ہمیں یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی سے بچانا ہی مقصود تھا بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کسی ذریعے سے بچالیا اور جب بے حیائی سے بچانے کا ذریعہ خود اللہ تعالیٰ نے مہیا فرمایا تو پھر یوسف علیہ السلام کی مقدس و مطہر باعصمت زندگی کوئی قابل فخر چیز نہیں رہی۔ اسی سورت میں آگے ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ	بے شک نفس برائی کا حکم دیتا ہے مگر جس پر

إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (یوسف: ۵۳) میرے رب کا رحم و کرم ہو جائے۔

گویا برائی سے بچنا بھی اللہ کے رحم و کرم پر موقوف ہے، اب اگر کوئی شخص برائی سے بچ جائے تو اس آیت کی رو سے اس نے کون سا کمال کیا کہ جس پر فخر کیا جائے۔

برق صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "اللہ ماں کے پیٹ ہی میں ایسی ساخت بنا سکتا تھا کہ گناہ کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو"۔ ہم کہتے ہیں کہ شقِ صدر سے ساخت میں تبدیلی ہی کہاں ہوئی۔ لہٰذا اعتراض مندفع ہے۔ اب قرآن مجید کی سنیئے وہ کیا کہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر کے ذریعہ ایک لڑکے کو محض اس لئے قتل کرا دیا کہ کہیں بڑا ہو کر اپنے نیک ماں باپ کو سرکشی میں مبتلا نہ کر دے۔ آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا (الکہف: ۸۰)

اور لڑکے کو اس لئے قتل کیا کہ اس کے ماں باپ مؤمن تھے ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا نہ کر دے۔

کیا اس واقعہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ ایسے بچے کو پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی جس کو قتل کرانا مقصود تھا، پھر ان ماں باپ کی مقدس زندگی کس طرح قابلِ فخر و ستائش سمجھی جا سکتی ہے جن کے لئے گناہ میں مبتلا کرنے والی چیز ہی باقی نہیں رہی۔ نہ معلوم بغیر آزمائش کے اللہ تعالیٰ ان پر کیوں ایسا مہربان تھا کہ ان کے ننھے معصوم بچے کو قتل کرا دیا غرض یہ کہ اعتراض کی گنجائش تو ہر جگہ باقی رہتی ہے مگر اللہ تعالیٰ ایسے اعتراضات سے محفوظ رکھے کہ جن کی زد سے نہ قرآن بچ سکے نہ حدیث۔

برق صاحب کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ پانی سے مرکزِ گناہ کو دھونا بھی عجیب و غریب ہے۔ دھونے سے گناہ کیسے ختم ہو جائیں گے اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے کہ روحانیات میں مادی اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں، پھر حدیث میں یہ کہاں ہے کہ وہ حصہ اس لئے دھویا گیا کہ آئندہ اس سے گناہ سرزد نہ ہوں یا گذشتہ گناہ مٹ جائیں۔ حدیث میں اس شیطانی حصہ کو دھونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ دل کو دھونے کا ذکر ہے۔ حدیث کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

شَقَّ عَنْ قَلْبِهِ فَاسْتَخْرَجَ الْقَلْبَ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ عَلَقَةً فَقَالَ هٰذَا حَظُّ الشَّيْطَانِ مِنْكَ ثُمَّ غَسَلَهُ فِيْ طَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ لَأَمَهُ ثُمَّ أَعَادَهُ فِيْ مَكَانِهِ

حضرت جبریل نے آپ کے دل کو چیرا پھر دل کو باہر نکالا اور اس میں سے ایک علقہ نکالا اور کہا کہ یہ آپ کے دل میں شیطان کا حصہ ہے۔ پھر دل کو سونے کے لگن میں آبِ زمزم سے دھویا پھر دل کے شگاف کو

(صحیح مسلم) ملادیا، پھر دل کو اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

یہی وہ دل ہے جس کو مستقبل میں مہبطِ وحی بننا تھا لہٰذا اس کی نورانیت کے لئے پہلے سے انتظامات ہو رہے تھے۔ ان انتظامات سے اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت تھی۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی مغیرہ، شعبی، اعمش اور قاسم جیسے علمائے تابعین جمع احادیث کو ناجائز سمجھتے رہے (دو اسلام ص۷۸)

ازالہ امام شعبی کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

مَا كَتَبْتُ سَوَادًا فِي بَيَاضٍ قَطُّ وَمَا سَمِعْتُ مِنْ رَجُلٍ حَدِيثًا فَأَرَدْتُ أَنْ يُعِيدَهُ عَلَيَّ (جامع بیان العلم)

میں نے کاغذ پر کبھی کوئی چیز نہیں لکھی اور میں نے جب کبھی کسی سے حدیث سنی تو میں نے کبھی نہیں چاہا کہ وہ اسے دوبارہ مجھے سنائے۔

امام شعبی اپنے حافظہ کی تعریف کر رہے ہیں، اس سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ جمع احادیث کے خلاف تھے۔

امام مغیرہ اور امام اعمش کے اقوال ثابت نہیں کیونکہ ان کی سند میں ایک راوی عمر بن محمد مھمی مجہول ہے (برق اسلام ص۱۰۷)

امام قاسم کی روایت ثابت نہیں، اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن یونس مجہول الحال ہے، مزید برآں امام قاسم کے اصل الفاظ یہ ہیں إِنَّهُ كَانَ لَا يَكْتُبُ الْحَدِيثَ یعنی وہ حدیث نہیں لکھتے تھے۔ ان الفاظ سے ان کے حافظہ کی قوت ظاہر ہوتی ہے نہ یہ کہ وہ جمع احادیث کے خلاف تھے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "جن احادیث کو مشتبہ سمجھ کر فاروقؓ و صدیقؓ جلا رہے تھے وہ اڑھائی سو برس بعد کیسے صحیح بن سکتی تھیں" (دو اسلام ص۷۹)

ازالہ صدیقی اور فاروقی دور میں ہرگز ایسا نہیں ہوا جو روایت بیان کی جاتی ہے وہ سراسر کذب و افتراء ہے۔ تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو۔

غلط فہمی علامہ محمد طاہر گجراتی نے اپنی مشہور تصنیف "قانون الاخبار الموضوعہ والرجال الضعفاء" میں تقریباً دو ہزار ایسے اشخاص کے نام دیئے ہیں جو زندگی بھر احادیث گھڑتے رہے (دو اسلام ص۷۹)

• • • • • • • • • •

ازالہ دو ہزار کی تعداد صحیح نہیں، کتاب مذکور میں تقریباً ایک ہزار راویوں کا حال ہے جن میں سے اکثر ضعیف ہیں اور صرف چند ایسے ہیں جو احادیث گھڑتے تھے، کتاب کا نام جو برق صاحب نے تحریر فرمایا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ضعیف راویوں کا حال بھی ہے یعنی ایسے راویوں کا بھی حال ہے جو صادق تو تھے لیکن حافظہ کے کمزور تھے۔ برق صاحب نے راویوں کو گنا نہیں محض اندازے سے دو ہزار کی تعداد لکھ دی اور غلط فہمی سے ضعفاء کو وضّاع سمجھ لیا۔

غلط فہمی برق صاحب نے چند واضعین حدیث کے نام لکھ کر یہ شبہ وارد کیا ہے کہ ان کی وضع کردہ احادیث صحاحِ ستہ میں داخل ہو گئیں۔

(دو اسلام ص ۷۹)

ازالہ جن واضعین کے نام برق صاحب نے لکھے ہیں، ان سے کوئی روایت صحاحِ ستہ میں نہیں ہے اور اگر بالفرضِ محال ہوتی بھی تو اس متن کے ساتھ اس کی سند میں اس واضع کا نام بھی موجود ہوتا تو پھر بتلایئے دھوکا کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کا نام آتے ہی وہ حدیث، حدیث نہیں رہتی، جن کتب میں ایسی احادیث جمع کی گئی ہیں، وہاں ان گھڑنے والوں کے نام بھی موجود ہیں۔ لہٰذا کوئی شخص ان کی جعل سازی سے دھوکا نہیں کھا سکتا، برق صاحب یاد رکھیئے، محدثین اس حدیث پر فنی بحث ہی نہیں کرتے جو موضوع ہوتی ہے۔ محدثین تو صحیح سند سے ثابت شدہ متن کی تحقیق میں اپنا سارا زور خرچ کرتے ہیں۔ موضوع حدیث کا تو مقام ہی علیٰحدہ ہے۔ آپ نے غلط فہمی سے دونوں کو خلط ملط کر دیا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

صحاحِ ستہ میں بعض ایسی احادیث راہ پا چکی ہیں جو نہ صرف قرآن سے متصادم ہوتی ہیں بلکہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند علم، عظیم المرتبت شخصیت بے مثال کردار کے سخت منافی ہیں (دو اسلام ص ۷۹)

ازالہ صحاحِ ستہ میں ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں، اگر غلط فہمی سے کسی حدیث کا ایسا مطلب لے لیا جائے تو پھر تو یہ قرآن مجید کی آیات کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں برق صاحب ایسی احادیث پیش کریں گے وہیں ہم بھی اس قسم کی آیات کی نشاندہی کریں گے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے فرمایا تھا، میں ایک یورپین نومسلم کو کتاب

بخاری کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ اس کی وجہ میں مجلسِ عام میں نہیں بتا سکتا (دو اسلام ص۷۹-۸۰)

ازالہ اوّل تو معلوم نہیں کہ عبید اللہ سندھی کا یہ قول ان کی کس کتاب میں ہے۔ صرف رسالہ "الفرقان" کا حوالہ اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

دوم عبید اللہ سندھی کا شمار ذی علم ہستیوں میں نہیں لہٰذا اگر وہ صحیح بخاری کو نہ سمجھ سکے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ایسی صورت میں ان کا قول کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

احادیث تراشی میں بڑے بڑے "بزرگانِ قوم" شامل تھے (دو اسلام ص۸۱)

ازالہ برق صاحب! ان کو بزرگانِ قوم کون کہتا ہے عوام جو چاہیں کہیں، کسی کو علامہ کہہ دیں اور کسی کو قاضی کہہ دیں مگر محدثین کی فہرست میں یہ لوگ بزرگانِ قوم میں شمار نہیں ہوتے بلکہ مشہور کذابین کی فہرست میں داخل ہیں، لہٰذا صحیح احادیث ان کے وجود سے پاک ہیں۔

باب ۳

چند عجیب راوی و صحابہ

غلط فہمی برق صاحب نے صفحہ ۸۷ پر ایک موضوع حدیث جماع کے بعد غسل کرنے کی فضیلت میں نقل کی ہے اور صفحہ ۸۸ پر ایک موضوع حدیث کلمہ پڑھنے کی فضیلت میں نقل کی ہے اور ان دونوں احادیث پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔

ازالہ برق صاحب! آپ کو تعجب کس پر ہے، گھڑنے والے پر یا محدثین پر، اگر گھڑنے والے پر ہے تو ہم بھی آپ کے شریک ہیں اور اگر محدثین پر ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ محدثین نے بہت پہلے ان کو جعلی کہہ دیا تھا۔ آپ تو آج ان کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن محدثین نے بڑی متانت سے پہلے ہی دن ان کی حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا لہٰذا محدثین پر تعجب کرنا خود تعجب خیز ہے۔

غلط فہمی آگے چل کر برق صاحب نے چند جھوٹوں کا تذکرہ کیا ہے کہ ان لوگوں نے کئی سو سال بعد صحابی ہونے کا دعویٰ کیا مثلاً قیس بن تمیم، سرباتک، جبیر بن حرب، ابو عبداللہ محمد الصقلی، جعفر بن نسطور، بابا رتن ہندی۔ ان لوگوں کا ذکر کرنے سے پہلے برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"اب ذرا سوانح میں ان کی حقیقت نگاری کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے"۔ (دو اسلام صہ ۸۹)

آگے چل کر سرباتک کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"حیرت ہے کہ جب اسحاق بن ابراہیم ۲۳۸ھ کے قریب سرباتک سے ملاقاتی ہوا تھا تو اس

کی عمر سات سو ستر برس تھی اور ۲۳۳ھ یعنی ۲۶۸ برس پہلے اس کی عمر ۴۹۲ سال تھی۔ ریاضی کے ان محدثانہ نکات کو ہم جیسے بے علم کیا سمجھیں۔" (دو اسلام صـ۹۰)

ازالہ برق صاحب! یہ حقیقت نگاری محدثین کی نہیں ہے بلکہ دجالین و کذابین کی ہے۔ محدثین نے تو بہت پہلے ہی ان کو کذابین کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ ان سب لوگوں کا مفصل حال آپ کو تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۰۲ تا صفحہ ۱۰۶ میں ملے گا۔ ریاضی کی یہ غلطیاں افسوس ہے کہ آپ ان کو محدثین کی طرف منسوب کر رہے ہیں حالانکہ محدثین کے پاس ایسا زبردست معیار ہے جس کی بنیاد پر وہ آنکھ بند کر کے ان مدعیان صحبت نبوی کے کذب پر قسم کھا سکتے ہیں اور اسی معیار پر رکھ کر محدثین نے ان کے کذاب ہونے کی صراحت کی ہے۔

دوم: ایک بات اور یاد رکھیئے وہ یہ کہ یہ دجال سب کے سب تدوین حدیث کے دور کے بعد ظاہر ہوئے لہٰذا حدیث کے معتبر دواوین ان کی من گھڑت خرافات سے پاک ہیں۔

محدثین کا وہ زبردست معیار جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ صحیح حدیث ہے جو درج ذیل ہے۔ وفات سے کچھ دن پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اَرَأَيْتُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهٖ فَاِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ اَحَدٌ (صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب ذکر العشاء والعتمۃ)	آج کی رات سے سو سال ختم ہونے تک روئے زمین پر جتنے انسان اس وقت موجود ہیں ان میں کوئی زندہ نہیں رہے گا۔

اس معیار پر مدعیان صحبت نبوی پورے نہیں اترے لہٰذا محدثین نے فوراً انہیں کذاب کہہ دیا۔

برق صاحب لکھتے ہیں:۔

غلط فہمی علامہ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ "بابا رتن ہندی کی وفات ۶۳۲ھ ۱۲۳۴ء میں ہوئی تھی لیکن محدثین کی ایک خاص تعداد اسے صحابی سمجھ کر اس کی احادیث روایت کرتی ہے۔ جب علامہ ذہبی نے بابا رتن کی روایات کو جھوٹا قرار دیا تو قاموس کے مصنف علامہ مجدالدین فیروز آبادی (وفات ۸۱۴ھ) کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ انہوں نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لئے۔"

(دو اسلام صـ۹۱)

ازالہ یہ بات قطعاً صحیح نہیں کہ محدثین کی ایک خاص تعداد بابا رتن کو صحابی سمجھ کر اس کی احادیث روایت کرتی ہے ہاں ملفوظات خواجگان کو اگر آپ کتب حدیث

سمجھ بیٹھے ہیں تو پھر بات ہی دوسری ہے۔ محدثین کے نزدیک تو یہ ملفوظات بھی خرافات سے مملو ہیں۔ پھر یہ ملفوظات بہت بعد کی پیداوار ہیں، محدثین سے ان کا کوئی تعلق نہیں بابا رتن خود دورِ تدوینِ حدیث کے بہت عرصہ بعد ظاہر ہوا تھا لہٰذا اس سے محدثین کا حدیث روایت کرنا عقلاً محال ہے۔ متاخرین نے جہاں ان لوگوں کی تردید کی ہے وہیں سے برق صاحب یہ افسانے نقل فرمائے ہیں اور حیرت ہے کہ تردید کرنے والوں کو ان چیزوں کا ماننے والا سمجھ رہے ہیں پھر یہ بھی غلط ہے کہ علامہ مجد الدین نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لئے تھے برق صاحب نے بے حوالہ اس کو نقل کیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ علامہ مجد الدین نے بابا رتن کو صحابی تسلیم کیا۔ ایک طرف تو برق صاحب جامعینِ حدیث کا تذکرہ کرتے ہیں اور نام لیتے ہیں علامہ مجد الدین کا حالانکہ علامہ مجد الدین جامعینِ حدیث میں سے نہیں ہیں اور نہ تدوینِ حدیث سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ علامہ ذہبی نے رتن کے وجود پر تردد کا اظہار کیا تو علامہ مجد الدین نے اس تردد کا انکار کیا اور کہا ایسا شخص یقیناً ہوا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ علامہ مجد الدین نے اس کے دعوی صحابیت میں اس کو سچا سمجھا، تذکرۃ الموضوعات میں جہاں سے برق صاحب نے یہ چیزیں نقل کی ہیں، اس چیز کی وضاحت موجود ہے ملاحظہ فرمائیے:

قَالَ ابْنَ حَجَرٍ رَأَيْتُ شَيْخَنَا مَجْدَ الدِّيْنِ صَاحِبَ الْقَامُوْسِ يُنْكِرُ عَلَى الذَّهَبِيِّ إِنْكَارَهُ وُجُوْدَ رَتَنٍ وَ ذَكَرَ اَنَّهُ دَخَلَ فِيْ ضَيْعَتِهٖ فِي الْهِنْدِ وَ وَجَدَ فِيْهَا مَنْ لَا يُحْصِىْ كَثْرَةً يَنْقُلُوْنَ قِصَّةَ رَتَنٍ عَنْ آبَائِهِمْ وَاَسْلَافِهِمْ قُلْتُ هُوَ لَمْ يَجْزِمْ بِعَدَمِهٖ بَلْ تَرَدَّدَ قَالَ وَالظَّاهِرُ اَنَّهُ كَانَ طَوِيْلَ الْعُمُرِ فَادَّعٰى وَتَمَادٰى عَلَيْهِ حَتّٰى اشْتَهَرَ وَلَوْ كَانَ صَادِقًا لَا اشْتَهَرَ فِي الْمِائَةِ الثَّانِيَةِ اَوِ الثَّالِثَةِ وَلٰكِنْ لَمْ يُنْقَلْ عَنْهُ شَيْءٌ اِلَّا فِيْ اٰخِرِ الْمِائَةِ السَّادِسَةِ ثُمَّ فِيْ اَوَائِلِ السَّابِعَةِ قَبْلَ مَوْتِهٖ

علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ ذہبی نے بابا رتن کے وجود کا انکار کیا تو ہمارے استاد مجد الدین نے اس انکار کی تردید کی۔ وہ کہتے تھے کہ میں ہندوستان کی ایک بستی میں گیا تو مجھے لاتعداد ایسے آدمی ملے جو اپنے آباؤ اجداد سے رتن کا قصہ روایت کرتے تھے۔ ابن حجر کہتے ہیں میں کہتا ہوں علامہ ذہبی نے رتن کے وجود کا انکار نہیں کیا بلکہ تردد کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی عمر طویل تھی لہٰذا اس نے صحابی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ مشہور ہو گیا۔ اگر وہ سچا ہوتا تو دوسری یا تیسری صدی ہجری میں بھی مشہور ہوتا لیکن اس سے کوئی چیز نقل نہیں ہوئی مگر چھٹی صدی کے آخر میں پھر ساتویں صدی کے شروع میں اس کی موت

(تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۰۶-۱۰۷) سے کچھ عرصہ پہلے۔

عبارت بالا سے ظاہر ہے کہ علامہ ذہبی نے ایک زبردست معقول دلیل سے بابا رتن کے کذّاب ہونے کا ثبوت دیا۔ علامہ مجدالدین کو غلط فہمی ہوئی کہ وہ یہ سمجھ گئے کہ علامہ ذہبی اس کے وجود کے منکر ہیں لہذا انہوں نے تردیداً کہا کہ وجود تو ضرور تھا اس لئے کہ لاتعداد لوگ اس کے وجود کی شہادت دیتے تھے۔

خلاصۂ باب سوئم

الغرض بعض جاہل ملاؤں نے ان مدّعیانِ صحابیت کے دعویٰ کو سچ سمجھ لیا ہو تو دوسری بات ہے۔ شارحینِ حدیث اور محققین نے ان کی تکذیب کی اور ان پر سخت تنقید کی اور یہ برق صاحب کو بھی تسلیم ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"بحمداللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گزرے تھے۔ جنہوں نے ایسے تمام واقعات پر سخت تنقید کی ہے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاءؒ۔ (دو اسلام صفحہ ۹)

باب ۴

کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں، حضرت انس اور حضرت ابوسعید خدری حدیث رسول سے محض ناواقف ہیں اس لئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔" (دو اسلام ص ۹۴)

ازالہ یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر افتراء ہے، اس کی سند منقطع ہے (جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۵۴) دوم یہ کہ یہ عقلاً بھی محال ہے، اس لئے کہ ان ہر دو صحابیوں کی عمر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یقیناً زیادہ تھی، لہٰذا وہ کم سنی کا اعتراض نہیں کرسکتیں۔

سوم یہ کہ ان دونوں صحابیوں کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ۲۰ سال سے کچھ زائد ہی تھی اور یہ عمر اتنی کم نہیں ہے کہ احادیث کی حفاظت نہ ہوسکے، اس عمر میں آج کل، ایم۔اے اور ایم۔ایس سی پاس کر لیتے ہیں اور سات آٹھ برس کے بچے پورا قرآن حفظ کر لیتے ہیں تو اس زمانہ میں جب کہ حافظہ کئی گنا تھا، احادیث کو محفوظ کر لینا کیا بعید ہے، یہی حضرت ابوسعید خدریؓ ہیں جن کو صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوموسٰی اشعریؓ کے ساتھ حدیث کی تصدیق کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کی خدمت میں روانہ کیا تھا، اور یہ کہہ کر روانہ کیا تھا کہ "ہماری قوم کا سب سے چھوٹا آدمی اس کی تصدیق کرنے جائے گا۔" اس نوجوان کو وہ حدیث معلوم تھی جو حضرت عمرؓ کو معلوم نہ تھی، یہ وہ نوجوان ہے جس پر حضرت عمرؓ نے اعتماد کیا تھا اور اس کی شہادت کو تسلیم کیا تھا (تفصیل کے لیے باب اوّل ملاحظہ ہو) اور حضرت انسؓ وہ نوجوان صحابی ہیں جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تحصیل دار بنا کر بحرین روانہ کیا تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ) ان نوجوان صحابیوں پر حضرت

ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تو اعتماد کریں اور آپ ان پر اعتماد نہ کریں، یہ کس قدر حیرت کا مقام ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "ایک آدمی نے وتر کے متعلق حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث پڑھی، ابن عمرؓ نے فرمایا کَذَبَ اَبُوْھُرَیْرَۃ (ابوہریرہ جھوٹا ہے)" دو اسلام ص ۹۵

ازالہ کذب کے معنی اگر "جھوٹ" کے ہی لئے جائیں تو "کذب ابوہریرہ" کے صحیح معنی یہ ہوں گے کہ "ابوہریرہ نے جھوٹ کہا" اُس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ "ابوہریرہ جھوٹا ہے" محاورہ کے لحاظ سے ان دونوں جملوں میں بہت فرق ہے "ابوہریرہ جھوٹا ہے" یہ بہ نسبت "ابوہریرہ نے جھوٹ کہا" کے زیادہ قبیح ہے، معلوم نہیں غلط اور پھر زیادہ قبیح معنی کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ ہو سکتا ہے کہ غلط فہمی ہو گئی ہو۔

صدق اور کذب کا استعمال محض سچ اور جھوٹ ہی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ صدق کا استعمال صحیح نتیجہ پر پہنچ جانے کے لئے بھی ہوتا ہے اور کذب کا استعمال غلطی کر جانا، خطا کر جانا کے معنوں میں بھی ہوتا ہے، عرب کا محاورہ ہے کہ اگر تیر نشانہ پر بیٹھ جائے تو "صدق" استعمال کرتے ہیں اور اگر خطا کر جائے تو "کذب" استعمال کرتے ہیں، لہٰذا "کذب ابوہریرہ" کے صحیح معنی یہ ہوئے کہ "ابوہریرہ سے خطا ہو گئی"

علامہ احمد عبدالرحمٰن البنا الشہیر بالساعاتی لکھتے ہیں:۔

"وَمَعْنٰی قَوْلِہٖ کَذَبَ اَیْ اَخْطَأَ وَھُوَ لُغَۃُ اَھْلِ الْحِجَازِ — کذب کے معنی "خطا کی" اور یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔

(بلوغ الامانی علی فتح الربانی (مسند احمد) جزو ۳ ص ۳۰۲)

امام باجیؒ کہتے ہیں:۔

اَیْ وَھِمَ وَغَلِطَ (بلوغ الامانی جزو ۴ ص ۲۷۰) — یعنی وہم ہو گیا، غلطی ہو گئی۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

کَذَبْتَ اَیْ اَخْطَأْتَ لِاَنَّ اَھْلَ الْحِجَازِ یُطْلِقُوْنَ الْکَذِبَ فِیْ مَوْضِعِ الْخَطَإِ — کَذَبْتَ کے معنی ہیں "تو نے خطا کی" یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔

(فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۱۰ کتاب فضائل القرآن باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "جب حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث پڑھی گئی "صلوٰۃ اللیل مثنٰی مثنٰی واذا خشیت الصبح فواحدۃ" یعنی رات کی نماز دو

رکعت ہے، اور جب صبح قریب آجائے، تو ایک رکعت (یعنی وتر) ادا کرو، تو آپ نے فرمایا "کذب ابن عمر" ابن عمر جھوٹا ہے' (دو اسلام صـ ۹۵)

ازالہ | یہاں بھی ترجمہ غلط کیا گیا ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ "ابن عمرؓ سے خطا ہو گئی" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے شایان شان یہی معنی ہیں، ایک اور موقع پر حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا تھا۔

يَغْفِرُ اللّٰهُ لِأَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَمَا إِنَّهُ	اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمٰن (یعنی ابن عمر) کو معاف
لَمْ يَكْذِبْ وَلٰكِنَّهُ نَسِيَ أَوْ أَخْطَأَ (صحیح	فرمائے۔ جھوٹ تو وہ نہیں بولتے لیکن وہ
مسلم باب المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ)	بھول گئے یا ان سے خطا ہو گئی۔

یہ حدیث بالکل صحیح ہے، اس میں حضرت عائشہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے جھوٹ نہ بولنے کی صراحت کر رہی ہیں، لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ وہ کسی دوسرے موقع پر انہیں جھوٹا سمجھیں، لہٰذا برق صاحب کی وارد کردہ روایت محلِ نظر ہے۔

خود حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی یہ حدیث انہی معنوں میں مروی ہے، وہ فرماتی ہیں۔

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعت
.... إِحْدَىٰ عَشْرَةَ رَكْعَةً يُسَلِّمُ	پڑھا کرتے تھے، آپ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے
بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوتِرُ بِوَاحِدَةٍ	اور ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اس حدیث کی موجودگی میں کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بیان کردہ حدیث کو غلط سمجھا۔ لہٰذا برق صاحب کی بیان کردہ روایت باطل ہے۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

جب حضرت عمر بن خطاب کی یہ حدیث "ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ" کہ میّت پر رونے سے میّت کو سزا ملتی ہے، حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا، اللہ عمر پر رحم کرے، کیا اس نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (بخاری و مسلم) مسلم نے یہ حدیث چھ مرتبہ، چھ صحابہ سے روایت کی ہے.... حضرت عائشہؓ نے گویا سب کی تردید فرما دی (دو اسلام صـ ۹۶،۹۵)

ازالہ | حضرت عائشہؓ نے تردید تو بے شک کی، لیکن کتنے پیار سے انداز میں۔

لَمَّا بَلَغَ عَائِشَةَ قَوْلُ عُمَرَ وَابْنِ عُمَرَ قَالَتْ إِنَّكُمْ لَتُحَدِّثُونِّي عَنْ غَيْرِ كَاذِبَيْنِ وَلَا مُكَذَّبَيْنِ وَلٰكِنَّ السَّمْعَ يُخْطِئُ (صحیح مسلم)

جب حضرت عائشہ کو حضرت عمر اور حضرت ابن عمر کی روایت کردہ حدیث پہنچی تو انہوں نے کہا تم ایسے آدمیوں سے حدیث بیان کر رہے ہو جو نہ جھوٹے ہیں نہ جھٹلائے جا سکتے ہیں مگر سننے میں غلطی ہو سکتی ہے

پھر فرماتی ہیں "یرحم اللہ عمر" اللہ عمرؓ پر رحم فرمائے، عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا "یغفر اللہ لابی عبدالرحمان" اللہ ابن عمرؓ کو معاف فرمائے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے تردید میں صرف قرآن مجید کی آیت ہی پیش نہیں فرمائی، بلکہ حدیث بھی پیش کی۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا۔

إِنَّ اللّٰهَ يُعَذِّبُ الْمُؤْمِنَ بِبُكَاءِ أَحَدٍ

بے شک اللہ مومن پر کسی دوسرے کے نوحہ کی وجہ سے عذاب کرتا ہے

بلکہ یہ فرمایا تھا۔

إِنَّ اللّٰهَ يَزِيدُ الْكَافِرَ عَذَابًا بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ (صحیح مسلم)

بے شک اللہ کافر پر اس کے اہل کے نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب زیادہ کر دیتا ہے

حضرت عائشہؓ نے جو کچھ سنا تھا، اس کو اپنی دلیل میں پیش فرمایا، اور پھر قرآن مجید کی آیت تلاوت فرمائی، کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، لیکن حضرت عائشہؓ نے جو حدیث پیش کی۔ وہ بھی اس آیت کے خلاف ہے اور حضرت عمرؓ کی حدیث بھی اس آیت کے خلاف ہے، حدیث دونوں نے پیش کی، اور ایسی حالت میں پیش کی کہ وہ بظاہر قرآن مجید کی آیت سے ٹکراتی تھی، ان میں سے کسی نے بھی صرف قرآن مجید کی مخالفت کی وجہ سے حدیث کو مسترد نہیں کیا، اور نہ یہ صحابہ کرامؓ کا دستور تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کیا سمجھیں اور انہوں نے کیوں تردید کی، امام نووی لکھتے ہیں۔

وَقَالُوا كَانَ مِنْ عَادَةِ الْعَرَبِ الْوَصِيَّةُ بِذٰلِكَ وَمِنْهُ قَوْلُ طَرَفَةَ بْنِ الْعَبْدِ
إِذَا مِتُّ فَانْعِينِي بِمَا أَنَا أَهْلُهُ وَشُقِّي عَلَيَّ الْجَيْبَ يَا ابْنَةَ مَعْبَدِ

(بلوغ الامانی علی فتح الربانی جزء صفحہ ۱۲۶)

جمہور نے کہا ہے کہ یہ اہل عرب کی عادت تھی کہ وہ اس کی وصیت کرتے تھے طرفہ بن عبد کا قول بھی اسی قبیل سے ہے وہ کہتا ہے۔ جب میں مر جاؤں تو مجھ پر ایسا نوحہ کرنا جس کا میں اہل ہوں اور اے معبد کی بیٹی میرے غم میں گریبان چاک کرنا۔

غرض یہ کہ حضرت عائشہؓ یہ سمجھیں کہ کافر کے متعلق تو میں نے یہ حدیث سنی ہے، کیونکہ انکے ہاں نوحہ کی رسم ہے اور وہ اپنے اہل کو اس کی ترغیب دیتے ہیں، لہٰذا اس ترغیب کا عذاب ان کو ہوگا، لیکن مؤمن تو ایسا نہیں کرسکتا لہٰذا اس پر دوسروں کا بوجھ کیسے پڑے گا، مگر حضرت عمرؓ کی حدیث عام ہے، مؤمن ہو یا کافر جو شخص بھی اپنے ہاں نوحہ کی رسم کو جاری رکھے اس سے روکے نہیں، تو پھر مؤمن ہو یا کافر دونوں پر عذاب ہوگا، نہ حضرت عائشہ کی حدیث حقیقۃً قرآن مجید کے خلاف ہے، نہ حضرت عمرؓ کی حدیث، ہاں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو مطلب سمجھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی منشاء کے مطابق نہ تھا، وہ یہ سمجھتی رہیں کہ مؤمن ایسا کر نہیں سکتا، اس کو عذاب کیوں ہوگا، انہوں نے اس غلطی کو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا، اور حضرت عمرؓ و دیگر صحابہ اس کے حقیقی منشاء کو سمجھ کر اس کو روایت کرتے رہے۔ اس کی دلیل ان صحابہ کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبَعْضِ بُکَاءِ أَھْلِہٖ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) بے شک میّت پر اس کے اہل کے بعض نوحوں کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔

یعنی میّت پر ہر حالت میں عذاب نہیں ہوتا، بلکہ بعض حالات میں ہوتا ہے اور وہ بعض حالات یہی ہیں کہ اس میّت کے ہاں نوحہ کی رسم ہو، اور اس نے اس رسم کو بند کرنے کی کوشش نہ کی ہو، یا اس رسم کی ترغیب دی ہو، تو پھر اس رسم کی وجہ سے جو نوحہ کیا جائے گا، اس کا عذاب میّت پر بھی ہوگا۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

اسی طرح جب حضرت عائشہؓ کے سامنے ابن عمرؓ کی یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضور نے مقتولین جنگ کی لاشوں کو جو ایک گڑھے میں پڑی تھیں دیکھ کر فرمایا، کیا اللہ تعالیٰ نے وہ مواعید پورے کر دئیے ہیں، جو تم سے کئے گئے تھے، کسی نے کہا، آپ مردوں کو پکار رہے ہیں؟ فرمایا تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے، فرق یہ ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے، تو آپ نے فرمایا، حضور نے ان لاشوں کو دیکھ کر صرف اتنا فرمایا تھا "انھم لیعلمون الاٰن ان ما کنت اقول حق" ان لوگوں کو اب معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں کہا کرتا تھا وہ درست ہے، اور پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی[۱] تم مردوں کو کوئی بات نہیں سنا سکتے۔ (دو اسلام صہ ۹۶)

ازالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیثِ مذکور کے جو الفاظ سنے تھے، ان کے مطابق حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کو نہ پایا۔ مزید برآں انہوں نے حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کو بظاہر قرآن مجید کی آیت کے خلاف سمجھا، لہٰذا اس پر شبہ کا اظہار فرمایا، انہوں نے فرمایا

وَهَلَ (صحیح مسلم کتاب الجنائز) ابن عمر سے خطا ہو گئی، وہ بھول گئے۔

پھر یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف اتنا فرمایا تھا۔

إِنَّهُمْ لَيَعْلَمُونَ الْآنَ أَنَّ مَا كُنْتُ أَقُولُ لَهُمْ حَقٌّ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) ان لوگوں کو اب معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں ان سے کہتا تھا وہ صحیح تھا۔

گویا حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیث کے صرف اتنے ہی الفاظ سنے تھے، یعنی انہوں نے صرف وہ ہی الفاظ سنے تھے، جو آپؐ نے مسلمین کو مخاطب کر کے فرمائے تھے، اور وہ الفاظ نہیں سنے، جو اس کے بعد لاشوں کو مخاطب کر کے فرمائے تھے، لہٰذا حضرت عائشہؓ نے اپنی سنی ہوئی حدیث اور پھر قرآنی آیت سے استشہاد کرتے ہوئے ابن عمرؓ کی حدیث کو صحیح نہیں سمجھا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا وہ صحیح بھی ہو، حضرت عائشہ صدیقہؓ میں تحقیق کی عادت زیادہ تھی، اگر وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے بھی یہ الفاظ سنتیں تو خاموش نہ رہتیں، بلکہ اس کی تشریح کے طالب ہوتیں، اور تعارض میں قرآن مجید کی آیت بھی پیش کر دیتیں، مثلاً ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ حُوسِبَ عُذِّبَ جس کا حساب لیا گیا اس پر عذاب ہو گا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فوراً عرض کیا، کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن مجید میں یہ فرماتا ہے۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا (الانشقاق:۔ ۸) (جس شخص کے سیدھے ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائے گا) اس کا حساب آسان ہو گا۔

حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ یہ حدیث تو قرآن مجید کے خلاف معلوم ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آیت میں جس حساب کا ذکر ہے، وہ محض سرسری پیشی ہے، لیکن جس کی چھان بین کی گئی، تو اس پر عذاب ہونا لازمی ہے (صحیح بخاری) الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غلط فہمی کو اس طرح دور فرمایا کہ آیت میں حساب سے مراد سرسری پیشی ہے اور حدیث میں حساب سے مراد چھان بین ہے، اگر اتفاقاً یہ تعارض اس وقت رفع نہ ہو گیا ہوتا، اور یہ حدیث کسی دوسرے صحابی کی روایت سے حضرت عائشہؓ کو پہنچتی، تو وہ اپنی سمجھ کے مطابق تعارض میں آیت کو پیش فرما دیتیں، اور بعد میں آنے والوں کے لئے

یہ واقعہ غلط فہمی کا ایک سبب بن جاتا، بعد والے یہ سمجھتے کہ انہوں نے حدیث کو آیت کے خلاف سمجھ کر رد کر دیا، حالانکہ ان کی غلط فہمی سے بعد والوں کا حدیث کو مسترد کر دینا کسی طرح بھی صحیح نہ ہوتا، اگر کوئی حدیث بظاہر قرآن مجید کے مخالف بھی ہو اور ہمیں کوئی صورت تطبیق کی بھی معلوم نہ ہو، تب بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم حدیث کو مسترد کر دیں، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں یا تو حدیث کا مطلب نہیں آیا یا ہم آیت کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے، اور یہ ہماری کم فہمی ہے۔

الغرض اگر کوئی صحابی یا صحابیہ یا کوئی اور آیت و حدیث میں تعارض سمجھے، تو اس کی غلط فہمی کی وجہ سے یہ لازمی نہیں کہ وہ تعارض حقیقۃً بھی ہو، اور نہ ہم پر یہ لازم ہے کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا وہی ہم بھی سمجھیں اور اپنی کم فہمی کی وجہ سے یا محض تقلیداً حدیث کو مسترد کر دیں، حدیث کو پرکھنے کا یہ کوئی ٹھوس معیار نہیں، وہ حدیث جس کو برق صاحب نے پیش فرمایا ہے، اس کے سلسلہ میں ہم صرف اتنا بتائے دیتے ہیں کہ آیت میں مردوں کو سنانے کی نفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تو سنا سکتا ہے، اگر بطور معجزہ کے صرف اسی وقت آپ کی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے ان مردوں کو سنا دیا تو یہ بالکل ممکن ہے، یہ معجزہ آیت کے حکم عام کا مخصص ہوگا، نہ کہ متعارض۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"عروہ بن زبیر مدنی (وفات ۹۴ھ) سے کسی نے کہا کہ بقول ابن عباس رسول کریم صلعم نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ میں رہے تھے، تو عروہ بولے ابن عباس جھوٹ کہتا ہے" (دو اسلام ص۹۷)

ازالہ

عروہ بن زبیرؓ کے قول کے صحیح معنی تو یہی ہیں، کہ "ابن عباس سے خطا ہو گئی" لیکن بفرض محال اس کے معنی وہی کئے جائیں، جو برق صاحب نے کئے ہیں، تو پھر یہ بتلایئے کہ واقعی حضرت ابن عباسؓ جھوٹے تھے؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ میں رہے، حضرت ابن عباسؓ نے تو سچ بیان کیا، اور وہ سچے ہی تھے، تو اب کوئی شخص غلط فہمی سے سچ کو جھوٹ کہہ دے، تو یہ اس کہنے والے کا قصور ہے، نہ کہ سچ کہنے والے کا، عروہ بن زبیرؓ بھی ایک حد تک معذور ہیں، اس لئے کہ انہوں نے ابن عباس کی بات محض تقلیداً ماننے سے اعراض کیا، اور جو کچھ ان کو معلوم تھا اس کی بنا پر ابن عباس کی بات کو تسلیم نہیں کیا، یہ آزادئ رائے، اور تحقیق و تنقید ایک مستحسن فعل ہے، لیکن یہ بعد والے دیکھیں گے کہ تنقید صحیح بھی ہے یا نہیں، کون حق پر ہے، کون غلطی پر، اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ

ہی حق بجانب تھے، اور حضرت عروہ بن زبیرؓ سے خطا ہوگئی لیکن نہ حضرت ابن عباسؓ پر اس سلسلہ میں کوئی حرف آتا ہے، نہ حضرت ابن زبیرؓ پر، ہاں خطا کو جھوٹ کا جامہ پہنانے سے بے شک معاملہ بگڑ جاتا ہے اور یہاں برق صاحب کی غلط فہمی کا یہی موجب ہوا۔

برق صاحب کی پیش کردہ روایت صحیح مسلم کتاب الفضائل میں موجود ہے، اس میں یہ لفظ نہیں ہیں کہ "ابن عباسؓ جھوٹ کہتا ہے۔ بلکہ صرف یہ لفظ ہے" فغفرہ" یعنی ابن زبیرؓ نے ابن عباسؓ کے لئے مغفرت کی دعا کی، اس صحیح روایت کی موجودگی میں برق صاحب کی پیش کردہ روایت باطل ہے، جامع بیان العلم میں عروہ بن زبیرؓ کا یہ قول بے سند منقول ہے (جامع جلد ۲ صـ۱۵۵) لہٰذا اس کے جھوٹ ہونے میں کیا شبہ ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالبؓ سے کسی نے وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ کی تفسیر پوچھی، جب آپ بیان کر چکے تو سائل نے کہا، کہ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ کی تفسیر کچھ اور ہے، فرمایا "قد کذبا" انہوں نے جھوٹ بولا ہے" (دو اسلام صـ۹۷)

ازالہ

"قد کذبا" کا صحیح مطلب یہ ہے، کہ ان دونوں سے خطا ہوگئی، دوم یہ کہ لفظ "کذبا" مشکوک ہے، اس لئے کہ تفسیر ابن جریر میں یہ لفظ نہیں ہے (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صـ۴۹۲) سوم یہ کہ جامع بیان العلم میں یہ قول بے سند منقول ہے (جلد ۲ صـ۱۵۵) لہٰذا یہ روایت باطل ہے۔

غلط فہمی

حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مغیرہ بن شعبہ، عبادہ بن الصامت، اور ابو محمد مسعود بن اوس انصاری بدری کی سب روایات جھوٹی ہیں (دو اسلام صـ۹۷)

ازالہ

یہ روایت جھوٹی ہے، اور حضرت علی پر اتہام ہے، جامع بیان العلم جہاں سے برق صاحب نے یہ اقوال نقل کئے ہیں، اس میں یہ قول بھی بے سند ہے (جامع جلد ۲ صـ۱۵۵)

غلط فہمی

محمد بن جبیر بن مطعم کہتے ہیں، کہ میں نے امیر معاویہ کو عبداللہ بن عمرؓ کی ایک حدیث سنائی، جس پر معاویہ کو سخت غصہ آیا، اور لوگوں کو جمع کر کے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ ایسی احادیث بیان کر رہے ہیں، جو نہ رسول اللہ صلعم سے منقول ہیں، اور نہ تعلیماتِ قرآن کے مطابق، خبردار تم ان جاہلوں سے بچو، اور گمراہ کن آرزوؤں سے دور رہو" (صحیح بخاری جلد ۲ صـ۱۷۱) اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے زمانہ ہی میں احادیث کا چشمہ مکدر ہو چکا تھا، اقوالِ رسول کو مسخ کیا جا رہا تھا اور اہل نظر صحابہؓ کا اعتماد اٹھ چکا تھا، ورنہ امیر معاویہ ابن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو جاہل کیوں کہتے۔ (دو اسلام صـ۹۷-۹۸)

ازالہ برقی صاحب نے امیر معاویہؓ کا پورا بیان نقل نہیں کیا، حضرت امیر معاویہؓ نے اس کے بعد فرمایا۔

اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قُرَیْشٍ لَا یُعَادِیْھِمْ اَحَدٌ اِلَّا کَبَّہُ اللّٰہُ عَلٰی وَجْھِہٖ مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ (صحیح بخاری، کتاب الاحکام)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ حکومت قریش میں رہے گی جو شخص ان کی مخالفت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرے گا۔ جب تک قریش دین کو قائم رکھیں گے (یہ بات جاری رہے گی)۔

اس حدیث کی بنا پر امیر معاویہ سمجھے، کہ حکومت قریش میں رہے گی، لہٰذا عبداللہ بن عمرؓ کی اس بات پر انہیں یقین نہ آیا کہ کسی وقت ایک بادشاہ قحطانی بھی ہوگا، کیونکہ عبداللہ بن عمرؓ کی یہ بات ان کی سنی ہوئی حدیث سے ٹکراتی تھی، لہٰذا انہیں اس پر تعجب ہوا، انہوں نے کہا کہ یہ بات اس لئے غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی نہیں، نہ یہ کتاب اللہ میں ہے، اور پھر اس حدیث کے بھی خلاف ہے کہ خلافت قریش میں رہے گی، امیر معاویہؓ کے یہ الفاظ، کہ :۔

لَا تُؤْثَرُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (صحیح بخاری باب الاحکام)	یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی۔

اس بات پر دلالت کرتے ہیں، کہ امیر معاویہ یہ سمجھے کہ یہ عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے، لہٰذا انہیں غصہ آیا کہ عبداللہ بن عمرؓ ایسی بات کیوں کہتے ہیں جو حدیث میں نہیں، اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ عبداللہ بن عمرؓ اپنی طرف سے نہیں کہتے، بلکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سنا ہے، تو پھر وہ اس قسم کی تردید نہ کرتے۔ بے شک یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، کیونکہ یہ حدیث صحیح بخاری کتاب الفتن میں مذکورہ بالا حدیث سے کچھ پہلے ان الفاظ میں موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَخْرُجَ رَجُلٌ مِّنْ قَحْطَانَ یَسُوْقُ النَّاسَ بِعَصَاہُ (رواہ البخاری عن ابی ھریرۃ رضؓ)	قیامت قائم نہ ہوگی جب تک قحطان سے ایک شخص نہ نکلے گا وہ لوگوں کو اپنی لاٹھی سے ہانکے گا یعنی سختی کے ساتھ حکومت کرے گا۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا، کہ اس میں غلطی امیر معاویہ کی تھی، نہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی، امیر معاویہؓ نے بغیر تحقیق کے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بات پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خود

اپنی بیان کردہ حدیث پر بھی غور نہیں فرمایا، ان کی حدیث میں بھی یہ چیز موجود تھی کہ حکومت قریش میں اس وقت تک رہے گی، جب تک وہ دین کو قائم رکھیں گے، اور جب وہ دین کو قائم نہیں رکھیں گے، تو پھر غیر قریشی حکمراں ہوں گے، ان میں سے ایک قحطانی بھی ہوگا، امیر معاویہؓ نے بغیر کسی وجہ کے دونوں کو متعارض سمجھ لیا، بہر حال ان کی نیت بہت اچھی تھی۔ انہوں نے حدیث کے خلاف ایک بات سنی تو فوراً اس کی تردید کر دی، اگر حضرت عبداللہ کی بات بھی حدیث کی شکل میں ان کے پاس پہنچتی، تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے، بلکہ تطبیق کی کوشش کرتے۔

امیر معاویہؓ کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا، کہ صحابہؓ کے زمانہ میں احادیث کا چشمہ مکدّر ہو چکا تھا، کسی طرح صحیح نہیں، اس لئے کہ صحابہ اپنی سنی ہوئی احادیث بیان کرتے تھے، نہ کہ غیر صحابی سے سنی ہوئی، پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ اقوالِ رسول کو مسخ کیا جا رہا تھا، آخر مسخ کرنے والے کون تھے؟ خود صحابہ کرام! صحابہ کرام کے متعلق برق صاحب یہ تحریر فرماتے ہیں:۔

صحابہ میں کافی تعداد ایسے حضرات کی موجود تھی، جو محرف احادیث بیان کرنے کے خوگر تھے (دو اسلام ص ۹۸)

معاذ اللہ اس غلط فہمی کی بھی کوئی حد ہے، صحابہ کرام اور جھوٹ! اور وہ بھی اس ہستی پر جس کا وہ کلمہ پڑھتے تھے۔ مزید برآں برق صاحب نے یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ "اہل نظر صحابہ کا اعتماد اٹھ چکا تھا" گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ امیر معاویہؓ بمقابلہ عبداللہ بن عمروؓ اہل نظر تھے۔ یہ بھی قطعاً صحیح نہیں، امیر معاویہ خلیفہ اور سیاست دان سہی، لیکن عبداللہ بن عمرو کی شخصیت بہت بلند و بالا ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ اہل نظر حضرات کی فہرست میں حضرت عبداللہ کو شامل کیا جائے، اور امیر معاویہ اس میں شامل نہ ہوں، لیکن اس کا عکس تو کسی طرح صحیح نہیں۔

برق صاحب کو کتنی بڑی غلط فہمی ہوئی کہ صحابہ کرام کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف میں فرماتا ہے:۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (الفتح:- ۲۹)	صحابہ کفار پر سخت ہیں۔ آپس میں رحم دل ہیں اے رسول آپ دیکھتے ہیں کہ وہ رکوع کرتے ہیں سجدہ کرتے ہیں، اللہ کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہیں ان کی علامت یہ ہے کہ سجدوں کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑ گئے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے تذکار جلیلہ توریت میں بھی ہیں اور انجیل میں بھی۔

برق صاحب کچھ تو بتایئے، کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے ناقابلِ اعتماد، محرّف احادیث بیان کرنے والے، اپنے رسول کی طرف جھوٹ منسوب کرنے والے قابلِ تعریف ہو سکتے ہیں؟ کیا ایسے ہی لوگوں کا ذکر توریت میں ہے، انجیل میں ہے!

برق صاحب اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے۔

أَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ	تقوے کی بات کو ان سے چمٹا دیا ہے اور
بِهَا وَأَهْلَهَا (الفتح، ۲۶)	وہ اس کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

اللہ تعالیٰ تو یہ فرمائے کہ ان کے ہاتھ سے تقوی کا دامن نہیں چھوٹتا، اور آپ یہ سمجھیں کہ وہ جھوٹی احادیث بیان کرتے تھے، وہ ناقابل اعتماد ہو گئے تھے، وہ جاہل تھے، یہ کہاں تک صحیح ہے، اگر کسی صحابی نے بفرضِ محال کسی دوسرے صحابی کو جوش میں آکر یہ کہہ دیا ہے کہ وہ غلط کہتے ہیں، یا وہ جاہل یعنی نادان ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حقیقت میں بھی ایسے ہی ہیں، برق صاحب آپ نے تو صرف یہی کہا ہے کہ صحابہ کرام ناقابل اعتماد تھے، محرّف احادیث بیان کرتے تھے، کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں، کہ صحابہ کرام مرتد ہو گئے تھے، قرآن مجید میں تحریف کرتے تھے، حتیٰ کہ موجودہ قرآن مجید انہی کا تحریف شدہ قرآن ہے، اصل قرآن نہیں ہے، نعوذ باللہ! برق صاحب پھر سوچیئے، کہ آپ نے صحابہ کرام کے متعلق جو رائے قائم کی ہے، کیا وہ قرآن مجید کی روشنی میں صحیح ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"جب سمرہ کی یہ حدیث کانت للنبی سکتتان عند قراءته فی الصلوٰۃ حضور قرأت نماز میں دو مرتبہ سکتہ (ٹھہرنا، وقفہ کرنا) فرمایا کرتے تھے" حضرت عمران بن الحصین (وفات ۵۲ھ) نے سنی تو کہا "کذب سمرۃ" سمرہ جھوٹا ہے۔"

(دو اسلام صفحہ ۹۸)

ازالہ یہاں بھی "کَذَبَ سَمُرَۃُ" کا ترجمہ "سمرہ جھوٹا ہے" صحیح نہیں، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ "سمرہ سے خطا ہو گئی" "کذب کے معنی ہر جگہ جھوٹ کرنا ہی تو اصلی غلط فہمی ہے، پھر اس حدیث کے صحیح الفاظ نقل نہیں کئے گئے، صحیح الفاظ درج ذیل ہے۔

إِنَّ سَمُرَةَ بْنَ جُنْدُبٍ وَعِمْرَانَ ابْنَ	حضرت سمرہؓ اور حضرت عمرانؓ میں مذاکرہ ہوا
حُصَيْنٍ تَذَاكَرَا فَقَالَ سَمُرَةُ بْنُ جُنْدُبٍ	سمرہؓ نے کہا مجھے یاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
حَفِظْتُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ	علیہ وآلہ وسلم دو سکتے کرتے تھے، ایک تکبیر تحریمہ

وَعَلَّمَ سَكْتَتَيْنِ فِي الصَّلٰوةِ سَكْتَةً إِذَا كَبَّرَ الْإِمَامُ حَتّٰى يَقْرَأَ وَسَكْتَةً إِذَا فَرَغَ مِنْ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُوْرَةٍ عِنْدَ الرُّكُوْعِ فَأَنْكَرَ عِمْرَانُ بْنُ حُصَيْنٍ فَكَتَبُوْا فِيْ ذٰلِكَ إِلٰى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ فَصَدَّقَ سَمُرَةَ

(ابو داؤد، ملخصاً صفحہ ۱۲۰)

کے بعد اور دوسرا فاتحہ اور سورت کے بعد. تو حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے اس کا انکار کیا۔ پھر انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھا حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصدیق کی۔

اصل واقعہ تو اس طرح ہے، اور اس میں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، اگر حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ بھی دیا کہ سمرہ غلط کہتے ہیں. تو کیا ہوا، غلطی پر ایک ضرور تھا، اور یہاں غلطی پر وہ نکلے جو دوسرے کو غلطی پر سمجھ رہے تھے۔ لہٰذا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی صحابی کسی دوسرے صحابی کو غلطی پر سمجھے، اور ہو وہ خود غلطی پر، اس قسم کے اقوال سے کسی صحابی کی تکذیب نہیں ہوتی، نہ یہ کوئی دلیل ہے۔ کسی شخص کی غلط فہمی کی بنا پر حق ڈالے کو ناحق سمجھنا تحقیق کا خون کرنا ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی "حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ کے متعلق محمد بن اسحاق کہا کرتے تھے، کہ وہ جھوٹا ہے، اور امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ ابن اسحاق دجال ہے"

(دو اسلام صہ ۹۹)

ازالہ یہ دونوں قول جھوٹ ہیں۔ امام بخاری نے اس قول کی صحت کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ لکھتے ہیں موضوع "اگر صحیح ہو، پھر صحیح فرض کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ مولوی شرف الدین صاحب لکھتے ہیں "اول تو اس روایت کی شروع سے سند مذکور نہیں ...... تا وقتیکہ سند مذکور نہ ہو کر صحت نہ ہو قابل وثوق نہیں" (برق اسلام صہ ۱۴۹) غرض یہ کہ یہ قول بے سند ہے۔

برق صاحب فرماتے ہیں۔

غلط فہمی "امام ابو حنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ جابر جعفی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے فرمایا "کذاب"۔ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔ (دو اسلام صہ ۹۹)

ازالہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بے شک صحیح فرمایا، جابر الجعفی واقعی کذاب تھا. حدیثیں گھڑتا تھا۔ برق صاحب نے شاید اس کو بھی محدث سمجھا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

غلط فہمی الاعمش حدیث کا امام تھا، علی بن خشرم المروزی (وفات ۲۵۷ھ) فضل بن موسی السینانی المروزی سے روایت کرتا ہے، کہ ایک مرتبہ الاعمش بیمار

پڑھ گئے، تو فضل بن موسیٰ اور امام ابو حنیفہ اس کی عیادت کو گئے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا، اگر میرا آنا آپ کو ناگوار نہ گذرتا، تو میں ہر روز آتا۔ اعمش نے جھٹ کہا، مجھے تو تیرا اپنے گھر میں بھی رہنا گوارا نہیں۔

"الاعمش کے متعلق امام ابو حنیفہ کی رائے یہ تھی، کہ وہ نہ روزے رکھتا ہے، اور نہ جنابت کے بعد غسل کیا کرتا ہے، یعنی ایک فاسق اور نجس سا آدمی ہے" (دو اسلام ص۹۹)

ازالہ | اول تو ترجمہ غلط کیا گیا ہے لیکن ہم ترجمہ کی صحت اور عدم صحت پر تو بحث جب کریں جب یہ روایت ثابت بھی ہو، یہ روایت سر تا پا جھوٹ اور افتراء محض ہے، اس کی سند میں ایک تو سلمہ بن قاسم ضعیف العقل تھے، دوسرے محمد بن احمد بن فیروز مجہول ہیں، پھر احمد بن عیسی نام کے کئی آدمی ہیں، نہ معلوم یہ کون صاحب ہیں، اور کیسے ہیں (برق اسلام ص۱۵۲) غرض یہ کہ پوری سند واہی تباہی ہے۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"سعید بن مسیب بن المدنی (وفات ۱۰۵ھ) اور حسن بصری، عکرمہ (وفات ۱۰۷ھ) کو جھوٹا کہا کرتے تھے، اور یہ ان کو کذاب سمجھتا تھا" (دو اسلام ص۹۹)

ازالہ | یہ روایت بھی جھوٹی اور افتراء محض ہے، جامع بیان العلم میں اس کی کوئی سند منقول نہیں (جامع جلد ۲ ص۱۵۶) معلوم نہیں برق صاحب ایسی بے سند باتیں کیوں نقل کرتے ہیں۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"قتادہ (وفات ۱۱۸ھ)، یحیی بن ابی کثیر (وفات ۱۲۹ھ کو جھوٹا سمجھتا تھا اور یہ اسے" (دو اسلام ص۱۰۰)

ازالہ | یہ روایت بھی ثابت نہیں، جامع بیان العلم میں، اوّل تو یہ الفاظ نہیں، دوم اس کی سند بھی منقطع ہے۔ (جامع جلد ۲ ص۱۵۷)

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اصمعی کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ سلیمان التیمی (وفات ۱۴۳ھ) کے ہاں ابن عروبہ کا ذکر چل پڑا، تو اصمعی نے کہا کہ ابن عروبہ اور اس کے استاد قتادہ دونوں جھوٹے ہیں"۔ (دو اسلام ص۱۰۰)

ازالہ | یہ روایت بالکل جھوٹی ہے، اس کا ایک راوی زہیر بن اسحاق ہے اور وہ ضعیف ہے۔ (لسان المیزان)

غلط فہمی یحییٰ بن معین پہلا محدث ہے، جس نے راویوں کے حالات قلمبند کئے تھے، آپ امام شافعیؒ کے متعلق فرماتے ہیں۔ "ھولیس بثقۃ آپ کی روایات قابلِ اعتماد نہیں" (دو اسلام ص۱۰۱)

ازالہ ابن معین نے ابراہیم بن محمد شافعی کو غیر ثقہ کہا ہے، نہ کہ امام محمد بن ادریس شافعیؒ کو (برق اسلام ص۱۶۰) برق صاحب کو شافعی کے الفاظ سے بڑی زبردست غلط فہمی ہوئی۔ جس راوی سے ابن معین کا قول شافعی کے غیر معتبر ہونے کے متعلق نقل کیا گیا ہے، اسی راوی نے اپنی کتاب میں ابن معین کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ امام شافعی ثقہ ہیں۔ (جامع بیان العلم، جلد ۲ ص۱۶۰)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
"حضرت امام مالک پر ابن ابی ذئبؒ ابراہیم بن سعد اور ابراہیم بن ابی یحییٰ نے سخت نکتہ چینی کی ہے۔" ص۱۰۱)

ازالہ یہ روایت بھی باطل ہے، اس لئے کہ بے سند ہے۔
(برق اسلام ص۱۵۹)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
"الساجی کتاب العلل میں لکھتا ہے، کہ عبد العزیز بن سلمہ، عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم، ابن اسحاق، ابن ابی یحییٰ اور ابن ابی الزناد۔ امام مالک کی حدیث کو اس لئے قابل اعتماد نہیں سمجھتے، کہ آپ نے ثور بن یزید اور سعد بن ابراہیم جیسے جھوٹے راویوں سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔" (دو اسلام ص۱۰۱)

ازالہ یہ روایت بھی جعلی ہے، امام مالک نے موطا کو تمام ائمہ کے سامنے پیش فرمایا تھا، اور سب نے موافقت کی تھی، اسی لئے اس کا نام موطا رکھا گیا، اگر یہ ائمہ دین امام مالک کی حدیث کو قابلِ اعتماد نہ سمجھتے، تو پھر یہ موطا کی صحت کی تائید بھی نہ کرتے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
امام ابو حنیفہ کے استاد حماد بن سلیمان سے کسی نے پوچھا، کہ حجاز کے محدثین عطاء، طاؤس اور مجاہد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ تو کہا "وصبیانکم اعلم منھم" تمہارے نادان بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں" (دو اسلام ص۱۰۱)

ازالہ یہ روایت بھی باطل ہے، اس کی سند میں احمد بن فضل بن عباس جھوٹا ہے (برق اسلام ص۱۶۰) دوسرا راوی محمد بن حمید رازی ضعیف ہے۔ (تقریب)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"امام شعبی کوفی کے ہاں امام ابراہیم نخعی کوفی (وفات ۹۵ھ) کا ذکر آیا، تو کہنے لگا، یہ یک چشم رات کے وقت ہر مسئلہ مجھ سے پوچھ جاتا ہے اور دن کے وقت لوگوں پر اپنی علمیت کا رعب گستا رہتا ہے، نخعی کو یہ بات پہنچی، تو اس نے کہا "ھو کذاب" وہ مہا جھوٹا ہے" (دو اسلام ص۱۰۱)

ازالہ یہ روایت بھی جھوٹی ہے، اس کی سند میں احمد بن فضل جھوٹا ہے، دوسرا راوی قاسم بن محمد بن ابی شیبہ مجروح و متروک ہے (برق اسلام ص۱۴۹)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"جابر بن یزید کا قول ہے، کہ میرے پاس ستر ہزار احادیث ایسی ہیں، جن کا راوی صرف ابو جعفر ہے"۔ (فتح الملہم ص۱۳۵) (دو اسلام ص۱۰۱)

ازالہ مذکورہ بالا قول کا قائل جابر بن یزید ہے جو جابر جعفی کہلاتا ہے، یہ رافضی ہے اور مشہور کذاب ہے، اس کا یہ بیان امام ابو جعفر باقر پر اتہام ہے۔

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں

"ابو جعفر الہاشمی المدنی کی رائے یہ تھی، کہ عمرو بن عبید جھوٹا ہے" (دو اسلام ص۱۰۱ بحوالہ فتح الملہم ص۱۳۷)

ازالہ یہ قول حضرت ابو جعفر کا بالکل صحیح ہے اس لئے کہ عمرو بن عبید واقعی جھوٹا، معتزلی اور متروک ہے۔ (التقریب)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

عبید اللہ بن زیاد عنبری کہتے ہیں، کہ میں نے شعبہ (وفات ۱۶۰ھ) کو لکھا، کہ واسط کے قاضی ابی شیبہ کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ جواب میں لکھا "اس کی کوئی حدیث مت لکھو، اور میرا یہ خط ضائع کر دو۔ (دو اسلام ص۱۰۱ بحوالہ فتح الملہم ص۱۳۸)

ازالہ قاضی ابی شیبہ واقعی کذاب ہے، وہ ائمہ حدیث میں سے نہیں ہے، برق صاحب نے بلا وجہ اس کو نقل کیا، ان کا مقصد تو محدثین پر جرح کرنا ہے، نہ کہ کذابین پر، اور یہاں وہ منجملہ اور مقامات کے ایک کذاب پر جرح نقل کر گئے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

عفان کہتے ہیں کہ میں نے صالح المری کے سامنے حماد بن سلمہ بصری

(وفات ۱۶۷ھ) کی بیان کردہ احادیث پیش کیں، تو اس نے کہا وہ جھوٹا ہے"
(فتح الملہم ص ۱۳۸) (دو اسلام ص ۱۰۲)

ازالہ صالح المری خود ناقابلِ اعتماد بلکہ متروک ہے (قانون الموضوعات ص ۲۶۳) اس کی بات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
"یزید بن ہارون بیان کرتا ہے کہ زیاد بن میمون نے ایک ہی حدیث مجھے تین مختلف موقعوں پر سنائی اور ہر مرتبہ نئے راوی جوڑ دیئے، چنانچہ میں نے قسم کھالی کہ آئندہ اس کی کوئی حدیث بیان نہیں کروں گا"۔ (فتح الملہم ص ۱۳۹) (دو اسلام ص ۱۰۲)

ازالہ زیاد بن میمون کذاب ہے (قانون الموضوعات لابن طاہر ص ۲۵۷) لہٰذا اس پر جرح کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، نہ معلوم محدثین کی فہرست میں برق صاحب ان لوگوں کو کیوں لے آتے ہیں جو محدثین کے نزدیک کذّاب ہیں، غالباً غلط فہمی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
"علی بن مسہر کوفی کہتا ہے، کہ میں نے اور حمزۃ الزیات نے ابان بن ابی عیاش سے تقریباً ایک ہزار احادیث سنی تھیں، حمزہ بیان کرتا ہے کہ ایک رات خواب میں حضور علیہ السلام کے دیدار نصیب ہوئے، میں نے وہ تمام احادیث آنحضرت کو سنائیں، حضور نے صرف پانچ یا چھ کو صحیح قرار دیا اور باقی کے متعلق فرمایا، کہ میں انہیں نہیں پہچانتا"۔ (دو اسلام ص ۱۰۲)

ازالہ ابان بن ابی عیاش بے حد ضعیف، متروک، بلکہ کذّاب ہے (قانون الموضوعات لابن طاہر ص ۲۳۱ و تقریب)، لہٰذا برق صاحب کا ابان بن ابی عیاش کو محدثین کی ذیل میں پیش کرنا زبردست غلط فہمی ہے، ان کے باب کی سرخی یہ ہے "کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق" لیکن اکثر وہ ان راویوں پر جرح نقل کرتے ہیں جو ائمہ حدیث تو کجا معتبر بھی نہیں ہوتے، بلکہ کذّاب و وضاع ہوتے ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
"ابو اسحٰق الفزاری فرماتے ہیں، کہ صرف مشہور اور معتبر راویوں کی احادیث بیان کرو، لیکن اگر اسماعیل بن عیاش مشہور راویوں سے بھی کوئی حدیث روایت کرے تو مت مانو، لیکن یحییٰ بن معین کہتے ہیں، کہ اسماعیل ثقہ (قابل اعتماد) ہے"۔ (دو اسلام ص ۱۰۱)

ازالہ اسماعیل بن عیاش شام کے محدث ہیں، علمائے شام کی احادیث انہوں نے بہت

اچھی طرح محفوظ کر لی تھیں اور اس میں غلطی نہیں کرتے تھے، اسی لئے امام بخاری فرماتے ہیں "حدیثہ عن الشامیین صحیح" یعنی ان کی شامیوں سے بیان کردہ احادیث صحیح ہیں، اور انہی معنوں میں یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے، حجازی محدثین کی روایت کو وہ اچھی طرح محفوظ نہ کر سکے، لہٰذا اس میں ان سے غلطی ہو جایا کرتی تھی، یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے ان کی اہل حجاز سے روایت کردہ احادیث کو صحیح نہیں سمجھا (قانون الموضوعات ص۲۴۷) ان ہی معنوں میں ابو اسحاق فزاری نے ان کو نا قابل اعتماد قرار دیا، برق صاحب آپ کو تو محدثین کو داد دینی چاہیئے تھی، کہ ایک معتبر راوی کو بھی انہوں نے بعض حالات میں غیر معتبر قرار دیا، اور باریک بینی کی انتہا کر دی۔ اپنے کو دھوکہ سے محفوظ رکھا، اور حدیث کی حفاظت پر آنچ نہ آنے دی۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"محمد بن عبد الرحمن کے متعلق امام مالک کی یہ رائے ہے کہ وہ ثقہ نہیں لیکن ابو زرعہ اسے ثقہ سمجھتے ہیں" (دو اسلام ص۱۰۲-۱۰۳) اس کے بعد برق صاحب نے چار نام اور دئیے ہیں، جن کو کسی نے ثقہ کہا، اور کسی نے غیر ثقہ، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"کہاں تک گنوں، سینکڑوں ایسے راوی ہیں، جنہیں ایک جماعت سچا سمجھتی ہے، اور دوسری جھوٹا...... کس کی سنیں اور کس کی نہ سنیں" (دو اسلام ص۱۰۳)

ازالہ محدثین اگر کسی شخص کی توثیق میں اختلاف کرتے ہیں، تو یہ مختلف حالات کے ماتحت ہوتا ہے، مثلاً (۱) ایک امام نے کسی راوی کو جوانی کی حالت میں دیکھا، حفظ و اتقان میں معتمد سمجھا، لہٰذا اس کو ثقہ کہہ دیا۔ دوسرے امام نے اس راوی کو بڑھاپے کی حالت میں دیکھا، حافظہ کمزور ہو چکا تھا، غلطی کرنے لگے تھے، لہٰذا اس امام نے اس کو غیر ثقہ کہہ دیا، اب اس کی جوانی کے ایام میں روایت کردہ حدیث قابل اعتماد ہو گی، اور بڑھاپے کی نہیں، تاوقتیکہ دوسرے قرائن سے اس کا ضعف دور نہ کر دیا جائے۔

(۲) ایک امام نے کسی راوی کے متعلق کہا کہ فلاں شخص کے حق میں ثقہ ہے، دوسرے امام نے اس کو کسی دوسرے شیخ کے حق میں غیر ثقہ قرار دیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے شیخ کے پاس وہ باقاعدگی سے احادیث حاصل کرتا رہا، برخلاف اس کے دوسرے شیخ کے پاس وہ کافی عرصہ نہ رہ سکا، جو کچھ اس سے حاصل کیا، وہ سرسری مطالعہ تھا۔

(۳) بعض راوی ایسے بھی ہیں، جن کا حافظہ ان کی کتابیں جل جانے کے صدمہ سے

خراب ہو گیا۔ اب اگر ایک محدث اس کو ثقہ کہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کتابیں جلنے سے پہلے وہ بالکل قابل اعتماد تھا اور اس زمانہ میں اس کی روایت کردہ احادیث صحیح تھیں، اور اگر کسی محدث نے اس کو ضعیف کہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کتابیں جلنے کے بعد وہ قابل اعتماد نہیں رہا، اس کی روایت کردہ احادیث مشکوک ہو گئیں۔ یہ اختلاف بھی کوئی وقیع اختلاف نہیں، تحقیق کرنے سے ہر بات کھل کر سامنے آجاتی ہے، اور کسی قسم کا دھوکا نہیں ہوتا۔

اگر کسی امام نے کسی راوی کو صادق کہا، دوسرے نے غیر ثقہ کہا، یہ بھی اختلاف نہیں ہے، اس لئے کہ محض صادق ہونے سے ثقہ ہونا لازم نہیں آتا، اس قسم کے اختلافات سے فن حدیث پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ یہ اختلاف وقیع ہے تو اس صورت میں تحقیق سے اس کا فیصلہ ہو گا کہ کس امام سے اس کی جرح یا تعدیل میں غلطی ہوئی، محض اس امام کی غلط فہمی یا غلط اطلاع پر فیصلہ نہ ہو گا۔ اگر فیصلہ کرنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو (حالانکہ یہ بھی مفروضہ ہے) تو پھر وہ حدیث ضعیف تصور کی جائے گی۔ اس کے ضعف سے صحیح، ثابت شدہ احادیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، دین کے لوازمات اسی حدیث سے ثابت ہوں گے جو صحیح و ثابت شدہ ہو گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، لہٰذا جو چیز صحیح و ثابت ہو گی، وہی عنداللہ محفوظ ہو گی، اور جو چیز ضعیف ہو گی، وہ گویا غیر محفوظ ہو گی اور عنداللہ دین میں شامل نہ ہو گی، برق صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا کہ اگر بعض خبریں غلط ہوں، تو گویا سب ہی غلط ہیں، کسی طرح صحیح نہیں، اگر یہ مان لیا جائے، تو دنیا کا انتظام درہم برہم ہو جائے، جو غلط ہو گی وہ اس لئے غلط ہو گی کہ اس کا جھوٹ ہونا ثابت ہو جائے گا، اور جو صحیح ہو گی، وہ اس لئے صحیح ہو گی کہ اس کی صحت کے لئے شواہد ہوں گے۔ دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا خلاف عقل و تجربہ ہے۔

خلاصہ باب چہارم

برق صاحب نے بعض ائمہ دین پر بعض ائمہ دین کی جرح نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نہ ائمہ کا اعتبار رہے، نہ ان کی جرح و تعدیل کا، یہ سارا علم ہی بے کار ہے، نہ کوئی عالم ہے، نہ کوئی علم، وہ لکھتے ہیں:۔

"ائمہ حدیث اور صحابہ کرام کے فتوے ایک دوسرے کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں تو جو احادیث ان صحابہ، ان ائمہ، اور ان دلچسپ راویوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی

ہیں انہیں وحی سمجھ کر شور مچانا، کہ یہ اسوۂ رسول ہے' یہ مفصل ہے اور قرآن مجمل، یہ شارح ہے اور قرآن متن، کہاں تک جائز ہے" (دو اسلام ص۱۰۳)

صحابہؓ تو صحابہؓ ہیں، ان پر اعتماد نہ کرنا۔ یا ان کو کاذب، محرف احادیث بیان کرنے والا سمجھنا، قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف ہے، قرآن مجید کی یہ تصریحات اس باب میں اوپر گذر چکی ہیں، اوپر ہم یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ ائمہ دین کی ائمہ دین پر جرح کے جتنے اقوال ہیں، وہ سب جھوٹ ہیں' یہ بھی پہلے لکھا جا چکا ہے، کہ ان میں سے بعض کو برق صاحب نے ائمہ حدیث شمار کیا ہے، حالانکہ وہ ائمہ حدیث نہیں، بلکہ دشمنان دین، کذاب و وضاع ہیں، تمام روایتیں جو ائمہ دین کے متعلق بیان ہوئی ہیں، وہ ان لوگوں کی مخترعہ ہیں' جو حدیث اور ائمہ حدیث یعنی اسلام کے دشمن تھے، اور ائمہ حدیث کو بدنام کر کے دین کو بگاڑنا چاہتے تھے، برق صاحب نے ان تمام خرافات کو جمع کر دیا، اور یہ تحقیق نہیں کی، کہ ان اقوال کی سندوں میں کیسے کیسے دجال پوشیدہ ہیں، کاش برق صاحب نے لکھنے سے پہلے تحقیق کر لی ہوتی۔

مذکورہ بالا نتیجہ نکالنے کے باوجود برق صاحب نے اسی باب میں اعتراف کیا ہے کہ:۔

"ائمہ حدیث میں ایسے بزرگ بھی پائے جاتے ہیں' جن پر ملت اسلامیہ کو ہمیشہ ناز رہا ہے' ان کا علمی مقام اتنا بلند اور ان کے ثقافتی کارنامے اتنے عظیم ہیں' کہ ہمیں ان پہ تنقید کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی" (دو اسلام ص۹۴)

برق صاحب یہی وہ ائمہ حدیث ہیں جو ہمارے نزدیک بھی ائمہ حدیث ہیں، اور یہ دلچسپ راوی نہیں ہیں' ان ہی کی روایت کردہ احادیث ہیں جن کو ہم مستند سمجھتے ہیں، اور ان ہی ائمہ کے واسطے سے جو دین پہنچا' اس کے متعلق اعلان کرتے ہیں کہ یہ وحی ہے، اسوۂ رسول ہے، یہ مفصل ہے' اور قرآن مجید مجمل' یہ شارح ہے اور قرآن مجید متن، اب بتائیے' ہمارا یہ کہنا صحیح ہے نہیں؟ آپ ہی جواب دیں گے کہ بے شک صحیح ہے' اس لئے کہ آپ کو خود اعتراف ہے۔

"حدیث کا مضمون صحیح ہو' اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (دو اسلام ص۲۴۱)

"اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں' جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں"۔ (دو اسلام ص۲۴۲)

"یہ تمام تفاصیل حدیث میں ملتی ہیں' اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پر ہم نازاں ہیں' اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں" (دو اسلام ص۲۴۳)۔

باب ۵

حدیث پر ایک مکالمہ

اس باب میں برق صاحب نے ایک مکالمہ تحریر فرمایا ہے، برق صاحب نے اس مکالمہ میں اپنے لئے حرف "ب" استعمال کیا ہے اور جن مولوی صاحب سے یہ مکالمہ ہُوا اُن کے لئے حرف "م" استعمال کیا ہے، معلوم نہیں، یہ مکالمہ فرضی ہے یا واقعی، اگر فرضی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کے جوابات بھی فرضی ہیں اور ان کا کمزور ہونا لازمی ہے اور اگر مکالمہ فرضی نہیں تو پھر جو مولوی صاحب برق صاحب کے ہاں تشریف لاتے تھے، وہ برق صاحب کی اصطلاح میں ملّا ہوں گے، نہ کہ عالم دین۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

غلط فہمی

"برق :- وحی کے اصطلاحی معنی کیا ہیں ؟

م :- پیغام

ب :- بہت اچھا! جب قرآن بھی پیغام خدا ہے، اور حدیث بھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ نے قرآن کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کے لئے تمام تر انسانی وسائل اختیار کئے لیکن حدیث کو نہ صرف نظر انداز کر دیا، بلکہ حضورؐ نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا، اور صدیق و فاروق نے احادیث کو مٹانے اور جلانے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ حدیث اللہ کا پیغام ہو، اور صحابہ اُسے جلاتے پھریں، یعنی چہ ؟" (دو اسلام ص ۱۰۴-۱۰۵)

ازالہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کرام نے حدیث کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کے لئے بھی تمام انسانی وسائل اختیار کئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے خود احادیث تحریر فرمائیں۔ صحابہ کو لکھنے کا حکم دیا (مفصل جواب، بابِ اوّل میں ملاحظہ فرمائیں) احادیث کی حفاظت کے لئے احکام دیئے۔ مثلاً ایک موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا :-

اِحْفَظُوْهُنَّ وَاَخْبِرُوْهُنَّ مَنْ وَّرَآءَكُمْ (صحیح بخاری کتاب الایمان) — ان کو محفوظ کر لو اور اپنے پیچھے رہنے والوں کو بھی مطلع کر دو۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:۔

وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰى اَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ اَوْعٰى لَهٗ مِنْهُ (صحیح بخاری، کتاب العلم) — حاضر غائب کو یہ احکام پہنچا دے، کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کو پہنچایا جائے وہ پہنچانے والے سے زیادہ محفوظ کر لیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو بعض لوگوں نے احادیث لکھنے سے منع کیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کو خبر پہنچی تو ارشاد فرمایا:۔

اُكْتُبْ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا الْحَقُّ (ابو داؤد، ج ۲ ص۱۵۸ و رجالہ ثقات) — ضرور لکھا کرو۔ اس لئے کہ اللہ کی قسم اس منہ سے حق کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہُوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم احادیث لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے، برق صاحب کو ایک روایت کی بنا پر یہ غلط فہمی ہوئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا، حالانکہ آپ نے قرآن مجید کے ساتھ مخلوط کر کے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا، (تفصیل کے لئے باب اوّل ملاحظہ ہو) یہ بھی صحیح نہیں کہ صحابہ کرام احادیث جلایا کرتے تھے (تفصیل کے لئے باب اوّل ملاحظہ فرمائیں۔)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "م:۔ فلاں عالم، فلاں مجتہد اور فلاں امام نے حدیث کو وحی خفی کہلہے آپ کون ہیں جو انکار کرتے ہیں؟" (دو اسلام ص۱۰۵)

ازالہ مولوی صاحب کا یہ جواب مقلدانہ جواب ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مولوی صاحب جن سے برق صاحب کا مباحثہ ہُوا عالم نہیں تھے بلکہ مقلد تھے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "ب:۔ مجھے سچائی سے معاندت نہیں، بات کو واضح کیجئے اور میں ابھی آپکا ہم خیال بن جاتا ہوں۔ اگر حدیث وحی تھی تو اسے قرآن کے متن میں کیوں شامل نہ کیا گیا، وہ بھی اللہ کا پیغام، یہ بھی اللہ کا پیغام، پھر فرق کیا تھا؟" (دو اسلام ص۱۰۵)

ازالہ قرآن متن ہے اور حدیث شرح ہے، متن اور شرح کو ایک کر دینا مضحکہ خیز ہے، کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ تمام قوانین اور فرامین (ACTS AND ORDINANCES) کو دستور CONSTITUTION میں شامل کر دیا جائے؟ پھر

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہوگی کہ تمام ذیلی قواعد و ضوابط RULES AND REGULATIONS کو جو کسی قانون (ACT) یا فرمان (ORDINANCE) کے ماتحت وضع کئے جائیں۔ دستور میں شامل کرلیا جائے، نہ ایسا ہوا ہے نہ ہوگا۔ قرآن مجید کی حیثیت بنیادی اصول کی ہے، اور حدیث اس کی عملی تشریح اور توضیح ہے، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "ب۔ اللہ نے یہ دو قسم کے پیغامات کا سلسلہ کیوں شروع کیا تھا، کیا اللہ کے خزانے میں الفاظ کی کمی ہوگئی تھی، یا کوئی خاص مصلحت اس دو رنگی کی متقاضی تھی" (دو اسلام صفحہ ۱۰۵-۱۰۶)

ازالہ اللہ تعالےٰ کی مصلحت تو اللہ تعالےٰ ہی جانتا ہے، بہرحال کسی کتاب کی عملی تشریح کے لئے تشریح کے الفاظ کا مخصوص و متعیّن ہونا کسی کے نزدیک بھی ضروری نہیں، بس صرف اتنا کافی ہے کہ جو تشریح کی جائے وہ صحیح ہو، اور یہ کام اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

ارشاد باری ہے:۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ (النساء:۔ ۱۰۵)

ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کی روشنی میں جو اللہ آپ کو بتلائے فیصلہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

هُوَ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ عَلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ مِنْهُ ءَايَٰتٌ مُّحْكَمَٰتٌ هُنَّ أُمُّ ٱلْكِتَٰبِ وَأُخَرُ مُتَشَٰبِهَٰتٌ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَٰبَهَ مِنْهُ ٱبْتِغَآءَ ٱلْفِتْنَةِ وَٱبْتِغَآءَ تَأْوِيلِهِۦ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُۥٓ إِلَّا ٱللَّهُ وَٱلرَّٰسِخُونَ فِى ٱلْعِلْمِ يَقُولُونَ ءَامَنَّا بِهِۦ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُو۟لُوا۟ ٱلْأَلْبَٰبِ (آل عمران:۔ ۷)

وہ اللہ ہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اس کتاب میں بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیات کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ اس کے ذریعہ فتنہ برپا کریں اور ان کے معانی تلاش کریں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات کے معانی سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور جن لوگوں کو علم میں رسوخ ہے وہ اس طرح کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور عقلمندوں کے علاوہ دوسرے لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

مندرجہ بالا آیت سے ثابت ہُوا کہ قرآن مجید میں دو قسم کی آیات ہیں، محکم اور متشابہ محکم کے معنی لوگ جانتے ہیں لیکن متشابہ کے معنی اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو شخص ان آیات کے معنی کی جستجو کرتا ہے وہ فتنہ پرور ہے۔ اس کے دل میں کجی ہے۔ یہاں بھی سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کا دو قسم کی آیات بھیجنے سے کیا مقصد تھا؟ کیا اللہ تعالےٰ کے خزانے میں آیات محکمات کی کمی تھی۔ آخر کیا بات تھی جو اس قسم کی آیات نازل فرما دیں جو انسانوں کے کام کی نہیں، انسان ان کا مطلب نہیں سمجھتے، لہٰذا ان کے نزول سے فائدہ؟ ان سوالات کا جواب ایک ہی ہے، کہ "ہم ان پر ایمان لاتے ہیں یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ان کے نزول میں کیا مصلحت ہے، مصلحت اللہ ہی جانتا ہے"۔ بالکل اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن وحی جلی ہے، اور حدیث وحی خفی، ہم دونوں پر ایمان لائے، دونوں اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے ہیں ہم نہیں جانتے کہ جلی اور خفی کی تقسیم میں کیا مصلحت ہے، مصلحت اللہ ہی جانتا ہے، اور بس۔ اگر اب بھی ہم مصلحت کی جستجو کے درپے ہوں گے تو پھر جو اعتراض حدیث پر ہے وہی قرآن مجید پر ہوگا۔ (نعوذ باللہ)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

غلط فہمی "قرآن کے متعلق اللہ کا یہ ارشاد موجود ہے إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" یہ ذکر اور یہ ہدایت ہم نے نازل کی، اور ہم اس کی حفاظت کریں گے۔" (دو اسلام صہ۱۰۷)

ازالہ یہ ارشاد قرآن مجید کے متعلق نہیں، بلکہ ذکر کے متعلق ہے۔ ذکر کے معنی ہیں نصیحت کیونکہ نصیحت میں حدیث بھی شامل ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ حدیث کا بھی محافظ ہے

غلط فہمی قرآن کی ایسی حفاظت ہوئی کہ تمام عالم نے اس کتاب کی صحت پر شہادت دی، لیکن حدیث تو یہ ہی بھلی، اس کا تو وہ ستیاناس ہُوا کہ اس سے زیادہ محرف، بریدہ، تراشیدہ اور مسخ شدہ لٹریچر دنیا کے صفحے پر موجود نہیں۔ (دو اسلام صہ۱۰۸)

ازالہ حدیث کی بھی ایسی ہی حفاظت ہوئی، اور تمام عالم نے اس کی صحت کی شہادت دی۔ ہاں اگر برق صاحب چند لوگوں کے اقوال سے معارضہ کریں، تو پھر چند لوگوں کے اقوال سے ہم بھی معارضہ کر سکتے ہیں۔ معاندین کو چھوڑیئے۔ خود کلمہ پڑھنے والوں کا ایک بہت بڑا فرقہ قرآن مجید میں تحریف کا قائل ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب فصل الخطاب فی اثبات تحریف کلام رب الارباب صہ۳۱ الفاظ یہ ہیں:-

قَدْ اَطْبَقُوْا عَلٰی صِحَّۃِ الْاَخْبَارِ الْمُسْتَفِیْضَۃِ صحیح صریح اور متواتر دلائل سے ثابت ہے

بَلِ الْمُتَوَاتِرِ الْاَدِلَّۃِ بِصَرِیْحِہَا عَلٰی وُقُوْعِ التَّحْرِیْفِ فِی الْقُرْاٰنِ (برق الاسلام ۔ ص۶)

کہ قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے ۔

اصول کافی میں ہے :۔

اِنَّ الْقُرْاٰنَ الَّذِیْ جَآءَ بِہٖ جِبْرِیْلُ اِلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعَۃَ عَشَرَ اَلْفَ اٰیَۃٍ

جو قرآن جبرئیل امین حضرت رسولِ خدا پر لے کر اترے اس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں ۔

(اصول کافی مترجم بناء الثانی جلد دوم کتاب فضل القرآن باب ۴ النوادر ص۲۳۲ مطبوعہ آفسٹ پریس کراچی)

ترجمہ کرنے کے بعد ظفر حسن لکھتے ہیں " موجودہ قرآن میں آیات کی تعداد ۶۶۶۶ ہے "۔

احادیث کے اوّلین محافظ خود صحابہ کرام ہیں، پھر ائمہ دین ہیں ۔ احادیث کی حفاظت بالکل قرآن مجید کی طرح ہوتی رہی، بلکہ جن احادیث کا تعلق عمل سے ہے ان کی حفاظت تو قرآن مجید سے بھی زیادہ ہوئی اور وہ قرآن مجید سے زیادہ محفوظ ہیں ۔ اس موضوع پر تمہید میں مفصل لکھا جا چکا ہے ۔ وہیں ملاحظہ فرمائیں ۔

محمد علی جوہر صاحب نے سچ فرمایا تھا کہ :۔

" قرآن پاک تو قرآن پاک ہے ، دوسرے صحائف ہماری کتب حدیث کی تحقیق اور صحت و حفاظت کا مقابلہ نہیں کر سکتے "۔ (خالص اسلام ص۱۴۵)

محدثین نے اس سلسلہ میں اس درجہ دیانت داری، حق گوئی اور تحقیق سے کام لیا کہ یہ کارنامہ آج اسلام کے مفاخر میں سے ہے، ولیم میور جیسا متعصب شخص بھی اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا جان ڈیون پورٹ، اپنی کتاب " اپولوجی فور محمدؐ " میں لکھتا ہے ۔

" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام مقننین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کے وقائع عمری محمدؐ کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں "۔

ریورنڈ اسمتھ لکھتا ہے :۔

" کوئی شخص نہ اس میں دھوکہ کھا سکتا ہے نہ دوسرے کو دھوکہ دے سکتا ہے ۔ یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک پہنچ رہی ہے "۔ (تاریخ جمع القرآن والحدیث مولفہ ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی ۔)

غرضکہ ایک عالم گواہ ہے کہ احادیث محفوظ ہیں اور اس عالم میں ہمارے برق صاحب بھی شامل ہیں ۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

۱ ۔ " صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا "۔ (دو اسلام ص۳۴۱)

۲- "دوم۔ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

۳- "اس طرح کی احادیث ہزارہا ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیماتِ قرآن کے عین مطابق ہیں۔ بلکہ آنحضرت صلعم کی حیاتِ مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں" (دو اسلام ص۳۴۲)

۴- "یہ تمام تفاصیل حدیث میں ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پہ ہم نازاں ہیں" (دو اسلام ص۳۴۳)

برق صاحب! جس بیش بہا سرمایہ پر آپ نازاں ہیں اسی پہ ہم نازاں ہیں۔ کیا یہ بیش بہا سرمایہ محرف ہے، ہرگز نہیں فللہ الحمد۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

غلط فہمی اللہ نے رسولِ کریم ؐ کو جو کتاب بذریعہ وحی عطا کی تھی اس کا نام قرآن ہے نہ کہ صحیح بخاری ملاحظہ ہوں یہ آیات :- اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ (یوسف) ہم نے جو کتاب بذریعہ وحی تم کو عطا کی ہے اس کا نام قرآن ہے (دو اسلام ص۱۰۸)

ازالہ سورۂ یوسف کی مذکورہ بالا آیت آپ نے پوری نقل نہیں فرمائی، نہ ترجمہ ہی صحیح کیا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ (یوسف۔۳)

ہم آپ کو بہترین قصہ سناتے ہیں۔ اس وحی کے ساتھ جو اس قرآن کی صورت میں بھیجی گئی ہے۔

اس آیت سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ قرآن مجید کے علاوہ ہے۔ البتہ قرآن مجید کے ساتھ اس کو بھی نازل کر دیا گیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے فرقۂ میمونیہ، سورۂ یوسف کو قرآن مجید میں شمار نہیں کرتا، اس کے باوجود برق صاحب لکھتے ہیں کہ ایک عالم اس کی صحت پر گواہ ہے اگر باایں ہمہ قرآن مجید کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے تو حدیث کے متعلق بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ "صحیح بخاری" کی صحت پر ایک عالم گواہ ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ قرآن مجید بذریعہ وحی نازل ہوا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ وحی نہیں آتی تھی۔

نہ مذکورہ بالا آیت کا یہ مفہوم ہے "قرآن مجید وحی ہے" اور "قرآن مجید ہی وحی ہے"۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں جس سے ثابت ہو کہ "قرآن مجید ہی وحی ہے"۔ اور جب یہ نہیں تو پھر قرآن مجید بھی وحی ہے اور دوسری چیز بھی وحی ہو سکتی ہے۔

غلط فہمی "کیا سارے قرآن میں حدیث کا ضمناً بھی کہیں ذکر ہے۔ اگر نہیں تو آپ اسے ہمارے ایمان کا جزو کیسے بنا رہے ہیں" (دو اسلام ص۱۰۹)

ازالہ حدیث کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ (آل عمران: ۳۱)
کہہ دیجئے کہ اگر تم کو اللہ تعالےٰ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو۔

۲۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ (البقرۃ: ۱۴۳)
اور جس قبلہ پر آپ ہیں وہ ہم نے اس لئے مقرر کیا ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ اتباع رسول کون کرتا ہے

پہلے قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ اس حکم کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس آیت میں حدیث کے منجانب اللہ ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ تحویلِ قبلہ کا حکم اس لئے دیا جا رہا ہے کہ متبعین ممتاز ہو جائیں۔ آیت سے اتباع رسولؐ کی اہمیّت ظاہر ہے یہی اتباع رسولؐ ہے جس کو سنت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۳۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

اگر یہ نمونہ قرآن مجید ہے تو پھر رسول اللہؐ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بھول سے قرآن مجید کی جگہ رسول اللہؐ کر دیا۔ نعوذ باللہ منہ۔

۴۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء: ۶۵)
آپ کے رب کی قسم لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام اختلافات میں آپؐ کو حاکم نہ مان لیں پھر جو فیصلہ آپ کریں اس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں۔ بلکہ اس کو بسروچشم قبول کریں۔

اتباعِ سُنّت اور اطاعتِ رسولؐ کا اس سے زیادہ واضح حکم اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیا یہاں بھی ضمیر مخاطب سے مراد قرآن مجید ہے؟ اگر ہے تو پھر یہ کہنا حق بجانب ہے کہ اللہ تعالےٰ صاف صاف حکم دینے کے بجائے الجھن میں مبتلا کرتا ہے؟ نعوذ باللہ۔

۵۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (النور: ۵۱)
مؤمنین کا تو یہ قول ہونا چاہیئے کہ جب انہیں اللہ اور رسولؐ کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے معاملات میں فیصلہ کرے تو کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔

۶۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء: ۶۱)
اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ شریعت کی طرف اور رسولؐ کی طرف آؤ تو آپ دیکھتے ہیں کہ منافق آپ سے منہ پھیر لیتے ہیں

اگر اس آیت میں "اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ" اور "اِلَی الرَّسُوْلِ" کے درمیان "واؤ" تفسیری ہے تو معاملہ صاف ہے کہ "مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ" سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں، وہ سب "مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ" (اللہ کی طرف سے نازل شدہ) ہے۔ اور اگر واؤ عطف کے لئے ہے تو پھر "مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ" کی طرف بلانے کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بلانا یہی ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فیصلہ کریں وہ بھی ماننا ہوگا اور اسی کا نام اتباع حدیث ہے۔

۷۔ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (الاعراف:۔ ۱۵۶، ۱۵۷)

میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اس رحمت کو میں ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو رسول، نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں۔

اتباعِ سنت کی اس آیت میں کتنی واضح دلیل ہے۔

۸۔ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (النساء:۔ ۱۱۳)

اور اللہ نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اور حکمت نازل کی اور وہ باتیں سکھائیں جو آپ نہیں جانتے تھے۔

اس آیت میں کتاب کے علاوہ ایک اور چیز کے نزول کی خبر ہے، اور یہ حکمت یعنی سنت ہے جو لوگ یہاں "واؤ" کو تفسیری کہتے ہیں، وہ صحیح نہیں کہتے اسلئے کہ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہونگے کہ اللہ نے آپ پر کتاب نازل کی یعنی حکمت نازل کی یعنی وہ باتیں سکھائیں جو آپ نہیں جانتے تھے۔ بار بار واؤ تفسیری کا آنا بلاغت کے منافی ہے۔ لہٰذا یہاں "واؤ" برائے عطف ہے۔

ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے ہیں:۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ (البقرۃ:۔ ۱۲۹)

اے ہمارے رب ان لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے۔ بے شک تو عزیز و حکیم ہے۔

اس آیت میں، اگر واؤ کو تفسیری مانا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ بھی تفسیر کا محتاج ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ابراہیم علیہ السلام [illegible] سمجھنے میں دھوکہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام نے تفسیر کر دی، اور یہ قطعاً باطل ہے، پس ثابت ہوا کہ کتاب و حکمت دو چیزیں ہیں اور دونوں نازل ہوئی ہیں۔

پرویز بھی جو بہت زیادہ واؤ تفسیری کی طرف مائل ہیں۔ اس آیت میں واؤ تفسیری شمار نہیں

کرتے۔ ان کا ترجمہ درج ذیل ہے :-

"اللہ نے تم پر کتاب وحکمت نازل کردی ہے اور وہ باتیں سکھادی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ (معارف القرآن ج ۱ صہ ۱۸۴)

اگر بالفرض محال کتاب وحکمت ایک ہی چیز ہے تو پھر "وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" کے دوسری چیز ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، اور یہی چیز حدیث ہے۔

۹ - وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (الاعراف: ۱۵۷)
رسولؐ ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتا ہے اوران پر خبیث چیزوں کو حرام کرتا ہے۔

اس آیت میں تحریم وتحلیل کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فعل بتایا گیا ہے، نہ کہ قرآن کا، گائے کے پیشاب کو بعض لوگ اب بھی پاک سمجھتے ہیں، اسے پیتے ہیں، کیا ایسے لوگوں کو اگر وہ مسلم ہو جائیں، پیشاب پینے کی اجازت ہوگی۔ اگر نہیں تو کیا قرآن مجید سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ پیشاب حرام ہے ہرگز نہیں، یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے حکم دیا پیشاب سے بچو، اور اس طرح پیشاب حرام کردیا۔ گدھے، کتے، بلی وغیرہ مختلف جانوروں کو حرام قرار دیا، ورنہ قرآن مجید کی رُو سے تو سب چیزیں حلال کی جاسکتی ہیں۔

۱۰ - وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ○ (الاحزاب: ۳۶)
کسی مؤمن مرد یا عورت کو زیبا نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملہ میں فیصلہ کردیں تو پھر بھی ان کو اس معاملہ میں اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگیا۔

۱۱ - فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (الاعراف: ۱۵۸)
اللہ اور اس کے رسولؐ، نبی امیؐ پر ایمان لاؤ جو خود بھی اللہ اور اللہ کے کلمات پر ایمان لاتا ہے اور اس کا اتباع کرو تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے۔

اتباعِ رسولؐ کی کتنی واضح آیت ہے، اسی اتباعِ رسولؐ کا نام اتباعِ سنت یا اتباعِ حدیث ہے

۱۲ - قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○
آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو، پھر اگر تم منہ موڑو تو رسولؐ اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے اور تم اپنے فرائض کے ذمہ دار ہو، اور اگر تم اس کی اطاعت کروگے تو تمہیں ہدایت مل جائے گی اور رسولؐ

کے ذمہ کچھ نہیں سوائے صاف صاف پہنچا دینے کے۔ (النور: ۵۴)

یہ آیت کتنی واضح ہے کہ ہدایت کا کوئی راستہ نہیں، سوائے اطاعتِ رسولؐ کے، اطاعت رسولؐ کرو گے تو ہدایت یاب ہو گے ورنہ نہیں۔ پھر شروع آیت میں اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسولؐ کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ آیت میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے مرکزِ ملت کی اطاعت مراد نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہاں اللہ و رسولؐ کے الفاظ ساتھ ساتھ آتے ہیں وہاں ان سے مراد مرکزِ ملت ہوتا ہے، پھر آیت مذکورہ میں آگے چل کر اطاعت الٰہی کو حذف کر کے پورا زور اطاعتِ رسولؐ پر دیا جا رہا ہے اور کیوں نہ ہو، جبکہ اطاعت رسولؐ ہی اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہو۔ اگر اطاعت رسولؐ نہیں تو اطاعتِ الٰہی بھی نہیں۔ اسی لئے فرمایا:۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النسآء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی

اگر رسولؐ کی اطاعت سے مراد قرآن مجید کی اطاعت ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو یہ دونوں الفاظ معلوم نہیں تھے کہ بار بار رسولؐ کا لفظ تو استعمال کرتا ہے اور جو اصل مطاع ہے اس کے نام کو ترک کر دیتا ہے۔ الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن سے اتباعِ رسولؐ لازمی ثابت ہوتا ہے اور یہ چیز ضمناً نہیں بلکہ صراحتاً ہے۔ اطاعتِ رسولؐ فرض ہے اور اطاعت اور اتباع کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے اقوال اور افعال کا موجود ہونا لازمی ہے۔ ورنہ بغیر اقوال اور افعال رسول کے اطاعت اور اتباع ناممکن ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اقوال اور افعالِ رسولؐ یعنی احادیث محفوظ ہیں، اور ان کی اطاعت و پیروی از روئے قرآن مجید فرض ہے۔

اب برق صاحب ہمیں بتائیں کہ اتباعِ رسولؐ یعنی احادیث کو جزو ایمان ہم بنا رہے ہیں یا اللہ تعالیٰ، اور تو اور خود برق صاحب بھی احادیث کے جزو ایمان ہونے کے قائل و معترف ہیں۔ لہٰذا اس بحث کا خاتمہ ان ہی کے الفاظ پر کیا جاتا ہے۔

برق صاحب فرماتے ہیں:۔

"اقوالِ رسول کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے۔ اگر اقوالِ رسولؐ مل جاتے تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآنِ حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پہ ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرۂ ایمان میں داخل ہو جاتے"
(دو اسلام ص۱۱۱)

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ اقوالِ رسولؐ کو جزو ایمان بنانے میں برق صاحب بھی ہمارے ہمنوا ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے نزدیک اقوالِ رسولؐ کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے اور ہمارے نزدیک بے حد آسان۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ اقوالِ رسولؐ کا دستیاب ہونا کس طرح آسان ہے اور وہ کہاں ملیں گے۔ برق صاحب یہ اقوالِ رسولؐ جن کو آپ جزو ایمان بنانے کی فکر میں ہیں،

آپ سے دور نہیں۔ بلکہ آپ کے بہت ہی قریب ہیں۔ آپ ہی تحریر فرماتے ہیں۔
کہ "صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا" (دو اسلام صـ۳۴۱)

برق صاحب اب ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ یہ صحیح احادیث آپ کو کہاں سے مل گئیں۔ ان کا کوئی وجود تھا جب ہی تو آپ کو دستیاب ہو گئیں، اور جب دستیاب ہو گئیں تو اب ان کو جزو ایمان بنانے سے کیا امر مانع ہے۔ صحیح احادیث کے وجود کو آپ نے آگے چل کر پھر تسلیم کیا ہے۔
آپ لکھتے ہیں :-
"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں" (دو اسلام صـ۳۴۱)

لیجئے اب تو فیصلہ ہو گیا، صحیح احادیث کے وجود کے آپ بھی معترف ہیں۔ لہٰذا یہ صحیح احادیث تو یقیناً بقول آپ کے دائرہ ایمان میں شامل ہو گئی ہوں گی۔
اس کے آگے برق صاحب رقمطراز ہیں :-
"صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی طرف صحیح ہو یعنی ہم یہ دلائل ثابت کر سکیں کہ یہ قول حضورؐ کی زبان مبارک سے واقعی نکلا۔ ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں، البتہ ظنِ غالب یہ ہے کہ بعض اقوال صحیح ہوں گے۔ دوم کہ احادیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں۔" (دو اسلام صـ۳۴۱)

اس عبارت میں برق صاحب نے صحیح احادیث کے وجود کو تسلیم کیا ہے بعض کو ظنِ غالب سے اور بعض کو یقیناً، کیونکہ اصل مطلوب و مقصود تو مفہوم ہی ہے۔ جب مفہوم ثابت ہو گیا تو وہ مفہوم قرآنِ کریم کی تشریح ہو گیا اور اس اعتبار سے قرآن مجید پر ایمان لاتے ہی وہ مفہوم دائرۂ ایمان میں شامل ہو گیا۔ برق صاحب نے مذکورہ بالا عبارت میں بعض احادیث کو با اعتبار الفاظ یقیناً صحیح تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ظنِّ غالب کے طور پر تسلیم کیا۔ اس چیز سے ہمیں تھوڑا سا اختلاف ہے، بعض نہیں، بہت سی احادیث با اعتبار الفاظ کے بھی یقیناً صحیح ہیں اور ان کے صحیح ہونے پر فن حدیث میں کافی دلائل موجود ہیں)

خلاصہ مذکورہ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور خود برق صاحب کی تحریر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحیح احادیث جزو ایمان ہیں۔
برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

غلط فہمی "اگر حدیث پر ایمان ایسا ہی ضروری تھا تو جس خدا نے لاکھوں انبیاء، بیسیوں دینی صحائف اور کروڑوں ملائکہ پر ایمان لانے کا بیسیوں مرتبہ حکم دیا تھا، کیا وہ حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ اگر اللہ نے اس چیز کو قابلِ ایمان نہیں سمجھا تو آپ کون ہیں ہمیں حدیثوں پر ایمان لانے کا حکم دینے والے۔" (دو اسلام صـ۱۰۹)

ازالہ اللہ تعالیٰ نے کتاب پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اور کتاب میں قرآن مجید اور حدیث یعنی پوری شریعت شامل ہے۔ ان تمام آیتوں میں جن میں کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ قرآن مجید کا نام نہیں ہے بلکہ کتاب یا ما انزل اللہ کے الفاظ ہیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں۔

دوم۔ حدیثوں پر ایمان لانے کا حکم دینے والے ہم نہیں ہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے اور آ خود اس کے معترف ہیں یہ آپ ہی کے الفاظ ہیں:۔

"قرآن پہ ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے" (دو اسلام ص۱۱۱)

اب آپ کے لئے صرف ایک ہی الجھن باقی رہ جاتی ہے کہ ایسے اقوال ملیں کہاں سے، تو یہ مشکل آپ نے خود ہی حل کر دی ہے اور ان احادیث کی نشاندہی فرما دی ہے یہ تفصیل کے لئے ازالہ ما قبل ملاحظہ فرمایئے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی م:۔ اور آپ کے پاس "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى"........ کا کیا جواب ہے؟

ب:۔ آیت کا مفہوم نہایت صاف ہے، کہ قرآن رسولؐ کی خواہشات کا آئینہ دار نہیں، بلکہ وہ اللہ کا پیغام ہے مطلب یہ کہ قرآن رسولؐ کی تصنیف نہیں، کہ جو جی میں آیا اس کے مطابق آ ت تیار کر لیں۔ (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى) بلکہ وہ ہمارا پیغام ہے، ہماری مشیت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ (اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى) (دو اسلام ص۱۰۹)

ازالہ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر اقوال رسول مل جاتے، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پہ ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرۂ ایمان میں شامل ہو جاتے"۔ (دو اسلام ص۱۱۱)

اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوئیں:۔

اوّل۔ قول رسولؐ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا ہے۔

دوم۔ رسولؐ کا قول دائرہ ایمان میں شامل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک بشر کے اقوال کو یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس کا ہر قول قرآن حکیم کی تشریح ہو اور ایسا ہر قول دائرۂ ایمان میں شامل ہو؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ وہ بشر، اللہ تعالیٰ کا رسولؐ ہے۔ وہ جو کچھ تشریح کرتا ہے، من جانب اللہ وحی ہوتی ہے، یعنی یہ تشریح اس کی طرف سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، اور اسی لئے اس پر ایمان

لانا ضروری ہوتا ہے۔

لہٰذا برق صاحب کے تحریر کردہ اصول کی روشنی میں آیت کا یہ مفہوم ہوا کہ قرآن مجید کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہشات کی آئینہ دار نہیں بلکہ وہ اللہ کا پیغام ہے۔ مطلب یہ کہ تشریحِ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں کہ جو جی میں آیا کہہ دیا۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ بلکہ وہ تشریح اللہ تعالیٰ کا پیغام ہوتی ہے جو مشیت الٰہی کی ترجمانی کرتی ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى مثلاً قرآن مجید میں ہے کہ نماز پڑھو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز تم پر فرض ہے۔ فلاں وقت اتنی رکعت ہیں۔ ہر رکعت میں ایک رکوع ہے۔ دو سجدے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متصور نہیں ہوگی اس پر اسی طرح ایمان لانا ہوگا جس طرح قرآن مجید پر۔ اب اگر کوئی شخص نماز کی فرضیت کا تو اقرار کرے اور پانچ وقت کا انکار کرے تو وہ اسی طرح کافر ہوگا جس طرح نماز کی فرضیت کا انکار کرنے والا کیونکہ حکم الٰہی کے منشاء کا انکار خود اس حکم کا انکار ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

(اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى) اس آیت میں "ہُوَ" کا مرجع ہے قرآن جو یہاں محذوف ہے آپ کہیں گے محذوف کے لئے کوئی قرینہ چاہیئے۔ بھائی صاحب سینکڑوں آیات اس حذف کے لئے بطور قرینہ موجود ہیں (دو اسلام صفحہ ۱۰۹)

ازالہ ھُوَ کا مرجع قرآن مجید نہیں ہے بلکہ نطقِ رسولؐ یعنی قولِ رسولؐ ہے جو اس سے پہلے کی آیت میں موجود ہے "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى" یعنی رسولؐ اپنی خواہش سے نہیں بولتا اس کا قول وحی ہوتا ہے۔ قریب ترین آیت میں "ھُوَ" کا مرجع موجود ہوتے ہوئے دور دراز کی آیتوں سے مرجع تلاش کرنا قرینِ انصاف نہیں۔ یہ غلط فہمی صرف اس لئے پیدا ہوئی کہ برق صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ "قرآن وحی ہے لہٰذا ہر وحی قرآن ہے"۔ بے شک پہلا جملہ "قرآن وحی ہے"، بالکل صحیح ہے لیکن "ہر وحی قرآن ہے"، "صحیح نہیں" اور نہ اس کا کوئی قائل ہے۔

غلط فہمی برق صاحب رقم طراز ہیں:۔

حدیث کا باطل نے وہ بلیستر بگاڑا ہے کہ لاکھوں آفتاب، ماہتاب لے کر بھی ڈھونڈھو تو حقیقت کا سراغ نہ مل سکے الا ماشاء اللہ (دو اسلام صفحہ ۱۱۱)

ازالہ اس کے جواب میں برق صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت ہی کافی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں ..... حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزارہا احادیث صحیح ہیں .... اس

طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں۔ جو نہ صرف تعلیماتِ قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مطہرہ کی مکمّل تصویر پیش کرتی ہیں .... اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں۔ (دو اسلام ص۲۴۱، ص۲۴۳)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

غلط فہمی

م :- لیکن حدیث کی حُجیّت پر ایک اور آیت موجود ہے۔

ب :- فرمائیے۔

م :- أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (اللہ اور رسولؐ دونوں کی اطاعت کرو) اللہ نے قرآن دیا ہے اور رسولؐ نے حدیث، اس لئے دونوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

ب :- آپ نے پوری آیت نہیں پڑھی "واولی الامر منکو" چھوڑ گئے ہیں۔ ساری آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہوا (اللہ، رسولؐ اور حاکم وقت (جو تم میں سے ہو) کو مانو) اگر رسولؐ کی اطاعت کا یہی مطلب ہے کہ آپ کے تمام اقوال پر ایمان لاؤ۔ تو پھر حاکم وقت کے اقوال پر بھی ایمان لانا پڑے گا کیونکہ اللہ نے اس کی اطاعت کا بھی ویسے ہی حکم دیا ہے۔ (دو اسلام ص۱۱۰-۱۱۱)

ازالہ

جی نہیں، اللہ نے حاکم وقت کے اقوال پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ اس کے آگے فرمایا ہے کہ :-

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ (النساء:- ۵۹)

اگر تم کسی معاملہ میں اختلاف کرو تو اس کو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹادو۔

یعنی اُمّت کو حاکم وقت سے اختلاف کا اختیار دیا۔ اس کے قول پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ اختلاف کرکے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا، گویا قول رسولؐ خود سند ہے اس سے اختلاف کرنے کا نہ اختیار ہے، نہ کسی دوسری طرف رجوع کا حکم ہے۔ بلکہ صاف ارشاد ہے

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء:- ۱۱۵)

جو شخص ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسولؐ کے خلاف چلے اور مؤمنین کے راستہ سے علیحدہ کوئی راستہ اختیار کرے تو ہم اس کو ادھر ہی جانے دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کردیں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے خلاف چلنا مؤمنین کا راستہ نہیں بلکہ کافروں کا راستہ ہے۔ دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم سے اختلاف کرنے کے اختیار کو سلب کرلیا گیا ہے۔ ارشاد ہے :-

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (الاحزاب۔ ۳۶)

کسی مؤمن مرد یا عورت کے لئے زیبا نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اس معاملہ میں اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

قول و فعل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم سے اختلاف رکھنا تو بہت بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ بھی برداشت نہیں کرتا کہ کوئی شخص دل میں بھی کسی قسم کا اختلاف رکھے۔

ارشادِ باری ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء۔ ۶۵)

آپکے رب کی قسم لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام اختلافات میں آپ کو حَکَم نہ مان لیں پھر جو فیصلہ آپنے کیا ہو اُس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ بسر و چشم اسے قبول کریں۔

کیونکہ ایمان کا اصلی تعلق دل سے ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم سے دل میں اختلاف رکھنے کو بھی کفر بتایا، اور قسم کھا کر فرمایا کہ ایسا شخص مؤمن نہیں ہو سکتا، اسی بناء پر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ قولِ رسول صلے اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لانا فرض ہے۔ اگر قولِ رسولؐ پر ایمان لانا فرض نہ ہوتا تو اختلاف کی گنجائش نکل سکتی تھی اور کم از کم پوشیدہ طور پر تو اختلاف رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن یہاں ان باتوں کی قطعاً گنجائش نہیں، بلکہ غیر مشروط طور پر سر جھکا دینا لازم ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، کہیں اللہ اور رسولؐ کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں، اور کہیں صرف رسولؐ کی اطاعت کا ذکر ہے۔ مثلاً:۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (النّور۵۶)

اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور رسولؐ کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

امیر کی اطاعت کا حکم صرف ایک آیت میں ہے، پھر اس آیت میں بھی حکم امیر کو آخری سند کا درجہ نہیں دیا گیا، بلکہ اس سے اختلاف کی اجازت دی گئی اور آخری سند اللہ اور رسولؐ کو بنایا گیا۔ اس وضاحت کے بعد یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم اور حاکم وقت کی اطاعت کی نوعیت ایک ہی ہے۔ دونوں اطاعتوں میں بڑا فرق ہے۔ لہٰذا ان دونوں اطاعتوں کا مقابلہ غیر صحیح ہے۔ حاکم کی اطاعت کو کہیں بھی اللہ تعالےٰ نے اپنی اطاعت نہیں فرمایا مگر رسولؐ کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت فرمایا۔

ارشادِ باری ہے:۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:۔۸۰) جس نے رسول ؐ کی اطاعت کی۔ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

پس ثابت ہُوا کہ کجا اطاعتِ حاکم اور کجا اطاعتِ رسول ؐ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

م:۔ تو کیا اقوالِ رسول ؐ قابلِ ایمان نہیں؟

ب۔ کیوں نہیں بالشرطیکہ ہمیں کہیں سے کوئی قولِ رسول ؐ مل جائے۔ (دو اسلام ص۱۱۱)

گزارش اس عبارت میں برق صاحب نے اقوالِ رسول ؐ کو قابلِ ایمان تسلیم کیا ہے۔ یہ حقیقتاً حق کا اعتراف ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہمارا اور برق صاحب کا اختلاف ہی ختم ہو گیا، جو برق صاحب کا عقیدہ وہی ہمارا، لہٰذا اب برق صاحب سے ایک گزارش ہے، وہ یہ کہ براہِ کرم اپنے موجودہ رویّہ میں کچھ اصلاح کیجئے۔ اس لئے جس چیز پہ ایمان لانا ضروری ہو، اس کو ماخذِ قانون اور حجّتِ شرعیہ تسلیم نہ کرنا شانِ ایمان نہیں، پھر بقول آپ کے اقوالِ رسول ؐ قرآن حکیم کی تشریح ہیں۔ اور دائرۂ ایمان میں شامل ہیں تو پھر ان کا من جانب اللہ تسلیم نہ کرنا کسی مؤمن کو تو زیب نہیں دیتا۔ پھر یہ کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں کہ جو تشریح من جانب اللہ ہو، جس پہ ایمان لانا ضروری ہو۔ وہ غیر محفوظ ہو، گویا ایمان کے لوازمات ضائع ہو گئے۔ قرآن مجید کے الفاظ تو موجود ہوں، لیکن یہ نہ معلوم ہو کہ قرآن مجید کے بھیجنے والے کا منشا ان الفاظ سے کیا تھا، اور جو چیز منشاء الٰہی کو بتانے والی تھی وہ موجود نہیں، بتایئے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دین کی حفاظت ہے۔ کیا یہ اہانتِ اسلام نہیں، حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید محفوظ ہے اور اس کی تشریح بھی محفوظ ہے اور یہ تشریح کہاں محفوظ ہے اس کے لئے بھی زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی کتاب کا بیسواں باب (ص۲۴۱، ص۲۴۳) ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کی عبارتوں کے اقتباسات برق صاحب ہم اسی باب میں گذشتہ صفحات میں نقل کر چکے ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

اللہ تعالےٰ نے ہمیں قوانین کی ایک کتاب یعنی قرآن دے کر اپنے رسول ؐ کو ہمارا امیر اور اولوالامر بنا دیا۔ تاکہ وہ ان قوانین کو نافذ کر سکے اور ہمیں حکم دے دیا کہ رسول ؐ کی اطاعت کرو۔ رسولِ خدا جب تک بقیدِ حیات رہے صرف انہیں قوانین کی تعمیل کراتے رہے جن کی تفصیل قرآن مجید میں دی ہوئی تھی اور آج بھی ہم پہ رسولِ خدا کی اطاعت قرآنی احکام کی حد تک فرض ہے

(دو اسلام ص۱۱۲)

ازالہ جب رسول ایسا حاکم نہیں جو خود حاکم بن بیٹھا ہو، یا لوگوں نے اس کو اپنا حاکم بنا لیا ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا حاکم ہے، تو پھر اس کی فرمانروائی منصب رسالت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا ہے حالانکہ ہر مقام پر امیر کی اطاعت کا حکم ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تلاوت قرآن کی حد تک رسول ہیں، اور اس کے بعد وہ ایک عام حاکم کی طرح ہیں، تو پھر بار بار بلکہ ہر بار یہ کہنا کہ رسول کی اطاعت کرو نعوذ باللہ دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر کلام میں وضاحت ہوتی ہے اور کوئی کلام مبہم اور گمراہ کن نہیں ہوتا۔ اس لئے یہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بہ حیثیت منصب رسالت ہے، نہ کہ بہ حیثیت حاکم لہٰذا ایسا حاکم جس کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہو، جس کی حکمرانی منصب رسالت کے ساتھ وابستہ ہو، جب کوئی حکم نافذ کرے گا، یا کسی قانون کی تشریح کرے گا، تو اس کا وہ طریقۂ نفاذ اور اس کی وہ تشریح من جانب اللہ ہی ہوگی، اور ہر لحاظ سے بالکل منشاء الٰہی کے موافق ہوگی، اور اگر ایسا نہ ہو تو کہا جائے گا۔ کہ قانونِ الٰہی کے نفاذ اور اس کی تشریح میں روز اول ہی سے غلطی نے راہ پالی، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں قانون کی تشریح کیا ہے، اور اس کو کس طریقہ سے نافذ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی (نجم ۱-۲) رسول نہ کبھی گمراہ ہوا نہ کبھی بھٹکا۔

بلکہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (نجم ۴-۳) اس کی زبان وحی الٰہی کی ترجمانی کرتی ہے۔

بھلا ایسے حاکم کی فرمانروائی کو دوسرے حاکموں کی فرمانروائی سے کیا نسبت؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قرآن مجید کی حد تک فرض ہے، اور اس کے علاوہ نہیں، تو پھر بلا وجہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ قرآن مجید کے بجائے رسول کا لفظ استعمال کرکے دنیا کو غلط فہمی میں مبتلا کیا، کیوں نہ ہر جگہ قرآن مجید کی اطاعت کا حکم دیا۔ کیا اللہ تعالیٰ بھی بھول جایا کرتا ہے، یا قصداً ایسا کرتا ہے، کہ کہنا کچھ چاہتا ہے اور کہتا کچھ ہے؟ نعوذ باللہ من ذلک۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ہ۔ آپ کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اگر رسول قرآنی احکام کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دے تو آپ اس کی تعمیل نہیں کریں گے۔

(ب) یہ آپ نے فرض ہی کیوں کیا، کہ رسول صلعم قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دینے کی بھی جرأت کر سکتے تھے، انہیں بار بار کہا جا رہا تھا۔ بَلِّغْ مَا

اُنْزِلَ اِلَیْکَ " اے رسول تم وہ احکام امت تک پہنچاؤ جو ہم تمہیں دے رہے ہیں، کیا رسول اکرم صلعم اس صریح حکم سے سرتابی کی جرأت کر سکتے تھے؟ لفظ رسول کے معنی ہی قاصد، ایلچی اور چٹھی رساں ہیں، تو ایک قاصد خود کیسے آقا بن سکتا ہے؟ (دو اسلام ص ۱۱۲)

ازالہ جی ہاں وہ خود آقا نہیں بن سکتا، بلکہ بنایا جاتا ہے، جس چٹھی کو وہ لے کر آتا ہے، اسی چٹھی میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ چٹھی رساں کی اطاعت کرنا، یہ میرا تو چٹھی رساں ہے، لیکن تمہارا حاکم ہے، اس کی اطاعت کرو، بس یہی میری اطاعت ہے، اس سلسلہ میں متعدد آیات اس چٹھی میں موجود ہیں، جن کو اوپر نقل کیا جا چکا ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود حاکم بن بیٹھا؟ ہرگز نہیں اگر رسول کی حیثیت اتنی ہی ہے کہ وہ چٹھی پہنچا دے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، تو پھر اس کا درجہ ہر انسان سے کم ہوا، اس لئے کہ چٹھی بھیجنے والے اور چٹھی وصول کرنے والے کے درمیان چٹھی رساں محض ایک ذریعہ ہوتا ہے، اہم شخصیتیں تو وہ ہیں جو چٹھی کو بھیجنے والی اور چٹھی کو وصول کرنے والی ہیں، چٹھی رساں کی حیثیت دونوں کے درمیان محض ایک ملازم کی سی ہوتی ہے اور بس، اگر یہی درجہ آپ رسول کو دینا چاہتے ہیں تو بس پھر ایمان کا اللہ ہی حافظ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ	تحقیق اللہ نے مؤمنین پر بڑا احسان کیا جب
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	کہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول معبوث فرمایا
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کے قلوب کا
وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ	تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آل عمران: ۱۶۴)	ورنہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

برق صاحب کیا چٹھی رساں کے یہی فرائض ہوتے ہیں، ذرا غور کیجئے، مزکّی و معلم انسانیت کو آپ چٹھی رساں بنا رہے ہیں، العیاذ باللہ، حقیقت تو یہ ہے کہ رسول کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جو کہ بادشاہ کی طرف سے کسی صوبہ کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے، بادشاہ کی طرف سے چند ہدایات اس کو دی جاتی ہیں، اور وہ ان کی روشنی میں اس صوبہ پر حکومت کرتا ہے وہ چٹھی رساں نہیں ہوتا، کہ چٹھی حوالہ کی اور چل دیا اسی طرح رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہوتا ہے اور مُطاعِ عالم بنا کر بھیجا جاتا ہے، وہ ہدایت کا نسخہ دے کر رخصت نہیں ہو جاتا بلکہ اپنی اطاعت اور فرمانروائی کا ڈنکہ بجاتا ہے، وہ آتا ہے، اور علی الاعلان کہتا ہے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء: ۱۰۸) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

اطاعت اور فرمانروائی کا یہ منصب وہ اپنے لئے خود اختیار نہیں کرتا، بلکہ اس منصب پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فائز ہوتا ہے، ارشاد باری ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء) ہر رسول کی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جاتی ہے

تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں، تمہید میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ سنت بھی وحی کے ذریعہ نازل ہوئی ہے، لہٰذا "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ" میں وہ بھی شامل ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ ایک چھوٹا سا نکتہ پیش نظر رکھیں، کہ رسول اکرم صلعم کی دو حیثیتیں تھیں وہ پیغمبر بھی تھے اور بشر بھی، بہ حیثیت پیغمبر ہم ان کی اطاعت پر مامور ہیں، اور بہ حیثیت بشر، اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی ہے، کہ ہم چاہیں تو کھانے پینے، چلنے، بولنے، لیٹنے اور سونے میں حضور کی روش اختیار کریں یا حدود شریعت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی پسند، اپنے مذاق، اپنے ملک و ماحول اور اپنے رجحان سے کام لیں۔" (دو اسلام صہ ۱۱۲-۱۱۳)

ازالہ اگر کھانے پینے سے یہ مراد ہے، کہ ہم اپنی پسند کی چیزیں کھائیں اور پئیں، اور ہم پر یہ لازمی نہیں کہ جو کی روٹی اور کھجور ہی کھائیں تو بے شک آپ نے ٹھیک فرمایا۔ ان چیزوں کے سنت دینی ہونے کا کوئی قائل نہیں لیکن کھانے پینے کے جو اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرمائے ہیں ان سے ہم تجاوز نہیں کر سکتے اور نہ اس معاملہ میں ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ خواہ ان اصولوں کے مطابق عمل کریں خواہ ان کو ترک کر کے دوسرے اصول اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی اور اصول وضوابط مقرر فرمائے۔ ان اصول وضوابط کی خلاف ورزی کرنا بے شک جرم ہے۔ مثلاً آپ نے ہم کو الٹے ہاتھ سے کھانے پینے سے منع فرمایا، اب ہم اپنے ماحول یعنی مغربی تہذیب کے غلبہ سے متاثر ہو کر الٹے ہاتھ سے کھانا پینا شروع کر دیں تو یہ کسی طرح جائز نہیں۔ بلکہ اس سے مسلم معاشرہ کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس طرح اندھا دھند تقلید، نقالی، اور احساس کمتری کے جراثیم اسلامی تہذیب کو فنا کر دیں گے۔ الغرض ایک تو ہوئی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی پسند اور ایک ہوئی اصولی وتشریعی پسند۔ طبعی پسند کی مثال لوکی کھانا ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ لوکی کھائیں۔ لیکن لوکی ہو یا کوئی دوسری چیز اس کے کھانے کے جو آداب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دیئے ہیں وہ ہمارے اسلامی تہذیب وشریعت کا جزو لاینفک ہیں۔ ان میں ہمیں اختیار نہیں کہ خواہ ان پر عمل کریں۔ خواہ اپنے ماحول یا اپنی پسند کے مطابق دوسری قوم کی نقالی کرتے پھریں۔ ابھی

طرح زراعت وتجارت۔ جہاد وسفر تبلیغ دین کے وہ تمام ذرائع جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں رائج تھے یا جن کو خود آپؐ نے استعمال فرمایا سنت نہیں کہے جا سکتے مثلاً جہاد میں تیر وکمان کا استعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا لیکن دور حاضرہ میں اس کے استعمال کو سنت کوئی نہیں کہتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جہاد اور اسی طرح کے دوسرے معاملات کے متعلق جو اصول آپ نے مقرر فرمائے وہ چاہے ہم قبول کریں چاہے ان کی جگہ دوسرے اصول اپنی پسند وماحول کے مطابق وضع کر لیں۔ یہ ہرگز جائز نہیں۔ یہ حدودِ شریعت ہیں اور غالباً اسی وجہ سے برق صاحب نے بھی "حدودِ شریعت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اگر ان کا یہی منشاء ہے تو ہمیں ان سے اتفاق ہے۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں، کہ بعض اوقات صحابہ نے آپ کے بشری ہدایات یا مشورہ پر عمل نہیں کیا تھا، مثلاً جب آپ کے غلام زید نے اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی، تو آپ نے فرمایا "اَمْسِكْ عليكَ زوجكَ" (طلاق مت دو) لیکن زید نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ اسی طرح جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصرار تھا، کہ انہیں قتل کر دیا جائے، لیکن حضور نہ مانے، اور وحی نے عمرؓ کی تائید کر دی (ص ۱۱۳)

ازالہ | برق صاحب نے جو مثالیں ذکر کی ہیں، یہ احکام، اصول اور ضوابط کی مثالیں نہیں ہیں، بلکہ بقول برق صاحب یہ مشورے ہیں، اور مشورہ ہوتا ہی اسی لئے ہے کہ جس کو مشورہ دیا جا رہا ہے وہ مانے یا نہ مانے، لہٰذا مشورہ کو حکم وہدایت کے ذیل میں لانا بہت بڑی غلط فہمی ہے، مزید براں جنگ بدر کے قیدیوں کا معاملہ تو اس جگہ قطعاً بے محل ہے، اس لئے کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کر دینا۔ یہ اکثریت کی رائے تھی، اسی وجہ سے اس پر عمل کیا گیا، مشورہ سے جو معاملات طے ہوتے ہیں، وہ قانون اور ضوابط نہیں بنتے، قانون اور ضوابط تو صرف احکام الٰہی ہوتے ہیں، جو بذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں، اور کسی قانون وضابطہ کے بنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا، مثلاً جب آپ نے الٹے ہاتھ سے کھانا پینا منع فرمایا تو اس سے پہلے کوئی مجلس مشاورت قائم نہیں کی، بلکہ بغیر مشورہ کے اس ضابطہ کا اعلان فرمایا، لہٰذا اس ضابطہ کو ماننا ہم پر فرض ہے۔ اسی طرح ہر ضابطہ ماننا ہم پر فرض ہے۔ مشورہ ماننا فرض نہیں، مشورہ حکم کا درجہ اختیار نہیں کرتا۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"حضور نے گیارہ نکاح کئے تھے، لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں" (دو اسلام ص۱۱۱)

ازالہ یہ اختیار کی مثال نہ ہوئی، بلکہ جبر کی مثال ہوئی یعنی ہم مختار نہیں، بلکہ مجبور ہیں، کہ چار سے زیادہ نکاح نہ کریں، حالانکہ قرآن مجید سے اس کی صریح ممانعت ثابت نہیں ہوتی پھر فعلی سنت بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ چار سے زیادہ نکاح کئے جا سکتے ہیں، لیکن قولی حدیث کے ذریعہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آزادی کو ہم سے سلب کر لیا، اور ہم کو چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت کر دی، الغرض ایک فعلی سنت سے روکنے والی دوسری قولی سنت ہے، ہمارے اختیار کو اس میں کہاں دخل ہے۔

برق صاحب آپ سے ایک سوال ہے، وہ یہ ہے کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت قرآن مجید میں ہے یا نہیں؟

(۱) اگر ہے، تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گیارہ نکاح کرنے کی اجازت قرآن مجید کی کس آیت میں ہے؟ اگر قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں تو پھر یا تو یہ اجازت کسی دوسری وحی میں آئی ہوگی، یا یہ کہنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے؟ کیونکہ قرآنی احکام کی خلاف ورزی آپ سے قطعاً ناممکن ہے، لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم قرآن مجید کے علاوہ بھی وحی کا آنا تسلیم کریں، اور اسی وحی کو حدیث کہتے ہیں۔

(۲) اگر قرآن مجید میں چار سے زیادہ نکاح کی ممانعت نہیں، تو پھر وہ ممانعت کس جگہ ہے ظاہر ہے کہ اس ممانعت کا مقام حدیث میں ہوگا، پس ثابت ہوا کہ حدیث بھی ماخذِ قانون اور حجتِ شرعیہ ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"حضور نے ایک اندھے سے بے التفاتی فرمائی تھی، جس پر سورۂ عبس نازل ہوئی اور ملک العرش نے اپنے محبوب کو ایک ہلکی سی ڈانٹ پلا دی" (دو اسلام ص۱۱۱)

ازالہ برق صاحب کا منشا یہ ہے کہ اندھے سے بے التفاتی سنت ہے، لیکن اس سنت پر عمل کرنا منع ہے۔ یا یہ کہ اس سنت پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، گویا سنت کوئی واجب الاتباع چیز نہیں، بلکہ سنت کو کوئی دینی اہمیت حاصل نہیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لغزشیں ہوتی تھیں اور اللہ تعالیٰ تنبیہ نازل فرماتا تھا، برق صاحب نے درحقیقت سنت کا مطلب سمجھا ہی نہیں، سنت دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فعل یا قول ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا بھی صاد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ اور

حیات طیبہ میں جو اقوال و افعال آپ سے صادر ہوئے سب پر اللہ تعالیٰ کا صاد ہے۔ پوری زندگی میں یہ دو تین مثالیں ہی ایسی ملتی ہیں، جن سے معمولی سی غلطی کا ثبوت ملتا ہے اور یہی وہ مثالیں ہیں جو ہمارے لئے موجب اطمینان ہیں۔ انہی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال پر کس طرح اللہ تعالیٰ کی تنقیدی نظر پڑ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے "اِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا" آپ ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اول تو غلطی ہوتی نہیں، اور اگر کبھی ذرا سی بھی غلطی ہوتی ہے تو فوراً وحی الٰہی جنبش میں آجاتی ہے اور اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال پر اللہ تعالیٰ خاموش رہتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان افعال سے راضی ہے اگر ناراض ہوتا تو ضرور تنبیہ کرتا، جس طرح ان دو تین واقعات کے سلسلہ میں تنبیہ کا نزول ہوا، گویا اس اصلاح کے بعد اب پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی منظور و مقبول ہوتی، لہٰذا ثابت ہوا کہ جن اعمال سے اللہ راضی ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ہیں، اگر ان کی پیروی کر لی، تو اللہ راضی ہو جائے گا۔ اور یہی مؤمن کا مقصدِ حیات ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو اسوۂ حسنہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (الاحزاب۔۲۱) اللہ تعالیٰ کی تنقید، پھر اصلاح، پھر منظوری پھر یہ آیت، کیا اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی پیروی میں ہی نجات ہے۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے، کہ آخر اللہ تعالیٰ کیوں ذرا ذرا سی بات پر تنبیہ کرتا ہے، کبھی اندھے سے بے التفاتی پر تنبیہ کرتا ہے۔ کبھی شہد نہ کھانے کے عہد پر تنبیہ کرتا ہے حتیٰ کہ بیویاں مال و دولت کی خواہش کرتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ مداخلت کرتا ہے آخر اس کی کوئی وجہ ہے، یا یہ سب کچھ یوں ہی ہو رہا ہے۔ بات در حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل قانون کا درجہ رکھتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ اصلاح فرما دیتا ہے تاکہ کوئی ایسا قانون نہ بن جائے جو اللہ تعالیٰ کی منشاء کے خلاف ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دو تین غلطیاں ہوئیں، ان کی اصلاح ہو گئی، لہٰذا اب ہم بے کھٹکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کو اپنے لئے ضابطہ حیات اور ماخذ شریعت تسلیم کرتے ہوئے اس کا اتباع کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے تنقیدی معیار پر پوری اتری، لہٰذا اس نے حکم دے دیا کہ اب اس زندگی کی پیروی کرو گے تو ہدایت ملے گی ورنہ نہیں، ارشاد باری ہے۔

وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (الاعراف: ۱۵۸) رسول کی پیروی کرو تاکہ تمہیں ہدایت نصیب ہو۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"قرآن کے گنے ہوئے چند سادہ سے ابدی احکام کے سوا ہم کسی اور ہنگامی حکم یا وقتی ہدایت کے لیے قطعاً مامور نہیں" (دو اسلام ص۱۱۲)

ازالہ

ایک طرف تو آپ یہ تحریر فرماتے ہیں، کہ اقوال رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) وقتی ہدایت ہیں، اور ص۱۱۱ پر آپ تحریر فرما چکے ہیں۔ کہ "اگر اقوال رسول مل جاتے، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا، اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرۂ ایمان میں شامل ہو جاتے"۔ معلوم نہیں، ان میں سے کون سی تحریر صحیح ہے۔ وقتی ہدایت کس طرح دائرہ ایمان میں داخل ہو سکتی ہے، بات دراصل یہ ہے، کہ سچی بات آپ کے قلم سے نکل گئی ہے، اور وہ یہ کہ اقوالِ رسول دائرۂ ایمان میں شامل ہیں۔

اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ قرآن مجید کے علاوہ جتنے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے، وہ سب ہنگامی تھے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پانچ وقت کی نماز بھی ہنگامی حکم تھا، اور اس میں تخفیف یا اضافہ کیا جا سکتا ہے، الٹے ہاتھ سے کھانے پینے کی ممانعت، سیدھے ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت وقتی ہدایات تھیں اور اب اگر ان پر عمل نہ کیا جائے، تو کوئی گناہ نہیں، گویا یہ تمام ہدایات ابدی حیثیت کی حامل نہیں کیا کوئی عقلمند انسان ایسی بات تسلیم کر سکتا ہے؟

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

اگر ہم ملا کا مذہب قبول کر لیں، تو پھر استنجا بھی اصول دین، منڈا ہوا سر بھی رکن اسلام، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار بھی مذہبی فرض، منڈی ہوئی مونچھیں، لمبی داڑھی، مسلمان کیا ہوا ایک اچھا خاصا جوکر بن کر رہ گیا"۔ (دو اسلام ص۱۱۴)

ازالہ

منڈے ہوئے سر کو تو رکن اسلام کسی نے نہیں کہا، بلکہ سر منڈانا مندرجہ ذیل دو وجہ کی بنا پر اچھا نہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر پر بال رکھا کرتے تھے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر منڈانا خارجیوں کی نشانی بتائی تھی۔

استنجا بے شک اصولِ دین ہے، اس لئے کہ طہارت و نظافت کا ذریعہ استنجا ہی تو ہے، اگر یہ نہ ہو تو وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (مدثر: ۴) پر کیسے عمل ہو سکتا ہے، نہ معلوم برق صاحب

تو کیا مونچھیں کترانے کو قابلِ ملامت سمجھا، اگر ان کا مطلب اس استنجاء سے ہے جو جاہل لوگ چلتے پھرتے کرتے ہیں، تو ہمیں بھی ان سے اتفاق ہے، یہ طریقہ بے شک حیا سوز اور خلافِ سنت ہے، بلکہ بدعت ہے۔

ٹخنوں سے اونچی شلوار یا پائجامہ، پست مونچھیں، اور لمبی داڑھی اسلامی شعار ہے یہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، صحابہ کرام ان پر عمل کرتے تھے، کیا آپ ان کو بھی اسی لفظ سے یاد کریں گے جس لفظ سے ملا کو یاد کیا ہے؟

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر آپ کسی نومسلم انگریز کا سر مونڈ کر اوپر ایک موٹا سا پگڑ باندھ دیں، مونچھیں مونڈ ڈالیں، داڑھی ناف تک بڑھا دیں، نیچے ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار پہنا دیں، پگڑ میں مسواک، ٹانگ کے ساتھ تسبیح باندھ دیں، اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اسے انگلستان بھیج دیں، تو دو ہی نتیجے ہوں گے، یا تو انگریز اسے جن سمجھ کر مار ڈالیں گے، اور یا پھر چڑیا گھر میں بند کر دیں گے (دو اسلام صہ ۱۱۴)

ازالہ سر مونڈنے کو سنت کس نے کہا؟ بلکہ سر پر بال رکھنا سنت ہے، پھر بالوں کی تحسین و تزئین اور تکریم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص ہدایات دی ہیں۔ لہٰذا سر مونڈنے کو رکنِ اسلام سمجھنا برق صاحب کی بڑی زبردست غلط فہمی ہے "موٹا سا پگڑ، پگڑ میں مسواک، ٹانگ میں تسبیح" یہ چیزیں تو آج تک کسی ملّا میں نہیں دیکھیں، معلوم نہیں برق صاحب کو ایسے ملّا کہاں دستیاب ہوئے تھے۔

مونچھیں مونڈنا کوئی انوکھی چیز نہیں، اس کا تو رواج عام ہے، پھر یورپ میں اس پر تعجب کیوں ہوگا۔ رہا داڑھی بڑھانا، تو یہ بھی کوئی انوکھی چیز نہیں، اکثر پادری لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے ہیں۔

ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار بھی تعجب کی چیز نہیں، بھلا جن لوگوں کے ہاں گھٹنوں سے اوپر نیکر بلکہ نصف رانوں تک کی شورٹس (SHORTS) پہننے کا رواج ہو وہ کیسے ٹخنوں سے اونچی شلوار پر متعجب ہوں گے، متعجب تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں، امریکی لباس کو ملاحظہ فرمایئے، ٹخنوں سے اونچی پتلون، کمر تک بلکہ کمر سے بھی اونچی بش شرٹ یا کوئی اور چیز اور پھر اس پر فخر، ڈھیلی اتنی کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پہلوان کی اترن ہے، لیکن بایں ہیئت کذائی انہیں اپنے لباس پر ناز ہے، اور مسلمانوں کو ان

کی نقالی پر فخر، اگر ایسی بش شرٹ پہنے ہوئے ہمارا کوئی بزرگ انہیں دیکھتا، تو یہ کہنے پر مجبور ہوتا، کہ اپنے چھوٹے لیکن بے حد موٹے بھائی کی بش شرٹ پہنے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے چھوٹی بھی ہے اور ڈھیلی بھی ہے۔

آنکھوں میں سرمہ لگانا بھی کوئی تعجب کی چیز نہیں، یہ تو خوبصورتی کے لئے لگایا جاتا ہے، برق صاحب سرمگین آنکھوں کو بھی بدتہذیبی شمار کرتے ہیں، اور بدتہذیبی شمار کرنے کو انگریزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، بھلا جن کے ہاں ہونٹوں پر سرخی لگانا زینت ہو، وہ سرمے کو عجوبہ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

برق صاحب اگر آپ اپنی عبارت کو اس طرح کر لیں تو مناسب ہے "اگر ہم کسی نومسلم انگریز کے سر پہ بال رکھ کر، ان میں تیل ڈالدیں، اور مانگ نکال دیں، پھر خوبصورت سا عمامہ باندھ دیں، عمامہ میں اوپر طرّہ ہو اور پیچھے شملہ، مونچھیں پست کر دیں، اور ڈاڑھی چھوڑ دیں، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنا دیں، یا تہ بند باندھ دیں، آنکھیں سرمگیں کر دیں، سفید جھک لمبا کرتہ پہنا دیں، اور پھر اسے انگلستان بھیجدیں، تو لوگ اس کو فرشتہ سمجھیں گے اور ہر جگہ اس کا اکرام اور احترام کریں گے۔"

برق صاحب اصول دین تو یہ ہے "اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُّحِبُّ الْجَمَالَ" اللہ خوبصورت ہے خوبصورتی کو پسند کرتا ہے (الحدیث رواہ مسلم) لہٰذا بات اصول دین کی کیجئے، نہ کہ فرضی ملاّ کی۔

غلط فہمی: برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

اسلام میں یہی تو خوبی ہے کہ وہ صرف حقائق پر نظر رکھتا ہے، اور ان ظواہر و مناسک کو قابل التفات نہیں سمجھتا (دو اسلام ص۲۷)

ازالہ: اسلام میں تو یہ خوبی ہے، کہ وہ ظاہر و باطن کو یکساں دیکھنا چاہتا ہے، ظاہر باطن کی نمائندگی کرتا ہے۔ شریعت ظاہری باتوں پہ نافذ ہوتی ہے، باطن کا حال سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اگر ظاہر بے کار چیز ہے، تو پھر بتایا جائے، کہ ہر ملک کی فوج کی وردی الگ الگ کیوں ہے؟ جھنڈا الگ الگ کیوں ہے؟ بیجیز (BADGES) علیحدہ علیحدہ کیوں ہیں؟ اگر ہم دشمن فوج کی وردی پہن کر لڑیں تو کیا حرج ہے؟ حقائق پر اس کا اثر کیا ہوگا۔

جماعت المسلمین اللہ کا شکر ہے، اور اس کا بھی ایک طرز ہے جو اس کو غیروں سے ممتاز کرتا ہے، یہ شانِ امتیاز ہی تو ہے جس پہ ہر قوم کو ناز ہوتا ہے، برق صاحب نہ معلوم

کیوں اس امتیازی شان کے خلاف ہیں، کیوں ان ظواہر و مناسک کو قابل التفات نہیں سمجھتے حالانکہ ان ظاہری مناسک کے ملنے کی دو عظیم الشان پیغمبر اس طرح دعا کرتے ہیں۔

(۱) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (البقرۃ:۔ ۱۲۸)

اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت ایسی بنا جو تیری مسلم ہو اور اے اللہ ہم کو ہمارے مناسک بتا دے اور ہم پر رحمت کے ساتھ متوجہ ہو بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی ظاہری مناسک میں سے ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۲) لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ الخ (البقرۃ:۔ ۱۷۷)

یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرو یا مغرب کی طرف بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا جائے۔ الخ۔

آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا کوئی خاص نیکی کی چیز نہیں، محض ایک ظاہری چیز ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت ملاحظہ ہو، ارشاد باری ہے۔

(۳) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (البقرۃ:۔ ۱۴۳)

اور جس قبلہ کی طرف آپ منہ کرتے ہیں اس کو ہم نے اس لئے قبلہ مقرر کیا ہے کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون کفر کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے۔

گویا ان ظاہری چیزوں سے اتباعِ رسول کے جذبہ کی جانچ ہوتی ہے، ان ظاہری چیزوں کو بے حقیقت سمجھنا گویا جذبۂ اتباعِ رسول سے عاری ہونا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہم سے اسی کا مطالبہ کرتا ہے، اور ان ظاہری چیزوں کو مسلمین کے لئے طرۂ امتیاز قرار دیتا ہے۔ بظاہر عرفات سے طواف کے لئے جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

(۴) ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ (البقرۃ:۔ ۱۹۹)

پھر تم طواف کے لئے اسی جگہ سے چلو جہاں سے عام لوگ چلتے ہیں (یعنی قریش جس مقام سے چلتے ہیں) وہاں سے مت چلو،

ایک اور ارشادِ گرامی سنیئے:۔

(۵) وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ

اور تم لوگ اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی

اَلْهَدْیُ مَحِلَّهٗ (البقرۃ:۔ ۱۹۶) کا جانور اپنی جائے مقررہ پر نہ پہنچ جائے

سر کا منڈانا یا نہ منڈانا کتنی بے حقیقت چیز ہے، نہ یہ کوئی اسلام کے بنیادی احکام میں سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس ظاہری اور غیر اہم چیز کا حکم دے رہا ہے، اور حکم ہی نہیں دے رہا بلکہ اگر شرعی عذر کی وجہ سے سر منڈانا پڑ جائے تو اس کا جرمانہ بھی مقرر فرما رہا ہے/ ارشاد ہے۔

(۶) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (البقرۃ:۔ ۱۹۶) — پھر جو شخص تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ (سر منڈا دے لیکن) بطور فدیہ کچھ روزہ رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

ایک اور جگہ ارشاد باری ہے۔

(۷) لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (المآئدۃ:۔ ۹۵) — حالت احرام میں شکار مت کرو۔

بتایئے اس حکم میں کون سے حقائق مضمر ہیں، محض ظواہر میں سے ہے لیکن حکم اس شد و مد کے ساتھ ہے، آخر کیا بات ہے، اللہ تعالیٰ کیوں ظواہر کو اتنی اہمیت دے رہا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد گرامی ہے۔

(۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرۃ:۔ ۱۸۳) — اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں۔

روزہ بالکل ایک ظاہری چیز ہے، جس سے انسان فاقہ مستی اور نفس کشی سیکھتا ہے اور بقول آپ کے اللہ تعالیٰ کبھی ایسے لغو کاموں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تو حقائق کو پسند کرتا ہے، اس سے راضی ہوتا ہے دنیا کی تمام قومیں تو اپنی افواج کے لئے عمدہ سے عمدہ راشن مہیا کرتی ہیں، ان کی ہر قسم کی آسائش کا لحاظ رکھتی ہیں، تاکہ ان میں کسی قسم کی جسمانی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہے، کہ اپنی فوج کو بھوکا رکھ کر اسے دشمن کے مقابلہ میں کمزور دیکھنا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں اس ظاہری فاقہ مستی سے اللہ تعالیٰ کیوں خوش ہے اس میں کیا مصلحت ہے؟ بہر حال ہم تعمیل کرتے ہیں، اگر ہم ہر چیز کو ظاہری ظاہری کہہ کر چھوڑتے چلے جائیں تو بس پھر اسلام ختم ہو جائے گا۔

جادو کے متعلق ارشاد باری ہے۔

لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرۃ:۔ ۱۰۲) — جس نے جادو کو حاصل کیا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں

جادو ایک فن وہنر ہے، لیکن کیا کیا جائے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا، محض ظاہری چیز پر اتنا زور دیا، اللہ تعالیٰ کو تو حقائق سے بحث کرنی چاہئیے تھی، اور وہ یہ کہ ایسی چیزوں کے متعلق بس یہ حکم نافذ ہوتا کہ اگر نیک مقاصد کے لئے استعمال کی جائیں تو جائز ہیں ورنہ ناجائز لیکن ایسا نہیں ہے، تو پھر یہی کہا جائے گا کہ ظواہر اور مناسک پر قرآن مجید بھی زور دیتا ہے۔

اعتکاف کے متعلق حکم صادر ہوتا ہے۔

(۱۰) وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ (البقرۃ:۔ ۱۸۷) — جب تم مساجد میں اعتکاف کے لئے بیٹھو تو عورتوں سے میل جول مت رکھو۔

یہ کیا راہبانہ زندگی کا سبق ہے؟ یہ کیا نفس کشی کی تعلیم ہے؟ کہا جاسکتا ہے کہ اصل حقیقت تو دل کا پاک وصاف ہونا ہے، محض ترک لذّات سے کیا ہوتا ہے، اب اگر ایسا کہا جائے تو پھر یہ قرآن مجید پر اعتراض ہوتا ہے، نعوذ باللہ۔ پس ثابت ہوا کہ ظاہری مناسک بھی کوئی حقیقت رکھتے ہیں، ان کی بھی کوئی اہمیّت ہے۔

خرید و فروخت کے متعلق ارشاد ہے۔

(۱۱) وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ (البقرۃ:۔ ۲۸۲) — جب خرید و فروخت کیا کرو تو گواہ کر لیا کرو

بھلا دو پیسے کا نمک خریدیں تو بھی گواہ کر لیا کریں، یہ کتنی بے حقیقت بات ہے، لیکن حکم بظاہر یہی ہے ہاں حدیث سے کچھ تخصیص ہوتی ہے، اور معاملات سہل ہو جاتے ہیں۔

عورتوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

(۱۲) وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ (النور:۔ ۳۱) — عورتیں (غیر محرم کے سامنے) اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں

یہ حکم بھی بظاہر بے حقیقت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اصل مقصد تو عفّت و پاکدامنی ہے، اور وہ تزکیۂ نفس سے حاصل کی جاسکتی ہے، تاہم اللہ تعالیٰ ظواہر پر زور دیتا چلا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے۔

(۱۳) اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ (البقرۃ:۔ ۵۸) — شہر کے دروازہ میں جھک کر داخل ہو اور "حِطّۃ" کہو ہم تمہارے سارے گناہ معاف کر دیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے، کہ جب قرآن مجید حقائق سے بحث کرتا ہے، ظاہر پرستی کو لغو سمجھتا ہے، تو پھر یہ کیوں نہیں کہتا، کہ خالص دل سے توبہ کرو، تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، اس ظاہری ہیئت پر کہ داخلہ کے وقت تم جھکے ہوئے ہو، کیوں زور دیا جا رہا ہے۔

الغرض اس قسم کے بیسیوں قرآنی احکام ہیں، جن میں ظواہر کی اچھی خاصی اہمیّت پائی جاتی ہے، اب اگر اس قسم کے ظواہر احادیث میں ہوں، تو یہ کہنا کہ یہ مُلّا کی ایجاد ہے۔ کس حد تک

مبنی بر انصاف ہے؟ اگر قرآن مجید قبلہ کی طرف منہ کرنے، طواف کے لئے ایک خاص مقام سے روانہ ہونے، قربانی سے پہلے سر نہ منڈانے، رمضان کے مہینہ میں نفس کشی، حالت احرام میں شکار نہ کرنے، نامحرم کے سامنے زینت چھپانے، شہر میں داخلہ کے وقت سجدہ کرنے کے ظاہری حکم دے سکتا ہے، اور ان کو دینی حقائق میں شمار کرتا ہے، تو پھر احادیث کے احکام مثلاً ڈاڑھی چھوڑنا، سیدھے ہاتھ سے کھانا پینا، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہننا وغیرہ حقائق میں کیوں شمار نہیں ہو سکتے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"ملاّ سے میرا نزاع اس بات پر ہے، کہ وہ حدیث کو آگے لاکر بے شمار ظواہر کو جزو اسلام بنانا چاہتا ہے، اور میں قرآن کو پیش کر کے ملت کو ان طلائی قیود سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔" (دو اسلام صہ ۱۱۴)

ازالہ برق صاحب! حقیقت میں یہ نزاع آپ کا ملاّ سے نہیں ہے، بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس لئے کہ یہ سب باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نزاع گمراہی اور ضلالت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ	اور جو شخص رسول کے خلاف چلے بعد اس کے
مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ	کہ اس کے پاس واضح طور پر ہدایت پہنچ چکی ہو
سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى	اور مؤمنین کے راستہ کے علاوہ کوئی راستہ اختیار کرے
وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ؕ	تو ہم اس کو ادھر ہی جانے دیں گے جدھر وہ جا رہا
(النسآء:- ۱۱۵)	ہے اور اس کو دوزخ میں داخل کر دیں گے وہ بہت بری جگہ ہے۔

برق صاحب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ قیود سے آزادی گویا اسلام سے آزادی ہے پھر نہ قرآن قرآن رہے گا۔ نہ اسلام اسلام رہے گا۔ قرآن بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ اگر ہم اقیموا الصلوٰۃ کے معنی یہ کریں کہ رقص و سرود کی محفل قائم کرو تو ہمیں روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی روکے تو ہم اسے ملاّ کہہ کر چپ کر دیں گے۔ اس لئے کہ وہ بلا وجہ حدیث کی رو سے پانچ وقت کی نماز کی پابندی لگا کر ہم کو قیود میں جکڑنا چاہتا ہے حالانکہ قرآن مجید ہمیں آزادی دیتا ہے کہ جو مناسب معنی ہوں وہ کر لئے جائیں۔ اور اگر کہیں "مرکز ملت" بھی ہمارے معنوں کی تائید کر دے تو بس پھر وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا۔ اب تو کسی کو چون و چرا کی گنجائش بھی نہ ہوگی، ایسے موقع پر سوائے انا للہ پڑھنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے حدیث

کے قیود اگر آپ پر بار گزرتے ہیں تو آخر قرآنی قیود کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ قرآن مجید بھی تو قیود و حدود سے مملو ہے۔ طلاق کے معاملہ میں قیود۔ نکاح کے قیود۔ نماز روزہ کے قیود، حج میں طرح طرح کے قیود، خاوند مر جائے تو عورت چار ماہ دس دن عدت میں بیٹھے، پھر نکاح کر سکتی ہے۔ آخر یہ قید کیوں لگائی گئی ہے؟ کیوں اُسے مرد کی طرح آزادی نہیں دی گئی کہ وہ جب چاہے نکاح کرے۔ غرض یہ کہ قرآن مجید کے قیود کو کہاں تک گنایا جائے۔ کیا ان قیود سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ حکومتِ وقت کتنے قواعد و ضوابط بناتی ہے جن کی خلاف ورزی جرم ہوتی ہے۔ آخر یہ قیود تسلیم کرنے پڑتے ہیں یا نہیں؟ طوعاً یا کرہاً۔ اور جب غیر کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط سے چھٹکارا نہیں تو نبی کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط سے نجات کی کیوں کوشش کی جاتی ہے؟ قواعد کی پابندی تو بہرحال کرنی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قواعد کی نہ سہی کسی اور کے سہی۔ اب یہ اپنی اپنی پسند ہے کہ کوئی کسی پابندی کو اچھا سمجھتا ہے اور کوئی کسی کو۔ مگر ایک مؤمن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے ضابطے ہی عینِ ایمان ہیں انہی سے نورِ ہدایت مل سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب:۔ ۴۶)	ہم نے آپ کو شاہد، بشارت دینے والا، ڈرانے والا اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

برق صاحب کیا کسی چٹھی رسان میں بھی یہ خصوصیات ہوتی ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الجمعۃ:۔ ۲)	وہی ہے جس نے اُمیوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، ورنہ پہلے تو وہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

برق صاحب کیا کسی چٹھی رسان میں یہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، اچھا یہ بتایئے کہ چٹھی رساں، چٹھی یعنی قرآن مجید لے کر آیا، کیا وہ دے کر چلا گیا؟ اگر نہیں تو پھر وہ کیا کرتا رہا کیا وہ ان پر نگران بنا کر بھیجا گیا تھا، کہ اس کی نگرانی میں قرآن مجید پر عمل کیا جاتا رہا؟ کیا کسی چھٹی رساں کے یہ فرائض ہوتے ہیں؟ قرآن مجید اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اس کا اتباع کیا جائے، اور یہ چیزیں

خود قرآن مجید میں بھی موجود ہیں، جب اصل اتباع قرآن مجید کا کرنا تھا، تو قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور اس کی اطاعت پر کیوں زور دیا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع صرف قرآن مجید کی حد تک کرنا تھا، تو پھر تو یہ اس حکم میں شامل تھا کہ "قرآن کا اتباع کرو" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو علیحدہ ذکر کیا۔ اور بار بار ذکر کیا، حتیٰ کہ قرآن مجید کے اتباع کا ذکر اگر چند مقامات پر کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا ذکر بیسیوں مقامات پر کیا ہے کیا یہ سب فضول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے مراد قرآن مجید کا اتباع تھا تو آخر قرآن مجید کا ذکر بار بار کرنے میں کون سا امر مانع تھا؟ آخر اس میں کیا راز ہے کہ چٹھی میں کل ہدایات موجود ہیں اور کامل ہدایات موجود ہیں لیکن پھر بھی چٹھی میں یہ لکھا ہوا ہے کہ چٹھی رساں کی اطاعت کرنا، اس کی نافرمانی نہ کرنا، آخر یہ کیوں؟

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ب۔ روایت بالمعنیٰ کی تشریح کیجئے۔

م۔ بالکل سادہ سا لفظ ہے، کہ احادیث میں رسول صلعم کے الفاظ منقول نہیں، بلکہ صرف مطالب منقول ہیں۔

ب۔ آپ کا مطلب یہ ہے، کہ مضمون حضور علیہ السلام کا ہوتا ہے، اور الفاظ راوی کے

م۔ جی ہاں!

ب۔ تو آپ ہر حدیث میں یہ کیوں کہا کرتے ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ .... اگر ہر حدیث راوی کا قول ہے، تو پھر وہ قول رسول نہیں ہو سکتی، یہ تو ناممکن ہے، کہ ایک ہی قول راوی کا بھی ہو، اور حضور کا بھی، مزید براں اگر روایت بالمعنیٰ تسلیم کی جائے، تو اس صورت میں حدیث کبھی وحی خفی نہیں بن سکتی، اس لئے کہ تمام احادیث راویوں کے اقوال ہیں، اور وحی حضور پر آیا کرتی تھی نہ کہ راویوں پر۔ (دو اسلام صہ ۱۱۵)

ازالہ برق صاحب کے مخاطب مولوی صاحب بالکل ہی جاہل تھے، ورنہ ایسے جاہلانہ جوابات دے کر خاموش نہ ہوتے، برق صاحب آپ کے اس سوال کا جواب خود آپ کی عبارت میں ملاحظہ ہو۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں، "صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں، اول یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلعم کی طرف صحیح ہو، یعنی ہم بہ دلائل ثابت کر سکیں کہ یہ قول حضور کی زبان مبارک سے واقعی نکلا، ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں، البتہ ظن غالب یہ ہے کہ

بعض اقوال صحیح ہوں گے، دوم یہ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں۔" (دو اسلام صہ ۲۴۱)

لیجئے، آپ نے خود تسلیم کر لیا، کہ بعض احادیث ظنِّ غالب ہے کہ صحیح ہوں گی، اور یہ بھی آپ نے تسلیم کر لیا کہ معنیً تو ہزاروں صحیح ہیں۔

اچھا برق صاحب یہ بتائیے، کہ اگر کوئی اردو دان جس کو عربی نہ آتی ہو، یہ کہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نماز قائم کرو، کعبہ کی طرف منہ کرو" تو یہ صحیح ہوگا یا غلط؟ یقیناً صحیح ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ادا نہیں کر رہا، بلکہ اس کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اس کے باوجود اگر وہ یہ کہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" اور یہ طریقہ صحیح ہو، تو پھر حدیث کی ادائیگی کے لئے یہ طریقہ صحیح کیوں نہیں۔

روایت بالمعنی اگر کسی قرآنی حکم پر عمل کرنے کا طریقہ مختلف الفاظ میں بتایا جائے، اور معنی ان تمام الفاظ کے ایک ہی ہوں تو بتائیے قرآن مجید پر عمل کرنے کا طریقہ متعین ہو گیا، یا نہیں، اب یہی وہ طریقہ ہے جس کے متعلق ہم کہیں گے کہ وحی خفی نے اس کو متعین کیا تھا، یعنی یہی وہ طریقہ ہے، جو من جانب اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کیا گیا تھا، اگر کسی کام کا طریقہ متعین ہو جائے، تو اس سلسلہ میں الفاظ کے تعین کا اصرار خود آپ یعنی برق صاحب کے نزدیک بھی لغو ہوگا، ذرا علم کیمیا کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے کہ ایک ہی گیس کی تیاری کے لئے ہر کتاب والا ایک ہی طریقہ بیان کرتا ہے، لیکن ہر ایک اپنے الفاظ میں، تو کیا اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ چونکہ ہر کتاب والے کے الفاظ علیحدہ علیحدہ ہیں، لہٰذا یہ طریقہ قابل اعتماد نہیں، یہ بات ہرگز نہیں کہی جا سکتی، بلکہ وہ طریقہ قابل عمل اور قابل اعتماد ہوگا، اور اس کو کسی بھی کتاب سے اخذ کیا جا سکے گا اور اس کے متعلق یقین سے کہا جا سکے گا کہ یہی وہ طریقہ ہے جو اس سلسلہ میں بانی اول سے بتواتر منقول ہے اور یہاں یہی مطلوب ہے، نہ کہ الفاظ اور طریقِ بیان۔

روایت باللفاظ اب رہی یہ بات کہ کیا کوئی قولی حدیث من وعن محفوظ ہے یا نہیں تو برق صاحب صرف اتنا تسلیم کرتے ہیں کہ بعض احادیث ایسی بھی ہیں، لیکن یقینی طور پر نہیں بلکہ ظنِ غالب ہے، کہ صحیح ہوں گی، اس سلسلہ میں ہمارا کہنا یہ ہے، کہ ظنّ غالب کا استعمال وہاں تو ممکن ہے جہاں کسی متن حدیث کی صرف ایک سند ہو لیکن جہاں دو دو، چار چار، دس دس اور بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ سندیں ہوں، اور الفاظ مشترک ہوں، تو پھر ظنّ غالب نہ ہوگا، بلکہ یقین ہوگا کہ واقعی یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اور اس قسم کی بہت سی احادیث موجود ہیں۔

غلط فہمی

بہت خوب پہلے تو رسول اللہ سے روایت بالمعنی کرتے ہیں، پھر راوی رسولؐ سے روایت بالمعنی کی تکرار کرتا ہے، اگر اسی طرح ہر راوی "بالمعنی" کے مصرع کا تکرار کرتا رہے، تو آخری راوی تک پہنچ کر غریب "معنی" کا کچومر نہ نکل جائے گا؟" ناظر ثانی (حاشیہ دو اسلام صہ۱۱۵)

ازالہ

معلوم نہیں کہ یہ ناظرِ ثانی کون صاحب ہیں، بہر حال اب ہمیں غلط فہمی ان کی دور کرنی ہے۔ ناظر صاحب سمجھتے نہیں، روایت بالمعنی سے "معنی" کا کچومر نہیں نکلے گا، اس لئے کہ معنی کی حفاظت تو ہر راوی کا مطمع نظر رہے گا۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے تھے کہ الفاظ کا کچومر نکل جائے گا، معلوم ہوتا ہے کہ ناظر صاحب کہنا یہی چاہتے تھے غلطی سے بجائے "الفاظ" کے "معنی" لکھ گئے۔

اس سلسلہ میں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ کسی راوی کا یہ منشا نہیں ہوتا کہ بس مفہوم ادا کر دو، حدیث کا حق ادا ہو گیا، نہیں بلکہ سو فیصدی ہر راوی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ ہی روایت کئے جائیں، حتیٰ کہ اگر کسی کو دو ہم معنی الفاظ میں شک ہوتا ہے، کہ ان میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سا لفظ فرمایا تھا، تو وہ دونوں الفاظ کا ذکر کر دیتا ہے، اور یہ صاف بتا دیتا ہے کہ مجھے ان دونوں لفظوں کے معاملہ میں شک ہو گیا ہے، کتب حدیث پڑھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں، بتایئے، جہاں ہم معنی لفظوں کے سلسلہ میں اتنی سختی اور تشدد ہو، وہاں دوسرے الفاظ کے لئے نرمی، تساہل، مداہنت کا پایا جانا محال ہے۔ اگر کوئی راوی اضطراری طور پر روایت بالمعنی کر دیتا ہے تو اسے پسند نہیں کرتا بلکہ اپنے اختیار اور امکان کی صورت میں روایت بالمعنی سے احتراز کرتا ہے، پھر اگر کسی راوی میں روایت بالمعنی کی ذرا سی بھی عادت پائی جاتی ہے، تو محدثین اس کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور متن حدیث کی چھان بین میں لگ جاتے ہیں، اور اس طرح تحقیق و تفتیش کے بعد حدیث کے اصلی متن کو صحیح حدیث کی شکل میں امت کے سامنے پیش کرتے ہیں، الغرض قولی احادیث میں الفاظ ہی کی حفاظت کی گئی ہے، اور اس کی حفاظت کے لئے پورا فنّ حدیث معیاری طور پر مرتّب و مدوّن ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ فن حدیث کا پورا زور حفاظت الفاظ پر ہے نہ کہ حفاظتِ مفہوم پر ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ وحی بلا الفاظ میری سمجھ سے بالاتر ہے، وحی کے معنی ہیں پیغام، اگر

اللہ کوئی پیغام بھیجے، اور الفاظ ساتھ نہ ہوں، تو وہ سمجھ میں کیسے آئے گا۔ (دو اسلام ص۱۱۵)

ازالہ یہ ضروری نہیں کہ وحی خفی ہمیشہ بلا الفاظ ہی آتی ہو، اور اگر ہر وحی خفی کو ہم بلا الفاظ ہی سمجھ لیں تو بھی یہ سمجھ سے کوئی بالاتر چیز نہیں، اس لئے کہ خیال پہلے پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں الفاظ کی شکل اختیار کرتا ہے، خیال اور الفاظ کا ساتھ ساتھ پیدا ہونا لازمی نہیں، ایک ہی خیال اگر مختلف لوگوں کو پیدا ہو تو الفاظ ہر شخص کے علیحدہ ہوں گے، صرف خیال میں وہ لوگ متحد ہوں گے لیکن جب وہ اس کو ادا کریں گے تو الفاظ علیحدہ ہوں گے، بلکہ اکثر کی زبان بھی علیحدہ ہوگی، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خیال دماغ میں گھومتا رہتا ہے لیکن اس کی ادائیگی کے لئے موزوں الفاظ دیر میں یاد آتے ہیں، وہ مفہوم جو ذہن میں ہو، لیکن ابھی الفاظ ذہن میں نہ آئے ہوں، تو وہ خیال و تصور بلا الفاظ ہوا یا نہیں، بس اسی پر وحی خفی کو سمجھ لیجئے بلکہ اصل بات تو یہ ہے، وحی خفی ہو یا جلی ہمارے سمجھنے کی چیز ہی نہیں، اور یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے تو پھر "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" (الاسراء ۳۶:۱۷) کی تعمیل میں ہمیں اس کی تاویل و تشریح سے باز ہی رہنا چاہیئے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"م۔ آپ وحی خفی کا مطلب "سوجھنا" سمجھ لیں، کہ حضور کو جب کوئی بات سوجھ جاتی تھی، تو وہ اسے اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے، سوجھتے ہمیشہ خیالات ہی ہیں، اور یہی وحی خفی ہے۔

ب۔ اجی حضرت! سوجھنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے، ایک فلسفی کسی نئی الجھن کو پہروں، ہفتوں بلکہ مہینوں سوچتا ہے، اور کسی نہ کسی دن اسے حل سوجھ ہی جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حل اس فلسفی کے دماغ میں اللہ نے ڈالا ہے، لیکن اسے وحی یا الہام نہیں کہتے، بلکہ القا کہتے ہیں۔ (دو اسلام ص۱۱۶)

ازالہ ہمیں اس سے کلیتہً اتفاق نہیں، کہ جو حل فلسفی کو سوجھا ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کے دماغ میں ڈالا تھا، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ڈالا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ ڈالا ہو، دونوں ممکن ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ہی نے ڈالا ہو تو اس کی بھی دو صورتیں ہوں گی، یا تو وہ ہدایت و حکمت پر مشتمل ہوگا، یا گمراہی اور ضلالت سے بھرپور، اگر ہدایت و حکمت پر مشتمل ہے، تو پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی مہر بھی ثبت ہوگی، اور اگر گمراہی اور ضلالت پر مشتمل ہے، تو اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت اور اس کے نتائج کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ ہی

کی طرف منسوب ہو گا لیکن اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی مہر ثبت نہ ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو گا۔ بداعمالی، ضد، ہٹ دھرمی اور سرکشی کے نتائج اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں اب اگر کسی شخص کے دل میں بُرے خیالات آتے ہیں تو ان کا خالق تو بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن گنہگار وہی شخص ہے جس نے برے عمل کئے اور ان برے اعمال کو برے خیالات کا سبب بنایا۔ مندرجہ ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِىْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (الحجر: ۱۰ تا ۱۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی گذشتہ اقوام میں نبی بھیجے تھے اور جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول آیا تو انہوں نے اس کا مذاق ہی اڑایا۔ مجرمین کے دل میں یہ استہزاء اور مخالفت ہم اسی طرح ڈال دیتے ہیں۔

برق صاحب یہ آیت آپ کے سامنے ہے۔ رسولوں کی مخالفت اللہ تعالیٰ ہی مجرمین کے دلوں میں ڈالتا ہے، اب آپ بتائیے کیا اس مضمون کی آیت قرآن مجید میں ہو سکتی ہے؟ اگر یہی مضمون کسی حدیث میں ہوتا تو کیا آپ جلدی سے نہ کہہ دیتے کہ حدیث وضعی ہے اب یہاں کیا کہیں گے؟ اگرچہ ہم نے آیت کو نقل کرنے سے پہلے اس الجھن کو دور کر دیا ہے لیکن متن پر جو اعتراض ہو سکتا ہے، وہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور آپ کے لئے داعی الی الانصاف ہے۔

اگر وہ حل اللہ تعالیٰ نے دماغ میں نہ ڈالا ہو تو پھر شیطان نے ڈالا ہو گا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہے۔

اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۲۱)

بے شک شیاطین اپنے اولیاء کی طرف وحی بھیجتے ہیں کہ وہ تم سے مجادلہ کریں اور اگر تم نے ان کا کہنا مان لیا تو تم بے شک مشرک ہو جاؤ گے

اس آیت سے ثابت ہوا کہ شیطان بھی دلوں میں بعض باتیں ڈالتا رہتا ہے۔ اور اللہ اس شیطانی وسوسہ کو بھی وحی کا نام دے رہا ہے۔ لہٰذا فلسفی جو کچھ سوچتا ہے۔ ہو سکتا ہے صحیح ہو اور ہو سکتا ہے کہ غلط ہو، بے شمار فلسفے ایسے ہیں جو پہلے قابل اعتماد تھے لیکن بعد میں آنے والوں نے اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ فلسفی اور نبی کے سوچنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نبی سوچتا ہے اور نور نبوت اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ اللہ کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تنقیدی نگاہیں اس پر پڑتی رہتی ہیں اور جہاں اس سے اس سوچ و اجتہاد میں غلطی ہوئی فوراً وحی آتی ہے اور اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ نبی کی ہر سوجھ پر

اللہ تعالیٰ کی رضا کی مہر ہوتی ہے، نبی غلطی نہیں کر سکتا اور اگر غلطی کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ رسول احکام الٰہی پر عمل کرتا ہے اور اس عمل کا طریقہ (سنّت) مقرر کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ سمجھتا ہے کہ اس طریقہ سے یہ عمل غلط ہے اور پھر بھی وہ خاموش رہتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ایسا معلّم و مزکّی بھیجا جو خود کتاب اللہ کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں غلطی کرتا ہے اس صورت میں اللہ تعالیٰ اور اس کی رسالت سب محلّ اعتراض بن جائیں گے اور یہ آیت بے معنی ہو جائے گی۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (الانعام: ۱۲۴) اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کس کو دے۔

جس رسول کے طریقہ کو ہمارے لئے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہو اگر وہی غلطی کرے تو پھر وہ تمام لوگ جو اس کی اتباع کریں گے غلطی پر ہی رہیں گے اور اگر بالفرض وہ لوگ اپنے اجتہاد سے صحیح مطلب اخذ کر کے عمل کریں گے تو پھر یہ اعتراض لاحق ہوگا کہ عام لوگوں کی فہم و فراست رسول کی فہم و فراست سے بالاتر ہوئی اور یہ بھی ناممکن ہے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معمولی سی غلطیوں پر بھی چشم پوشی نہیں فرمائی بلکہ وحی جلی سے ان کی اصلاح کر دی تو بھلا بڑی بڑی غلطیوں پر جو اصولِ دین پر اثر انداز ہوتی ہیں کیسے خاموش رہ سکتا ہے، لہٰذا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند ہے اور یہی وحی خفی کا اصلی مفہوم ہے۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ تمام احادیث قولی و فعلی اسی وحی خفی کے ضمن میں آتی ہوں، یہ تو محض ایک اصطلاح ہو گئی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سی احادیث وحی جلی کے ذریعہ نازل ہوئیں اور بالکل اسی کیفیت سے نازل ہوئیں، جس طرح قرآن مجید نازل ہوتا تھا، احادیث میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

کیا لوگوں کو فکر و عقل کی دعوت دینے والا نبی۔۔۔۔۔ خود نہیں سوچا کرتا تھا اور اسے اپنے آپ پر اس قدر بے اعتمادی تھی کہ جب تک جبریل مشورہ نہ دیتا یا اللہ تعالیٰ رہنمائی نہ کرتا تو وہ دین و دنیا کے کسی معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ وحی خفی کا شوشہ تعظیم رسولؐ کے لئے نہیں بلکہ تنقیص رسولؐ کے لئے چھوڑا گیا ہے۔ (دو اسلام ص ۱۱۶-۱۱۷)

ازالہ قرآن مجید نے جہاں کہیں تدبّر و تفکر کی دعوت دی ہے تو اس تدبّر و تفکر کے ذریعہ توحید اور آخرت کی طرف دعوت دی ہے، اور اس بات پر زور دیا ہے، کہ یہ وحی یہ مناظر قدرت، یہ کائنات، کیا تم کو اس بات کا یقین نہیں دلاتے، کہ جو ان کا خالق ہے، وہی

حقیقی الٰہ ہے، وہی عبادت اور فرمانروائی کے لائق ہے۔ اب رہا قرآنی احکام پر عمل کرنے کا طریقہ، تو یہ قرآن مجید نے کہیں نہیں کہا کہ تدبر و تفکر سے ان کا طریقہ تلاش کرو، مثلاً نماز پڑھنے کا طریقہ تدبر و تفکر سے خود متعین کرو، اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو اس کا یہ قول عجوبۂ روزگار ہے، وحی خفی کا شوشہ تنقیصِ رسول کے لئے نہیں، بلکہ تعظیمِ رسول کے لئے ہے، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا، اللہ تعالیٰ اس سے راضی تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس پر تنبیہ نہیں کی، پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تفکر و تدبر اتنا صحیح ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ بھی اس پر گرفت نہیں کرتا تھا۔ اور پوری زندگی میں صرف دو تین موقعوں پر ہی اللہ کی طرف سے گرفت ہوئی، ورنہ ساری زندگی کے اجتہادات اللہ تعالیٰ کے معیارِ تنقید پر پورے اترے، یہ وحی خفی کا سلسلہ صرف ایک حد تک احادیث پر حاوی ہے ورنہ احادیث کا معتد بہ حصہ وحی جلی کے ذریعہ یعنی وحی مثلِ قرآن کے ذریعہ نازل ہوتا تھا، علم حدیث کے طالب علم اس سے بخوبی واقف ہیں اور قرآن مجید میں بصیرت رکھنے والے قرآنی آیات سے اس پر استدلال کر سکتے ہیں اور کرتے آئے ہیں۔ تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی "برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ہمارے بعض علماء تو عشقِ حدیث میں یہاں تک عقل و خرد گم کر چکے ہیں کہ اللہ کے کلام کو نہ صرف احادیث کا محتاج ٹھہراتے ہیں، بلکہ یہ کہتے ہوئے بھی سنے جاتے ہیں، کہ اگر اللہ کا کوئی قول رسول کے قول سے متصادم ہو جائے تو قولِ خدا کو منسوخ سمجھو" (دو اسلام صـ۱۱) اوزاعی مکحول کے اس قول کے راوی ہیں کہ "حدیث قرآن کی اتنی محتاج نہیں، جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے" (دو اسلام صـ۱۱۸-۱۱۹)

ازالہ برق صاحب ایسا ہوا تو نہیں ہے، کہ کسی حدیث سے قرآن مجید کا کوئی حکم کلیۃً منسوخ ہوا ہو۔ لیکن اگر ایسا بھی ہو جائے، تو بعید از عقل بھی نہیں ہے، غلط فہمی آپ کو صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ قرآن مجید کو تو آپ اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہیں، اور حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ حالانکہ یہ نظریہ ہی غلط ہے، قرآن مجید بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور حدیث بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، بفحوائے آیۂ کریمہ مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء۔۸۰) یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔ لہٰذا منسوخ حکم بھی اللہ تعالیٰ کا ہے، اور منسوخ کرنے والا حکم بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں حدیث میں ہر چیز کی تفصیل ہے، اور تفصیل کے لئے اجمال کی ضرورت نہیں ہوا کرتی

ہاں اجمال کے لئے تفصیل و تشریح کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً حدیث میں ہے کہ نماز قائم کرو، اور اس، اس طریقہ سے اس اس وقت پڑھو، تو اب حدیث میں دو چیزیں آگئیں، اول قرآنی حکم کہ "نماز قائم کرو" اور پھر اس کی تشریح کہ اس طرح اور اس وقت پڑھو، تو آپ بتائیے حدیث میں قرآن کو سمو دیا گیا، یا نہیں، حدیث کی تشریح کے لئے قرآن مجید کی کیا ضرورت ہے لیکن برخلاف اس کے اگر قرآن مجید کا حکم سنایا جائے کہ "نماز قائم کرو" تو پھر یہ سوال ہوگا، کہ کب اور کیسے ؟ اور اب حدیث کی ضرورت ہوگی۔ یعنی قرآن مجید کی تشریح کے لیئے حدیث کی ضرورت پیش آئے گی۔ مطلب یہ کہ قرآن مجید کی تشریح کے لئے حدیث کی احتیاج و ضرورت ہے اور یہی مطلب ہے امام مکحولؒ کے قول کا، کہ قرآن حدیث کا محتاج ہے۔ لفظ "محتاج" کا استعمال اردو میں کراہت پیدا کرتا ہے، لیکن عربی میں نہیں اور یہی وجہ ہے کہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوگئی، اور اس لفظ کو قرآن مجید کے شایانِ شان نہیں سمجھا۔

غلط فہمی | یہ طریقت، رہبانیت اور جہاد اکبر کے راستے نکال کر خدائی پیغام کو کس نے مسخ کیا تھا...... (دو اسلام صـ۱۱۸)

ازالہ | برق صاحب آپ نے سچ فرمایا، یہ کام بے شک کسی ملا نے کیا تھا یا کسی صوفی نے لیکن کسی عالم دین نے کبھی اس پر مہر تصدیق ثبت نہیں فرمائی، للہذا ہم بھی آپ کی تائید کرتے ہیں۔

باب ۶

تحریف احادیث کے اسباب

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

غلط فہمی تحریف احادیث کے کئی اسباب تھے۔ اول حضور علیہ السلام نے حدیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا اور جو چیز لکھی نہ جائے اسے تحریف سے بچانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ (دو اسلام ص۱۳۱)

ازالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے سے منع نہیں فرمایا تھا بلکہ قرآن مجید کے ساتھ ملا کر لکھنے سے منع فرمایا تھا متواتر احادیث سے کتابت کی اجازت و حکم ثابت ہے۔ تفصیل کے لیے باب اوّل ملاحظہ ہو، حدیث لکھی گئی، مسلسل لکھی گئی لہٰذا بقول برق صاحب تحریف سے بچ گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی تحریر کردہ کتب احادیث کا بیان باب اوّل میں گذر چکا ہے۔ ان کے بعد تابعین و تبع تابعین کے دور میں تو کتب احادیث اتنی لکھی گئیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ تفصیل کے لئے مولوی عبدالرؤف صاحب جھنڈا نگری کی کتاب "صیانتہ الحدیث" ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی "چند روز کا ذکر ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم لاہور تشریف لائے، یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک جلسہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں عبدالباری کی صدارت میں منعقد ہوا جب میاں صاحب تقریر کے لئے اٹھے تو مجمع سے یہ آوازیں بلند ہوئیں "ہم خائنوں کے سردار کی تقریر نہیں سننا چاہتے۔ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ" چنانچہ وہ بیٹھ گئے۔ نوائے وقت اور اس کے ہمنواؤں نے لکھا کہ شور مچانے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہیں تھی، لیکن "زمیندار" اور چند دیگر اخبارات کہہ رہے تھے کہ یہ جلسہ

میں شریک ہونے والے دو لاکھ انسانوں کی متفقہ آواز تھی، واقعہ دو دن کا ہے، دو لاکھ انسانوں نے اسے دیکھا، ہر اخبار کے نمائندے بھی وہاں موجود تھے، اور پھر اصل حقیقت نہیں کھلتی۔" (ص ۱۲۲)

ازالہ برق صاحب! یہاں دو سیاسی جماعتوں کے سیاسی فریب ہیں، جو اس خبر کی اشاعت میں کام کر رہے ہیں، برخلاف اس کے احادیث کی روایت میں صحابہ کرام میں دو جماعتیں نہیں تھیں، کہ ایک جماعت دوسری جماعت کو گرانے کے خیال سے فریب دیتی، اور احادیث میں تحریف کرتی، یہ تو صحابہ کرام کے متعلق بڑی زبردست غلط فہمی ہے اور اس کا جواب باب چہارم میں دیا جا چکا ہے، پھر یہ تو بتایئے، اس اختلاف تعداد سے اصل واقعہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ میاں عبدالباری صاحب لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے تقریر نہ کر سکے تھے، یہ تو صحیح ہے یا نہیں کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ تعداد میں اختلاف ہے، لہٰذا یہ واقعہ ہوا ہی نہیں، یہ سارا واقعہ من گھڑت ہے! کیا کوئی فہیم انسان اسے تسلیم کرے گا؟ خود آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ ہوا اور اختلاف تعداد کے باعث اس واقعہ کو نہیں جھٹلاتے، تو پھر یہی حال حدیث کا بھی ہے، مثلاً "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بھول گئے، آپ کو یاد دلایا گیا۔ آپؐ نے کمی کو پورا کیا، اور بعد میں سہو کے دو سجدے کئے" اب اگر اس حدیث میں فرض کیجئے، یہ اختلاف پیدا ہو جائے، کہ کوئی کہے، کہ آپ عصر کی نماز میں بھولے تھے، کوئی کہے کہ ظہر کی نماز میں بھولے تھے، تو بتایئے اس سے اصل واقعہ پر کیا اثر پڑے گا۔ ظہر یا عصر کی تصریح ہونا تو کوئی اہمیت کی چیز نہیں، اہمیت کی چیز یہ ہے کہ جب کبھی نماز میں بھول ہو جائے، تو بعد میں دو سجدے سہو کے کر لئے جائیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا، سہو کے مسئلہ پر ظہر یا عصر کا اختلاف بالکل اثر انداز نہیں ہوگا، بلکہ مسئلہ پوری طرح ثابت ہوگا، اور محفوظ ہوگا، اور چونکہ سجدۂ سہو کا مسئلہ ہی دینی مسئلہ ہے، لہٰذا اس کے محفوظ ہونے سے دین محفوظ ہو گیا۔ اور ظہر یا عصر کی صراحت محفوظ نہ ہونے سے دین کی حفاظت متاثر نہ ہوگی، تمام احادیث میں یہی بات آپ کو ملے گی، جزئی اختلاف کے باوجود جب مسئلہ کی بات آئے گی، تو پھر صحیح احادیث میں ایک ہی بات ہوگی، اسی کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت کہتے ہیں، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدۂ حفاظت پورا کیا۔

غلط فہمی "احادیث کی تحریف میں انسان کے اس فطری خاصہ کا کافی دخل ہے، حضور علیہ السلام سے بات نکلی، ہزاروں نے سُنی، رفتہ رفتہ اس

میں ردّو بدل ہونے لگا، زمانہ گذرتا گیا، اور بات بگڑتی گئی، ہزاروں سے نکل کر لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں زبانوں تک پہنچی، جہاں کوئی حصہ بھول گیا، پاس سے بڑھا لیا، اصلی قول محفوظ نہیں تھا، کہ مقابلہ کر کے تصحیح کر لیتے، راویوں میں اچھے بھی تھے اور برے بھی، مؤخر الذکر نے احادیث کو اپنے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا، اور بات کہاں سے کہاں نکل گئی"۔ (صہ ۱۲۳)

ازالہ اس کے جواب میں برق صاحب آپ اپنی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں، مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

"گذشتہ ۷۴ برس میں مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا، جو رنگ آمیزی، مبالغہ اور دیگر سخن گسترانہ عیوب سے پاک ہو، میں خود ان عیوب سے مبرا نہیں اور آج کہ میری عمر ۷۴ سال سے کچھ اوپر ہو چکی ہے، علم کے کئی منازل طے کر چکا ہوں، متانت حقیقت اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں، پھر بھی داستان سرائی، مبالغہ اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں۔" (دو اسلام صہ ۱۲۱)

مندرجہ بالا غلط فہمی میں مبالغہ اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں۔

انتباہ برق صاحب! آپ نے غور فرمایا، آپ کی عمر ۷۴ سال سے کچھ اوپر ہے، اور گذشتہ ۷۴ سال میں آپ کو ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا، جو رنگ آمیزی سے پاک ہو، ریاضی کا معمولی سا طالب علم بھی کہہ سکتا ہے کہ کم از کم پانچ سال تو ۷۴ سال کے عرصہ میں سے تفریق کر دینے چاہیئے تھے، اس لئے کہ ایام رضاعت اور ایام طفولیت کے پانچ سال اس قسم کے تجربات و مشاہدات کے لئے بنیاد نہیں بن سکتے، بہر حال اس غلطی کے باوجود برق صاحب کے اس مفہوم میں کوئی غلطی نہیں کہ "ان کو ایسے لوگ نہیں مل سکے جو مبالغہ آمیزی سے مبرا ہوں" اگر ریاضی کی اس غلطی کے باوجود ان کا منشاء صحیح ہے تو یہی بات تو حدیث میں بھی ہوتی ہے کہ باوجود اس کے کہ بعض راوی بعض غلطیاں کر جاتے ہیں، لیکن منشاء میں کوئی غلطی نہیں کرتے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل منشاء کو کما حقہ اور بالکل صحیح ادا کر دیتے ہیں، آپ معمولی سے جزئی اور غیر اہم اختلاف کو مبالغہ سے اتنا عظیم بنا دیتے ہیں کہ ناواقف یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ جب اتنا اختلاف ہے تو اس کا اعتبار ہی کیا۔

غلط فہمی حضور کا زمانہ تھا، خود سرور کائنات بقید حیات تھے، کہ حضرت زبیرؓ سے انکے بیٹے عبد اللہ نے پوچھا کہ آپ روایت احادیث سے کیوں اجتناب کیا کرتے ہیں، فرمایا اللہ کی قسم! احادیث میں اختلاف ہو گیا ہے، میں نے حضور کی زبان مبارک

سے یہ حدیث ان الفاظ میں سنی تھی۔

مَنْ کَذَبَ علی فلیتبوا مقعدہٗ من النار — جو شخص کوئی غلط قول میری طرف منسوب کریگا جہنم میں جائے گا

لیکن لوگوں نے اس میں "متعمداً" کا لفظ (من کذب علی متعمداً) بڑھا لیا ہے۔

(دو اسلام صد ۱۲۳)

ازالہ برق صاحب آپ کی عقل میں یہ بات کیسے آگئی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور احادیث میں اختلاف ہو جائے، اختلاف دور کرنے والی ہستی موجود ہو، نہ وہ اختلاف کو دور کرے، نہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں اور اختلاف کو رفع کریں یہ کیسے ممکن ہے آپ نے تو بڑی عجیب وغریب بات کہی ہے۔

برق صاحب! آپ کی وارد کردہ روایت بالکل بے سند ہے، لہٰذا بالکل جھوٹی ہے۔ (خالص اسلام صد ۱۶۲) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے یہ سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد کیا تھا، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں، روایت کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کہتے ہیں۔

مَالِیْ لَا اَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَمَا اَسْمَعُ اِبْنَ مَسْعُوْدٍ وَفُلَانًا وَفُلَانًا قَالَ اَمَا اِنِّیْ لَمْ اُفَارِقْهُ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلٰكِنِّیْ سَمِعْتُ كَلِمَةً یَقُوْلُ مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (رواہ ابن ماجہ ورواۃ ثقات تقریب)

کیا بات ہے کہ میں آپ سے اس طرح حدیث نہیں سنتا جس طرح ابن مسعود اور فلاں فلاں شخص سے سنتا ہوں؟ حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ نہیں ہوا جب سے میں نے اسلام قبول کیا لیکن ایک کلمہ میں نے آپ سے سنا ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرنا چاہیئے۔

یعنی حضرت زبیرؓ اس خوف سے احادیث بیان نہیں کرتے تھے، کہ کوئی غلطی نہ ہو جائے اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ "متعمداً" کا لفظ حضرت زبیرؓ کی حدیث میں موجود ہے حضرت زبیرؓ کے علاوہ اس لفظ کو روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد دو سو تک بتائی گئی ہے، صرف کتبِ صحاح میں یہ لفظ چودہ صحابہ کی روایت میں موجود ہے (خالص اسلام صد ۱۶۲) پس ثابت ہوا کہ برق صاحب کی نقل کردہ روایت بالکل باطل ہے۔

غلط فہمی اسی طرح جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے حضرت ابوہریرہ کی کتے والی حدیث بیان کی گئی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مویشیوں کی رکھوالی اور کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنا جائز ہے، تو ابن عمرؓ نے فرمایا، کیوں نہ ہو، ابوہریرہ کھیتوں کا مالک

جو ٹھہرا۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کھیت کے لئے کتا پال رکھا تھا، اس لئے بقول ابن عمرؓ آپ نے ایک حدیث تراش کر کتا پالنے کا جواز نکال لیا تھا۔ (صـ ۱۲۳-۱۲۴)

ازالہ بات صرف اتنی ہے، کہ عبداللہ بن عمرؓ کو کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنے کی حدیث معلوم نہ تھی، حضرت ابو ہریرہ کو معلوم تھی، اور انہوں نے بیان کی، تو ابن عمرؓ نے کہا یہ حدیث انہیں معلوم ہونی ہی چاہیئے، کیونکہ وہ کھیتی کرتے ہیں" اور کتا پالتے ہیں" اگر انہیں معلوم نہ ہوتی، تو وہ ایسا کیوں کرتے نہ ابن عمرؓ کا اس میں کوئی طنز ہے، نہ ابو ہریرہ کی تکذیب، بلکہ ظاہر یہ کرنا تھا، کہ کوئی تعجب نہیں، اگر انہیں یہ حدیث یاد ہے اور مجھے یاد نہیں، اس لئے کہ وہ اس کے ضرورت مند ہیں اور میں نہیں، برق صاحب کا ابن عمرؓ پر یہ بہتان ہے کہ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ابو ہریرہ نے حدیث تراش لی، حاشا وکلا، بلکہ اس کلمہ کو انہوں نے بھی یاد کر لیا اور اس کی روایت کی۔

عَنْ أَبِي الْحَكَمِ سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ زَرْعٍ أَوْ غَنَمٍ أَوْ صَيْدٍ يُنْقَصُ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطٌ (صحیح مسلم کتاب البیوع)

ابو الحکم کہتے ہیں میں نے ابن عمرؓ کو یہ کہتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے کھیتی یا بکری یا شکار کے کتے کے علاوہ کتا پالا تو اس کے اجر میں سے ہر روز ایک قیراط کم ہو جائے گا۔"

گویا حضرت ابن عمرؓ نے تو حضرت ابو ہریرہ کو سچا سمجھا، اور برق صاحب غلط فہمی سے کچھ اور سمجھ رہے ہیں۔ پھر یہ روایت دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے اور اس میں حضرت ابو ہریرہؓ کا انفراد نہیں، الغرض دونوں صحابی اس بہتان عظیم سے بری ہیں، برق صاحب! اگر صحابہ کرام احادیث گھڑتے تھے، بدترین قسم کے کذاب ووضاع تھے تو پھر کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ ان لوگوں نے قرآن مجید میں بھی کوئی تحریف کی ہوگی، کیونکہ صحیفہ عثمانی و صدیقی کی ترتیب میں نعوذ باللہ ان کذابین کی جماعت شامل تھی، یہی وجہ ہے کہ ایک فرقہ موجودہ قرآن مجید کو محرف مانتا ہے (تفصیل کے لیے باب پنجم ملاحظہ ہو)

غلط فہمی زمانہ گذرتا گیا، اللہ سے ڈرنے والے اور ذات رسول سے عشق رکھنے والے ختم ہوتے گئے، اور بعد میں آگئے ایسے مسلمان جو کعبہ کو گرانے، آل رسول کو ذبح کرنے، اور حرم نبوی کے معصوم بچوں کو گرم ریگستان میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے، کیا ان حضرات کے لئے احادیث میں ردو بدل کوئی بڑی بات تھی۔ (دو اسلام صـ ۱۲۴)

ازالہ برق صاحب بقول آپ کے صحابہ کرام تک احادیث میں تحریف کیا کرتے تھے، تو پھر بعد والوں پر تحریف احادیث کے سلسلہ میں تعجب کی بات ہی کون سی ہے"۔ این خانہ ہمہ آفتاب ست" جب قرآن مجید کے مخاطبین اوّلین ہی احادیث میں ردّ و بدل کر دیا کرتے ہوں، تو پھر بعد والے جتنا بھی کریں کم ہے، گویا جن صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معتمد اور محبوب سمجھتے ہوں، قرآن مجید جن کی تعریف کرتا ہو، وہ گویا سب کے سب الا ماشاء اللہ منافق تھے، اس سے تو اس فرقہ کی تائید ہوتی ہے، جو کہا کرتا ہے کہ صرف تین صحابی (یا اس سے کچھ زائد) مسلم تھے باقی سب منافق، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

برق صاحب جن واقعات کی طرف آپ نے اپنی مذکورہ بالا عبارت میں اشارہ فرمایا ہے، ان میں سے اکثر بناوٹی ہیں، لیکن معلوم نہیں آپ نے بے تحقیق بے سند باتوں پر کیسے یقین کر لیا، محدثین کی معیاری اور باسند باتیں تو آپ کو تسلیم نہیں اور مورخین کی بے سند اور جھوٹی باتوں پر آپ یقین کر لیتے ہیں، تعجب ہے، اگر ہم ان واقعات کو صحیح مان لیں تو ہم آپ سے پوچھتے ہیں، کہ کیا محدثین کی جماعت تھی جو یہ کام کرتی تھی، کیا آل رسول کو محدثین نے ذبح کیا تھا کیا قاتلانِ حسینؓ اصحابِ حدیث تھے، جو طلبائے حدیث کو احادیث املاء کراتے تھے؟ آخر کیا بات ہے؟ اللہ کے لئے انصاف کیجئے، محدثین کی جماعت ہمیشہ ان فتنوں سے علیحدہ رہی، وہ یکسوئی کے ساتھ صرف احادیث کی خدمت کرتے رہے، ان کی زندگی بے داغ اور اسلامی زندگی کا شاندار نمونہ تھی، محدثین کرام تو ان لوگوں کا اعتبار ہی نہیں کرتے تھے جو ان واقعات میں شریک ہوئے تھے۔

غلط فہمی "ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ احادیث کو چھوڑ دو گے، تو نماز پڑھنے کا طریقہ کہاں سے سیکھو گے اور زکوٰۃ کی مقدار کہاں سے معین کرو گے؟

جواب:۔ اس سوال کے تین جواب ہیں:۔ اول:۔ اگر ہم احادیث کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دیں تو ہر مسجد کی نماز دوسری سے مختلف ہو جائے گی" (دو اسلام صفحہ ۱۲۴)

ازالہ برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ اب تمام مسجدوں میں نماز کی ایک ہی صورت ہے اگر حدیث کے مطابق پڑھیں گے، تو مختلف ہو جائے گی، برق صاحب نے یہ تو بڑی عجیب و غریب بات کہی ہے، کیونکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، یعنی آج کل نماز کی ہیئت میں اختلاف ہے اور اس کی وجہ تقلیدی فرقہ بندی اور احادیث کی طرف سے غفلت ہے، اگر سب مل کر صحیح احادیث کے مطابق نماز پڑھنے لگ جائیں، تو یہ اختلاف مٹ جائے گا جو آج کل مسجدوں میں پایا جاتا ہے، کہ کوئی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے، اور کوئی ہاتھ باندھ کر تو کوئی سینہ پر

ہاتھ باندھتا ہے، اور کوئی ناف کے نیچے، کوئی بلند آواز سے آمین کہتا ہے، اور کوئی بلند آواز سے پڑھتا ہے، کوئی رفع یدین کو نماز کی زینت سمجھتا ہے، اور کوئی اس کو سرکش گھوڑوں کے دموں سے تشبیہ دیتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

غلط فہمی "دوم۔ رسول اکرم صلعم کو لاکھوں مسلمانوں نے نماز پڑھتے دیکھا۔ انہیں کروڑوں نے، اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچ گیا، کیا ان ارب کھرب انسانوں کی شہادت کافی نہیں؟ کیا دیہاتی مسلمان صحیح بخاری سے نماز کا طریقہ سیکھا کرتے ہیں جس طریقہ سے ہمارے آباؤ اجداد نماز ادا کرتے رہے، ہم نے وہ سلسلہ جاری رکھا، اور اب[1] ہماری نقل اتار رہی ہے، یہاں صحیح بخاری کی ضرورت ہی کہاں پیش آتی ہے۔ کشمیر کی ساری وادی میں غالباً صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہوگا، لیکن پھر بھی وہ نہایت صحت سے نماز پڑھتے ہیں" (دو اسلام ص۱۲۵)

ازالہ یہ جواب خود برق صاحب کے خلاف ہے، یعنی حدیث کی کتابت، حدیث کی حفاظت کے لئے لازمی شئے نہیں، بلکہ حدیث پر جو عمل تواتر سے ہر زمانہ میں ہوتا رہا یہی اس کی اصل حفاظت ہے اور یہ ایسی حفاظت ہے کہ تقریباً پورا قرآن مجید اس حفاظت میں احادیث کی برابری نہیں کرتا، برق صاحب کی اس عبارت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صحیح بخاری ہو یا نہ ہو، احادیث عملاً محفوظ ہیں اور جس طرح آج تواتر کی وجہ سے محفوظ ہیں۔ صحیح بخاری کی تالیف سے پہلے بھی تواتر کی وجہ سے اسی طرح محفوظ تھیں، لہٰذا یہ اعتراض کہ صحیح بخاری کی تالیف سے پہلے ڈھائی سو سال گذر چکے تھے، اس طویل زمانہ میں حفاظت حدیث کا کوئی انتظام نہ تھا، اور یہ کہ تمام احادیث غیر محفوظ تھیں اس لئے ناقابل اعتماد ہیں" خود بخود کالعدم ہو جاتا ہے، اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ صحیح بخاری کی تالیف کے وقت بھی احادیث عملی تواتر کی وجہ سے محفوظ تھیں۔ امام بخاری نے ان ہی محفوظ احادیث کو روایتہً اور سنداً بھی محفوظ کر لیا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ امام بخاری پہلے آدمی نہیں ہیں جنہوں نے احادیث کو لکھ کر محفوظ کر لیا بلکہ ہر دور میں یہ کام تواتر سے ہوتا رہا، اور احادیث روایتہً بھی تواتر کے ساتھ نقل ہوتی رہیں، الا ما شاء اللہ

سوال برق صاحب مالکی اور شیعہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں، اور باقی فرقے ہاتھ باندھ

---

[1] :۔ اصل کتاب میں عبارت اسی طرح ہے۔ غالباً عبارت یہ ہے" اور اب ہماری اولاد ہماری نقل اتار رہی ہے"۔

کر نماز پڑھتے ہیں، مالکیوں اور شیعوں نے یہ طریقہ سلسلہ بہ سلسلہ اربوں، کھربوں انسانوں کے عملی تواتر سے اخذ کیا، اسی طرح باقی فرقوں نے بھی اپنا طریقہ عملی تواتر سے حاصل کیا، تو اب بتائیے، کونسا عملی تواتر صحیح ہے اور اگر ان میں سے ایک صحیح ہے، دوسرا غلط، تو کیا پھر تواتر کی اہمیت کچھ باقی رہ جائے گی؟ حالانکہ آپ نے اپنے اعتماد کی ساری عمارت تواتر کی بنیاد پر ہی کھڑی کی ہے، اگر آپ فرمائیں کہ دونوں تواتر صحیح ہیں، تو پھر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کبھی دوسرے تواتر پر بھی آپ نے عمل کیا، اگر نہیں کیا تو کیوں؟ کیا ایک طریقہ کو اختیار کرنا اور دوسرے کو مطلقاً چھوڑ دینا مناسب ہے؟

برق صاحب! پھر ان متواتر اعمال میں بعض ایسے بھی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، مثلاً ایک ہی چیز ایک فرقہ کے ہاں حرام ہے، دوسرے کے ہاں حلال، ایک ہی چیز ایک فرقہ کے ہاں پاک ہے دوسرے کے ہاں ناپاک، ایک فرقہ کے نزدیک زیور پر زکوٰۃ فرض ہے، دوسرے کے ہاں نہیں، تو اب بتائیے کیا دونوں تواتر صحیح ہیں، حلال بھی عملی تواتر سے ثابت ہے، اور حرام بھی عملی تواتر سے ثابت ہے، اور دونوں صحیح۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز ہے، اس مضحکہ خیز اختلاف کو دور کرنے کا ایک طریقہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان احادیث کو دیکھا جائے جو روایۃً محفوظ اور منضبط ہیں کہ آخر وہ کس کی تائید کرتی ہیں، بس جس کی وہ تائید کریں وہ صحیح ہے، اور دوسرا غلط ہے، یہ ہے وہ مقام جہاں کتبِ حدیث کی ضرورت پڑتی ہے اور ان کے بغیر چارہ نہیں دوسری بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ عملی تواتر کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، مثلاً تعزیہ پرست تعزیہ کو عملی تواتر کا درجہ دیتے ہیں، وہ جب جواب دیتے ہیں، یہی جواب دیتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد سے ایسا ہوتا آیا ہے، لہٰذا ہم تو یہی کریں گے، خواہ آپ ان کے سامنے قرآن مجید کی آیات تلاوت کریں یا احادیث سنائیں، ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا، اور اگر ہوگا تو اس صورت میں ہوگا کہ وہ اپنے عملی تواتر کو مسترد کر دیں۔

برق صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ وادیٔ کشمیر میں صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہیں، صحیح بخاری تو کیا وہاں کے کتب خانوں میں صحاح ستہ تک محفوظ ہیں، اور نہ صرف کتب خانوں میں، بلکہ بہت سے علماء کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں۔

پھر یہ خیال بھی صحیح نہیں، کہ کشمیری نہایت صحت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، نہایت صحت تو کجا سو میں سے ایک بھی بہ مشکل صحیح نماز پڑھ سکتا ہے، جہالت، تقلیدی بندشوں اور تغافل کا دور دورہ ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ کا نقشہ نظر آتا ہے۔

غلط فہمی "سوم۔ قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے، جس طرح ہم کسی تفسیر

تاریخ یا تصوف کی کتاب کو یہ منصب عطا نہیں کر سکتے، کہ وہ اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ کرے، اسی طرح ہم حدیث کو بھی یہ رتبہ نہیں دے سکتے، انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش کی وجہ سے اس کی حیثیت انسانی تصنیف کی ہو چکی ہے جس طرح بعض باقی انسانی تصانیف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآنی آیات و احکام کی تشریح بیان کریں، اسی طرح محدثین کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔"
(دو اسلام صہ ۱۲۵)

ازالہ برق صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے، کہ انسانی اقوال کی آمیزش کی وجہ سے حدیث کی حیثیت ایک انسانی تصنیف کی سی ہو گئی ہے، لہذا ایسی حدیث اسلام میں کسی نئے اصول یا حکم کا اضافہ نہیں کر سکتی، برق صاحب! ہمیں آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے، لیکن مطلب اس کا ظاہر ہے، کہ اگر انسانی اقوال کی آمیزش نہ ہو تو پھر حدیث انسانی تصنیف نہ ہو گی، اور یہی ہماری مراد ہے، اور یہی برق صاحب کا منشاء ہے، جب یہ بات تسلیم ہو چکی، کہ خالص حدیث انسانی تصنیف نہیں، تو پھر حدیث کا حجتِ شرعیہ ہونا بھی ظاہر ہے، کیونکہ اس سے اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ برق صاحب کے نزدیک بھی جائز ہے۔

برق صاحب محدثین کو قرآن مجید کی شرح کا حق دے رہے ہیں، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی صحیح نہیں۔ نہ محدثین خود کو شارحِ قرآن مجید سمجھتے تھے، نہ لوگوں ہی نے انہیں شارح قرآن مجید سمجھا، محدثین تو صرف صحیح خالص حدیث کو قرآن مجید کا شارح سمجھتے تھے، اور اسی شرح کو ہم تک پہنچاتے تھے۔ لہذا اس شرح کو ہر حال میں قبول کرنا ہو گا۔ یا پھر یہ کہدیا جائے کہ ہماری شرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح سے زیادہ صحیح اور منشائے الٰہی کے زیادہ مطابق ہے، نعوذ باللہ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ احادیث میں انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش ہے، محدثین نے تخلیصِ حدیث کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا، متعدد فنون اور اصولِ حدیث اس پر شاہد ہیں۔

برق صاحب کا یہ فرمانا کہ اگر محدثین کوئی ایسی شرح پیش کریں، جو قرآن مجید سے متصادم نہیں ہوتی ہو اور تواترِ عمل کے بھی خلاف نہ ہو تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے، ظاہر ہے کہ برق صاحب کی مراد اس سے محدثین کی اپنی شرح ہے، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح، کیونکہ اس کو تو ہر حال میں قبول کرنا ہو گا۔ ہاں محدثین کی اپنی شرح اس وقت قبول کی جائے گی، جب وہ قرآن مجید کے یا تواتر عملی کے خلاف نہ ہو، اور یہ تواتر عملی حدیث ہی تو ہے، اس کو آپ حدیث کا نام کیوں نہیں دیتے، برق صاحب کی عبارت اس طرح ہونی چاہیئے تھی یعنی "اگر محدثین اپنی طرف سے قرآن مجید کی شرح کریں، اور وہ شرح قرآن اور حدیث کے

خلاف نہ ہو، تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں عذر ہی کیا ہو سکتا ہے" اور اس طرح ہمارا اور برق صاحب کا اتفاق ہو جائے گا۔

برق صاحب تواترِ عملی کو حجت تسلیم کر رہے ہیں۔ یعنی دوسرے معنوں میں حدیث کو حجت مان رہے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا صحیح ہونا یقینی ہو، نماز کا طریقہ تواترِ عملی یعنی یقینی احادیث ہی سے معلوم ہوتا ہے، ورنہ قرآنِ مجید تو اس معاملہ میں خاموش ہے اور صرف نماز ہی کا ذکر ہے۔ قرآن مجید بہت سی باتوں کے متعلق خاموش ہے، بعض آیتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو حدیث کی روشنی میں نہ دیکھا جائے تو بالکل مہمل نظر آتی ہیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں "قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے"۔ یہ ایک خوشنما جملہ تو ضرور ہے لیکن حقیقت کچھ بھی نہیں، نہ نماز کا طریقہ اس میں ہے، نہ کسی اور عمل کا، اور پھر بھی وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے! یہ عجیب بات ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"باقی رہا زکوٰۃ کا مسئلہ، تو اسے خود قرآن نے بھی واضح کر دیا ہے زکوٰۃ ہے کیا چیز؟ اللہ کے راستہ میں مالی قربانی" (دو اسلام صـ۱۲۶)

ازالہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی زکوٰۃ کی تشریح نہیں دی گئی، برق صاحب کو اعتراف ہے کہ زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی کے ہیں (دو اسلام صـ۱۲۶) تو پھر اس کے معنی مالی قربانی کرنا نہ قرآن مجید سے ثابت ہے نہ لغت سے، قرآن مجید میں جہاں کہیں مالی قربانی کا ذکر ہے، یہ کہنا کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے، زبردستی ہے، کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی مالی قربانی کے ہیں، نہ کہ زکوٰۃ کے۔

غلط فہمی ہمارے فقہاء کہتے ہیں، کہ ادائے زکوٰۃ کے لئے ایک وقت (ماہ رجب)......... معین ہے۔ (دو اسلام صـ۱۲۶)

ازالہ یہ قطعاً صحیح نہیں، ماہ رجب ادائے زکوٰۃ کے لئے مقرر نہیں، برق صاحب نے حوالہ نقل نہیں کیا،

غلط فہمی مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت نہیں، جب بھی ملت پہ ابتلا کا وقت آیا، مسلمان نے سب کچھ خدا اور رسول کی خدمت میں پیش کر دیا (دو اسلام صـ۱۲۶)

ازالہ برق صاحب! تاریخ سے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ہر مسلم نے ہر ابتلاء کے وقت یا کسی خاص ابتلا کے وقت اپنا سارا مال اللہ اور اس کے رسول کی خدمت

میں پیش کر دیا ہو، تاریخ میں تو یہ ملتا ہے کہ جس شخص نے جتنا چاہا دیا، کسی پر زبردستی نہیں کی گئی، برخلاف اس کے جن لوگوں نے مقررہ شرح سے مقررہ میعاد میں زکوٰۃ دینے سے انکار کیا، ان سے زکوٰۃ جبراً وصول کی گئی، برق صاحب کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی حکمران ہر وقت ہر ضرورت کے وقت مسلمین سے چندہ کی درخواست کرتا رہے، بند باندھنا ہو تو چندہ مانگے، پل بنانا ہو تو چندہ مانگے، سرائے بنانی ہو تو چندہ مانگے، کسی اندھے کا وظیفہ مقرر کرنا ہو تو چندہ مانگے، اس کے پاس سالانہ مستقل آمدنی کی مد کوئی نہ ہو، کہ وہ ان کاموں کے لئے اس مد میں سے صرف کر سکے، گویا اسلامی حکومت کی سالانہ آمدنی کی کوئی مد نہ ہو، نہ سالانہ اخراجات کا کوئی بجٹ۔

غلط فہمی "اگر میری بات پر یقین نہ آئے۔ تو لیجئے اللہ کا فیصلہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ بِهَا وَتُزَكِّيهِم [۱] " مسلمانوں سے صدقہ لے کر انہیں مطہر اور مزکی (پاک) بناؤ، تزکی کا ماخذ زکوٰۃ ہے، تو گویا اللہ کے ہاں ہر قسم کی مالی قربانی زکوٰۃ شمار ہوتی ہے۔" (دو اسلام صد ۱۲۶-۱۲۷)

ازالہ "تطہر" کا ماخذ طہارت ہے، تو کیا اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر قسم کی مالی قربانی "طہارت" شمار ہوگی اور جہاں کہیں بھی قرآن مجید میں لفظ طہارت یا اس سے مشتق کوئی لفظ آئے گا، تو اس کے معنی مالی قربانی کے ہوں گے؟ ہرگز نہیں، لہٰذا زکوٰۃ کے معنی ہر مالی قربانی قرآن مجید سے ثابت نہیں۔

برق صاحب آپ کا کہنا تو یہ ہے کہ سب مال اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دے دو، لیکن آپ کی وارد کردہ آیت میں "من اموال" ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اموال میں سے کچھ لو، نہ کہ سب، گویا سارا مال دے دینا فرض نہیں ہے۔

غلط فہمی کیا اہل سرمایہ کو ان تمام آرائش اور زاید از ضرورت املاک پر قابض ہونے کا حق حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے، ہرگز نہیں، سنو اللہ کا ازلی اور اٹل فیصلہ "يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ" اے رسول لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ مالی قربانی کی حد کیا ہے۔ انہیں کہہ دو کہ ہر فالتو اور زائد از ضرورت چیز خدا اور رسول کے سامنے پیش کر دو۔ (دو اسلام صد ۱۲۸)

ازالہ برق صاحب نے آیت مذکورہ کا ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے۔

---

[۱] دو اسلام میں اسی طرح ہے۔ صحیح یہ ہے "تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا"

اے رسول! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا صَرف کیا کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ فاضل مال صَرف کیا کرو" اس سے ظاہر ہوا کہ مسلم اس مال کو جو ضروری اخراجات کے بعد بچ جائے۔ اللہ کے راستہ میں بقدر ضرورت خرچ کرتا ہے۔ خواہ مقررہ وقت میں مقررہ شرح سے یا ہنگامی حالات میں غیر مقررہ شرح سے۔ غرض یہ کہ جو مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیا جائے وہ زائد از ضرورت مال میں سے دیا جائے۔ نہ یہ کہ بھوکا اور ننگا رہ کر سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

ارشاد ہے:۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ○	نہ ہاتھ کو بالکل روک ہی دو، اور نہ بالکل کھول ہی دو کہ بعد میں تم ملامت زدہ اور نادم ہو کر بیٹھ جاؤ۔

(بنی اسرائیل:۔ ۲۹)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ضروریات زندگی کے لئے جس مال کی ضرورت ہے وہ خرچ نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ منشا نہیں کہ انسان خود محتاج ہو کر بیٹھ جائے اور سب کچھ دے دے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہے کہ بس جو بچ گیا وہ اللہ کے راستے میں خرچ کر دے، کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھے اگر ایسا ہوتا تو نہ ترکہ ہوتا نہ وارثوں میں تقسیم ہوتا۔ حالانکہ قرآنِ مجید نے اس تقسیم کو فرض کیا ہے اسی طرح نہ دولت مند ہوتے نہ فقراء، حالانکہ قرآن مجید کہتا ہے کہ فقراء کو صدقہ دیا کرو۔

برق صاحب نے آیت مذکورہ کو زکوٰۃ کی تشریح میں پیش فرمایا گویا ان کے نزدیک زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ "ہر فاضل اور زائد از ضرورت چیز اللہ اور رسولؐ کے سامنے پیش کر دینا"۔ لیکن برق صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کب پیش کی جائے البتہ اس سے پہلے وہ فرما چکے ہیں:۔

"کہ زکوٰۃ کا کوئی خاص وقت معیّن نہیں" (دو اسلام ص۱۲۷)

دوسری جگہ برق صاحب فرماتے ہیں:۔

"جس طرح جان سپاری کا کوئی وقت معیّن نہیں۔ جس وقت جنگ کا بگل بجا مسلمان سر بکف حاضر۔ اسی طرح مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت معیّن نہیں۔ جب بھی ملت پر ابتلا کا وقت آیا مسلمان نے سب کچھ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا" (دو اسلام ص۱۲۶)

برق صاحب کی ان عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ زائد از ضرورت مال صرف ہنگامی حالات میں پیش کر دینا "زکوٰۃ" ہے۔ اس سلسلہ میں ہم عرض کرتے ہیں کہ ہنگامی حالات کا مقابلہ تو اس مالی امداد سے

کر لیا جائے گا۔ لیکن روزمرہ کے سرکاری اخراجات کی کیا سبیل ہے؟ امن کی حالت میں فوج کے اخراجات اور اسلحہ کی فراہمی کا کیا ذریعہ ہے؟ دوسرے سرکاری اور رفاہِ عامہ کے کاموں کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟ کیا حکومت کا نہ کوئی سالانہ میزانیہ ہوگا نہ سالانہ تخمینہ اخراجات؟ کیا کوئی حکومت اس طرح چل سکتی ہے۔ سالانہ اخراجات کے لئے آمدنی کا ایک جچا تلا ذریعہ ہونا چاہیئے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ جو سالانہ وصول کی جاتی ہے، اور یہ چیز صرف حدیث سے ثابت ہے۔ قرآن مجید اس سے یکسر خاموش ہے ورنہ براوکرم وہ آیت پیش کیجئے جس میں یہ ہو کہ "زکوٰۃ زائد از ضرورت مال کو خرچ کر دینے کا نام ہے" پھر یہ بھی ثابت کیجئے کہ عام اور غیر ہنگامی حالات میں بھی سرمایہ دار طبقہ سے سرکاری اخراجات کے لئے کچھ لیا جائے یا نہیں؟

برق صاحب! زکوٰۃ اگر زائد از ضرورت مال کے صرف کر دینے کا نام ہے تو پھر یہ بتایئے کہ ضرورت کا معیار کیا ہوگا؟ ہر ایک کا انفرادی معیار ہوگا یا حکومت ایک خاص معیار مقرر کرے گی، اگر انفرادی معیار ہوگا تو اس میں بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ زکوٰۃ دینے والوں اور وصول کرنے والوں کے درمیان ایک مسلسل اختلاف رونما ہوگا۔ اگر حکومت نے اس کا کوئی خاص معیار مقرر کر دیا تو یہ فطرت کے تقاضے کے خلاف ہوگا۔ اور اسلام فطری قانون کے خلاف تعلیم نہیں دیتا۔ پھر فطرۃً زیادہ کمانے کی خواہش مفقود ہو جائے گی اور کچھ عرصہ میں حکومت کا خزانہ خالی ہو جائے گا۔ اگر آپ روس کے اشتراکی نظام کی مثال پیش کریں تو وہ مثال یہاں صادق نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ روس میں ہر چیز حکومت کی ہوتی ہے۔ اور حکومت کے قبضہ میں رہتی ہے وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ضروریاتِ زندگی کے لئے کچھ مال رکھ کر باقی سب حکومت کے حوالہ کر دو۔ نہ وہاں یہ ہوتا ہے کہ صرف ہنگامی حالات میں رعایا سے مال طلب کیا جاتا ہے۔ وہاں رعایا کے پاس ہوتا ہی کچھ نہیں کہ وہ اس میں سے چندہ دیں۔ ترکہ وارثوں میں تقسیم کریں۔ اقرباء اور فقراء کو دیتے رہیں۔ برخلاف اس کے قرآن مجید انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ رعایا سے مانگتا ہے۔ ترکہ کو تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اقربا اور مساکین کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ روس کے اخراجات اس لئے چلتے رہتے ہیں کہ حکومت نے ہر چیز پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور اسلامی حکومت کے اخراجات اس لئے نہیں چل سکیں گے کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہوگا جو کچھ ہوگا وہ رعایا کی ملکیت ہوگی۔ اور رعایا سے حکومت صرف ہنگامی حالات کے لئے ہی مانگ سکتی ہے۔ نہ کہ غیر ہنگامی حالات میں، برق صاحب! براوکرم سوچیں یہ گتھی کس طرح سلجھے گی؟

برق صاحب! ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ ہنگامی حالات میں حکومت کے سامنے سب کچھ پیش کر دو اور دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ غیر ہنگامی حالات میں بھی سرمایہ داروں کا پیسہ پاس مال رکھنا، زیادہ کمانا، عیش و راحت کی زندگی گذارنا قطعاً ناجائز ہے ان کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:۔

"اس دنیا میں ہم فی صدی افراد کو عظیم الشان محلوں، موٹروں، باغوں اور پارکوں میں عیش اڑانے کا کیا حق حاصل ہے؟ انہوں نے سرمایہ کے بل بوتے پر غریبوں سے کیوں زمینیں چھینیں، ان کی کمائی پر کیوں ناجائز قبضہ کیا؟ کیا اہلِ سرمایہ کو ان تمام آرائشی اور زائد از ضرورت املاک پر قابض ہونے کا حق حاصل ہے؟ قرآن کہتا ہے، ہرگز نہیں سنو اللہ کا ازلی اور اٹل فیصلہ"۔ (دو اسلام صد ۱۲۷-۱۲۸)

(اس کے بعد برق صاحب نے وہی آیت پیش کی ہے جو غلط فہمی کے عنوان سے اوپر درج کی جا چکی ہے)

اب بتائیے جائز طریقہ سے مال کمانے والا طبقہ کس طرح اپنی جائز آمدنی سے فائدہ اٹھانے سے روکا جا رہا ہے؟ آخر کیوں؟ کہیں تو برق صاحب فرماتے ہیں کہ "ہنگامی حالات میں سب کچھ دے دو، اور یہاں یہ فرمایا کہ ہر حالت میں کچھ رکھو ہی نہیں جب سب کچھ بچتے ہی حکومت کے حوالہ کیا جا چکا تو بتائیے اب فقراء کو کیا دیا جائے۔ اقرباء کو کیا دیا جائے، وارثوں میں کیا تقسیم کیا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ برق صاحب سے اللہ تعالیٰ کا منشاء سمجھنے میں غلطی ہو گئی انہوں نے ایک آیت کو سامنے رکھا اور پھر غلط فہمی سے کچھ کا کچھ نتیجہ نکال لیا۔ اللہ تعالیٰ کا ہرگز یہ منشاء نہیں کہ تمام دنیا کے انسان ایک حالت میں زندگی گذاریں اور معیشت کے لحاظ سے فرقِ مراتب مفقود ہو جائے۔ کاش برق صاحب مندرجہ ذیل آیت کو بھی سامنے رکھ لیتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف: ۳۲)	کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں۔ حالانکہ دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت کو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیا ہے اور بعض کو بعض پر درجات کی بلندی عطا فرمائی ہے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے سکے۔

اس آیت سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سرمایہ دار طبقہ کو اپنی جائز آمدنی سے جائز عیش و راحت سے زندگی گذارنے کا حق حاصل ہے۔ اور اس آمدنی کے وسیلہ سے اپنے لئے خادم و ملازم رکھنے کا حق حاصل ہے۔ ان کی یہ سربلندی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اسی نے یہ فرقِ مراتب قائم کر رکھا ہے اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا نظام نہیں چل سکتا، رہا غرباء، خدام اور ملازمین کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی ضروریات کا لحاظ تو وہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ دونوں کا علیحدہ علیحدہ محل ہے۔ بے شک غرباء کی حسبِ ضرورت امداد ان پر فرض ہے لیکن سارا فاضل مال حکومت کے حوالہ کر دینا ان پر فرض نہیں۔ برق صاحب نے دونوں کو گڈمڈ کر دیا اور اس وجہ سے مغالطہ پیدا ہو گیا۔

غلط فہمی

"ہاں تو ہم عرض کر رہے تھے کہ اقوال رسول اڑھائی سو برس تک کروڑوں زبانوں پہ گھومتے رہے۔ کہیں مجبوراً اضافے ہوئے اور کہیں عمداً، کہیں حافظہ سے اتر گئے، اور کہیں انسانی اقوال حضورؐ کی طرف منسوب ہو گئے دراصل اقوالِ رسول کی تعداد پانچ سات ہزار سے زیادہ نہیں ہو گی، لیکن جب امام بخاریؒ کا زمانہ آیا تو ان کی تعداد چودہ لاکھ سے متجاوز ہو چکی تھی۔" (دو اسلام صفحہ ۱۳۰)

ازالہ

اس کا جواب کئی مرتبہ گذر چکا ہے لیکن کیونکہ برق صاحب اسے بار بار دہرا رہے ہیں، تو ہم بھی پھر عرض کرتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے کہ اقوالِ رسولؐ ڈھائی سو برس تک صرف کروڑوں زبانوں پر گھومتے رہے، نہیں بلکہ سینوں اور سفینوں میں محفوظ رہے۔ کیا امام مالک کی موطاء، امام شافعی کی کتاب الام، امام عبدالرزاق کی مصنف، امام احمد کی مسند وغیرہ وغیرہ۔ ڈھائی سو سال بعد کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، نہیں ہرگز نہیں، عہد رسالت سے لے کر امام بخاری کے عہد تک تدوینِ حدیث کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ہر زمانہ میں کتابیں لکھی گئیں، پہلی صدی کی تمام تصنیفات دوسری صدی کی تصنیفات میں سمو دی گئیں اور ان دوسری صدی کی تصنیفات سے منتخب کردہ اسناد کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کر دیا، پھر امام بخاری کی یہ تصنیف بھی ڈھائی سو سال بعد کی تصنیف نہیں ہے۔ امام بخاری کا انتقال ۲۵۶ھ میں ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ۲۴۶ سال بعد۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ صحیح بخاری دو سو پچاس سال بعد تصنیف ہوئی ہو۔ امام بخاری کی زندگی میں یہ کتاب ان سے لاکھوں طلباء نے نقل کی۔ امام بخاری کی پیدائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ۱۸۴ سال بعد ہوئی۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں انہوں نے صحیح بخاری کو تصنیف کیا۔ لہٰذا صحیح بخاری کی تصنیف کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تقریباً ۱۸۴ + ۲۰ = ۲۰۴ سال بعد قرار پاتا ہے۔ ۲۰۴ کو ۲۵۰ بنا دینا تحقیق کے یکسر منافی ہے۔

برق صاحب یہ بالکل صحیح ہے کہ اقوال رسولؐ کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ صحیح احادیث کی تعداد ہزاروں ہی میں ہے یہ چودہ لاکھ جو برق صاحب نے نقل کی ہیں یہ احادیث نہیں ہیں بلکہ ان چند ہزار صحیح احادیث کی اسناد ہیں اور کیونکہ ہر سند کو ایک حدیث کا نام دے دیا گیا ہے لہٰذا غلط فہمی پیدا ہو گئی۔

برق صاحب فرماتے ہیں کہ ڈھائی سو سال تک اقوال رسولؐ کروڑوں زبانوں پر گھومتے رہے اگر یہ صحیح ہے تو پھر احادیث کے متواتر ہونے میں کیا شبہ رہا اور متواتر کی صحت میں شبہ نہیں ہوتا، لہٰذا امام بخاری نے اگر ان متواتر غیر مشتبہ صحیح احادیث کو جمع کر دیا تو اعتراض کیا ہے۔ گویا برق صاحب کی اپنی عبارت سے احادیث متواتر ہونے کی وجہ سے محفوظ تھیں۔ اور انہیں محفوظ احادیث کو ضبطِ تحریر میں

لاکر قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا۔ فللہ الحمد۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

" قرآن کا اسلام بڑا مشکل اسلام ہے۔ یہاں جان و مال کی قربانی کرنا پڑتی ہے " (دو اسلام صـ۱۳۰)

ازالہ قرآن کا اسلام تو " بڑا آسان اسلام " ہے مشکل تو اس کو ان " قیود " نے بنا دیا ہے جو احادیث میں مذکور ہیں۔ ورنہ

۱۔ دعا مانگ لو صلوٰۃ ادا ہو گئی۔ ۲۔ پاکیزگی اختیار کر لو زکوٰۃ ادا ہو گئی۔

۳۔ صلوٰۃ میں ریاح خارج ہو جائے۔ وضو سلامت رہے۔

۴۔ ناچ ورنگ کی محفلیں قائم کرو۔ کوئی ممانعت نہیں۔

۵۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی لو کوئی حرج نہیں۔ ۶۔ تاش و شطرنج سے لطف اٹھاؤ، کوئی مضائقہ نہیں

۷۔ قحبہ خانہ کھولو کوئی ممانعت نہیں ہاں کسی عورت کو زبردستی قحبہ خانہ میں مت بٹھاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔

رہا جان و مال کی قربانی کا مسئلہ تو یہ احادیث میں بھی موجود ہے " شمشیر کے سایہ میں جنت " کا جو محاورہ برق صاحب نے صـ۱۳۰ پر استعمال کیا ہے وہ حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔

غلط فہمی برق صاحب نے صـ۱۳۱ سے صـ۱۶۱ تک کچھ گھڑی ہوئی احادیث قلم بند فرمائی ہیں اور ان احادیث کے گھڑنے کا الزام مُلّا پر لگایا ہے۔

ازالہ برق صاحب نے تمہید ہی میں " مُلّا " کی تعریف کر دی ہے اور ہم نے بھی اس اصطلاحی تعریف کو تسلیم کر لیا ہے (ملاحظہ ہو تمہید کتاب ہذا) اس تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اتفاق کرتے ہیں کہ بے شک یہ احادیث " ملا نے گھڑیں " فلعنۃ اللہ علی الکاذبین " لیکن یہ بتائیے کس عالم نے انہیں تسلیم کیا۔ محدثین نے ہمیشہ ان کو جھوٹی سمجھا اور موضوعات کی کتابوں میں ان کو جمع کر کے ہمیشہ کے لئے امت مسلمہ کو خبردار کر دیا۔ برق صاحب نے انہیں کتب موضوعات سے ان موضوع احادیث کو نقل فرمایا تو بتائیے اس میں قصور کس کا ہے؟ مُلّا کا یا ائمہ حدیث کا؟ جس مُلّا کو آپ ملزم ٹھہرا رہے ہیں۔ صدیوں پہلے ائمہ حدیث نے اس کو ملزم ٹھہرایا تھا، آپ نے انہیں کے قول کو دہرا دیا ہے اور بس۔

انتباہ

ائمہ حدیث کا عقیدہ ہے کہ " قرآن غیر مخلوق ہے " ان کی تائید میں کسی مُلّا نے حدیثیں بھی گھڑ دیں کہ " قرآن غیر مخلوق ہے " (ان احادیث کو برق صاحب نے بھی صـ۱۴۳ پر نقل کیا ہے) لیکن محدثین کی

دیانت داری کی داد دیجیئے کہ اپنی تائید میں احادیث انہیں ملتی ہیں تو بجائے خوش ہونے کے اعلان کرتے ہیں کہ یہ احادیث گھڑی ہوئی ہیں۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو بطور ہتھیار کے ان احادیث کو استعمال کر سکتے تھے اور خلیفۂ وقت کے سامنے پیش کر کے بحث کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، صحیح احادیث میں گھڑی ہوئی احادیث کی آمیزش اس نازک زمانے میں بھی نہیں ہونے دی۔ تو کیا یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ حالاتِ امن وامان میں انہوں نے اس آمیزش کو قبول کر لیا ہوگا۔ نہیں ہرگز نہیں، صحیح احادیث کا دامن تحریف سے بالکل پاک ہے۔ یہی نہیں بلکہ محدثین نے ان تمام احادیث کو بھی جن میں ان کی اپنی فضیلت تھی اور جن کو برق صاحب نے ص۱۴۸ تا ص۱۵۰ پر نقل کیا ہے جھوٹی قرار دیا۔

انتباہ

"حلوا" کے عنوان کے ماتحت برق صاحب نے چند احادیث نقل فرمائی ہیں۔ بے شک وہ سب احادیث جھوٹی ہیں سوائے مندرجہ ذیل حدیث کے۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ الْحَلْوَاءَ وَالْعَسَلَ (صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میٹھی چیز اور شہد پسند تھا۔

معلوم نہیں برق صاحب کو اس حدیث میں کیا قباحت نظر آئی کہ گھڑی ہوئی احادیث کے ساتھ اسے شامل کر دیا اور پھر مزا یہ کہ جہاں گھڑی ہوئی احادیث کے متعلق وہ ائمہ حدیث کی تصریح نقل کرتے ہیں کہ فلاں فلاں حدیث گھڑی ہوئی ہے اس حدیث کے متعلق ایسی کوئی تصریح بھی نقل نہیں فرمائی اور نقل فرماتے بھی کیسے اس لئے کہ یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

غلط فہمی

سوال :۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ تم صحیح وغلط کی الجھن میں کیوں پڑتے ہو جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہ لے لو، اور باقی سب کو مسترد کر دو

جواب :۔ اس سوال کے کئی جواب ہیں اول جو حدیث قرآن کے مخالف ہے وہ ہر طبقہ کے ہاں مردود ہے اور جو قرآن کے موافق ہے اس کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لئے کہ قرآن کافی ہے (دو اسلام ص۱۵۸)

ازالہ

ایسی کوئی حدیث نہیں جو صحیح ہو اور قرآن مجید کے خلاف ہو لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ جو شخص اپنی رائے سے قرآن مجید کے ایسے معنی کرے جو صحیح حدیث کے مخالف ہوں تو ایسے معنی مردود ہوں گے نہ کہ حدیث، مثلاً ایک صاحب نے "صلوٰۃ" کے معنی پریڈ کئے ہیں اور دوسرے نے "نظام ربوبیت"، یہ دونوں معنی صحیح حدیث کے خلاف ہیں لہٰذا مردود ہیں۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھیئے کہ قرآن مجید کے خلاف ہونا اور بات ہے۔ اور قرآن مجید کی شارح ہونا اور بات ہے، یہ تو کسی حد تک صحیح ہے کہ موافق کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تشریح و توضیح کی بھی ضرورت نہیں۔ تشریح کی بے شک ضرورت ہے، اور بغیر تشریح کے قرآن مجید پر عمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے:۔

۱۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ (البقرۃ:۔ ۱۵۰)

اور اے رسول! جہاں کہیں آپ جا رہے ہوں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیا کریں، اور اے مومنو! جہاں کہیں تم ہو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیا کرو۔

کیا قرآن مجید میں کہیں تشریح ہے کہ مسجد حرام کی طرف منہ کس وقت کیا جائے؟ قرآن مجید سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ چلتے پھرتے اور بحالت سکون و اقامت غرض ہر حالت میں منہ قبلہ کی طرف رہنا چاہیئے۔ کیا اس گتھی کو قرآن مجید سے سلجھایا جا سکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پیشاب پاخانہ کرتے وقت منہ قبلہ کی طرف مت کیا کرو، (صحیح بخاری و صحیح مسلم) کیونکہ قرآن مجید سے ہر حالت میں قبلہ کی طرف منہ کرنا لازمی ثابت ہوتا ہے تو کیا یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے؟ ہرگز نہیں۔ ظاہر بینی سے اس قسم کی غلط فہمیاں ہو سکتی ہیں۔

۲۔ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (البقرۃ:۔ ۱۱۵)

تم جس طرف منہ کرو اسی طرف اللہ تعالیٰ کا منہ ہے۔

پہلی آیت سے قبلہ کی طرف منہ کرنا لازمی ہوا اور اس آیت نے اس فرضیت کو ساقط کر دیا۔ کیا قرآن مجید سے آپ بتا سکتے ہیں کہ ان دونوں پر عمل کرنے کی کیا صورت ہے؟ بلکہ قرآن مجید تو اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتا ہے کہ:۔

۳۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ (البقرۃ:۔ ۱۷۷)

مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنا یہ کوئی نیکی نہیں بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے وغیرہ وغیرہ۔

اب ان تینوں آیات کا مطلب کوئی کیا سمجھے۔ جب تک معلّم کتاب و حکمت نہ سمجھائے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۴۔ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا۔ (البقرۃ:۔ ۲۳۴)

جو مرد تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو ان کی بیویوں کو چار مہینے اور دس .... عدت میں بیٹھنا چاہیے۔

کیا آپ قرآن مجید سے بتا سکیں گے کہ یہ دس کیا ہیں؟ سال یا مہینے، ہفتے یا دن؟ گھڑیاں یا گھنٹے؟
بس یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وضاحت کے لئے حدیث کی ضرورت ہے (تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ ہو)

غلط فہمی "دوم:۔ آپ کی اس تجویز کی بنیاد ایک وضعی حدیث پر ہے"
(دو اسلام صہ۱۵۸)

ازالہ نہ ہماری تجویز یہ ہے اور نہ ہم وضعی حدیث پر کسی تجویز کی بنیاد رکھ سکتے ہیں، ہمارے ہاں تو ایسی کسی حدیث کا ذکر ہی نہیں جو قرآن مجید کے خلاف ہونے کی وجہ سے مسترد کر دی گئی ہو۔ اور جو حدیثیں قرآن مجید کے خلاف ظاہر ہوئیں وہ صحت کے درجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی زٹل ثابت ہوئیں۔ ہماری تجویز تو یہ ہے کہ قرآن مجید کے معنی وہ کرو جو صحیح حدیث میں ہوں۔ نہ کہ اپنی رائے سے ایسے معنی گھڑ لو جو صحیح حدیث کے خلاف ہوں۔ صحیح حدیث تو قرآن مجید کے معنی کو متعین کرتی ہے اگر یہ نہ ہو تو قرآن مجید "شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا" کا مصداق بن جائے گا۔

غلط فہمی مطلب یہ کہ اگر کوئی رتن سنگھ یہ کہہ دے کہ دو اور دو چار بنتے ہیں اور اسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دے تو قبول کر لو۔ اس لئے کہ یہ قول خلاف حقیقت نہیں۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تجویز بری نہیں۔ لیکن اس راہ میں بھی بڑی مشکلات ہیں اس لئے کہ بعض ایسی احادیث بھی جو تعلیم قرآن کے عین مطابق اور حدیث کی اہم کتابوں میں شامل ہیں، محققین کے ہاں جعلی ہیں (دو اسلام صہ۱۵۹)

ازالہ برق صاحب محدثین یہ نہیں دیکھتے کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے وہ حقیقۃً "صحیح" ہے یا غلط۔ بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ بات حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح منسوب ہے یا نہیں، کیا وہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے ہیں یا نہیں؟ یہاں سائنس یا ریاضی کے مسلمہ اصول کی تالیف مقصود نہیں ہوتی، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال، آپ کا طور طریق، طرز گفتگو، طرز ادا، اسوۂ حیات مقصود ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ حدیث گھڑ دے کہ پانی، ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے تو یہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ فی الواقع یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ فی الواقع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے یا نہیں۔؟ پانی کے آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہونے سے یہ بات لازم نہیں آئے گی کہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی فرمایا تھا کیا آپ اس بات کو قبول کر لیں گے کہ یہ جملہ "دو اور دو چار ہوتے ہیں" قرآن مجید کے متن میں شامل کر دیا جائے کیونکہ یہ خلاف حقیقت نہیں۔ لہذا اسے قرآن مجید کی حیثیت سے قبول کرنے میں کیا امر مانع ہے؟ بقول آپ کے یہ تجویز بری نہیں تو پھر قرآن مجید کے لئے بھی اس کو برا نہ ہونا چاہیے۔ رہا یہ کہ بعض احادیث تعلیم قرآن کے عین مطابق ہیں، لیکن پھر بھی جعلی ہیں تو مکرر عرض ہے

کہ کسی حدیث کا مضمون صحیح ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ فی الواقع وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی حدیث ہے، اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے تو پھر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ طبیعیات، کیمیا، حیاتیات ریاضی وغیرہ علوم وفنون کے تمام مسلمات وحقائق حدیث ہیں اس لئے کہ وہ صحیح ہیں۔ برق صاحب جہاں حدیث کو تحریف سے بچانا مقصود تھا، یہ بھی مقصود رہا کہ صحیح اور ثابت مضمون کے لئے بھی وہی لفظ محفوظ کئے جائیں جو صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے۔ آپ نے جو احادیث صد ۱۵۹۔ ۱۶۰ پر نقل فرمائی ہیں، اگرچہ مضمون کے لحاظ سے صحیح سہی، لیکن الفاظ کے لحاظ سے صحیح نہیں، اس لئے کہ یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔ یہاں ایک بات اور بھی ثابت ہوئی کہ محدثین نے صرف مفہوم کی حفاظت نہیں کی، بلکہ الفاظ حدیث کی بھی حفاظت کی اور اسی وجہ سے ان الفاظ سے وارد شدہ احادیث کو گھڑی ہوئی قرار دیا۔ محدثین کا یہ کارنامہ ہمارے لئے باعث صد افتخار ہے اور اس پر ہم نازاں ہیں فللہ الحمد، یہاں ایک بات اور واضح کردینا ضروری ہے کہ برق صاحب نے مذکورہ بالا صفحات پر جو جعلی حدیثیں نقل فرمائی ہیں وہ ان الفاظ سے حدیث کی کسی اہم کتاب میں شامل نہیں ہیں۔

غلط فہمی

برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"حدیث طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم.... کو ابن راہویہ سخاوی، ابوعلی، نیشاپوری اور بیہقی نے موضوع قرار دیا ہے (دو اسلام صد ۱۶۰)

ازالہ

برق صاحب نے تذکرۃ الموضوعات کا حوالہ دیا ہے اور اس کتاب سے نقل کرنے میں ان سے غلطی ہوئی ہے ان چاروں اماموں میں سے کسی نے بھی اسے موضوع نہیں کہا امام سخاوی کے الفاظ یہ ہیں:۔

رُوِیَ عَنْ اَنَسٍ بِطُرُقٍ کُلُّهَا مَعْلُوْلَۃٌ وَّاهِیَۃٌ — یہ روایت حضرت انسؓ سے بہت سی سندوں سے مروی ہے جن میں ہر ایک معلول وکمزور ہے۔

مطلب یہ کہ کوئی سند درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں:۔

لَا یَثْبُتُ فِیْ هٰذَا الْبَابِ شَیْئٌ — اس باب میں کوئی سند ثابت نہیں۔

آگے لکھتے ہیں:۔

وَھٰکَذَا قَالَ ابْنُ رَاھُوَیْہِ وَاَبُوْعَلِیٍّ النَّیْسَابُوْرِیُّ — یہی ابن راہویہ اور ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے۔

یعنی ان تینوں میں سے کسی نے اس کو موضوع قرار نہیں دیا، نہ اس کے واضع کا نام بتایا، صرف اتنا بتایا کہ ہر سند میں کوئی نہ کوئی ضعف ہے۔ کوئی سند محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہوتی۔ اب رہ جاتی ہے محدثین کی ایک اصطلاح جو وہ ہے "حسن لغیرہ"، یعنی جب سندیں زیادہ ہوں، راوی کذاب نہ ہوں تو پھر

محض حافظہ کی وجہ سے جو شبہ ہے وہ زائل ہو جائے گا اور سند کے لحاظ سے نہیں بلکہ قرآن کے لحاظ سے وہ حدیث ثابت ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی محدث نے اسے موضوع نہیں کہا۔ برق صاحب نے امام بیہقی کی طرف جو اس کا موضوع قرار دینا منسوب کیا ہے، وہ بھی صحیح نہیں، امام بیہقی فرماتے ہیں:۔

مَتْنٌ مَشْهُورٌ وَاِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ وَ اَبُوْعَاتِكَةَ مِنْ رِجَالِ التِّرْمِذِيِّ لَمْ يُجْرَحْ بِكَذِبٍ وَلَا تُهْمَةٍ وَقَدْ وَجَدْتُ لَهٗ مُتَابِعًا عَنْ اَنَسٍ وَ نِصْفُهُ الثَّانِيْ لِابْنِ مَاجَةَ وَلَهٗ طُرُقٌ كَثِيْرَةٌ عَنْ اَنَسٍ يَصِلُ مَجْمُوْعُهَا مَرْتَبَةَ الْحَسَنِ۔ (تذکرۃ الموضوعات ص۱۸)

یعنی یہ متن مشہور ہے اسناد اس کی ضعیف ہے ابو عاتکہ ترمذی کے رجال میں سے ہے کسی نے اس پر اس قسم کی جرح نہیں کی کہ وہ جھوٹ بولتا ہے نہ کسی نے اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی پھر اس کے کئی متابع ہیں جو اس کو حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں اور آخری حصہ (یعنی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم) ابن ماجہ میں موجود ہے اور حضرت انس سے کثیر تعداد میں اس کے طرق ہیں جن کا مجموعہ اس کو حسن بنا دیتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

یہ ہے امام بیہقی کا بیان! انہوں نے کہاں کہا، کہ یہ موضوع ہے؟

غلط فہمی

ائمہ فن کی تصانیف میں اس طرح کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ حدیث کا مضمون درست، تعلیم قرآن کے عین مطابق، اور پھر بھی غلط۔ اب فرمائیے احادیث کو جانچنے کے لئے پیمانہ کہاں سے لائیں؟ (ص۱۶۱)

ازالہ

اس کے متعلق اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مضمون صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی الواقع وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ محدثین نے معانی کے ساتھ الفاظ کی بھی حفاظت کی۔ لہٰذا اب یہ کہنا کہ پیمانہ کہاں سے لائیں کس قدر عجیب ہے۔ ہر وہ بات جو فی الحقیقت صحیح ہو، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونی چاہیئے کیا یہ بھی کوئی پیمانہ ہے؟ عمدہ عمدہ اقوال گھڑو اور کہہ دو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ آپ اس جھوٹ کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن محدثین نے اس کے پرخچے اڑا کر رکھ دئے ہیں اور کسی بات کو بھی خواہ وہ کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور محض اجازت ہی نہیں دی بلکہ منسوب کرنے والے کو کذاب کہہ کر پھر اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کیا۔ اس طرح متن حدیث کو بالکل خالص طریقہ سے محفوظ رکھا۔ اگر عمدہ عمدہ اقوال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی اجازت دے دی جاتی یا اس سلسلہ میں ذرا سی بھی مداہنت برتی جاتی تو پھر وہ کون سی بدعت حسنہ ہے جس کی پشت پر سنت کی سند نہ ہوتی۔ کونسی

عمدہ رسم ہے جو دین میں داخل کر کے جزو دین نہ بنادی گئی ہوتی۔ ان بدعات کا وہ کوہِ گراں ہمارے سر پہ ہوتا کہ۔ اَلْاَمَانْ وَالْحَفِیْظ۔ اس کے نیچے دبے ہوئے اصل دین کا معلوم کرنا قطعاً ناممکن ہوتا، یہ محدثین ہی کا کارنامہ ہے کہ اصلی دین محفوظ ہے اور بعد والوں کی آمیزش اور اضافہ سے اس کو پاک کر دیا گیا ہے۔

برق صاحب: ہیمانہ کا سوال کرنا آپ جیسے شخص کی طرف سے عجیب معلوم ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہم سے کہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمین پر پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے۔ تو کیا ہم اس کو تسلیم کریں یا نہیں؟ اگر تسلیم نہیں کریں تو پھر تین صورتیں ہوں گی۔

پہلی صورت

ہم یہ کہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایسا فرمایا تو ہے لیکن ہم نہیں مانتے اس لئے کہ قرآن مجید میں پانچ وقت کی تصریح نہیں اور ہم کو صرف قرآن مجید پر ایمان لانے کا حکم ملا ہے نہ کہ حدیث پر"۔ اب بتائیے کہ ایسا کہنے کے بعد ایمان بالرسول باقی رہے گا اور اگر باقی رہے گا تو سوال پیدا ہوگا کہ وہ شخص جو اللہ تعالیٰ پر افترا کرتا ہے رسول بھی ہو سکتا ہے اور کیا اس کی لائی ہوئی کتاب صحیح ہو سکتی ہے، اگر وہ جھوٹ بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر سکتا ہے تو کیا یہ شبہ نہیں کہ اس نے یہ بھی جھوٹ بولا ہو کہ یہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اگر باوجود اس کے جھوٹ بولنے اور اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے کے قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ہی کتاب ہے تو پھر یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پہنچانے کے لئے ایسا آدمی منتخب کیا ہے جو جھوٹ بولتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتا ہے۔ کیا حدیث کا انکار تکذیبِ رسول اور تکذیبِ قرآن مجید نہیں ہے؟

دوسری صورت

اگر ہم یہ کہیں "اے ابوبکر، آپ غلط بیانی کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا اور آپ قرآن مجید سے زائد کچھ فرما ہی نہیں سکتے"۔ تو کیا اس صورت میں یہ لازم نہیں آئیگا کہ ہم ایک صادق کو کاذب سمجھ رہے ہیں اور محض اپنے مفروضہ عقیدہ کی خاطر ایک صادق القول کی بات کو تسلیم نہیں کرتے اگر یہ بات ہٹ دھرمی نہیں تو ہٹ دھرمی پھر کس کا نام ہے؟

تیسری صورت

مذکورہ بالا دونوں باتیں تو یقیناً ہم نہیں کہہ سکتے اب رہ جاتی ہے تیسری صورت اور وہ یہ کہ ہم کہیں

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا ہو گا بلکہ آپ کا مطلب کچھ اور ہو گا" اے ابوبکرؓ آپ کو غلط فہمی ہو گئی، ویسے ہم آپ کو جھوٹا تو نہیں کہتے لیکن بہرحال آپ انسان ہیں اور انسان سے غلطی یا غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے لہذا ہم اس شبہ کی بناپر آپ کی بیان کردہ بات کو حدیث رسولؐ تسلیم نہیں کرتے،، اس صورت میں ہمیں اپنے متعلق یہ یقین کر لینا چاہئیے کہ ہم ضرورت سے زیادہ وہمی ہیں یا علم وفن میں ہم چنیں دیگرے نیست کا مصداق ہیں کہ کسی کی بات نہیں مانتے۔ خواہ وہ غلط سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن ہم اسے اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ ہماری عقل وسمجھ کے خلاف ہے اور کیونکہ وہ ہماری عقل وفہم کے خلاف ہے لہذا بیان کرنے والا ضرور غلط سمجھا ہے یہ ایمان کی علامت نہیں، ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ تیسری بات بھی ہم علم وفہم، حفظ واتقان، صدق ودیانت والے لوگوں کے متعلق نہیں کہہ سکتے بلکہ صادق، حافظ، ضابط، علیم وفہیم شخص کی بات کو تسلیم کرنے میں ہم کو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے خصوصاً ایسی صورت میں کہ ایسے بیان کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ میں دو دو، تین تین، چار چار، دس دس، بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو۔

خلاصہ

لہذا اب حدیث کو پرکھنے کا معیار خود بخود نکل آیا کہ جو حدیث بھی صادق، حافظ، ضابط، علیم وفہیم شخص یا اشخاص کے ذریعہ ہم تک پہنچے وہ صحیح ہو گی خواہ ہماری نگاہ میں وہ بظاہر قرآن مجید سے ٹکرائے یا ہماری عقل سے ٹکرائے۔ ہم اپنی عقل اور فہم کو قصوروار ٹھہرا سکتے ہیں نہ کہ صادق القول، حافظ وضابط اشخاص کو۔

باب ۷

مؤطّا پر ایک نظر

غلط فہمی اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ امام مالک کا کردار تقدس اور خلوص تمام شبہات سے ورا تر تھا اور کہ انہوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرتے کے لئے تمام انسانی ذرائع استعمال کئے ہوں گے۔ لیکن پونے دو سو برس کا عرصہ گذر چکا تھا۔ احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھیں اس ذخیرے میں سے قول رسول تلاش کرنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ (دو اسلام ص ۱۶۳)

ازالہ امام مالک کی ولادت ۹۳ھ میں ہوئی اور یہی سنہ پیدائش برق صاحب نے بھی ص ۱۶۲ پر نقل فرمایا ہے گویا امام مالکؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے صرف ۸۳ سال بعد پیدا ہوئے۔ تقریباً سترہ سال کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ گویا موطا کی تصنیف کے وقت صرف سو سال گذرے تھے، نہ کہ پونے دو سو برس۔

برق صاحب کا فرمانا کہ "احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھیں" کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ امام مالکؒ اور صحابی کے درمیان ان کی اکثر روایتوں میں صرف ایک ہی راوی ہوتا ہے مثلاً حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایتوں میں صرف امام نافعؒ ہوتے ہیں۔ نافع ایک بہت بڑے عالم اور حضرت ابن عمر کے بہت ہی قابل شاگرد تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنی تمام مرویات امام نافع کو لکھوا دیں اور ان سے امام مالک نے نقل کر لیں۔ لہذا ان روایات کو بگڑنے کا کونسا موقع ملا۔ یہی حال دوسری مرویات کا بھی ہے۔ مثلاً امام مالک کے دوسرے بہت بڑے استاد امام محمد بن مسلم زہری ہیں ان کی پیدائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے ۔۴ سال بعد ہوئی۔ امام زہریؒ نے

صحابہ کرام سے احادیث کو حاصل کیا اور یہ سرمایۂ احادیث امام مالک کو پہنچا دیا۔

اسی طرح دیگر تابعین ائمۂ حدیث نے حدیث کو صحابہ کرام سے براہ راست حاصل کیا، اور یہی وہ محفوظ و مکتوب سرمایۂ حدیث تھا، جو امام مالک کو ملا، اور اس سرمایہ کو امام مالک کے شاگردان عظام سے امام بخاری نے نقل فرمایا، لہٰذا بڑھنے اور گھڑنے کا سوال صرف وہم ہی وہم ہے، اور بس۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

غلط فہمی "ہم موطا کی تعظیم ضرور کرتے ہیں، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے، کہ اس کے مندرجات واقعی اقوالِ رسول ہیں، اور خصوصاً ان حالات میں کہ اس کی بعض روایات محلِ نظر ہیں، مثلاً موطا میں درج ہے کہ نیند سے بیدار ہوتے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے وضو ضروری ہے، اور اذا قمتم الی الصلوۃ کی تفسیر ای من المضاجع دی ہوئی ہے۔ لیکن صحیح بخاری (کتاب الوضوء) میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے یہ حدیث دی ہوئی ہے، کہ رسول اللہ رات کو جاگے، صلوۃ تہجد ادا کی . . . . . . پھر بستر پہ دراز ہو گئے، پھر سو گئے، یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی، اس کے بعد نماز کے لئے بلانے والا آیا، آپ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دئے، اور وضو کئے بغیر نماز پڑھ لی" (دو اسلام صـ ۱۶۲ و صـ ۱۶۳)

ازالہ موطا کی جو روایت برق صاحب نے نقل کی ہے، وہ حدیث نہیں ہے، بلکہ حضرت زید بن اسلم تابعی کا قول ہے، لہٰذا قولِ تابعی اور حدیث رسول کو تعارض کی مثال میں پیش کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ اس سے موطا پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے، کسی شخص کا قول خواہ وہ صحیح ہو یا غلط نقل کر دینا کتاب کے لئے موجب نقص نہیں ہوتا، ہاں یہ واضح رہے کہ زید بن اسلم کا قول غلط نہیں ہے، اور نہ وہ صحیح بخاری کی حدیث کے متعارض ہے، محض سونا ناقض وضو نہیں، ریاح کے خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اور چونکہ بستر پر لیٹ کر سونے سے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں، اور ریاح خارج ہونے کا قوی احتمال ہوتا ہے لہٰذا جب سو کر اٹھے تو وضو کرنا چاہیئے۔ یہ ہے زید بن اسلم کے قول کا مطلب اور یہ مندرجہ ذیل حدیثوں کے بالکل مطابق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

(۱) اِنَّ الْعَيْنَ وِكَاءُ السَّهِ فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ (رواہ احمد وابوداؤد وسندہ حسن بلوغ جز ۱ صـ ۳۳) — آنکھ دبر کا بندھن ہے، پس جو سو جائے، وہ وضو کرے۔

(۲) لَيْسَ عَلَى مَنْ نَامَ سَاجِدًا وُضُوءٌ حَتّٰى يَضْطَجِعَ فَإِنَّهُ إِذَا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مَفَاصِلُهُ (رواہ احمد وسندہ حسن بلوغ الامانی) — جو سجدہ میں سو جائے اس پر وضو نہیں جب تک لیٹ کر نہ سوئے، کیونکہ جب لیٹ کر سوئے گا تو جوڑ ڈھیلے ہو جائیں گے۔

جز۶ صـ ۸۲)
لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ مخصوص تھا۔ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں دل نہیں سوتا تھا، فرشتوں کا مندرجہ ذیل مقولہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَّالْقَلْبَ يَقْظَانُ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ سوتی ہے۔
(صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) — دل جاگتا رہتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند میں اتنے غافل نہیں ہوتے تھے کہ آپ کو خبر ہی نہ ہو کہ ریاح خارج ہوا ہے یا نہیں، پس اس یقین کی بنا پر آپ سو کر اٹھتے تو بغیر تازہ وضو کئے نماز پڑھ لیتے تھے، لہٰذا زید بن اسلم کے قول میں اور صحیح بخاری کی حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اگر برق صاحب تحقیق کر لیتے تو یہ الجھن پیدا نہ ہوتی۔ خود امام مالک نے اپنی موطا میں مندرجہ ذیل حدیث نقل کر کے اس الجھن کو دور کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوتِرَ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي (موطا صـ ۴۲)

حضرت عائشہ کہتی ہیں، میں نے کہا، اے اللہ کے رسول آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ بیشک میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں، لیکن میرا دل نہیں سوتا۔

غلط فہمی "چند اور احادیث ملاحظہ ہوں۔

مَنْ قبل امرأته اوجسها بيده فعليه الوضوء (موطا صـ ۲۳)

جو شخص اپنی بیوی کو چوم لے، یا صرف چھو لے، تو اس پر وضو لازم ہو جاتا ہے۔

لیکن اسی صفحہ پر یہ حدیث بھی موجود ہے۔

عَنْ عائشة ؓ ان النبي قبل بعض نسائه ثُم خرج الى الصلوٰة ولم يتوضا۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے اپنی ازواج میں سے کسی کے بوسے لئے اور پھر وضو کئے بغیر نماز ادا فرمائی۔

حضور کا حکم وہ، اور عمل یہ۔ کس کی اقتدا کریں" (دو اسلام صـ ۲۶۳)

ازالہ موطا کی جس روایت کو برق صاحب حدیث سمجھ رہے ہیں، وہ حدیث نہیں ہے، بلکہ ایک صحابی کا قول ہے، برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی کہ اسے حدیث سمجھ لیا، لہٰذا برق صاحب کا یہ سوال صحیح نہیں کہ "حضور کا حکم وہ، عمل یہ، کس کی اقتدا کریں" حدیث صرف دوسری ہے، اور اسی پر عمل کرنا چاہیئے۔

غلط فہمی صحیح مسلم (جلد اول مع فتح الملہم طبع مجتبائی صـ ۴۸۵) میں درج ہے۔۔۔۔ ابی بن کعب ؓ

کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلعم سے ایک ایسے شخص کے متعلق فتویٰ پوچھا کہ جو اپنی بیوی کے پاس بغرض مجامعت گیا، کام شروع کیا، لیکن انزال سے پہلے ہی اس کی شہوت ختم ہو گئی، فرمایا، وہ تمام نجاستوں کو دھولے، اور پھر وضو کر کے نماز پڑھ لے...... اسی مسئلہ پر اب موطا کا فیصلہ سنیئے...... عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کس صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے کہا جب آلہ تناسل کا سر عورت کی شرمگاہ کے ابتدائی حصہ میں داخل ہو جائے، تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ (دو اسلام ۱۹۴)

ازالہ جن احادیث کا ترجمہ برق صاحب نے نقل کیا ہے، ان احادیث کا متن بہت ہی مخفی اور حیادار الفاظ کا مجموعہ ہے، معلوم نہیں برق صاحب نے اتنا عریاں ترجمہ کیوں کیا، خیر۔ برق صاحب نے صحیح مسلم اور موطا میں تضاد سمجھا، ان کے خیال میں صحیح مسلم سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں غسل واجب نہیں، اور موطا سے ثابت ہوتا ہے، غسل فرض ہے، چونکہ برق صاحب نے اس باب میں موطا پر اعتراض کیے ہیں، اور اس کی بعض احادیث کو محل نظر سمجھا ہے، لہٰذا ہمارا گمان ہے کہ برق صاحب کے خیال میں ایسی حالت میں غسل واجب نہیں، بلکہ ان کی بیان کردہ صحیح مسلم کی حدیث پر عمل ہونا چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ برق صاحب کو یہاں بھی غلط فہمی ہو گئی، حالانکہ جو کچھ موطا میں ہے وہی صحیح مسلم میں بھی موجود ہے، امام مسلم کی اپنی صحیح میں پہلے یہ باب ہے۔

باب انما الماء من الماء — غسل انزال کی صورت میں فرض ہے۔

اور اسی عنوان کے ماتحت وہ حدیث ہے، جو برق صاحب نے نقل کی ہے، پھر اس باب کے بعد دوسرا باب ہے۔

باب نسخ الماء من الماء و وجوب الغسل بالتقاء الختانین — یہ حکم کہ غسل انزال کی صورت میں فرض تھا، منسوخ ہوا، اور بعد میں محض ختنہ کے مقامات ملنے سے غسل فرض کیا گیا۔

برق صاحب نے شاید اگلا باب نہیں دیکھا، اس باب میں امام مسلم نے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، ان میں سے ایک حضرت عائشہؓ کی حدیث بھی ہے، غرض کہ حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث موطا میں بھی ہے اور صحیح مسلم میں بھی، لہٰذا دونوں کتابوں میں کوئی تعارض نہیں اور نہ موطا کی حدیث محل نظر ہے، برق صاحب نے ایک کتاب سے ناسخ اور دوسری سے منسوخ حدیث دیکھی، اور اس طرح انہیں غلط فہمی ہو گئی۔

غلط فہمی سب سے پہلے تو یہ دیکھئے، کہ اس زمانہ میں سینکڑوں صحابہ مدینہ میں موجود تھے، اور عبدالرحمٰن بن عوف خود بھی فقیہ صحابہ میں شمار ہوتے تھے، اس مضمون پر احادیث

بھی لوگوں کو یاد ہوں گی، بایں ہمہ انہوں نے یہ کمال کیا، کہ ایک نہایت نازک مسئلہ حضور علیہ السلام کی سب سے کم عمر زوجہ مطہرہ سے جا پوچھا، کیا مدینہ بھر میں اس چھوٹی سی بات کو جاننے والا کوئی مرد موجود نہیں تھا، کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے، اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ ابن عوف یہ غلطی کر بیٹھے تھے تو حضرت عائشہ کو چاہیئے تھا کہ ابن عوف کو اس جسارت پر ڈانٹتیں، کہ تم کو حرم نبوی سے ایسا عریاں سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی (دو اسلام ص۱۹۵)

ازالہ یہ صحیح ہے کہ سینکڑوں صحابہ مدینہ میں موجود تھے، اور اس مضمون پر احادیث بھی لوگوں کو یاد تھیں، مثلاً حضرت ابی بن کعبؓ جن سے صحیح مسلم کی روایت برق صاحب نے اوپر نقل کی ہے فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا كَانَ الْمَآءُ مِنَ الْمَآءِ رُخْصَةً فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ ثُمَّ نُهِيَ عَنْهَا (رواہ الترمذی وغیرہ وسندہ صحیح مرقاۃ ج۱ ص۲۹۵)

صرف انزال کے بعد نہانا یہ رخصت شروع اسلام میں تھی، پھر اس سے روک دیا گیا، اور حکم دیا گیا، کہ انزال نہ ہو، تب بھی غسل کریں۔

وفی روایۃ ثم اُمرنا بالاغتسال (رواہ ابوداؤد و رواتہ ثقات، تقریب)

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ہی یہ مسئلہ کیوں پوچھا گیا؟ اس کا جواب بھی صحیح مسلم میں موجود ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں۔

اِخْتَلَفَ فِي ذٰلِكَ رَهْطٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ فَقَالَ الْأَنْصَارِيُّونَ لَا يَجِبُ الْغُسْلُ إِلَّا مِنَ الدَّفْقِ أَوْ مِنَ الْمَاءِ وَقَالَ الْمُهَاجِرُونَ بَلْ إِذَا خَالَطَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ قَالَ قَالَ فَأَنَا أَشْفِيكُمْ مِنْ ذٰلِكَ فَقُمْتُ فَاسْتَأْذَنْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَأَذِنَ لِي فَقُلْتُ لَهَا يَا أُمَّاهُ أَوْ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ أَسْأَلُكِ عَنْ شَيْءٍ وَإِنِّي أَسْتَحْيِيكِ فَقَالَ لَا تَسْتَحْيِي أَنْ تَسْأَلَنِي عَمَّا

وجوب غسل کے سلسلہ میں مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت میں اختلاف ہوا، انصار نے کہا، کہ بغیر انزال کے غسل فرض نہیں ہوتا، مہاجرین نے کہا غسل فرض ہو جاتا ہے، میں نے کہا، میں اس کا تصفیہ کرتا ہوں، میں اٹھا، اور حضرت عائشہ کے پاس گیا اور ان سے اجازت چاہی، انہوں نے مجھے اجازت دی، میں نے کہا، اے اماں جان، میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن آپ سے پوچھتے ہوئے شرم آتی ہے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا، شرماؤ نہیں، جو چیز تم اپنی ماں سے جس نے تم کو جنا تھا پوچھ سکتے ہو، وہی مجھ سے بھی پوچھ سکتے ہو کیونکہ میں بھی تمہاری

كُنْتُ سَائِلاً عَنْهُ اُمَّكَ الَّتِي وَلَدَتْكَ فَاِنَّمَا اَنَا اُمُّكَ قُلْتُ فَمَا يُوجِبُ الْغُسْلَ قَالَتْ عَلَى الْخَبِيرِ سَقَطْتَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ بَيْنَ شُعَبِهَا الْاَرْبَعِ وَمَسَّ الْخِتَانُ الْخِتَانَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ (صحیح مسلم)	ماں ہوں۔ میں نے کہا غسل کب فرض ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ تم باخبر کے پاس آئے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب مرد عورت کی چاروں شاخوں کے درمیان بیٹھ جائے، اور ختنہ ختنہ سے مل جائے تو غسل فرض ہو گیا۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اس مسئلہ میں صحابہ کے درمیان اختلاف ہو گیا تھا۔ حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف کو شبہ ہو گیا، لہٰذا وہ اپنی تسلی کے لئے حضرت عائشہؓ کے پاس تحقیق کرنے چلے گئے اور اپنی ام محترمہ ام المومنینؓ سے مسئلہ پوچھ کر چلے آئے۔

الغرض اس اختلاف کے دوران ہی ان دونوں کو اس سوال کے پوچھنے کی جرأت ہوئی ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف نے انفرادی طور پر پوچھا، اور حضرت ابو موسیٰؓ نے صحابہ کرام کے نمائندہ کی حیثیت سے پوچھا، اور ان سب کو مطلع کر دیا۔

انتباہ برق صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ سوال کرنے والے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے صاحبزادے ابوسلمہ تھے۔

غلط فہمی کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ ابن عوف یہ غلطی کر بیٹھے تھے تو حضرت عائشہ کو چاہیئے تھا کہ ابن عوف کی اس جسارت پر ڈانٹتیں، کہ تم کو حرم نبوی سے ایسا عریاں سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی، یا خاموشی اختیار فرمالیتیں، اور اگر خواہ مخواہ کوئی جواب دینا ہی تھا، تو کنایہ و استعارہ سے کام لیتیں" یہ آلہ تناسل کا سر شرمگاہ میں داخل ہونا" ایسے الفاظ ہیں جو ایک حیادار اور شریف خاتون اپنے شوہر کے سامنے بھی منہ سے نہیں نکال سکتی، چہ جائیکہ غیر مردوں کے سامنے (دو اسلام صـ ۱۶۵)

ازالہ یہ تو اوپر بتایا جا چکا ہے، کہ کن حالات میں یہ مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی بات تو ضرور شرم کی تھی لیکن مسئلہ کی تحقیق اس سے زیادہ اہم تھی، سوال جس سے پوچھا گیا، وہ بے شک معزز خاتون ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ ماں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ (الاحزاب: ۶) نبی کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں۔

برق صاحب قرآن مجید کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ۝ ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ (الواقعہ:- ۵۸، ۵۹)

کیا تم نے دیکھا، کہ جب تم ... ٹپکاتے ہو تو کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو، یا ہم

(۲) فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ (الطارق:- ۵، ۶)

انسان کو چاہیئے، کہ دیکھے وہ کس چیز سے بنایا گیا ہے وہ کود کر آنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔

(۳) وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا (التحریم:- ۱۲)

اور مریم بنت عمران، جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی، پس ہم نے اُس میں اپنی روح پھونک دی۔

(۴) فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا (الاعراف:- ۱۸۹)

جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو وہ حاملہ ہوگئی

(۵) أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ (القیامتہ:- ۳۷)

کیا انسان ایک قطرہ نہیں تھا .... کا جو ٹپکائی گئی تھی۔

برق صاحب کیا ان آیات کا عریاں ترجمہ نہیں ہو سکتا؟ بیشک ہو سکتا ہے، اور یہ وہ آیتیں ہیں جو مردوں، عورتوں اور کنواری لڑکیوں کے سامنے تلاوت کی جاتی رہی ہیں اور تلاوت کی جاتی ہیں، لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھائی جاتی ہیں، اور سمجھائی جاتی ہیں، فرمایئے، ان کو پڑھاتے وقت شرم آئے گی یا نہیں۔ برق صاحب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (البقرۃ:- ۲۲۳)

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، پس اپنی کھیتیوں میں آؤ، جس طرح تم چاہو۔

کیا کنواری لڑکی اپنے باپ یا استاد سے یا لڑکا اپنی ماں یا اُستانی سے ان تمام آیات کی تشریح پوچھ سکتا ہے، اگر لڑکا اپنی ماں سے ان آیات کی تشریح کرا سکتا ہے، تو پھر اگر کسی شخص نے اپنی محترم ماں سے غسل کے وجوب کا سوال کیا، اور ایسے وقت کر لیا، جس وقت اور کوئی اس مسئلہ کو حل کرنے والا نہ رہا تھا، تو کیا غضب ہو گیا، برق صاحب اگر آپ علم الحیوانات کے درس میں شریک ہوئے ہیں، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہاں کیا کیا ہوتا ہے، وہ کون سی چیز ہے جو پڑھائی نہیں جاتی، اور جس کی تشریح نہیں کی جاتی، اور وہ بھی ایسی جماعت میں جس میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بیٹھی ہوتی ہیں، اور اکثر پڑھانے والے بھی جوان ہی ہوتے ہیں۔ بورڈ پر شرمگاہوں کی شکلیں تک کھینچی جاتی ہیں، ان پر نام تک لکھا جاتا ہے، اور پھر وہ شکلیں کئی کئی دن تک بورڈ پر باقی رہتی ہیں، کیا یہ سب کچھ عریانیت ہے، نہیں تعلیم و تعلم کے لحاظ سے ایسی چیز عریانیت میں شمار نہیں ہوتی، نہ کبھی کسی کو اس کا خیال بھی آتا ہے، عریانیت جب ہوتی ہے کہ مزا لینے کے لئے یا چھیڑ چھاڑ کے لیئے ایسی باتیں صادر ہوتی ہوں، برق صاحب یہ حدیث تعلیم و تعلم کے ذیل میں آتی ہے، پھر الفاظ کتنے پوشیدہ ہیں، کہ عریانیت کا شائبہ بھی اس میں

نہیں پایا جاتا، ترجمہ صرف اتنا ہے، کہ "جب ختنہ سے ختنہ مل جائے، تو غسل فرض ہو جاتا ہے" بتایئے کتنا جاندار جملہ ہے، اور پھر مطلب بھی پورا ہو گیا، ختنہ کا لفظ کتنا مشہور اور زبان زد خاص و عام ہے؟ حجام کی دکانوں کے بورڈ پر بھی لکھا ہوتا ہے، نہ اس میں کوئی عریانیت ہے نہ بے شرمی، حضرت عائشہؓ نے تو درحقیقت کنایہ ہی سے مطلب ادا کیا تھا۔ اور انہی الفاظ میں ادا کیا تھا جو الفاظ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے تھے۔ برق صاحب کتنا اچھا ہوتا اگر آپ عریاں ترجمہ نہ کرتے۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
چونکہ یہ حدیث ہمارے مشاہدہ، عام تجربہ، عورت کے مسلمہ کیفیات نفسی، اور حضرت عائشہؓ کے بلند مقام سے متصادم ہو رہی ہے، نیز صحیح مسلم کی دو احادیث اس کی تردید کر رہی ہیں۔ اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ اس قول کو حضرت عائشہ کی طرف منسوب کرنا درست نہیں (دو اسلام ص ۱۶۵)

ازالہ | مذکورہ بالا بحث اور قرآنی آیات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس حدیث میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں، نہ صحیح مسلم کی احادیث اس کی تردید کرتی ہیں، بلکہ صحیح مسلم کی ناسخ حدیثیں اس کی تائید کرتی ہیں، جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔

غلط فہمی | "ملا کہتا ہے، کہ میری حدیث کا ہر ہر لفظ محفوظ رہے، اسلام رہے یا نہ رہے، حضور کی منزلت زیادہ ہو یا کم، لوگ اسلام پر ہنسیں یا روئیں، میری بلا سے" (دو اسلام ص ۱۶۶)

ازالہ | اس عبارت میں رنگ آمیزی کے سوا اور کچھ نہیں، اگر کسی ملا نے ایسا کیا ہو تو ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں، لیکن کسی عالم دین محدث نے تو ایسا کبھی نہیں کیا، برخلاف اسلام موضوع حدیث کے پرخچے اڑا کر رکھ دئے۔ حتیٰ کہ اسلام کی تائید میں جو خوش آیند حدیثیں گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی گئی تھیں، ان کی غلط نسبت کو بھی واشگاف کر دیا، اور اپنی کامل دیانتداری کا ثبوت دیا، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ ان صحیح واقعات کو بھی جھٹلا دیتے جن سے بظاہر اسلام پر اعتراض وارد ہو سکتا تھا، اگر وہ ایسا کرتے، تو پھر یہی رویہ ان کا قرآن مجید کے ساتھ بھی ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ قرآن مجید میں بھی ایسی آیات پائی جاتی ہیں جن سے بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منزلت کو بہت بڑا دھکا لگتا ہے۔ مثلاً

(۱) إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (الفتح: ۲،۱) — بیشک ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی، تاکہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمائے۔

اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیات سے مترشح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ گناہ گار تھے؟

(۲) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ (التحریم ۔ ۱)

اے نبی آپ ان چیزوں کو کیسے حرام کرتے ہیں جن کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کر دیا، آپ تو اپنی بیویوں کی رضا کے جویا ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذاللہ شریعتِ الٰہیہ میں تبدیلی کر دیا کرتے تھے، اور وہ بھی محض اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لئے۔

(۳) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ (الانفال ۔ ۶۷)

نبی کے لئے یہ زیبا نہیں، کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں خوب خونریزی نہ کرے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اسلام خونریزی کو بہت پسند کرتا ہے۔

کیا ان آیات سے دشمنانِ اسلام کو اسلام پر ہنسنے کا موقع نہیں ملتا؟ برق صاحب کیا آپ کے مذکورہ بالا عبارت میں "حدیث" کی جگہ "آیت" کا لفظ چسپاں نہیں ہو سکتا؟ اگر احادیث کو اس معیار پر رکھ کر رد کر دینا جائز ہے، تو آیات کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اگر نہیں تو آخر اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ تفصیل کے لیے بیسواں باب ملاحظہ ہو۔

غلط فہمی لیلۃ القدر کی تردید کرتے ہوئے برق صاحب لکھتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں، کہ قرآن حکیم میں لیلۃ القدر کا ذکر آیا ہے "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" ہم نے یہ قرآن لیلۃ القدر یعنی فیصلہ کن رات میں اتارنا شروع کیا (دو اسلام صـ۱۶۷)

ازالہ برق صاحب! لیلۃ القدر کے معنی آپ نے "فیصلہ کن رات" کے کس طرح کر دیئے، اس کے لئے آپ نے کوئی دلیل نہیں دی، پھر "انزلنا" کے معنی "اتارنا شروع کیا" کیسے ہو گئے؟ حالانکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں، کہ "ہم نے اتارا" کیونکہ آپ ایک اعتراض سے بچنا چاہتے تھے۔ جو بغیر حدیث کے حل نہیں ہو سکتا اس لئے آپ نے معنوں میں تھوڑا سا تصرف کر دیا، برق صاحب آخر اس تصرّف سے کیا فائدہ! کیوں نہ حدیث کی روشنی میں ترجمہ کر دیا جائے۔ نہ اعتراض رہے نہ تصرّف کی ضرورت، بہر حال اتنا ضرور ثابت ہوا کہ قرآن مجید پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ مفہوم قرآن میں تصرف کر لیتے ہیں، لیکن حدیث کے لئے آپ اس کو بھی گوارا نہیں فرماتے، کاش آپ غور فرمائیں۔

مزید براں آپ کی تحریر سے روز روشن کی طرح یہ بات ظاہر ہے کہ لیلۃ القدر وہ رات ہے جس رات کو قرآن اترنا شروع ہوا تھا، وہ رات گذر گئی، اور اب کبھی نہیں آتی، حالانکہ اس نظریہ کی تردید خود قرآن مجید میں موجود ہے، ارشاد باری ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ (القدر ۔ ۴)

اس رات کو فرشتے اور روح الامین اپنے ربّ کے حکم سے تمام احکام لے کر اترتے ہیں۔

بقول برق صاحب اگر یہ رات گذر گئی، تو الفاظ اس طرح ہونے چاہیئے تھے "اس رات کو فرشتے اترے تھے"۔ "تَنَزَّلُ" مضارع کا صیغہ ہے، لہٰذا اس کے صحیح معنی "اترتے ہیں" ہوئے، لہٰذا یہ رات بار بار آتی ہے، اور یہی حدیث کا مقصد ہے، قرآن و حدیث میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

غلط فہمی اگر واقعی لیلۃ القدر ہر رمضان میں آتی ہے، تو وہ گذشتہ تین سو برس میں شب بھر جاگنے والے چوکیداروں، ریلوے ملازموں، ملاحوں، ہوابازوں اور مورچے میں ڈٹے ہوئے فوجیوں کو کیوں نظر نہ آئی (دو اسلام ص۱۶۸)

ازالہ مذکورہ بالا قرآنی تشریح کے بعد ان الفاظ میں کوئی جان نہیں ہے، مادّی باتوں سے روحانیات کا مذاق نہیں اڑایا جا سکتا، جب قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ یہ رات بار بار آتی ہے، تو اب اس اعتراض کا رخ قرآن مجید کی طرف مڑ جاتا ہے، معاذ اللہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم:۔۳۹) انسان کو وہی ملتا ہے، جو اس نے کوشش کی

ملاحوں نے اور چوکیداروں نے اس رات کے لئے محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر کوئی کوشش نہیں کی، لہٰذا ان کو وہ رات کیسے مل سکتی تھی، محض اس رات کو جاگنا، اس رات کو پانا نہیں، بلکہ اس رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کو راضی کر لینا درحقیقت اس رات کو پانا ہے، یعنی اس رات کی فضیلت سے فیضیاب ہونا ہی حقیقت میں رات کو پانا ہے، لیکن اس کے لئے بھی محض اس رات کی عبادت اور رکوع و سجود کوئی وقعت نہیں رکھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

كَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ اِلَّا السَّهَرُ (رواہ الدارمی و سندہٗ جید و رواہ نحوہ الحاکم و سندہٗ صحیح۔ مرعاۃ جلد ۳ ص۲۴۹) بہت سے نماز پڑھنے والے ایسے ہیں، کہ ان کو سوائے جاگنے کے اور کچھ نہیں ملتا۔

برق صاحب! چوکیدار اور ملاح تو کجا نماز میں شب گذارنے والوں کو بھی اس رات کا فیض حاصل نہیں ہوتا، اس کے لئے توحید خالص، انابت الی اللہ، تقوی اور خشیتِ الٰہی کی ضرورت ہے۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (مآئدۃ:۔۲۷) اللہ تو صرف اہل تقوی کے اعمال قبول کرتا ہے۔

حدیث کا جواب اوپر نقل کیا گیا، باقی رہے لوگوں کے من گھڑت افسانے، احوال و مشاہدات تو ان کے ہم ذمہ دار نہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے، کہ چند آیات پہلے قرآن میں موجود تھیں، لیکن بعد میں نکال دی گئیں، مثلاً:۔

لولا ان يقول الناس زاد عمرؓ فی اگر لوگ مجھے یہ نہ کہتے کہ عمر بن خطاب نے قرآن

كتاب الله لكتبتها الشيخ والشيخة اذا زنيا فارجموهما فانا قد قرأناها (موطا ـ ص۳۴۸)

میں اضافہ کردیا، تو میں یہ آیت اس میں شامل کر دیتا "الشیخ والشیخۃ...." کہ جب کوئی بوڑھا اور بڑھیا زنا کے مرتکب ہوں، تو انہیں سنگسار کردو" ہم یہ آیت قرآن میں پڑھتے رہے اگر پڑھتے رہے تو نکالی کس نے؟ اور اگر نکال دی گئی تھی، تو اللہ کا وعدۂ حفاظتِ قرآن کیا ہوا"
(دو اسلام صـ ۱۶۸)

ازالہ اس حدیث کو حضرت عمرؓ سے روایت کرنے والے سعید بن مسیب ہیں، اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے اس حدیث کو نہیں سنا، علامہ ابن القطان لکھتے ہیں۔

اِنَّ سَعِيْدًا لَمْ يَسْمَعْ مِنْ عُمَرَ اِلَّا نَعْيَهٗ النُّعْمَانَ بْنَ مُقْرِنٍ قَالَ وَمِنْهُمْ مَنْ اَنْكَرَهٗ مُطْلَقًا (نصب الراية لاحاديث الهداية كتاب الجنايات. ج۴ ص۳۲۹)

سعید نے حضرت عمرؓ سے کچھ نہیں سنا، سوائے نعمان بن مقرن کے انتقال کی خبر کے، بلکہ بعض تو مطلق سننے کا انکار کرتے ہیں۔

لہٰذا سندِ حدیث منقطع ہے، اور یہ حدیث ضعیف ہے، اور ضعیف حدیث کے ہم جواب دہ نہیں، ضعیف حدیث پر اعتراض کرنا بھی فضول ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
اس موضوع پر ایک حدیث بخاری میں بھی موجود ہے۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ فِيْمَا اَنْزَلَ اٰيَةُ الرَّجْمِ

عمر بن خطاب فرماتے ہیں، کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا، اور ان پر ایک کتاب نازل فرمائی، جس میں آیت رجم بھی موجود تھی۔

یعنی امام بخاری نے بھی تسلیم کر لیا، کہ قرآن میں آیت رجم موجود تھی، لیکن یہ نہیں بتایا وہ گئی کہاں؟
(دو اسلام صـ ۱۶۹)

ازالہ اس سے پہلے کہ ہم صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث کا جواب دیں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی سزا کا پس منظر اور اس کی تاریخ پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالیں، اس سلسلہ کی سب سے پہلی سزا قرآن مجید کی اس آیت میں ہے۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي

جو عورتیں زنا کریں، ان پر چار گواہ پیش کرو، پس اگر وہ شہادت دیں، تو ان کو گھروں میں قید رکھو، یہاں تک کہ موت ان کا کام

الْبُيُوتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ○ (النساء:۔ ۱۵)	تمام کر دے۔ یا اللہ ان کے لئے کوئی اور سبیل یعنی سزا مقرر فرما دے۔

کیونکہ زنا عموماً عورت کے حق میں زیادہ معیوب سمجھا جاتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ جب تک عورت کی طرف سے رضامندی نہ ہو، مرد کی تمام کوششیں بے کار ہو جاتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے عورت پر سزا نافذ کی گئی، تاکہ عصمت کے قلعہ کو زیادہ محفوظ و مضبوط بنا دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد سزا کی حد دو گوادر زیادہ بڑھا دیا گیا ہو اور یہ آیت نازل کی گئی ہو، جو مندرجہ ذیل ہے، اور جس کا ذکر موطا کی روایت میں موجود ہے، (بشرطیکہ برقی صاحب کی وارد کردہ اس روایت کو صحیح مان لیا جائے)

اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا الخ	بوڑھا اور بوڑھی جب زنا کریں، تو انہیں سنگسار کر دو۔

کیونکہ بوڑھے اور بوڑھی کا زنا کرنا بہت زیادہ قبیح تھا، لہٰذا پہلے ان پر سزا کو نافذ کیا گیا، جوان اور کنواری عورتوں کے متعلق ابھی تک کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور وہ بدستور محبوس رہا کرتی تھیں، اسی طرح جوان مردوں کے متعلق بھی کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں آخری حکم نازل فرمایا، جس کا ذکر مندرجہ ذیل حدیث میں ہے۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ كُرِبَ لِذٰلِكَ وَتَرَبَّدَ لَهٗ وَجْهُهٗ قَالَ فَاُنْزِلَ عَلَيْهِ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَقِيَ كَذٰلِكَ فَلَمَّا سُرِّيَ عَنْهُ قَالَ خُذُوْا عَنِّيْ فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا.... ...اَلثَّيِّبُ جَلْدُ مِائَةٍ ثُمَّ رَجْمٌ بِالْحِجَارَةِ وَالْبِكْرُ جَلْدُ مِائَةٍ ثُمَّ نَفْيُ سَنَةٍ (صحیح مسلم کتاب الحدود)	حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی، تو آپ مشقت محسوس کرتے تھے، چہرہ متغیر ہو جاتا تھا، ایک دن آپ پر وحی نازل ہوئی، اور یہی کیفیت ہو گئی، پھر جب وہ کیفیت زائل ہو گئی، تو آپ نے فرمایا، مجھ سے یہ احکام سیکھ لو، بے شک اللہ نے ان کے لئے سبیل (سزا) مقرر کر دی...... شادی شدہ کو سو کوڑے مار کر رجم کر دیا جائے، اور کنوارے کنواری کو سو کوڑے مار کر ایک سال کے لئے جلا وطن کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں سو کوڑے کی سزا شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کے لئے مشترک تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سزا کو قرآن مجید کی آیت کی صورت میں نازل فرما کر مصحف میں شامل کر دیا۔ اور غیر مشترک سزا کو احادیث کی صورت میں رہنے دیا گیا۔

اب رہ گیا برقی صاحب کا یہ اعتراض کہ وہ آیت کہاں گئی، جس کا ذکر حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا روایت

میں ہے، تو اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا پورا بیان درج ذیل کیا جاتا ہے، حضرت عمر فرماتے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ آيَةُ الرَّجْمِ فَقَرَأْنَاهَا وَعَقَلْنَاهَا وَوَعَيْنَاهَا رَجَمَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ فَأَخْشَى إِنْ طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ أَنْ يَقُولَ قَائِلٌ وَاللّٰهِ مَا نَجِدُ آيَةَ الرَّجْمِ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَيَضِلُّوا بِتَرْكِ فَرِيضَةٍ أَنْزَلَهَا اللّٰهُ وَالرَّجْمُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلَى مَنْ زَنَى إِذَا أُحْصِنَ

(صحیح بخاری، وصحیح مسلم)

بے شک اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، اور آپ پر شریعت نازل کی اس نازل کردہ شریعت میں رجم کا حکم بھی ہے۔ ہم نے اسے پڑھا ہے، سمجھ لیا ہے اور محفوظ کر لیا ہے۔ پھر (عملاً بھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے، اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے، میں ڈرتا ہوں کہ ایک مدت گذرنے کے بعد کہنے والا یہ نہ کہے، کہ اللہ کی قسم شریعت میں رجم کا کوئی حکم نہیں ہے۔ پس لوگ اللہ کے ایک فرض کو جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے ترک کر کے گمراہ نہ ہو جائیں، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ رجم کا حکم شریعت الٰہیہ میں اب بھی حق و ثابت ہے اس پر جو شادی شدہ ہو کر زنا کرے۔

برق صاحب اب بتائیے، حدیث پر کیا اعتراض ہے، اعتراض اس لئے پیدا ہوا کہ آپ نے کتاب اللہ کے معنی قرآن کر دئے، اور پھر ہم سے سوال کرنے لگے کہ قرآن مجید میں تھی تو کہاں گئی؟ یہ آیت قرآن مجید میں تھی ہی نہیں، حدیث میں تھی، اور بقول حضرت عمرؓ حدیث میں اب بھی موجود ہے، اور جو آیت قرآن مجید میں تھی، یعنی "بوڑھے اور بوڑھی کو سنگسار کرنے کی آیت" وہ منسوخ ہو گئی اور اب قرآن مجید میں نہیں ہے" یہ جواب برق صاحب کی وارد کردہ روایت کو صحیح مان کر دیا گیا ہے، ہاں اگر یہ تعجب ہو کہ قرآن مجید میں نسخ کیسا، تو یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں، یہ بات تو خود قرآن مجید سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا

(البقرۃ:۔ ۱۰۶)

جب ہم کوئی آیت منسوخ کر دیتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری آیت نازل کر دیتے ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید کی آیات میں نسخ ہوا ہے۔

(۲) وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا

اور جب کبھی ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ نازل کرتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ خود گھڑنے والے

يَعْلَمُونَ ۝ (النحل :- ۱۰۱) ہیں، بات یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے ہی نہیں

(۳) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا (البقرة :- ۲۶) بے شک، اللہ نہیں شرماتا، کہ مچھر کی مثال بیان فرمائے یا اس سے بھی ادنیٰ تر مخلوق کی۔

کفار نے اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی شان سے بعید ہے کہ وہ مچھر جیسی حقیر مخلوق کی مثال بیان فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ آیت اتاری، لیکن وہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے مچھر کی مثال بیان فرمائی تھی، اور جس پر کفار نے اعتراض کیا تھا، قرآن مجید میں نہیں ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ بعض آیتیں ضرور منسوخ ہوتی ہیں۔

(۴) سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝ إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ (الاعلیٰ :- ۷-۶) ہم آپ کو پڑھائیں گے لہٰذا آپ نہیں بھولیں گے، سوائے اس کے جو اللہ ہی بھلانا چاہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے، کہ ضرور کچھ نہ کچھ بھلانا اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادے میں تھا، ورنہ اس استثناء کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ان آیات کی روشنی میں اگر کسی حدیث میں یہ ملتا ہے، کہ فلاں آیت منسوخ ہوگئی، تو آخر اعتراض کی کون سی بات ہے، جو اعتراض حدیث پر ہوگا، وہی پھر قرآن پر بھی ہوگا۔ (معاذ اللہ)

غلط فہمی آج اعدائے اسلام یہی احادیث پیش کر کے ہمیں کہتے ہیں، کہ تمہارے قرآن میں ردّوبدل ہوتا رہا اور اس کی آیات انسانی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں، کوئی بتاؤ کہ ہم اس الزام کا کیا جواب دیں (ص ۱۶۹)

ازالہ برق صاحب یہ کس حدیث میں ہے کہ قرآنی آیات انسانی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں، یہ کس حدیث میں ہے کہ انسان آیات میں ردّوبدل کرتے رہے ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا ردّوبدل کرنا بھی انسانی ردّوبدل کہلا سکتا ہے؟ آخر کچھ تو انصاف کیجئے، قرآنی آیات انسانی دست برد سے بے شک محفوظ رہیں، دستبرد کرنے والی وہی ہستی ہے جس نے اس کو اتارا تھا، اس کو بے شک اختیار ہے کہ جس حکم کو چاہے بدل دے اور جس حکم کو چاہے باقی رہنے دے، دین کی تکمیل سے پہلے ردّوبدل ہوا، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا)، تو پھر اس میں کوئی ردّوبدل نہیں ہوا، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تھا آج تک ویسا ہی ہے، اعدائے اسلام یہ بتائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کون سی تبدیلی ہوئی، اور پھر اعتراض کریں، برق صاحب اعدائے اسلام کے اعتراض سے آپ مرعوب نہ ہوں، کیا آپ کو خبر نہیں کہ اعدائے اسلام نے قرآن مجید کے متن پر سینکڑوں اعتراض کئے ہیں، تو کیا ہم قرآن مجید کے متن کا انکار کر دیں؟ کیا ان آیات کا بھی انکار کر دیں جن سے نسخ آیات ثابت ہوتا ہے اور جو

اوپر نقل کی جا چکی ہیں، ہاں یہ دوسری بات ہے کہ آپ آیات کا مفہوم بدلتے چلے جائیں، اس طرح سے بظاہر آپ مطمئن ہو جائیں گے لیکن ضمیر کی آواز اس سے کچھ مختلف ہی ہوگی، مثال کے طور پر ایک اعتراض نقل کرتا ہوں، حروف مقطعات مثلاً الٓمٓ۔ کٓھٰیٰعٓصٓ وغیرہ کے کیا معنی ہیں؟ اگر کچھ معنی ہیں، تو لغت عرب، محاورات اہل زبان سے ان کے معانی کو ثابت کیجئے، تاکہ ہر عربی دان مسلم ہو یا غیر مسلم ان کو تسلیم کرے، اگر کچھ معنی نہیں ہیں، تو کیا یہ حروف انسانی دست برد کا نتیجہ ہیں؟ بتایئے اس اعتراض کا کیا جواب دیں۔

غلط فہمی تحریف کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ حضرت علقمہ فرماتے ہیں۔ کہ میں شام میں حضرت ابو درداءؓ سے ملا، تو آپ نے پوچھا، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود واللیل کی تلاوت کیسے کرتے ہیں، تو میں نے کہا اس طرح وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالذَّكَرِ وَالْأُنثَىٰ آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلعم سے یہ آیات بالکل اسی طرح سنی ہیں، اور میں اسی طرح پڑھوں گا (صحیح مسلم جلد ۲ صـ ۳۶۲)

تو گویا تین جلیل القدر صحابہ نے شہادت دی، کہ یہ آیات مذکورہ بالا صورت میں نازل ہوئی تھیں، لیکن آج قرآن شریف میں یوں درج ہیں وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ اب کس کو صحیح تسلیم کریں! ان صحابہ کو، صحیح مسلم کو؟ یا قرآن شریف؟ لازماً یہی کہنا پڑے گا، کہ ہمارا قرآن صحیح ہے، اور یہ حدیث غلط (دو اسلام صـ ۱۷۰)

ازالہ برق صاحب انفرادی غلطی اور لاعلمی سے مسلمات کو جواب نہیں دیا جا سکتا، اگر تین صحابیوں سے غلطی ہو گئی تو ہو جائے، ہزارہا صحابہ جس طرح تلاوت کرتے رہے، قرآن مجید تو درحقیقت وہی ہے، ان تین صحابیوں کی لاعلمی یا بھول کی وجہ سے قرآن مجید کے متن پر کوئی اعتراض نہیں آتا، لہٰذا احادیث قابل اعتراض ہی نہیں، اگر یہ اعتراض ہو، کہ یہ تین صحابی کیسے بھول گئے، تو اول تو یہ تین نہیں دو ہیں، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو درداؓ، آپ نے علقمہ تابعی کو بھی غلطی سے صحابی سمجھ لیا، وہ تو ان دونوں صحابیوں کی غلطی کے راوی ہیں، اب رہا بھول کا اعتراض، تو کیا بھول بھی کوئی قابل اعتراض چیز ہے، انسان سے بھول ہو ہی جایا کرتی ہے، وہ بھول جاتا ہے، اور سمجھتا یہ ہے کہ جو کچھ مجھے یاد ہے وہ صحیح ہے، یہ واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ اور روزمرہ کے تجربات میں سے ہیں، کیا محض ان دو صحابیوں کو بھول کے نقص سے بچانے کے لئے ایک مسلمہ حقیقت کا انکار کر دیا جائے، وہ یہ کہ علقمہ نے ان دونوں صحابیوں سے ایک آیت غلط طریقہ سے سنی تھی۔ اور اس کو انہوں نے بیان کر دیا، لہٰذا قرآن مجید بھی صحیح، حدیث بھی صحیح، البتہ ان دو صحابیوں سے بھول ہو گئی۔

اس اعتراض کا ایک اور جواب بھی ہے، ممکن ہے، کہ یہ آیت پہلے اسی طریقہ سے نازل ہوئی ہو، جس طریقہ سے ان دونوں صحابہ کو یاد تھی، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں "وَمَا خَلَقَ" کا اضافہ کر دیا،

اور ان دونوں صحابیوں کو اس کا علم نہ ہوسکا، اور یہ اُسی سے طریقہ پڑھتے رہے، قرآن مجید بہر حال جمہور صحابہ کی قرأت کے مطابق شائع ہوا۔ لہٰذا اس میں ان صحابیوں کی لاعلمی کی وجہ سے کوئی نقص نہیں آتا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"حضورؐ نے اصحاب صفہؓ میں سے چند حضرات کو اہل نجد کے پاس تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا، جب وہ بیر معونہ (مکہ اور عسفان کے درمیان ایک مقام) میں پہنچے تو عامر بن طفیل، رعل، ذکوان وغیرہ نے انہیں قتل کر ڈالا، حضرت انسؓ سے روایت ہے، کہ ان لوگوں کے متعلق مندرجہ ذیل آیت اتری تھی، جو بعد میں منسوخ ہوگئی۔ "بلغوا قومنا انا قد لقینا ربنا فرضی عنا و رضینا عنہ" ہماری قوم کو کہہ دو کہ ہم اللہ سے اس حال میں ملے، کہ وہ ہم سے خوش تھا، اور ہم اس سے (بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۲ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۳۷) اگر یہ آیت واقعی نازل ہوئی تھی، تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اس کا باقی رہنا ضروری تھا" (دو اسلام صفحہ ۱۷۱)

ازالہ آیت کے منسوخ ہونے کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے، منسوخ کرنے میں کیا مصلحت تھی، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے، ہاں ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے جو آپ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں پائی جاتی ہے

"قرآن شریف میں غزوات اور اس قسم کے دیگر واقعات کے متعلق بیسیوں آیات نازل ہوئیں جو بعینہٖ محفوظ ہیں" (دو اسلام صفحہ ۱۷۱)

گویا ان آیات کی موجودگی میں اس آیت کی ضرورت نہ سمجھی گئی، پیغام پہنچا دینے کے بعد اس کو منسوخ التلاوت کر دیا گیا، اور حوصلہ افزائی کے لئے باقی آیات کو کافی سمجھا گیا۔

غلط فہمی "چونکہ اس قسم کی احادیث سے قرآن کی قطعیت پر چوٹ پڑتی ہے، اس لئے ہمارے لئے محفوظ ترین راستہ یہی ہے، کہ ہم اس قسم کی تمام احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دیں" (دو اسلام صفحہ ۱۷۱-۱۷۲)

ازالہ نسخ کا جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے، نسخ سے قطعیت قرآن مجید مجروح نہیں ہوتی، پھر قرآن مجید کی قطعیت پر تو قرآن کی آیات سے بھی چوٹ پڑتی ہے۔ لہٰذا حدیث کا انکار چھوڑ کر، پہلے ان کا جواب سوچنا چاہیئے، ستیارتھ پرکاش وغیرہ کتابیں ملاحظہ فرمائیں، دو ایک اعتراض اوپر نقل کئے جا چکے ہیں، مثلاً "مچھر کی مثال والی آیت کہاں گئی؟ حروف مقطعات قرآن مجید میں کہاں سے آ گئے؟"

غلط فہمی "میری ذاتی رائے یہ ہے، کہ دشمنانِ اسلام ایک خاص سازش کے ماتحت اس قسم کی احادیث معتبر راویوں کے نام سے وضع کرتے رہے، تاکہ مسلمان کا ایمان قرآن کے متعلق متزلزل ہو جائے اور چونکہ ائمۂ حدیث صرف اسناد کو دیکھتے تھے، اس

ئے مسلم جیسے محقق بھی اس چال کے شکار ہو گئے، اور انہوں نے اس روایت کو اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا" (دو اسلام ص ۱۷۲-۱۷۳)

ازالہ یہ تو تسلیم کیا جاسکتا ہے، کہ دشمنانِ اسلام اس قسم کی احادیث وضع کرتے تھے، یہ بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے، کہ معتبر راویوں کے نام ان کی اسناد میں لگا دیا کرتے تھے، لیکن براہِ کرم یہ تو سوچئے کہ محققین کے پاس وہ احادیث کس سند سے پہنچتی تھیں، کیا ان اسناد میں ان دشمنانِ اسلام کے نام نہیں ہوتے تھے، ضرور ہوتے تھے، تو پھر جو حدیث دشمنانِ اسلام کا نام آتے ہی موضوع ہو جاتی تھی، محققین کے نزدیک صحیح کیسے ہو گئی، معتبر راویوں کے نام تو ان دشمنان اسلام کے اوپر ہوں گے، لہٰذا اوپر کے راویوں کے معتبر ہونے سے حدیث مستند کیسے ہو جائے گی جب کہ نیچے کے راوی کذاب ہوں، برق صاحب یہ بات آپ نے سوچ سمجھ کر نہیں لکھی۔ واللیل کی قرأت کے متعلق جو حدیث برق صاحب نے نقل فرمائی ہے، صحیح مسلم میں اس کی یہ اسناد ہیں۔

- عبداللہ بن مسعود وابو درداءؓ
  - علقمہ
    - شعبی
      - داؤد بن ابی ہند
        - اسمٰعیل بن ابراہیم
          - علی بن حجر
            - امام مسلم
        - عبدالاعلیٰ
          - محمد بن المثنیٰ
            - امام مسلم
    - ابراہیم
      - اعمش
        - ابو معاویہ
          - ابوبکر
            - امام مسلم
          - ابوکریب
            - امام مسلم
      - مغیرہ
        - جریر
          - قتیبہ
            - امام مسلم
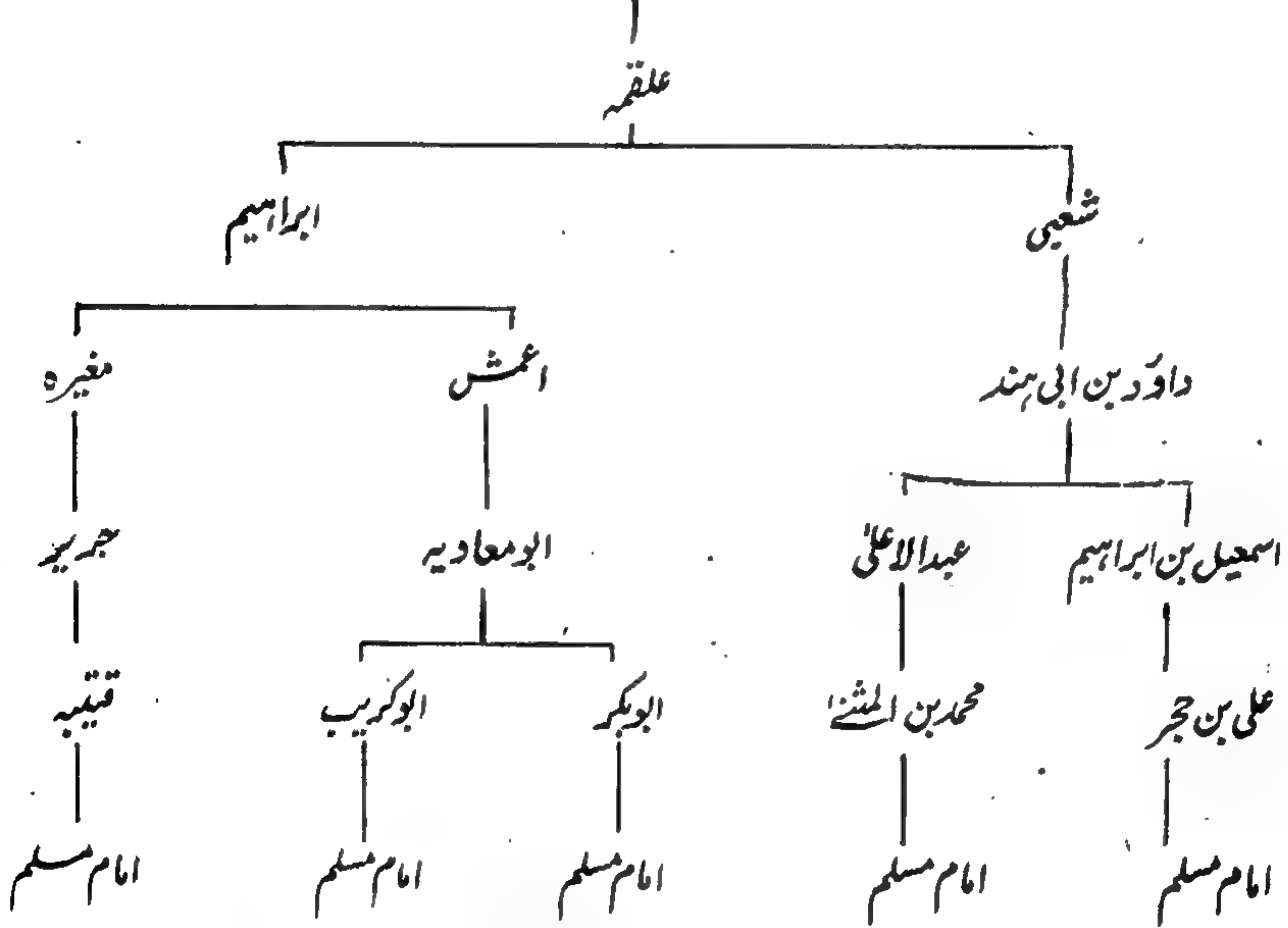
(صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب ما یتعلق بالقراءات)

اس اسناد میں ہر ایک مسلمہ امام ہے، بتائیے کس کو دشمنِ اسلام سمجھیں؟ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ امام علقمہ تابعی کو دشمنِ اسلام قرار دے دیا جائے، جو کہ عبداللہ بن مسعود کے اصحابِ کبار میں شمار ہوتے ہیں، کیونکہ صرف ان کو دشمنِ اسلام قرار دے کر باقی کو اس الزام سے بچایا جاسکتا ہے۔ اگر ان کو صادق سمجھا جائے تو پھر دو اماموں کو یعنی امام شعبی اور امام ابراہیم نخعی کو دشمنانِ اسلام

ماننا پڑے گا، اور اگر یہ بھی صادق سمجھے جائیں، تو پھر متعدد ائمۂ دین کو دشمنانِ اسلام کی فہرست میں شامل کرنا ہوگا اور یہ کبھی بھی قرینِ قیاس نہیں ہو سکتا کہ اتنے زیادہ آدمی اس حدیث کے بنانے میں شریک ہوں اور کسی کے متعلق ادنیٰ سا بھی وہم نہ امام مسلم کو ہوا، نہ کسی اور محدّث کو، حالانکہ صحیح مسلم کی احادیث کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے، امام مسلم خود لکھتے ہیں۔

لَيْسَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدِي صَحِيحٌ وَضَعْتُهُ هٰهُنَا اِنَّمَا وَضَعْتُ هٰهُنَا مَا اَجْمَعُوا عَلَيْهِ (صحیح مسلم باب التشہد فی الصلوٰۃ)

میں صحیح مسلم میں ہر وہ حدیث نہیں لکھتا جو میرے نزدیک صحیح ہے، صحیح مسلم میں تو صرف وہ حدیث لکھتا ہوں، جس کی صحت پر اجماع ہے۔

اب بتلایئے یہ کیسے ممکن ہے کہ تمام محدثین ان تمام دشمنانِ اسلام سے بے خبر رہے، بلکہ ان کو ائمۂ دین شمار کرتے رہے، ظاہر ہے، کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے، برقی صاحب صحیح مسلم کی یہ اسناد آپ کے سامنے ہیں، آپ اس شخص یا ان اشخاص پر انگلی رکھیئے، جو اس حدیث کے گھڑنے والے تھے، لیکن مشکل یہ ہے کہ کس کس کو کذاب کہا جائے، صرف صحیح مسلم کی سند کا یہ حال ہے، تمام کتب حدیث میں اس کی سند کا ایک جال بچھا ہوا ہے، ناممکن ہے، کہ ان تمام کے تمام ائمۂ حدیث و فن کو دشمن اسلام قرار دیا جائے، پھر بھی کیوں نہ کہدیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے، اور صرف گنتی کے چند افراد کو مسلم چھوڑ گئے، باقی سب کے سب منافق تھے، ان کی نسل سے بھی منافق پیدا ہوتے رہے، ان کے شاگردان خاص بھی منافق تھے، غرض یہ کہ امتِ مسلمہ سب کی سب ان منافقوں پر مشتمل تھی، نہ کوئی مسلم تھا، نہ کوئی حق گو، اور اگر کوئی تھا بھی تو وہ کہیں گوشۂ عافیت میں زندگی گذار رہا تھا، نہ اس سے کوئی واقف تھا، نہ وہ کسی سے واقف، دور دورہ انہیں منافقوں کا تھا، جو علم و فن کے آفتاب و ماہتاب تھے، عمل صالح، اور تقویٰ و طہارت کے پیکر تھے، ائمۂ دین کہلاتے تھے، لیکن تھے منافق، اور دشمنِ اسلام، نعوذ باللہ، قطعاً ناممکن ہے کہ یہ لاتعداد ائمۂ دین سب کے سب منافق ہوں، لہٰذا ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ ہمارے لئے سب سے آسان بات یہ ہے، کہ ہم ان تمام ائمہ کو دشمنانِ دین کہنے کے بجائے امام علقمہ کو دشمن دیں کہدیں لیکن یہاں بھی ایک بڑی مشکل ہے، وہ یہ کہ علقمہ معمولی آدمی نہیں بلکہ صحابہ کرام کے شاگرد خاص، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مشہور اصحاب کبار میں سے ہیں، ائمۂ دین اور محدثین کے مسلمہ استاذ ہیں، لہٰذا اس مشکل کا حل سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم صحتِ حدیث کے معترف ہوں، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو درداءؓ کی اس قرأت کو قرأتِ شاذّہ میں شمار کریں اور یہ کہیں کہ غالباً یہ قرأت اوائل اسلام میں کبھی جائز تھی، اب منسوخ ہے۔

غلط فہمی

سرورِ عالم صلعم اور ان کے صحابہ گوشت کو ایک نعمت سمجھ کر کھایا کرتے تھے، لیکن موطا کی ایک حدیث ہمیں گوشت جیسی نعمت سے اجتناب کا حکم دیتی ہے

... عمر بن الخطاب قال ایاکم واللحم فان لہ ضراوۃ کضراوۃ الخمر — عمر فاروق فرماتے ہیں کہ گوشت خوری سے بچو۔ اس لئے کہ شراب کی طرح اسکی عادت پڑ جاتی ہے۔

اگر ایک اچھی چیز کی عادت بھی پڑ جائے، تو ہرج کیا ہے۔ (دو اسلام صد ۱۷۳-۱۷۴)

ازالہ امام مالک نے اس قول کو متصل سند سے بیان نہیں کیا، لہٰذا یہ قول ضعیف ہے، اور اس پر اعتراض اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے، اعتراض جب ہوتا کہ امام مالک اس کو متصل سند سے بیان کر کے اس پر اعتماد کرتے، پھر برق صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ہر اچھی چیز کی عادت اچھی ہوتی ہے، کھانے پینے کی چیزوں میں سے کسی چیز کی عادت پڑ جانا یقیناً تکلیف کا باعث ہوتا ہے اگر کبھی وہ چیز میسر نہیں ہوتی، تو طبیعت مکدر رہتی ہے، آدمی اس کا غلام بن جاتا ہے، اور اس کو بغیر اس چیز کے چین نہیں آتا اور ہو سکتا ہے کہ جب بے صبری زیادہ بڑھ جائے تو وہ اس کے حصول کے لئے کوئی ذلیل قسم کی حرکت کر بیٹھے، ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اگر یہ قول حضرت عمر کی طرف صحیح منسوب ہے، تو یہی وہ حرج ہے، جس کی طرف ان کے اس قول میں اشارہ ہے، کثرت کسی چیز کی بھی اچھی نہیں ہوتی، حتیٰ کہ عبادت کی کثرت بھی نامحمود ہے، تو پھر گوشت خوری کی کثرت کیوں نہ نامحمود ہو، یہی وہ رمز ہے جو اس قول میں پوشیدہ ہے، فللہ الحمد۔

باب ۸

صحیح بخاری پر ایک نظر

غلط فہمی "اس میں کلام نہیں، کہ امام بخاری (وفات ۲۵۶ھ) نے صحیح احادیث کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کئے، اور سالہا سال کی مسلسل جستجو و تگاپو کے بعد اپنا مجموعہ تیار کیا" (دو اسلام ص۱۵۱)

ازالہ اس کے یہ معنی نہیں کہ امام بخاری سے پہلے کوئی مجموعۂ احادیث نہیں تھا، بہت سے تھے لیکن ان مجموعوں میں کچھ ضعیف احادیث بھی شامل تھیں، بعض میں کسی قسم کا شبہ تھا، بعض کے متعلق اختلاف رائے تھا، امام بخاری نے ان کتب احادیث کو پڑھا، اور ان میں سے ان احادیث کا انتخاب کیا جو ہر قسم کے شبہ سے بالاتر تھیں، اور جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق تھا، ان منتخب کردہ احادیث کو اپنی جامع میں جمع کر دیا' علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔

وَجَاءَ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيُّ إِمَامُ الْمُحَدِّثِيْنَ فِي عَصْرِهٖ فَخَرَّجَ أَحَادِيْثَ السُّنَّةِ عَلٰى أَبْوَابِهَا فِي مُسْنَدِهِ الصَّحِيْحِ وَاعْتَمَدَ مِنْهَا مَا أَجْمَعُوْا عَلَيْهِ دُوْنَ مَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ثُمَّ جَاءَ الْمُسْلِمُ بْنُ حَجَّاجِ الْقُشَيْرِيُّ فَأَلَّفَ مُسْنَدَهٗ حَذَا فِيْهِ حَذْوَ الْبُخَارِيِّ فِي نَقْلِ الْمُجْمَعِ عَلَيْهِ (مقدمہ ابن خلدون ص۳۸۶)

محمد بن اسماعیل بخاریؒ جو اپنے زمانہ میں محدثین کے امام تھے آئے، اور انہوں نے ابواب کے ماتحت اپنی صحیح کو مرتب کیا، اور صرف انہی حدیثوں پر اعتماد کیا۔ جن کی صحت پر اجماع تھا اور ان کو چھوڑ دیا جن میں اختلاف تھا پھر امام مسلم آئے، انہوں نے بھی امام بخاریؒ کی طرح ان ہی احادیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا جن کی صحت پر اجماع تھا

برق صاحب کے ممدوح امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

وَمَا صَحَّحَاهُ كَانَ قَبْلَهُمَا عِنْدَ اَئِمَّةِ الْحَدِیْثِ صَحِیْحًا فَتَلَقَّی بِالْقُبُوْلِ کَذٰلِکَ فِیْ عَصْرِهِمَا وَکَذٰلِکَ بَعْدَهُمَا فَلَمْ یَتَفَرَّدَا الَّا بِرِوَایَتِهٖ وَلَا بِتَصْحِیْحِ (منہاج السنہ جلد ۴ صہ ۵۹)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث ان دونوں اماموں سے پہلے بھی ائمۂ حدیث کے نزدیک صحیح تھیں اور ان دونوں کے زمانہ میں بھی صحیح مانی گئیں اور ان کے بعد کے زمانہ میں بھی صحیح تسلیم کی گئیں، پس نہ روایت میں یہ منفرد ہیں نہ تصحیح میں ان دونوں کا انفراد ہے۔

غلط فہمی لیکن اس قدر محنت اور احتیاط کے باوجود اس مجموعہ میں چند ایسی احادیث موجود ہیں، جو یا تو تعلیم قرآن سے متصادم ہوتی ہیں، یا آپس میں ٹکراتی ہیں، یا مسلمانوں کو بے کار، اپاہج اور بے عمل بناتی ہیں اور یا ان سے حضور علیہ السلام اور ان کی ازواج مطہرات کی توہین کا پہلو نکلتا ہے (دو اسلام صہ ۱۷۵)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، صحیح بخاری میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جس میں مذکورہ بالا باتیں پائی جاتی ہوں، اگر بظاہر کوئی بات پائی بھی جائے تو وہ حقیقۃً ایسی نہیں ہوتی اگر حدیث کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو وہ غلط فہمی خود بخود دور ہو سکتی ہے، اور اگر محض ظاہری معنوں سے اس قسم کے اعتراضات کئے جا سکتے ہیں تو پھر ایسے اعتراضات سے قرآن مجید بھی نہیں بچ سکتا، جہاں برق صاحب احادیث سے اس قسم کی مثالیں پیش کریں گے، وہیں ان کے مماثل ہم قرآنی آیات پیش کریں گے۔

صحیح بخاری کی احادیث کی صحت پر جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ علمائے سلف و خلف کا اجماع ہے تو کیا یہ سب دشمنِ دین و پیغمبر تھے یا اسلام کے نادان دوست تھے، کوئی ان میں محبِ رسول اور اسلام کا دانا و سمجھ دار دوست تھا ہی نہیں؟ برق صاحب آخر کچھ تو انصاف چاہیئے، اگر ان سب نے مل کر کسی حدیث کو قرآن مجید کے خلاف نہیں سمجھا، اور ہم اس کو قرآن مجید کے خلاف سمجھیں، تو کیا یہ ہماری سمجھ کا قصور ہے، یا ان سب اگلے پچھلے محدثین کی سمجھ کا قصور ہے۔

غلط فہمی "امام بخاری کی نظر زیادہ تر اسناد پر رہی، انہیں جس حدیث کے وضعی ہونے پر کوئی تاریخی شہادت نہ مل سکی، اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر دیا" (دو اسلام صہ ۱۷۶)

ازالہ یہ قطعاً صحیح نہیں، اسناد کے ساتھ تمام فنونِ حدیث پر امام بخاری کی نظر تھی، موضوع حدیث تو کجا انہوں نے تو ضعیف و مشکوک اور مختلف فیہ احادیث بھی نقل نہیں کیں، بلکہ صحیح احادیث میں سے بھی بہت سی احادیث کو اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ احادیث ان کی سخت شرائط کے معیار کے مطابق نہیں تھیں، بھلا جو شخص صحیح احادیث اپنے سخت شرائط کی بنا پر چھوڑ دیتا ہو، وہ ضعیف بھی نہیں

بلکہ موضوع حدیثیں نقل کرے گا، حاشا وکلا۔

برق صاحب کا یہ جملہ "جس حدیث کے دفعی ہونے پر کوئی تاریخی شہادت نہ مل سکی، اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا"۔ درحقیقت معکوس جملہ ہے، اس جملہ کو اس طرح ہونا چاہیئے تھا "جس حدیث کے صحیح ہونے پر تمام ضروری تاریخی شہادتیں میسر تھیں، ان احادیث کو امام بخاری نے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا"۔ محدث تو صحتِ احادیث کے لیئے تاریخی شہادت مہیا کرتے تھے، اور جہاں یہ تاریخی شہادت نہ ہوتی تھی، اس کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے لیے تاریخی شہادت نہ مل سکے، اور پھر بھی وہ حدیث صحیح بخاری میں شامل ہو جائے۔

غلط فہمی "گذشتہ صفحات میں آپ دیکھ چکے، کہ احادیث کا کیا حال ہو چکا تھا، راویوں کے حالات کس بے احتیاطی سے قلمبند ہوئے تھے، اور وہ ایک دوسرے کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے" (دو اسلام ص ۱۷۶)

ازالہ ان غلطیوں کے ازالہ کے لئے گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں، متعلقہ ابواب ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی "احادیث کی حیثیت محض تاریخ کی ہے، تاریخ میں غلط باتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور صحیح بھی، فرق صرف اتنا ہے، کہ ایک مورخ تدوین تاریخ میں اس قدر خلوص اور محنت سے کام نہیں لے سکتا، جتنا کہ امام بخاری نے لیا" (دو اسلام ص ۱۷۶، ۱۷۷)

ازالہ جب کوئی مورخ تدوین تاریخ میں اس قدر خلوص سے کام نہیں لے سکتا، جتنا امام بخاری نے لیا۔ پھر بھی حدیث کو تاریخ کی حیثیت دینا عجیب ہے، بے شک تاریخ میں غلط باتیں ہوتی ہیں جیسا کہ برق صاحب کو اعتراف ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے، کہ وہاں واقعہ کی تنقید کے لئے نہ کوئی مخصوص معیار ہوتا ہے، نہ مؤرخین اس کی کوئی ضرورت ہی سمجھتے ہیں، جو سنا لکھ لیا، خواہ وہ واقعہ فرضی ہی کیوں نہ ہو، لیکن احادیث کا معاملہ بالکل الگ ہے، یہاں ہر واقعہ، ہر قول و فعل کی سند ہوتی ہے، پھر ایک سند نہیں ہوتی، بلکہ متعدد سندیں ہوتی ہیں، پھر ہر زمانہ میں سند پر بھی بحث ہوتی ہے، اور متن پر بھی، تمام فنون حدیث سے اسے پرکھا جاتا ہے، جب وہ تمام مراحلِ تنقید کو طے کر لیتی ہے، تو قابل اعتماد کہلاتی ہے، اس کو صحیح کہا جاتا ہے، یہاں نہ جانبداری ہوتی ہے، نہ بغض و تعصب، نہ مداہنت نہ تعسف، بلکہ پوری ہوشیاری، تندہی، ایمان و دیانت داری سے ہر حدیث کو پرکھا جاتا ہے، لہٰذا اس تنقید کے بعد جو حدیث صحیح کہلائے، اور تمام ناقدین کے نزدیک صحیح کہلائے اس کو تاریخ کا درجہ دینا بڑی زبردست غلط فہمی ہے۔

غلط فہمی رسول اللہ صلعم نے خسرو پرویز شاہِ ایران ..... اور ہرقل قیصر روم .... کی طرف

خطوط بھیجے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی، ہرقل نے قاصدِ رسول کی بڑی تعظیم کی، لیکن کسریٰ (شاہ ایران) نے خط پھاڑ ڈالا، اور قاصد کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیا، جب حضور کو اس سلوک کی اطلاع ملی، تو آپ نے ایک پیشین گوئی کی، قیصر کے حسن سلوک، اور کسریٰ کی بدتمیزی کا تقاضا تو یہ تھا، کہ حضور صرف نسل کسریٰ کے خاتمہ کی پیشین گوئی فرماتے اور ہرقل کے لئے اسی طرح محبت کا اظہار کرتے، جس طرح وہ نجاشی سے کیا کرتے تھے، لیکن جو پیش گوئی بخاری میں موجود ہے، وہ ہماری اس تمنا کو پورا نہیں کرتی۔

عن ابی هريرة ان رسول الله صلعم	ابوہریرہ نبی کریم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ
قال اذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ	آپ نے فرمایا، کسریٰ کے تباہ ہونے کے بعد
بعده واذا هلك قيصر فلا قيصر	کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا، اور نہ قیصر کے
بعده (دو اسلام صد ۱۷۸، ۱۷۷)	بعد کوئی اور قیصر۔

ازالہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی گئی، کہ کسریٰ نے آپ کا نامہ مبارک چاک کر ڈالا تو آپ نے یہ پیشین گوئی نہیں فرمائی، جو برق صاحب نے نقل کی ہے، بلکہ آپ نے اس وقت صرف یہ دعا فرمائی تھی۔

اَنْ یُّمَزَّقُوْا کُلَّ مُمَزَّقٍ (صحیح بخاری کتاب العلم) کہ وہ پارہ پارہ ہو جائیں۔

کیونکہ خسرو نے انتہائی ذلیل وگستاخانہ حرکت کی تھی، لہٰذا اس کے حق میں یہ بددعا فرمائی، جس کے نتیجے میں وہ اور اس کی سلطنت دونوں کے پرخچے بہت جلد اڑ گئے۔ اس واقعہ کو اس پیشین گوئی سے جس کو برق صاحب نے نقل فرمایا ہے، کوئی تعلق نہیں، برق صاحب نے غلط فہمی سے اس پیشین گوئی کے پس منظر میں اس واقعہ کو پیش کر دیا۔

برق صاحب کا یہ فرمانا کہ ہرقل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح محبت کا اظہار کرتے جس طرح نجاشی کے لئے کیا کرتے تھے، کسی طرح بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ نجاشی مسلم ہو گئے تھے اسلام اور مسلمین کی خدمت کیا کرتے تھے، برخلاف اس کے ہرقل مسلم نہیں ہوا، بلکہ اسلامی فوجوں کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہا، بھلا دونوں بادشاہوں کو ایک پلڑے میں کیسے رکھا جا سکتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوست و دشمن، وفادار و باغی، کفر و ایمان برابر ہیں، اور ان میں کوئی فرق نہیں ایک بادشاہ وفادار، اطاعت گذار، دوسرا نافرمان، باغی، اور دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کا مطالبہ کیا یہ تعجب خیز نہیں؟ قابلِ اعتراض بات تو برق صاحب خود کر بیٹھے، اور غلط فہمی سے صحیح بخاری پر اعتراض کر دیا۔

ایک غلط فہمی برق صاحب کو یہ بھی ہوئی کہ وہ بددعا اور پیشینگوئی کو ایک سمجھ بیٹھے، قیصر کے

حق میں جو الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے، وہ پیشین گوئی تو کہے جا سکتے ہیں، لیکن بد دعاء سے ان کا کوئی تعلق نہیں، لہٰذا برق صاحب کا یہ فرمانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے باادب شخص کے لئے بد دعائیوں کی، صحیح نہیں، آپ نے بد دعا نہیں کی، بلکہ ایک پیشین گوئی فرمائی تھی، اور پیشین گوئی باادب کافر تو کجا، مسلم، وفادار، اطاعت گذار کے لئے بھی کی جا سکتی ہے، جیسا کہ مسلمین کے زوال کے متعلق مختلف پیشین گوئیاں احادیث میں موجود ہیں۔

غلط فہمی "کسریٰ کے متعلق یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، آنحضرت کی رحلت سے صرف دس برس بعد ۶۴۲ء میں جنگ نہاوند نے ساسانی خاندان کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا، کچھ عرصہ بعد آخری کسریٰ (یزدگرد) قتل ہو گیا، اور اس کے بعد آج تک پھر کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوا، چاہیئے تو یہ تھا، کہ قیصر کے متعلق بھی یہ پیش گوئی اسی طرح پوری ہوتی، لیکن اے کاش کہ ایسا نہ ہوا" (دو اسلام ص۱۷۸)

ازالہ کسریٰ کے متعلق اگر یہ پیش گوئی اس طرح پوری ہوئی، کہ خسرو مارا گیا، اور سلطنت ختم ہو گئی، تو یہ صحیح نہیں، خسرو کے بعد بھی کئی بادشاہ ہوئے، اسی طرح ہرقل سوم کے بعد بھی کئی بادشاہ ہوئے، اگرچہ زیادہ ہوئے، پیش گوئی میں یہ نہیں ہے، کہ ایسا کب ہوگا، پیشین گوئی صرف اتنی ہے، کہ جب یہ دونوں سلطنتیں اپنے آخری حکمران کے ساتھ ختم ہو گئیں، تو پھر دوبارہ ان کی حکومتیں قائم نہیں ہوں گی۔

برق صاحب آپ کو یہ تو اعتراف ہے، کہ کسریٰ کے متعلق یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اور حرف بحرف پوری ہوئی، لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ یہ پیشین گوئی بھی پوری نہیں ہوئی، اس لئے کہ آپ نے تو یہ فرمایا تھا کہ کسریٰ (یعنی خسرو پرویز) ہلاک ہو گیا، تو پھر کوئی کسریٰ نہیں ہوگا، لیکن باوجود اس کے کہ خسرو ہلاک ہو گیا، مگر کسریٰ پھر بھی ہوئے، آخر اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ خسرو کی ہلاکت کے بعد اگر ایک کسریٰ بھی بادشاہ ہوتا، تو بھی یہی اعتراض ہوتا کہ پیشین گوئی صحیح نہیں نکلی، لیکن آپ فرماتے ہیں کہ حرف بحرف پوری ہوئی، جو توجیہہ اس کی آپ فرمائیں گے، وہی قیصر کے متعلق بھی سمجھ لیجئے گا۔

کسریٰ خاندان اس لئے جلد ختم ہو گیا، کہ اس کے حق میں اس کی ذلیل حرکت کی وجہ سے بد دعا کی گئی تھی، قیصر خاندان اس لئے دیر میں ختم ہوا، کہ اس نے کوئی ذلیل حرکت نہیں کی، بلکہ بقول آپ کے قاصد رسول کی بڑی تعظیم کی (دو اسلام ص۱۷۷) اسی شریفانہ حرکت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بد دعا نہیں کی،

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۞ (الانبیاء۔۱)	لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا، اور وہ ابھی تک غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے، کہ حساب کا وقت قریب آگیا، لیکن زمانہ شاہد ہے، کہ تقریباً ایک ہزار چار سو سال گذر چکے، وقتِ حساب ابھی تک نہیں آیا، یہ کیسا قرب ہے؟ بات یہ ہے کہ ہم جس کو بعید سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ قریب ہے، اسی طرح ہو سکتا ہے۔ کہ ہم جس مدت کو دراز سمجھ رہے ہوں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ قصیر ہو، اگر ہم لفظوں پر اس طرح اڑ جائیں، تو پھر قرآن مجید کو بھی اعتراض سے بچانا مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (النسآء - ۸۸) کیا تم اس شخص کو راہ راست پر لانے کا ارادہ کر رہے ہو جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا۔

کیا اللہ کا کام گمراہ کرنا بھی ہے؟ کیا بغیر تاویل کے آپ اس آیت کی صفائی کر سکتے ہیں، اس قسم کی ایک دو نہیں سینکڑوں آیات ہیں، جن کی صفائی بغیر تاویل کے ناممکن ہے۔

غلط فہمی "آٹھ سو برس قوموں کی قدرتی عمر ہے، اتنی لمبی زندگی کے بعد اگر کوئی سلسلہ منقطع بھی ہو جائے تو کوئی عقلمند یہ باور نہیں کرے گا، کہ اس کا خاتمہ کسی پیشین گوئی کی وجہ سے ہوا تھا" (ص ۱۷۹)

ازالہ برق صاحب کو یہاں پھر غلط فہمی ہوئی، وہ بددعا اور پیشین گوئی کو ایک سمجھ رہے ہیں، کسی کے خاتمہ کا سبب بددعا کو تو کہا جا سکتا ہے، لیکن پیشین گوئی کو اس خاتمہ کا سبب نہیں کہا جا سکتا۔ پیشین گوئی تو صرف اس بات کا نام ہے، کہ واقعہ کے ظہور سے پہلے اس واقعہ کی خبر دے دی جائے، اگر کسی واقعہ کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہ ہو، تب بھی وہ واقعہ تو ظاہر ہو کر رہتا ہے، اس کے وقوع میں پیش گوئی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

غلط فہمی "اگر حضور نے واقعی یہی فرمایا تھا، کہ قیصر کے بعد کوئی اور قیصر نہیں ہوگا، تو آپ کا اشارہ اس قیصر کی طرف ہوگا، جو اس وقت تخت نشین تھا" (دو اسلام ص ۱۷۹)

ازالہ اسی اصول پر اس پیشین گوئی کو بھی پرکھئے "کہ کسریٰ کے بعد اور کوئی کسریٰ نہیں ہوگا" تو آپ کا اشارہ اس کسریٰ کی طرف ہوگا جو اس وقت تخت نشین تھا، تو پھر ظاہر ہے، کہ خسرو کی ہلاکت کے بعد کوئی اور بادشاہ نہیں ہونا چاہیئے، لیکن ایک نہیں کتنی ہوئے، تو پھر پیشین گوئی کا یہ حصہ بھی حرف بحرف پورا نہیں ہوا، لیکن برق صاحب تسلیم کرتے ہیں، کہ کسریٰ والی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی تو پھر بتایئے کہ قیصر والی پیشین گوئی کو حرف بحرف پورا ہونے میں کیا امر مانع ہے؟ اگر برق صاحب تھوڑی سی تاویل کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں، تو حدیث کے دوسرے معانی بھی ہو سکتے ہیں، اور ان معانی کی صورت میں نہ کسریٰ والی پیشین گوئی میں اشکال وارد ہوگا، نہ قیصر والی پیشین گوئی میں۔

کسریٰ اور قیصر دونوں نکرہ واقع ہوئے ہیں، لہٰذا نہ کسریٰ سے خسرو مراد ہے، نہ قیصر سے ہرقل

سوم کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسریٰ اور قیصر نکرہ ہیں، لہٰذا ان دونوں سے مراد حکومت و سلطنت ہے، اور اس لحاظ سے پیشین گوئی میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ان سلطنتوں کی تباہی کے بعد آج تک کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں پھر دوبارہ قائم نہیں ہوئیں۔

غلط فہمی "اگر کوئی غیر مسلم ہم سے پوچھ بیٹھے، کہ کیا تمہارے نبی (علیہ السلام) کی تمام پیش گوئیاں ایسی ہی ہوا کرتی تھیں، تو ہم اس طنز کا کیا جواب دیں گے، بغیر اس کے اس حدیث میں قیصر والا حصہ بعد کا اضافہ تسلیم کریں" (دو اسلام صہ ۱۸۱)

ازالہ برقؔ صاحب آپ خاطر جمع رکھیئے، غیر مسلم احادیث کی طرف رخ نہیں کرے گا، الا ماشاء اللہ، وہ تو قرآن مجید پر اعتراض کرے گا، آپ قرآن مجید پر سے اعتراض کو دور کرنے کے لئے تیار رہیئے، مثلاً قرآن مجید میں پیشگوئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (البقرۃ: ۶) بے شک جو لوگ کافر ہیں، انہیں آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس پیشین گوئی میں اس بات کی صراحت ہے، کہ کافر ایمان نہیں لائیں گے، لیکن زمانہ اور تاریخ شاہد ہیں، کہ ایک دو نہیں لاکھوں کافروں نے اسلام قبول کیا، ایمان لائے، تو کیا اس شہادت کی موجودگی میں یہ کہا جاسکتا ہے، کہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اگر کوئی غیر مسلم ہم سے پوچھ بیٹھے، کہ کیا تمہارے قرآن میں ایسی پیشین گوئیاں مندرج ہیں، تو ہم اس کا سوائے تاویل کے اور کیا جواب دے سکتے ہیں، رہی حدیث زیر بحث تو اس کا جواب اوپر دیا ہی جا چکا ہے۔

مذکورہ بالا آیت پر اعتراض کرتے ہوئے دیانند لکھتے ہیں۔

"اور جو جھوٹے راستہ پر ہیں، ان کو یہ قرآن راستہ نہیں دکھلا سکتا، پھر کس کام کا رہا"

اور اس سے اگلی آیت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اگر خدا ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہے، اور اس لئے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا بھی قصور نہیں، یہ قصور بھی خدا ہی کا ہے" (ستیھیارتھ پرکاش باب ۱۴ صہ ۶۹۶، صہ ۶۹۷)

اب بتایئے اس قسم کی طنزوں کا سوائے تاویل کے اور کیا جواب ہے، جس طرح یہاں تاویل کی ضرورت ہے، اسی طرح بعض احادیث کی بھی تاویل کرنی پڑتی ہے، سوائے تاویل کے نہ وہاں چارہ ہے نہ یہاں، اور اگر تاویل نہ کریں، تو کیا نعوذ باللہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت انسانی اضافہ ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں تو بس پھر انصاف کی ضرورت ہے۔

غلط فہمی "حضرت سلیمان نے ۱۰۱۱ ق م میں مسجد اقصیٰ کی بنیاد ڈالی تھی، اگر عام تاریخوں پر اعتبار کرتے ہوئے ہم حضرت ابراہیم کی تاریخ وفات اندازاً ... ۲ ق م قرار

دیں' اور مکہ کی تعمیر ۲۰۰۷ کے قریب فرض کریں' تو تعمیر مکہ اور تعمیر بیت المقدس کے درمیان ۱۰۵۹ برس کا زمانہ بنتا ہے ..... لیکن بخاری کی ایک حدیث کے مطابق یہ زمانہ صرف چالیس سال بنتا ہے ..... ہے کوئی محدث جو اس صریح تاریخی غلط بیانی کی کوئی تاویل پیش کر سکے"۔
(دو اسلام صہ ۱۸۳ - ۱۸۴)

ازالہ برق صاحب صحیح بخاری کا تو اعتبار کیا جا سکتا ہے، یہاں ہر چیز با سند ہے' رہی تاریخ تو اس کا اعتبار کیسے ہو سکتا ہے، وہاں الاماشاء اللہ ہر چیز بے سند، من گھڑت، لہٰذا ہم تو یہ کہتے ہیں کہ صحیح بخاری کی مدت صحیح ہونی چاہیئے' اور تاریخ کی غلط، لیکن بات در حقیقت یہ ہے کہ نہ صحیح بخاری کی مدت غلط ہے نہ تاریخ کی، برق صاحب کو غلط فہمی ہوگی' تاریخ میں بنائے ابراہیم علیہ السلام اور بنائے سلیمان علیہ السلام کی درمیانی مدت کا ذکر ہے اور صحیح بخاری میں ان دونوں کی بنائے اولین کی درمیانی مدت کا بیان ہے۔

غلط فہمی اگر حقیقۃً مسجد اقصیٰ ایک مرتبہ پہلے بن چکی تھی تو تاریخی ثبوت لایئے، کوئی کتاب سند یا روایت پیش کیجئے۔ (دو اسلام صہ ۱۸۴)

ازالہ تاریخی ثبوت کی ہمیں کیا ضرورت؟ تاریخ کا کیا اعتبار؟ کتاب جو پیش کی جا رہی ہے، وہ صحیح بخاری ہے، سند جو پیش کی جا رہی ہے' وہ ٹھوس و مستند ہے، کتاب بھی اصح الکتب بعد القرآن' مقبول انام، اور سند بھی ٹکسالی، بھلا اس کو تقویت دینے کے لئے کسی تاریخ کے ضعیف' غیر مستند حوالہ کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں تاریخی واقعہ کے لئے صحیح بخاری سے تائیداً کوئی روایت پیش کیجئے، لیکن اس کا عکس بالکل نامناسب اور لایعنی ہے۔

حدیث زیر بحث اور تاریخ

ہمیں ضرورت تو نہیں، کہ صحیح بخاری کی تائید میں کوئی کتاب یا روایت پیش کریں، لیکن برق صاحب کی خاطر یہ مطالبہ بھی پورا کئے دیتے ہیں، امام قرطبی فرماتے ہیں۔

قَدْ رُوِیَ اَنَّ اَوَّلَ مَنْ بَنَی الْبَیْتَ اٰدَمُ — بے شک روایت کیا گیا ہے، کہ کعبہ کو سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔
(حاشیہ نسائی مرتبہ اشفاق الرحمان صاحب مطبوعہ مکتبہ رحیمیہ دہلی صہ ۵۸)

عطاء، سعید بن مسیب، عمرو بن دینار اور معمر کہتے ہیں کہ کعبہ کو سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ (مصنف عبدالرزاق جلد ۵ صہ ۹۱ تا ۹۴)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

ذَکَرَ ابْنُ هِشَامٍ فِیْ کِتَابِ التِّیْجَانِ — ابن ہشام نے کتاب التیجان میں لکھا ہے کہ

إِنَّ آدَمَ لَمَّا بَنَى الْكَعْبَةَ أَمَرَهُ اللهُ تَعَالَى بِالسَّيْرِ إِلَى بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَأَنْ يَبْنِيَهُ فَبَنَاهُ وَنَسَكَ فِيهِ (فتح الباری کتاب بدء الخلق جز۷ صـ ۲۱۹)

جب آدم علیہ السلام کعبہ تعمیر کر چکے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیت المقدس کی طرف جانے کا حکم دیا، اور اس کو بنانے کا حکم دیا، پس آدم علیہ السلام نے اس کو بنایا، اور اس میں عبادت کی،

لہٰذا حدیث زیر بحث میں جن عمارتوں کا ذکر ہے، وہ آدم علیہ السلام کی تعمیر کردہ عمارتیں ہیں، نہ کہ ابراہیمی اور سلیمانی عمارتیں، لیجئے اب تو تاریخ سے بھی حدیث کی تائید ہوگئی، برق صاحب ذرا تحقیق سے کام لیتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی، اس کی مزید تائید کے لئے مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا مَرَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَادِي عُسْفَانَ حِينَ حَجَّ قَالَ يَا أَبَا بَكْرٍ أَيُّ وَادٍ هٰذَا قَالَ وَادِي عُسْفَانَ قَالَ لَقَدْ مَرَّ بِهِ هُودٌ وَصَالِحٌ عَلَى بَكَرَاتٍ حُمْرٍ خُطُمُهَا اللِّيفُ أُزُرُهُمُ الْعَبَاءُ وَأَرْدِيَتُهُمُ النِّمَارُ يُلَبُّونَ يَحُجُّونَ الْبَيْتَ الْعَتِيقَ (مسند امام احمد وسندہ حسن فتح ربانی جز ۲۰ صـ ۴۲)

یعنی حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کرتے وقت وادی عسفان سے گذرے، تو آپ نے دریافت فرمایا، اے ابوبکر یہ کون سی وادی ہے، انھوں نے عرض کیا یہ وادی عسفان ہے، آپ نے فرمایا یہاں سے ہود اور صالح بھی سرخ اونٹنیوں پر گذرے ہیں، ان کے ازار عبا تھیں اور ان کی چادریں نمروں کی تھیں وہ لبیک کہتے تھے اور اس بیت عتیق (یعنی کعبہ) کا حج کرتے تھے۔

کیونکہ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہے لہٰذا کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی موجود تھا۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

بَعَثَ اللهُ جِبْرِيلَ إِلَى آدَمَ فَأَمَرَهُ بِبِنَاءِ الْبَيْتِ فَبَنَاهُ آدَمُ

رواہ البیہقی فی الدلائل وسکت علیہ الحافظ فی فتح الباری کتاب بدء الخلق جز۷ صـ ۲۱۱)

اللہ نے جبریل کو آدم کے پاس بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کو بنائیں، پس آدم نے اس کو بنایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔

(۳) لَمَّا كَانَ زَمَنُ الطُّوفَانِ رُفِعَ الْبَيْتُ (تفسیر ابن ابی حاتم سکت علیہ الحافظ

جب طوفان (نوح علیہ السلام) کا زمانہ آیا تو کعبہ کو اٹھا لیا گیا۔

حدیث زیر بحث اور صحیح بخاری

صحیح بخاری کی حدیثِ مذکورہ مع اپنے سیاق و سباق کے خود اس کی تشریح کے لئے کافی ہے۔ حضرت ابوذرؓ کا سوال ملاحظہ فرمایئے۔ وہ پوچھتے ہیں :-

اَیُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِی الْاَرْضِ اَوَّلُ	روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی
صحیح بخاری کتاب بدء الخلق	مسجد بنائی گئی ۔

کیا اس سوال کے بعد بھی کہا جاسکتا ہے کہ سوال سے مراد بنائے ابراہیمی ہے، کیا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے مساجد نہیں تھیں، ضرور تھیں، لہٰذا سوال اپنی جگہ پر واضح ہے، کہ انسانی آبادی کے بعد جو مسجد سب سے پہلے بنائی گئی وہ کون سی تھی، اور یہ وہی مسجد ہوسکتی ہے جس کو آدم علیہ السلام نے بنایا ہو، لہٰذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے۔

حدیث زیر بحث اور قرآن مجید

برق صاحب تو حدیث کی تائید میں تاریخی حوالہ کا مطالبہ کرتے ہیں ہم حدیث کی تائید میں قرآن مجید کی آیات پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝	سب سے پہلا گھر جو انسانوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور عالمین کے لئے ہدایت۔
(آل عمران:- ۹۶)	

اگر اس سے مراد بنائے ابراہیمی ہے، تو جو اعتراض حدیث پر تھا، وہی قرآن پر ہوگا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے سینکڑوں پیغمبر دنیا میں تشریف لائے، کیا کسی نے مسجد نہیں بنائی؟ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے مسجد بنائی، یہ بات بالکل قرین قیاس نہیں، برق صاحب بات دراصل یہ ہے کہ آپ تو خیر صحیح حدیث کو مانتے تو ہیں، کہیں کہیں آپ کو غلط فہمی ہو جاتی ہے، بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو قطعاً حدیث کو نہیں مانتے، حدیث پر لغو قسم کے اعتراض کرتے رہتے ہیں، معلوم نہیں کس وجہ سے وہ اس قسم کا اعتراض قرآن مجید پر نہیں کرتے، اور پھر اس کی صحت کا انکار نہیں کرتے، غالباً اس کی وجہ یہی ہو گی کہ وہ اپنے گمان میں یہ سمجھتے ہیں کہ پھر ہمیں مسلم کون کہے گا، حدیث کی مخالفت اور قرآن مجید کی موافقت سے بہرحال نادان لوگ ہمیں مسلم تو سمجھ لیتے ہیں، اور ہماری بات سن لیتے ہیں، اور مان لیتے ہیں، اگر قرآن مجید کا انکار کریں، یا اس پر اعتراض کریں، تو کوئی کچھ سنے گا ہی نہیں حالانکہ وہ غلط فہمی میں

مبتلا ہیں، وہ مسلم رہ کر بھی قرآن مجید کا انکار کر سکتے ہیں، وہ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں، قیامت پر، فرشتوں پر، کتب سماوی پر اور رسولوں پر ہمارا ایمان ہے، لیکن یہ قرآن وہ قرآن نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا، اس میں تحریف ہو چکی ہے، اور مسلمانوں کا ایک جم غفیر اس تحریف پر ایمان رکھتا ہے، اور خود قرآن مجید کی عبارت بھی اس کی شاہد ہے، وہ یہ کہ از روئے قرآن مجید روئے زمین پر سب سے پہلی مسجد بنائے ابراہیمی ہے، یہ ایک تاریخی غلطی ہے جو کسی دشمن اسلام نے پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے قرآن مجید میں داخل کر دی ہے، وغیرہ وغیرہ" کاش یہ لوگ حدیث کا انکار کرنے سے پہلے قرآن مجید پر بھی نظر ڈال لیتے۔

حدیث زیر بحث کی تائید میں ایک اور قرآنی شہادت

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٥ (البقرة:- ۱۲۷)	اور وہ وقت یاد کرو جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کعبہ کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے، اور وہ دعا کر رہے تھے کہ ہمارے رب اس خدمت کو ہم سے قبول فرما بیشک تو سمیع و علیم ہے۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، اوّل :۔ بنیادیں پہلے سے موجود تھیں، جن کو اٹھایا جا رہا تھا، یعنی کعبہ پہلے بھی تعمیر ہو چکا تھا، جس کی بنیادیں باقی رہ گئی تھیں، حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں۔

وَفِيْ هٰذَا السِّيَاقِ مَا يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ قَوَاعِدَ الْبَيْتِ كَانَتْ مَبْنِيَّةً قَبْلَ اِبْرَاهِيْمَ (تفسیر ابن کثیر ج اول ص ۱۷۹)	اس سیاق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ کی بنیادیں تعمیر ابراہیم علیہ السلام سے پہلے موجود تھیں۔

دوم :کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی شریک تھے، دوسری آیت میں ارشاد باری ہے۔

رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (ابراھیم:- ۳۷)	(ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں) اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو اس بنجر وادی میں تیرے باحرمت گھر کے پاس آباد کر دیا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ اسمٰعیل علیہ السلام کے آباد کرنے سے پہلے وہاں کوئی باحرمت مسجد موجود تھی، جس کا قرب حاصل کرنے کے لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو وہاں آباد کیا گیا، آباد کرنے کا واقعہ اسمٰعیل علیہ السلام کی شیرخوارگی کے زمانہ میں واقع ہوا تھا، ظاہر ہے کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کردہ کعبہ کی عمارت وہاں موجود نہ تھی، کیونکہ وہ تو بعد میں بنی، اور اسمٰعیل علیہ السلام کی جوانی کے زمانہ

الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ (بنی اسرائیل:۔ ۱)	کعبہ سے بیت المقدس، وہ بیت المقدس جس کے آس پاس کے علاقے کو ہم نے بابرکت بنایا ہے۔

غرض یہ کہ بیت المقدس اور اس کے آس پاس کا علاقہ مقدس و بابرکت تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کہ جوتیاں اتار دو، دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ۝ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ (الاعراف:۔ ۱۳۶، ۱۳۷)	پھر ہم نے قوم فرعون سے انتقام لیا، اور ان کو دریا میں غرق کر دیا، اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، اور اس سے غفلت برتی تھی پھر ہم نے اُس قوم کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا، جہاں کہ ہم نے برکت رکھی تھی، اور (اس طرح) بنی اسرائیل پر آپ کے رب کی نعمت پوری ہو گئی۔

اس آیت میں بھی شام و فلسطین کی برکت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ہجرت کر کے وہیں چلے گئے تھے، اور یہ برکت اس سرزمین میں موسیٰ علیہ السلام سے قبل ایک زمانہ سے چلی آرہی تھی۔

ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے۔

يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ (المائدة:۔ ۲۱)	(حضرت موسیٰ نے فرمایا) اے قوم اس ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ، یہ اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا اس سرزمین کو مقدس فرمانا، اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب وہ زمین پہلے سے مقدس چلی آرہی ہو، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک وہاں کوئی بیت المقدس نہ ہو محض زمین مقدس نہیں ہو سکتی۔ پس ثابت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے صدیوں پہلے اس سرزمین میں بیت المقدس تعمیر ہو چکا تھا، قرآن مجید سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بیت المقدس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا، ہاں یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے بیت المقدس کو تعمیر کیا گیا تھا، اور اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کو بنایا تھا، تو یہ بنائے ثانیہ ہو گی، نہ کہ بنائے اولین، اس لئے کہ بنائے اولین تو موسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے بن چکی تھی۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث زیر بحث میں کعبہ اور بیت المقدس کی اولین تعمیروں کا ذکر ہے، جو ابراہیم علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے بنائی گئی تھیں، اور ان دونوں تعمیروں کی درمیانی مدت چالیس سال تھی، کاش برق صاحب قرآن مجید کا غور سے مطالعہ فرماتے تو ان دونوں عمارتوں کی بنائے اولین کا ثبوت انہیں قرآن مجید ہی میں مل جاتا، اور یہ غلط فہمی نہ ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ حدیث فہمی میں غلطی ہوتی

ہی اس وقت ہے جب کہ اس ضمن میں قرآن مجید سے پوری طرح واقفیت نہیں ہوتی۔

غلط فہمی "اگر ہم یہ کہہ دیں، ممکن ہے، کہ امر یکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا" تو کیا آپ مان لیں گے"۔ (دو اسلام صہ ۱۸۴)

ازالہ یہ بات اگر آپ اپنی طرف سے کہیں گے، تو ہم نہیں مانیں گے، اگر آپ آیت یا حدیث پیش کریں گے تو ہم ضرور مان لیں گے، آیت اور حدیث کا تعلق ایمان سے ہے، ہمارا ایمان ہے، کہ آیت یا حدیث کی خبر غلط نہیں ہو سکتی، اس کا صحیح ہونا یقینی ہے، لہٰذا یقینی چیز کو تاریخی خرافات کے بل بوتے پر ہم ہرگز نہیں چھوڑ سکتے، مثلاً ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید کے مطابق سب سے پہلی مسجد کعبہ ہے، لیکن کعبہ تاریخی روایات کی بنا پر اور خود قرآن مجید کی تصریح کی بنا پر ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے، لہٰذا اس کے سب سے پہلی مسجد مان لینے سے یہ اشکال پیدا ہوگا کہ گویا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کوئی مسجد بنی ہی نہیں اور یہ ناممکن ہے، لہٰذا اس اشکال کو دور کرنے کے لئے ہم یہی کہیں گے کہ ممکن ہے کہ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے اس کو بنایا ہو، اور ابراہیم علیہ السلام نے صرف تجدید کی ہو، لیکن اس اشکال کی وجہ سے ہم کبھی یہ نہ کہیں گے کہ یہ آیت ہی محل نظر ہے، ممکن ہے انسانی اضافہ ہو، برق صاحب کا یہ کہنا کہ "ممکن ہے ایسا ہوا ہو"۔ یا "تاویل کرنا" اسی لئے ضروری ہوتا ہے کہ یقینی چیز پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

غلط فہمی سیرت کی تمام کتابیں اس حقیقت میں متفق ہیں کہ حضور علیہ السلام کی عمر تریسٹھ برس تھی، حضرت عائشہؓ کی روایت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔

عن عائشۃ ان النبی صلعم توفی وھو ابن ثلاث وستین — کہ نبی کریم صلعم نے تریسٹھ سال کی عمر میں رحلت کی (بخاری جلد ۲ صہ ۱۷۵)

لیکن حضور کے خادم خاص حضرت انس جو ۱۲۶۸، احادیث کے راوی بھی ہیں، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی عمر ساٹھ برس تھی ...... (دو اسلام صہ ۱۸۵)

"بے شمار کتب سیرت کی شہادت اور ابن عباسؓ و عائشہؓ کی روایت کی روشنی میں حضرت انسؓ کی روایت قطعاً غلط ہے۔ حیرت ہے کہ امام بخاری نے اس غلط روایت کو اپنی "صحیح" میں کیوں جگہ دی اور زیادہ حیرت اس امر پر کہ جس انس کو اپنے آقا، رہبر اور پیغمبر کی عمر تک معلوم نہیں تھی اس کی باقی ۸۳ روایات کو امام بخاری نے کیسے صحیح سمجھ لیا"۔ (دو اسلام صہ ۱۸۶)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، حضرت انسؓ نے دہائیوں کا ذکر کیا ہے، اور تین سال کی مدت کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، یہ نہیں کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر معلوم نہیں تھی، معلوم تھی اور ضرور معلوم تھی، حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔

قُبِضَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ برس

میں بنائی گئی وہ بھی اس تعمیر میں شریک تھے، اگر آباد کرنے کا واقعہ بعد کا واقعہ ہے، تب تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کرنے کے بعد اس باحرمت گھر کی قربت و برکت حاصل کرنے کے لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو وہاں آباد کیا، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ آباد پہلے کیا گیا اور کعبہ بعد میں بنایا گیا آباد اس لئے کیا گیا کہ وہاں اللہ تعالیٰ کا باحرمت گھر تھا، ورنہ اس بے آب وگیاہ ریگستان میں آباد کرنے کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا، کسی دوسری اچھی جگہ بھی آباد کیا جا سکتا تھا، اور وہاں مسجد تعمیر ہو سکتی تھی، لہٰذا ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے ہو چکی تھی، مرور ایام سے یا طوفان نوح علیہ السلام میں اس کی عمارت منہدم ہو گئی تھی، صرف بنیاد باقی رہ گئی تھی، اور اسی بنیاد پر ابراہیم علیہ السلام نے از سر نو کعبہ کی تعمیر کی تھی، اس کی مزید تائید میں قرآن مجید کی یہ آیت ملاحظہ فرمایئے اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیتا ہے۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (الحج:۔ ۲۷) — اور حج کرنے کے لئے لوگوں میں اعلان کر دو۔

پھر فرمایا:۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ٥ (الحج:۔ ۲۹) — (اے ابراہیم، جب لوگ حج کرنے آئیں اور قربانی کر چکیں تو) پھر وہ نہائیں دھوئیں، اپنی نذریں پوری کریں اور اس بیت قدیم کا طواف کریں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حج کا حکم دیا، تو اس کعبہ کو بیت قدیم کہا تھا، اگر یہ ابراہیم علیہ السلام ہی نے بنایا ہوتا، تو بیتِ جدید کہنا چاہیئے تھا، بیت قدیم کہنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ گھر بہت پرانا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے صدیوں پہلے بنایا گیا تھا۔

اب بیت المقدس کے متعلق قرآن مجید کا فیصلہ سنیئے، جب آگ کی تلاش میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچے، تو آواز آئی۔

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ٥ (طٰہٰ:۔ ۱۲) — اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں تم اپنی جوتیاں اتار دو، تم مقدس میدان میں ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ طور پہاڑ اور اس کا میدانی علاقہ پہلے سے مقدس تھا، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب وہاں پہلے سے کوئی بیت المقدس چلا آ رہا ہو، جس کی وجہ سے آس پاس کا علاقہ بھی محترم قرار دے دیا گیا ہو، پس اس آیت سے ظاہر ہوا کہ سلیمان علیہ السلام تو کجا موسیٰ علیہ السلام سے بھی بہت پہلے یہاں کوئی بیتِ مقدس موجود تھا، جس کی وجہ سے تمام قرب وجوار کا علاقہ بابرکت و باحرمت تھا، اسی برکت اور حرمت کا ذکر قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بھی موجود ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ — پاک ہے وہ جو لے گیا راتوں رات اپنے بندے کو

وَھوابن ثلاثٍ وستین (صحیح مسلم)   کی عمر میں ہوئی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ کو اصلی عمر بھی معلوم تھی، اور کبھی اکائیوں کو حذف بھی کر دیا کرتے تھے اور صرف دہائیوں کا ذکر کر دیتے تھے، لہٰذا صرف دہائیوں کی روایت بھی بالکل صحیح ہے اور اسی وجہ سے امام بخاریؒ نے اس کو اپنی صحیح میں شامل کر لیا، حضرت انسؓ سے شمائل نبوی کے ضمن میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا حلیہ اور اخلاق ہمارے سامنے آجاتا ہے، برق صاحب کی وارد کردہ مذکورہ بالا روایت ہی میں حضرت انسؓ کے یہ الفاظ بھی ہیں۔

وَلَیْسَ فِیْ رَاْسِہٖ وَلِحْیَتِہٖ عِشْرُوْنَ شَعْرَۃً بَیْضَآءَ	وفات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈاڑھی اور سر میں بیس بال بھی سفید نہیں تھے۔

غرض حضرت انسؓ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا، حتیٰ کہ سفید بالوں کی تعداد کے متعلق بھی معلومات فراہم کر دیں۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا، کہ یہ بال کہاں کہاں تھے۔ (صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاَرْسَلْنٰہُ اِلٰی مِائَۃِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ۝ (الصافات: ۱۴۷)	اور ہم نے یونس کو رسول بنا کر بھیجا، ایک لاکھ آدمیوں کی طرف یا اس سے کچھ زیادہ کی طرف۔

کیا اس آیت سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صحیح تعداد معلوم نہ تھی، پہلے ایک لاکھ کہا پھر فرمایا "یا کچھ زیادہ ہوں گے" کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ بھی خوب ہے جس کو صحیح تعداد بھی معلوم نہ تھی، پھر کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر بات کا علم ہے، اس کو تعداد کے متعلق شک ہونا ناممکن ہے لہٰذا یہ آیت ہی محل نظر ہے؟ کسی دشمنِ اسلام یہودی کا کارنامہ ہے؟ نعوذ باللہ من ذلک، اللہ تعالیٰ کا یہ ایک طرزِ بیان ہے، اس میں شک کی گنجائش نہیں، اسی طرح حضرت انسؓ کا ایک طرزِ بیان ہے (یعنی اکائیوں کا حذف) اور شک کی اس میں گنجائش نہیں۔

غلط فہمی عطاء بن یسار کہتے ہیں، کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا، کہ کیا تورات میں حضور کے متعلق کوئی آیت موجود ہے، کہا کیوں نہیں، آپ کے متعلق یہ آیت تورات میں موجود ہے۔

یا ایّھا النبی انا ارسلنٰک شاھدا و مبشرا و نذیرا و حرزا للامیین انت عبدی و رسولی سمیتک المتوکل لیس بفظ و لا غلیظ	اے رسول ہم نے تمہیں شاہد، بشیر، نذیر، اور ان پڑھ عربوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے، تو میرا بندہ اور رسول ہے ...... تو نہ ترش مزاج ہے اور نہ تند طبع الخ

تورات کو "الف" سے "یا" تک پڑھ جاؤ، یہ الفاظ کہیں نہیں ملیں گے۔ (دو اسلام ص ۱۸۶-۱۸۷)

ازالہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

وَاللّٰہِ اِنَّہٗ لَمَوْصُوْفٌ فِی التَّوْرَاۃِ بِبَعْضِ صِفَتِہٖ فِی الْقُرْاٰنِ۔
(صحیح بخاری کتاب البیوع)

اللہ کی قسم آپ کی بعض صفتیں جو قرآن مجید میں ہیں، تورات میں بھی ہیں۔

اس کے آگے وہ الفاظ ہیں جو برق صاحب نے تحریر کئے ہیں یہ حدیث صرف عبداللہ بن عمرو رضی سے مروی نہیں ہے۔ بلکہ توریت کے مشہور عالم حضرت عبداللہ بن سلام رضی سے بھی مروی ہے (دارمی ص۵) توریت کے دوسرے مشہور عالم کعب احبار بھی یہ صفات بیان کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زائد (دارمی ص۲)
حضرت انس رضی سے مروی ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا جب وہ بیمار ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کو گئے، اس لڑکے کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا اور تورات پڑھ رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قسم دے کر پوچھا کہ کیا میری صفت تورات میں ہے؟ اس نے کہا نہیں لڑکے نے بستر مرگ پر کہا بے شک آپ کی صفت تورات میں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ مشکوٰۃ باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم:۔

اسی طرح ایک روایت حضرت علی رضی سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک یہودی کے مقروض تھے۔ اس نے آپ کے ساتھ کچھ زیادتی بھی کی اور بعد میں مسلم ہو گیا، پھر کہا

وَاللّٰہِ مَا فَعَلْتُ بِکَ الَّذِیْ فَعَلْتُ بِکَ اِلَّا لِاَنْظُرَ اِلٰی نَعْتِکَ فِی التَّوْرَاۃِ۔

میں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس لئے کیا کہ میں آپ کی صفات کو جو تورات میں ہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

پھر اس شخص نے بھی آپ کی صفات میں تورات کے وہی الفاظ نقل کئے جو برق صاحب کی نقل کردہ حدیث میں ہیں (رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ، مشکوٰۃ باب فی اخلاقہ)
الغرض توریت میں آپ کی توصیف ہونا یہ ایک مسلمہ امر ہے جو تواتر ثابت ہے لیکن برق صاحب کو اس سے انکار ہے۔ برق صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو توصیف توریت میں ہے اس کا ذکر تو قرآن مجید میں بھی ہے تو کیا قرآن مجید کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ
(الاعراف: ۱۵۷)

جو لوگ رسول، نبی، امی کی پیروی کرتے ہیں جس کے اوصاف کا ذکر تورات اور انجیل میں وہ لکھا ہوا پاتے ہیں

دوسری جگہ قرآنِ مجید میں ارشاد باری ہے :۔

یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرۃ :۔ ۱۴۶) — اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسطرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو۔

تیسری جگہ ارشاد ہے :۔

مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (الفتح : ۲۹) — صحابہ کی یہ صفات تورات و انجیل میں بھی موجود ہیں۔

لیجئے اب تو قرآن سے ثابت ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات تورات میں موجود ہیں۔ اب کیا قرآن مجید کی آیات بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ موجودہ تورات میں آپ کی کوئی صفت موجود نہیں۔

غلط فہمی

"ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ اجی صاحب ! تورات میں تو اس قدر تحریف ہو چکی ہے کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی یہ آیت ملے تو کہاں سے ؟

اس کے دو جواب ہیں اول اگر تحریف ہو چکی تھی تو ابن عمر نے وہ آیت کہاں سے دیکھ لی تھی،، (دو اسلام ص۱۸۷)

ازالہ

بے شک ہم بھی کہتے ہیں کہ تورات محرّف ہو چکی ہے لہٰذا یہ عبارت اس میں نہیں، اب سوال یہ ہے کہ پھر عبد اللہ بن عمروؓ کو کہاں سے معلوم ہوا۔ اس کے دو جواب ہیں :۔

اوّل :۔ یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے اس لئے کہ عبد اللہ بن عمروؓ اس قسم کی خبر خود نہیں دے سکتے۔ بلکہ انہوں نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو گی اور پھر اس کو بیان کیا ہو گا۔ یہ حدیث اخبار غیب میں سے ہے اور اس کی تصدیق ایمان بالرسول کا نتیجہ ہے اس کی تکذیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ اور ایمان بالرسول کا تقاضا یہ ہے کہ اس حدیث کی روشنی میں موجودہ تورات کو محرّف سمجھا جائے۔

دوم :۔ اناجیل کے اس وقت چار متداول نسخے ہیں جو عیسائی دنیا میں مستند مانے جاتے ہیں حالانکہ حقیقتاً انجیل کے یہی چار نسخے نہیں اور بھی نسخے ہیں، ان میں سے بعض نسخے اب بھی مل جاتے ہیں جو کہیں کہیں کسی کتب خانے میں دبے پڑے ہیں، ان میں سے ایک نسخہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فارقلیط والی پیشین گوئی موجود ہے لیکن ان چار مشہور نسخوں میں سے یہ پیشین گوئی خارج کر دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تورات کے بھی ایک سے زیادہ نسخے عہدِ رسالت میں پائے جاتے ہوں اور کسی غیر مشہور نایاب نسخہ میں حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے یہ صفات دیکھ لئے ہوں۔

سوم :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں توریت کے جو نسخے پائے جاتے تھے ان میں آپ کی

یہ صفات یقیناً موجود تھیں جب ہی تو حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار وغیرہ لوگوں نے ان صفات کو بیان کیا اور قرآن مجید نے بھی ان صفات کا ذکر کیا۔

عجیب وغریب

برق صاحب نے تاریخی حوالے اور مسیحی مصنفین کی تصریحات کا تذکرہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تورات میں تحریف ہوئی لیکن ان تمام تاریخی مندرجات اور محققین کے فیصلوں کو صحیح تسلیم نہیں کیا بلکہ قرآن مجید کی روشنی میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تورات میں تحریف نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ اب بھی ویسی ہی موجود ہے جیسے نازل ہوئی تھی۔ ہم بھی برق صاحب کی خاطر اسے تسلیم کئے لیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی ہی کتاب کے صفحہ ۳۴۷ پر لکھتے ہیں کہ "ہر وہ حدیث بلا دریغ ٹھکرا دی جائے جو مسلّمہ تاریخی واقعات کی تردید کرتی ہو" (دو اسلام) تو اب ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ تحریف تو مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے۔ لہٰذا جس آیت سے تحریف کی تردید ہوتی ہو وہ قابلِ ردّ ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر مسلّمہ تاریخی واقعہ کے خلاف آیت صحیح ہو سکتی ہے تو حدیث کیوں نہیں ہو سکتی یا پھر یہ کہیے کہ یہ معیار ہی غلط ہے اس لئے کہ اس معیار پر تو قرآن مجید بھی پورا نہیں اترتا۔ تفصیل کے لئے آخری باب ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی آخر یہودیوں میں بھی ایسے ہزارہا اشخاص موجود ہوں گے جنہیں اپنی کتاب سے اسی طرح محبت ہوگی جس طرح ہمیں قرآن مجید سے۔ (دو اسلام ص۱۸۴)

ازالہ جی ہاں! انہیں ایسی ہی محبت ہوگی جیسی ایک عظیم نام نہاد مسلم فرقہ کو قرآن مجید سے ہے جو قرآن مجید کو محرف خیال کرتا ہے یا جس طرح ہمارے پیٹ پرست علماء کو معنوی تحریف کے باوجود قرآن مجید سے محبت ہے۔

غلط فہمی دوم، حضرت مسیح نے اعلان کیا تھا "جب تک زمین و آسمان نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا شوشہ تورات سے ہرگز نہیں ٹلے گا" اگر تورات محرف ہو چکی تھی تو حضرت مسیح اتنے زور سے یہ اعلان کیوں کرتے (دو اسلام ص۱۸۵)

ازالہ برق صاحب گویا آپ کے نزدیک موجودہ اناجیل میں جو کچھ ہے سب صحیح ہے، حالانکہ یہ اناجیل تحریف شدہ بلکہ وضع کردہ کتابیں ہیں ان کے مضامین میں تناقض و تضاد ہے قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری سابق جج ریاست پٹیالہ تحریر فرماتے ہیں۔

"ان میں اتنا تناقض موجود ہے کہ تطبیق دینا سخت دشوار ہے، آدم کلارک، نورٹن اور ہارن صاحب انجیل کے مشہور شارح ہیں، تینوں کا متفقہ قول ہے کہ تطبیق کی کوئی صورت

موجود نہیں، پادری فرنچ کو اقرار ہے کہ ان انجیلوں کی چار یا پانچ آیتوں میں تحریف بھی ہوئی ہے، نیز وہ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ ان میں چھوٹی موٹی تیس ہزار غلطیاں موجود ہیں (رحمۃ للعالمین جلد ۳ ص ۳۱۶ - ۳۱۷)

برق صاحب آپ نے انجیل کی اصل نازل شدہ عبارت نقل نہیں کی بلکہ صرف ترجمہ کا ترجمہ نقل فرمایا ہے لہذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ نقطہ یا شوشہ سے کیا مراد ہے اگر اس سے رسم الخط مراد ہے تو برق صاحب وہ تو معدوم اور ناپید ہے جس زبان میں تورات نازل ہوئی اس زبان میں تورات کہیں نہیں اور اگر اس سے احکام مراد ہیں تو یہ بھی ٹل گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے احکام کو بدل دیا۔ قرآن مجید میں ہے:۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ	عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، میں تورات کی تصدیق
وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ	کرتا ہوں اور میں اس لئے آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو تم
عَلَيْكُمْ ۔ (آل عمران: ۵۰)	پر حرام کی گئی ہیں ان کو حلال کر دوں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے احکام کو بدل دیا تھا۔ ورنہ توریت کی موجودگی میں انجیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لہذا توریت کا شوشہ تک نہ بدلنا مہمل ہے۔ یا پھر نزول انجیل لغو عبث فعل ہے۔ الغرض یہ قول جو برق صاحب نے نقل کیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف غلط منسوب ہے۔

غلط فہمی "حضرت مسیح کے عہد تک توریت اپنی اصلی حالت میں باقی تھی اور بخت نصر وغیرہ کی حکایات فرضی ہیں،" (دو اسلام ص ۱۸۹)

ازالہ گویا موجودہ انجیل صحیح ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذکورہ بالا قول نقل کیا گیا ہے اور بخت نصر کا حملہ جو ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے غلط ہے۔ اگر یہ معیار صحیح ہے تو ہمیں بھی کہنے دیجئے۔ کہ جو حدیث صحیح ہے وہ صحیح ہے اور جو تاریخی واقعات اس کے خلاف ہیں وہ فرضی ہیں۔ برق صاحب آپ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ کی صرف اس لئے تکذیب کر رہے ہیں کہ وہ آپ کے اس مفروضہ کے خلاف ہے۔ کہ "اناجیل اپنی اصلی حالت میں باقی ہیں"، حالانکہ اناجیل اربعہ میں تناقض اور تضاد خود اس بات کی اندرونی شہادت ہے کہ موجودہ اناجیل سب جعلی ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی جعلی ہے۔

غلط فہمی "سورۂ بقر کی ابتدائی آیات میں ہمیں سالقہ آسمانی صحائف پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اگر وہ کتابیں محرف ہو چکی تھیں اور غلط سلط تھیں۔ تو ان پر ایمان لانے کا مقصد ؟" (ص ۱۸۹)

ازالہ

برق صاحب! کتب سابقہ پر ایمان لانے کا حکم اب بھی باقی ہے یا اب نہیں ہے صرف عہد رسالت تک تھا؟ اگر اب ایمان لانے کا حکم نہیں ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ آیتیں منسوخ ہیں۔ اگر یہ حکم صرف عہد رسالت میں تھا تو کیا اس زمانہ میں تمام کتب سماویہ غیر محرف طور پر موجود تھیں؟ اگر تھیں تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام انہیں پڑھا کرتے تھے۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو براہ کرم اس کا ثبوت دیجئے۔

اگر یہ کتب سماویہ عہد رسالت میں تھیں اور بعد میں ضائع ہو گئیں تو کیا قرآن مجید کی طرح ان کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا تھا؟ ان کتب سماویہ سے تو احادیث ہی اچھی رہیں، کہ ان کی حفاظت بہ تمام وکمال ہوئی۔ اگر ان کتب سماویہ پر ایمان لانا اب بھی فرض ہے تو کیا یہ کتب سماویہ اب غیر محرف موجود ہیں؟ کیا کتاب نوح علیہ السلام، کتاب ہود علیہ السلام، کتاب صالح علیہ السلام کہیں موجود ہیں؟ کیا صحف ابراہیم علیہ السلام، صحف لوط علیہ السلام، وصحف یوسف علیہ السلام کہیں سے دستیاب ہو سکتے ہیں؟ اگر ہو سکتے ہیں تو براہ کرم ان کا پتہ بتایئے اور اگر کہیں نہیں، ضائع ہو گئے تو پھر ان پر ایمان لانے کا مقصد بتایئے۔ جو مقصد آپ کے ذہن میں آجائے اسی کو اپنے سوال کا جواب سمجھ لیجئے وہی تورات وانجیل پر ایمان لانے کا مقصد ہوگا۔

غلط فہمی

"کیا خدا کو علم نہیں تھا کہ توریت میں تصرف ہو چکا ہے اگر علم تھا تو تصدیق کیوں کی۔ کیا کوئی مجسٹریٹ کسی جعلی دستاویز کی دیدہ دانستہ تصدیق کر سکتا ہے۔" (دو اسلام صفحہ ۱۹۰)

ازالہ

اللہ تعالیٰ نے موجودہ تورات کی تصدیق کہیں نہیں کی۔ جو آیات آپ نے نقل کی ہیں۔ ان کا جواب آگے آرہا ہے۔

غلط فہمی

آپ کہیں گے کہ اللہ نے اصلی تورات کی تصدیق کی تھی نہ کہ صحیفہ رائجہ کی بہت اچھا، تو پھر قرآن نے یہ کیوں کہدیا۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ

اے رسول اہل کتاب سے کہہ دو کہ جب تک وہ تورات وانجیل پر عمل نہیں کریں گے ان کی بگڑی کبھی نہ بن سکے گی۔

❖ ❖ ❖

اگر یہ کتابیں انسانی دست برد سے ناپاک ہو چکی تھیں تو اہل کتاب کو ان پر عمل کرنے کی دعوت کیوں دی؟؟ (دو اسلام صفحہ ۱۹۰)

ازالہ

اصلی تورات اور اصلی انجیل پر عمل کرنے کی دعوت بے شک دی گئی ہے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ موجودہ تورات وانجیل پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر

برق صاحب نے پوری آیت بھی نقل نہیں فرمائی جو اس تمہید کی غرض وغایت ہے اور وہ یہ ہے:۔

وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَیَزِیْدَنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ طُغْیَانًا وَّکُفْرًا ۚ (المائدۃ: ۶۸)

تمہاری بگڑی کبھی نہیں بن سکتی جب تک کہ تم تورات اور انجیل) اور اس چیز پر عمل نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل ہوئی ہے اور اے رسول جو چیز آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اس سے ان میں سے بہت سے لوگوں کی سرکشی اور کفر میں ضرور زیادتی ہو گی۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور بغیر اس کے فلاح نہیں اور اکثر اہل کتاب اس کے قائل نہیں ہیں، بلکہ قرآنی آیات سے ان کی سرکشی اور کفر زیادہ ہوتا تھا۔ برق صاحب آپ تو اہل کتاب کو مسلم سمجھتے ہیں خواہ وہ قرآن مجید پر ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ قرآن مجید پر عمل کریں یا نہ کریں۔ لیکن اس آیت میں اس کی تردید ہے۔ قرآن مجید پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے تورات وانجیل کی طرف ضمناً دعوت ہے اس لئے کہ ان کتابوں کی دعوت یہی ہے کہ آنے والے رسول پر ایمان لایا جائے۔ اور اس کی شریعت پر عمل کیا جائے تو جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی کتاب کا انکار کرتا ہے وہ گویا تورات وانجیل کو بھی نہیں مانتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دعوت دی کہ تورات وانجیل کو پوری طرح مانو یعنی ان کی ہدایت کے مطابق قرآن مجید کو مانو۔ اور اس پر عمل کرو۔

غلط فہمی

"وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ" اور ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا حکم درج ہے، یہ نہیں فرمایا کہ درج تھا۔ بلکہ درج ہے۔ نحو کا مشہور قاعدہ ہے کہ جہاں جار مجرور کا تعلق مذکور نہ ہو وہاں "موجود" یا "کائن" محذوف فرض کر لو اس قاعدہ کی رُو سے آیت کے معنی ہوں گے۔ تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے،" (دو اسلام صفحہ ۱۹۰-۱۹۱)

ازالہ

یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ ساری تورات محرف ہے بے شک موجودہ تورات میں بھی اللہ تعالیٰ کے بعض احکام من وعن محفوظ ہیں، شان نزول کے لحاظ سے یہ ارشاد باری ایک خاص حکم کے متعلق تھا۔ جو تورات میں اس وقت بھی موجود تھا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے واحد کا صیغہ "حکم" استعمال فرمایا ہے۔ پوری تورات کے محفوظ ہونے کی صراحت نہیں کی۔ پوری آیت درج ذیل ہے:۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۔ (المائدہ: ۴۳)

یہ لوگ آپ کو کیسے حکم تسلیم کر سکتے ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے باوجود اس کے یہ لوگ اس سے بھی منہ موڑ لیتے ہیں۔

یعنی جس کتاب پر ایمان ہے اس سے منہ موڑ لیتے ہیں، تو آپ پر تو ایمان بھی نہیں۔ آپ کو کیسے "حَکَم" مان سکتے ہیں۔ یہ چیز بعید از قیاس ہے اگر آپ کو حَکَم مان لیں تو پھر تورات کا حکم ماننے سے کیا امر مانع ہو سکتا ہے حالانکہ دونوں جگہ حکم ایک ہی ہے۔ انہیں تو وہ حکم ماننا ہی نہیں لہٰذا وہ آپ کو بھی "حکم" نہیں بنا سکتے، آپ کا حکم ماننا گویا پھر تورات کے اسی حکم کو مان لینا ہے جس سے اعراض کر چکے ہیں (نحوی قاعدہ کا جواب آگے رہا ہے)

غلط فہمی "إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ" (قرآن) ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور موجود ہے" (دو اسلام صد ۱۹۱)

ازالہ نحو کے جس قاعدہ کی رُو سے آپ نے مندرجہ بالا ترجمہ کیا ہے اور جس قاعدہ کا ذکر آپ اوپر کر چکے ہیں اس قاعدہ کے لحاظ سے صرف لفظ "موجود" آپ لگا سکتے ہیں، زمانہ کا تعین اس قاعدہ سے نہیں ہو گا، لہٰذا "موجود تھا" اور "موجود ہے" دونوں کا احتمال ہے اور محض احتمال سے آپ اپنے مطلب کو ثابت نہیں کر سکتے۔

غلط فہمی "ایک اور آیت ملاحظہ ہو:۔

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ ...... الخ

اگر یہود و نصاریٰ ان کتابوں پر ایمان لا کر نیک بن جاتے جو ان پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں تو وہ ہمارے انعامات کے مستحق بن جاتے۔

اس آیت میں اہل کتاب کو تورات و انجیل پر ایمان لا کر نیک بننے کی ترغیب دی ہے، اگر یہ کتابیں غلط تھیں تو اللہ نے ان پر ایمان لانے کا حکم کیوں دیا۔" (دو اسلام صد ۱۹۱)

ازالہ برق صاحب نے نہ تو آیات کو پورا نقل کیا ہے اور نہ ہی ترجمہ صحیح کیا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے:۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم۔ (المائدۃ: ۶۵، ۶۶)

اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے، اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہوں کو معاف کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کر دیتے اور اگر اہل کتاب تورات کو، انجیل کو اور اس چیز کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے قائم کرتے تو ان کو اوپر سے بھی رزق ملتا اور نیچے سے بھی۔

پہلی آیت میں صاف طور سے اہلِ کتاب کو ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے

کہ پہلے وہ کافر تسلیم کر لئے جائیں۔ دوسری آیت میں تورات اور انجیل کی طرف توجہ مبذول کرا کے قرآن مجید پر عمل کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ برق صاحب آپ تو نیک اہل کتاب کو خواہ وہ قرآن مجید پر ایمان لائیں یا نہ لائیں مؤمن سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید اہل کتاب کے متعلق کیا کہتا ہے۔ سنیئے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ (المائدة :۔ ۵۱)

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے تو وہ انہیں میں سے ہے۔ بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

تمام یہود و نصاریٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے کہ وہ سب ظالم ہیں۔ ان کو دوست نہ بنایا جائے۔

غلط فہمی

"ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ جب تورات و انجیل اصلی حالت میں موجود تھیں تو پھر قرآن اتارنے کی کیا ضرورت تھی اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں لیکن میں صرف قرآن کا جواب پیش کروں گا۔

وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ أَنْ تَقُولُوا إِنَّمَا أُنْزِلَ الْكِتَابُ عَلَىٰ طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَإِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ ۝ (انعام)

ہم نے تمہیں یہ مبارک کتاب (قرآن) عطا کی ہے۔ اسے مانو اور گناہ سے بچو تاکہ تم ہماری رحمت کے مستحق بن سکو اب تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے کہ ہم سے پہلے دو امتوں (یہود و نصاریٰ) پر کتابیں تو نازل ہوئیں تھیں لیکن وہ اجنبی زبان میں تھیں اور ہم انہیں سمجھ نہیں سکتے تھے۔

یعنی نزول قرآن کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی کہ پہلی کتابیں مسخ ہو چکی تھیں۔ بلکہ یہ کہ وہ ایسی زبان میں تھیں جس سے عرب ناآشنا تھے کیا تورات کی صحت پر اس سے بڑی شہادت پیش کی جا سکتی ہے"؟ (دو اسلام صـ ۱۹۱-۱۹۲)

ازالہ

برق صاحب آپ نے قرآن مجید میں صرف ایک ہی وجہ کو ملاحظہ فرمایا حالانکہ اس کی ایک اور بھی وجہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ سنیئے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ

اے اہل کتاب بے شک تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا، جو ایسے وقت میں تمہارے لئے شریعت کے احکام بیان کرتا ہے جبکہ رسولوں کا آنا

وَّلَا نَذِیۡرٍ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِیۡرٌ وَّنَذِیۡرٌ ؕ (المآئدۃ: ۱۹)

ایک عرصہ سے موقوف تھا یہ رسول اس لئے آیا کہ کہیں تم یہ نہ کہہ دو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر و نذیر نہیں آیا پس تمہارے پاس بھی بشیر و نذیر آگیا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن صرف عرب کے لئے نازل نہیں ہوا۔ بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی نازل ہوا، جن کے پاس بقول برق صاحب کتابِ الٰہی موجود تھی۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کے لئے بھی رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اور یہ کہ قرآن مجید اہل کتاب کی ہدایت کے لئے بھی نازل کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب

برق صاحب اگر آپ کی بات تسلیم کر لی جائے کہ قرآن مجید صرف عرب کے لئے نازل ہوا تو پھر سوال یہ ہے کہ انجیل کیوں نازل کی گئی؟ کیا بنی اسرائیل کے پاس بھی انجیل سے پہلے کوئی کتاب نہیں آئی تھی۔ اور اگر آئی تھی تو کیا وہ اجنبی زبان میں تھی؟

تیسرا جواب

کیا اسی اصول پر یہ ضروری نہیں کہ ہماری زبان میں بھی کوئی کتاب نازل فرمائی جاتی۔ بلکہ ہر ملک میں اس ملک کے باشندوں کی زبان میں کتاب کے نزول کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں اور ایک خطہ کی زبان دوسرے خطہ کے لئے اجنبی ہے تو کیا ہندوستان کے لئے سینکڑوں کتابوں کا نزول لازمی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کیونکہ قرآن کی زبان اکثر ممالک کے لئے اجنبی ہے لہٰذا ہر ایسے ملک کے لئے اس ملک کی زبان میں کتاب کا نزول ضروری ہے برق صاحب کیا آپ کا یہی خیال ہے؟

چوتھا جواب

برق صاحب ایک بات اور حل طلب ہے۔ قرآن مجید کی ابتدائی بلکہ متعدد آیات کی رو سے تمام کتب سماویہ پر ایمان لانا ضروری ہے اور بقول آپ کے یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام کتب محفوظ ہوں ورنہ ایمان لانے کا مقصد؟ (دو اسلام صفحہ ۱۸۹ ملخصاً) اور قرآن مجید ہی سے یہ ثابت ہے کہ:۔

وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ ؕ (فاطر: ۲۴)

یعنی ہر امت میں ڈرانے والا آیا ہے۔

اور جب ڈرانے والا آیا ہے تو کتاب بھی ضرور آئی ہو گی اور یہ بھی قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ہر قوم پر

کتاب الٰہی اس قوم کی زبان ہی میں نازل ہوتی رہی لہٰذا ہمارے ملک میں ہماری زبان میں ضرور کوئی کتاب نازل ہوئی ہوگی۔ بتائیے وہ کس خزانہ میں محفوظ ہے کیوں نہ ہم اس کا سراغ لگا کر اس پر عمل کریں اور قرآن مجید کو جو کہ اجنبی زبان میں ہے چھوڑ دیں۔ آخر غیر ملکی زبان کو اپنی زبان پر ترجیح کیوں دیں۔ یہ تو غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری ہے۔ پھر عربی کے مقابلہ میں ہم پاکستانی انگریزی زبان سے زیادہ قریب ہیں۔ بلکہ انگریزی زبان سے کوئی اجنبیت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ تو کیا ہمارے لئے یہ بہتر نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کے بجائے انجیل پڑھنی شروع کر دیں اور سب عیسائی ہو جائیں۔

غلط فہمی

اور سنیئے :-

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصَّالِحِيْنَ

(آلِ عمران)

سارے اہل کتاب برے نہیں۔ ان میں ایسے نیک اور پرہیزگار بھی موجود ہیں، جو رات کو اللہ کی آیات (تورات و انجیل) پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کی ترغیب دیتے ہیں برائی سے روکتے اور نیک کام کی طرف بے تابانہ بڑھتے ہیں۔ یہ لوگ صالح ہیں۔

اس آیت میں تورات و انجیل کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے۔ اگر تورات بگڑ چکی ہوتی، تو اللہ اس کے احکام کو آیات کیوں کہتا اور اس پر عمل کرنے والوں کو صالحین میں کیوں شمار کرتا۔" (دو اسلام صد ۱۹۲ - ۱۹۳)

ازالہ

آیت مذکورہ میں آیات سے مراد تورات اور انجیل کی آیات نہیں ہیں بلکہ قرآن مجید کی آیات مراد ہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :-

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ

(المآئدۃ : ۸۰ - ۸۱)

تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بہت سے لوگ کافروں کو دوست بناتے ہیں بے شک انہوں نے جو اعمال کئے وہ اس لحاظ سے بہت برے ہیں کہ ان کے نتیجے میں اللہ ان سے ناخوش ہے اور یہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اور اگر وہ اللہ پر، نبی پر، اور اس کتاب پر جو اس پر نازل ہوئی ہے ایمان لے آتے تو کبھی کافروں کو دوست نہ بناتے مگر ان میں بہت سے فاسق ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی ایک خصوصیت بیان فرمائی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان نہ لانے کے سبب اس مرض میں مبتلا ہیں اگر ان پر ایمان لے آتے تو کبھی کافروں کو دوست نہ بناتے۔ گویا کفر سے بیزاری کا ذریعہ یہ ہے، کہ اللہ، رسول اور قرآن مجید پر ایمان لایا جائے یہاں نبی سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں ورنہ اپنے نبی پر تو ان کا ایمان پہلے سے موجود تھا ایک اور جگہ ارشاد باری ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (البقرۃ ۴-۵)	جو لوگ اس وحی پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ پر اتری اور جو آپ سے پہلے اتری، اور قیامت پر بھی ایمان لاتے ہیں، یہی لوگ ہدایت پر ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں، جو فلاح پائیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہدایت و فلاح کے لئے قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے۔

غلط فہمی

"آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ صورت حال ہے تو پھر مسلمان بننے کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے عیسائی رہ کر بھی نیک عمل کئے جاؤ۔ نہ قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت اور نہ رسول پر، سارے اسلام سے چھٹی مل گئی۔ یہ سوال اسلام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اسلام کسی زبانی اقرار کا نام نہیں۔ بلکہ نیکی کا نام ہے اگر ایک عیسائی نیکی کر رہا ہے تو وہ قرآن کی رُو سے مسلمان ہے۔ رسول و قرآن کا صحیح پیرو وہی ہے۔" (دو اسلام صد ۱۹۳)

ازالہ

اس کے جواب میں کچھ آیات اوپر نقل ہوئیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے اگر ایک شخص نیکی تو کرتا ہے لیکن قرآن مجید کے متعلق کہتا ہے کہ (نعوذ باللہ) ایک شخص نے اسے گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کر دیا تو کیا وہ شخص مسلم ہو سکتا ہے ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ	(اے ایمان والو! اہل کتاب سے کہہ دو) کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل ہوا ہم پر اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب اور اسباط پر نازل ہوا اور جو صحائف موسیٰ اور عیسیٰ اور جملہ انبیاء کو دیئے گئے ان پر بھی ہم ایمان لائے ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے

آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَإِن تَوَلَّوا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ (البقرہ ۱۳۶ - ۱۳۷)

اور ہم اللہ کے مسلم ہیں، پس اگر وہ اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت یاب ہو گئے اور اگر منہ موڑیں تو وہ شقاق میں مبتلا ہیں ان سب کے خلاف آپ کے لئے اللہ کافی ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ جب تک وہ مسلمین کی طرح قرآن مجید پر ایمان نہ لائیں ہدایت نہیں پا سکتے، دوسری آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ○ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○ (آل عمران: ۸۴، ۸۵)

اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو ہم پر نازل ہوا اس پر ایمان لائے اور اس پر بھی ایمان لائے، جو ابراہیم، اسمٰعیل اسحاق، یعقوب اور اسباط پر نازل ہوا، اور موسیٰ اور عیسیٰ اور جملہ انبیاء پر نازل ہوا۔ ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔

اس آیت میں پھر بڑے زور کے ساتھ اہل کتاب کو قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، قرآن مجید اور جملہ کتب سماوی پر ایمان لانے کی دعوت دے کر فرمایا، یہ ہے اسلام، اب جو شخص اس کو اختیار نہیں کرے گا وہ تباہ و برباد ہوگا۔ اور اس کا دین قبول نہیں ہوگا اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام قرآن مجید پر ایمان لانے، اور قرآن مجید پر عمل کرنے کا نام ہے نہ یہ کہ قرآن مجید کی تکذیب کرے اس کا مذاق اڑائے، بس نیکی کرتا رہے تو وہ مسلم ہو گیا ہرگز ایسا نہیں۔ ارشاد باری ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا

اے ایمان والو! (اس خطاب میں اہل کتاب بھی آگئے کیونکہ برق صاحب کے نزدیک وہ بھی مومن ہیں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو اس سے پہلے نازل کیں اور جو انکار کرے اللہ کا، فرشتوں کا، اس کی

بَعِیْدًا ہ — کتابوں اور رسولوں کا اور قیامت کے دن کا
(النسآء: ۱۳۶) — وہ گمراہی میں بہت دور جا پڑا۔

اس آیت میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں کہ رسول سے مراد کوئی اور رسول ہو۔ رسول سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن مجید پر ایمان نہیں لاتا وہ بہت بڑا گمراہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک جگہ اور ارشاد فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں
وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَ	اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق
رُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ	کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر تو ایمان
نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا	لائے اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور بیچ میں
بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ	ایک راستہ نکالنا چاہتے ہیں، یہی لوگ حقیقی کافر
الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ	ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت کا عذاب
عَذَابًا مُّھِیْنًا ہ (النسآء ۱۵۰، ۱۵۱)	تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ بالکل کافر ہے لہذا جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، مطلقاً کافر ہے۔ برق صاحب سچے نبی کو نبی نہ ماننا اور جھوٹے نبی کو نبی مان لینا یہ بڑا اہم معاملہ ہے اگر عمومی طور پر ہر رسول پر ایمان لانے کا یہ منشاء ہے کہ جو شخص بھی رسول ہونے کا دعویٰ کرے اس کو رسول مان لیا جائے تو پھر تو ہر شخص کو مرزا غلام قادیانی پر ایمان لانا ہوگا۔ حالانکہ ہم قطعاً اس پر ایمان نہیں لاتے بلکہ اسے کذاب و دجال سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بعض وہ لوگ بھی ہیں جو باوجود نیک ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں تو کیا وہ مسلم ہیں۔ اگر جھوٹے نبی کا اقرار کفر ہے تو سچے نبی کا انکار بھی کفر ہے اور سنیئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ	کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو
فَاتَّبِعُوْنِیْ ۔ (آل عمران ۳۱)	میری پیروی کرو۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام محبت کرنے والوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو فرض قرار دیا ہے اب اگر نیک اہل کتاب جو اللہ سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں کرتے بلکہ اس سے منہ موڑتے ہیں تو کیا وہ فلاح پائیں گے۔ ہر محب اللہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع فرض ہے اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہے وہ کافر ہے سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً
وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ قَالَ
عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ
رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝
اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ
عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ
كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ
وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(الاعراف ۷-۱۵۷)

(موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے
رب) ہمارے لئے دنیا اور آخرت میں بہتری
لکھ دے ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ اللہ
نے فرمایا میں عذاب کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں
اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔ وہ
رحمت میں ان لوگوں کے لئے لکھوں گا، جو
پرہیزگاری کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری
آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جو لوگ رسول، نبی
امی کی پیروی کرتے ہیں، جس کا ذکر وہ اپنے
ہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو ان
کو بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے ان کو روکتا
ہے، ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتا ہے، ناپاک
چیزیں ان پر حرام کرتا ہے، ان کے بوجھ اور ان
کے طوق جو ان پر تھے ان پر سے اتارتا ہے،
پس جو لوگ اس رسول پر ایمان لائے، اس کا
احترام کیا، اس کی مدد کی اور اس نور کا اتباع
کیا جو اس پر نازل کیا گیا ہے تو یہی لوگ
فلاح پانے والے ہیں۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ اہل کتاب کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر موجود تھا۔ وہ ان اوصاف مذکورہ کے باعث آپ کو پہچانتے تھے، لیکن ایمان نہیں لاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:۔

۱۔ رحمت ان ہی کے حصہ میں ہے جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں۔

۲۔ وہ رسول ان پر پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے، ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے، رسم و رواج کے بوجھ اور وہ طوق وسلاسل جو گذشتہ کتب الٰہیہ میں ان کی بداعمالی کی سزا کی وجہ سے ان پر ڈال دئے گئے تھے ان پر سے الگ کرتا ہے۔

۳۔ اس رسول پر ایمان لانیوالے، اس کا احترام کرنے والے، اس کی مدد کرنے والے اور اس کی لائی ہوئی شریعت کا اتباع کرنے والے ہی نجات کے مستحق ہیں۔

کیا ان آیات کی موجودگی میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور قرآن مجید کا اتباع نہ کرنے والے بھی مومن ہیں۔ ان ہی آیات کے متصل اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ o

(الاعراف: ۱۵۸)

اے رسول کہہ دیجیے اے لوگو میں تم سب کی طرف رسول ہوں اس اللہ کا آسمانوں اور زمین میں جس کی بادشاہت ہے اس کے سوائے کوئی الٰہ نہیں وہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خود بھی اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے۔

اس آیت میں دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تم سب کے لئے رسول ہیں ان کا اتباع کرو گے تو ہدایت مل سکتی ہے اس خطاب عام میں اہلِ کتاب خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں کیونکہ اوپر سے انہی کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اہل کتاب کے لئے لازمی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں آپ کی پیروی کریں ورنہ وہ ہدایت نہیں پا سکتے اور نہ نجات۔ مزید سنیئے:۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۔ o

(آل عمران: ۱۹، ۲۰)

اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے اور اہل کتاب نے علم آجانے کے بعد محض آپس کی ضد کے باعث اختلاف کیا اور جو شخص بھی اللہ کی آیات کا انکار کرے تو اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے، پھر اگر یہ اہل کتاب آپ سے بحث کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں تو اللہ کے لئے اسلام لے آیا اور وہ لوگ بھی جو میری پیروی کرتے ہیں اور آپ اہل کتاب اور امی لوگوں سے یہ بھی کہہ دیجیے کہ کیا اسلام قبول کرتے ہو، پس اگر وہ اسلام قبول کریں تو ہدایت پائیں گے۔ اور اگر منہ موڑیں گے تو آپ کے ذمہ صرف تبلیغ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖

اس آیت میں بھی اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے ان کو ہدایت کی طرف بلایا جا رہا ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی پیروی کرنے والوں کو اہل اسلام بتایا جا رہا ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

(آل عمران : ۱۹۹)

بے شک بعض اہل کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی۔ اور اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ان پر نازل ہوئی یہ لوگ اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کے عوض متاع قلیل حاصل نہیں کرتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ان اہل کتاب کے لئے اجر ہے کہ جو قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں اور یہی وہ اہل کتاب ہیں جن کی تعریف میں قرآن مجید کی بعض آیات نازل ہوئی ہیں برق صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ ہر نیک عمل اہل کتاب کی تعریف میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ کاش وہ ان آیات کو ان آیات کی روشنی میں مطالعہ فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ایسے اہل کتاب کی مذمت فرمائی ہے جو قرآن مجید پر ایمان نہ لائیں مثلاً:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۔

(البقرة : ۹۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی ہے تو کہتے ہیں ہم اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی اور اس کے علاوہ دوسری کتاب کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

دوسری جگہ ارشاد باری ہے :۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۔

(البقرة : ۴۱)

اے بنی اسرائیل اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی ہے اور جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کے ساتھ اولین انکار کرنے والے نہ بن جاؤ۔

٭ ٭ ٭

ان دونوں آیات میں بھی اہل کتاب کو قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اہل کتاب ایمان لے آئے اگر قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری نہ ہوتا تو انہیں مسلم ہونے کی کیا ضرورت تھی وہ نیک بن جاتے بس ان کے لئے یہی کافی تھا، بلکہ وہ لوگ جو ایمان لائے مثلاً حضرت عبداللہ

بن سلام، حضرت سلمان فارسی وغیرہ پہلے ہی سے نیک تھے لیکن یہ نیکی ان کے لئے کافی نہیں سمجھی گئی اور انہیں اسلام قبول کرنا پڑا اور سنیئے ارشاد باری ہے۔

۱ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ۝ (النسآء: ۴۷)

اے اہل کتاب اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کی ہے اور جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ قبل اس کے کہ چہرے مٹا دئے جائیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیا جائے یا ہم لعنت کریں ان پر جیسا کہ ہم نے ہفتہ والوں پر لعنت کی تھی اور اللہ کا کام تو ہو کر رہتا ہے۔

اس آیت میں بھی اہل کتاب کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور ایمان نہ لانے کی صورت میں عذاب الٰہی کی دھمکی دی گئی ہے۔

غلط فہمی

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ۝

یہ قرآن مجید ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

اسلئے کتاب موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے۔ (دو اسلام صـ۱۹۳)

ازالہ

برق صاحب نے اوپر سے آیات نقل نہیں کیں اور "ہذا" کا مرجع قرآن مجید کو سمجھ لیا۔ آیات محولہ اس طرح ہیں:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ۝

(الاعلیٰ: ۱۴ تا ۱۹)

بے شک اس شخص نے نجات پائی۔ جس نے اپنے آپ کو پاک کر لیا۔ جو اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور جس نے نماز پڑھی۔ مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے یہ بات پہلے صحیفوں میں بھی موجود تھی (مثلاً) صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ میں۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ "ہذا" کا مرجع قرآن مجید نہیں ہے۔ بلکہ نجات اخروی کے اصول ہیں جو پہلی کتابوں میں بھی موجود تھے۔

اگر برق صاحب کے مطلب کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن مجید تورات میں موجود ہے یعنی پورا قرآن مجید تورات میں موجود ہے اور بقول برق صاحب کے تورات اس وقت بھی غیر محرف موجود ہے تو کیا قرآن مجید کو تورات میں دکھایا جا سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ پھر اسی اصول پر ذرا اور آگے چلیئے تو یہ کہنا

صحیح ہوگا کہ انجیل بھی تورات میں موجود ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝ (آلِ عمران: ۴۸)	اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو کتاب، حکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم دے گا۔

اب اگر انجیل تورات میں موجود تھی تو انجیل کی ضرورت ہی کیا تھی کیوں دونوں کی تعلیم عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی پھر ایک سوال اور ہے کہ اگر قرآن مجید تورات میں موجود ہے تو تورات اصل چیز ہوئی اور قرآن تورات کا ایک حصہ ہوا۔ بلکہ تورات میں کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ لہٰذا تورات قرآن مجید سے افضل اور زیادہ کامل ہوئی۔ اس کی موجودگی میں قرآن مجید کا نزول لاحاصل ہے تورات اور اس کے تراجم کی اشاعت کافی تھی۔

برق صاحب! آپ تحریر فرماتے ہیں کہ کتابِ موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے کیا یہ حقیقت ہے؟ کیا دونوں کتابوں میں تضاد نہیں ہے؟ کیا ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ دو الٰہی قانون چل سکتے ہیں؟

انتباہ

پہلے نبی صرف اپنی اپنی قوم کی طرف ہادی بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ اس نبی کی پیروی صرف اس قوم ہی پر فرض ہوتی تھی نہ کہ دوسری قوموں پر مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ (آل عمران ۴۹)	وہ بنی اسرائیل کے لئے رسول تھے۔

لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے۔

ارشاد باری ہے:۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا: ۲۸)	اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

دوسری آیت میں ہے:۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۝ (الاعراف: ۱۵۸)	کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

لہٰذا ایسے رسول پر جس کا دائرہ قوم و ملک کے ساتھ محدود نہ ہو بلکہ "للعالمین نذیرا" کے مصداق جس کی رسالت تمام اقوام عالم کی طرف ہو، ایمان نہ لانا اور اس کی پیروی نہ کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمادیا:۔

قُلْ لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ	آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب اور اے اہل عرب کیا تم اسلام قبول کرتے ہو پس اگر وہ اسلام قبول

اِهْتَدَوْا ۔ (آل عمران : ۲۰) کرلیں تو ہدایت پر آجائیں گے ۔

اس آیت میں تمام اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے اور ان کے لئے بھی اس کے بغیر چارہ نہیں یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی اور ہرقل جیسے نیک عیسائی بادشاہوں کو دعوت اسلام دی اور صاف کہہ دیا کہ اسلام قبول کر وگے تو سلامتی کے حق دار ہوگے ، ورنہ نہیں ۔

غلط فہمی اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے :۔

وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْهُ (آلِ عمران) ہم ان اہل کتاب کے کسی نیک عمل کو ضائع نہیں جانے دیتے (دو اسلام صـ۱۹۳، ۱۹۴)

ازالہ یہ ان اہل کتاب کے لئے ہے جو مسلم ہو گئے تھے، ارشادِ باری ہے :۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ۝ (القصص : ۵۲، ۵۳)

جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے ، تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے ہم تو اس سے پہلے ہی مسلم تھے ۔

یہ اہل کتاب نزول قرآن مجید سے پہلے مسلم تھے اور قرآن مجید کے نزول کے بعد فوراً اس پر ایمان لے آئے اور اس کا انکار نہیں کیا ۔ دوسری آیت سنیئے ۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۝ (العنکبوت : ۴۷)

اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری بس جو اہل کتاب ہیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور دوسرے لوگوں میں سے بھی بعض لوگ ایمان لے آتے ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار کوئی نہیں کرتا سوائے کافروں کے ۔

یہ ہیں وہ اچھے اور نیک عمل اہل کتاب جو قابلِ تعریف ہیں صرف اس وجہ سے کہ وہ قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں اور جو اس کا انکار کرتے ہیں وہ کافر ہیں :۔

اور سنیئے ان اچھے اہل کتاب کے متعلق ارشاد باری ہے :۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (المائدۃ : ۸۴)

اور ہم کیوں اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف حق کے ساتھ نازل ہوئی ایمان نہ لائیں ۔ ہمیں تو امید ہے کہ ہمارا رب ہم کو صالحین میں داخل کر دے گا ۔

یہ ہیں وہ اہلِ کتاب جن کی تعریف اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں کرتا ہے یہ ایمان لاتے ہیں اور طمع کرتے ہیں کہ انہیں صالحین میں جگہ مل جائے یہ ہیں وہ اہل کتاب جو قرآن مجید کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ ہماری طرف بھی حق کے ساتھ نازل ہوا ہے یعنی وہ قرآنِ مجید سے بے پرواہو کر اپنے کو اہلِ ایمان اور صالحین میں شمار نہیں کرتے، قرآنِ مجید پر ایمان لانے کو وہ اللہ پر ایمان لانا سمجھتے ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید پر ایمان لاکر ہی صالح بنا جاسکتا ہے اور درحقیقت اب قرآن کی پیروی ہی عملِ صالح ہے اور اس سے انکار اور اس سے لاپرواہی فلاح کے منافی ہے۔

غلط فہمی ان تفاصیل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ عہدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تورات اصلی حالت میں موجود تھی اور وہی تورات ہم تک پہنچی ہے۔ اس تورات میں ابن عمرؓ کی ذکر کردہ آیت کہیں موجود نہیں اس لئے یہ حدیث ایک تاریخی غلط بیانی ہے اور جعلی ہے (ص ۱۹۴)

ازالہ ان تفاصیل کا جواب تو اوپر دیا جاچکا ہے۔ برق صاحب آپ کو تورات دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ورنہ موجودہ تورات تو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ تحریف شدہ ہے۔ مثال کے طور پر ہم موجودہ تورات کے چند اقتباسات آپ کے ملاحظہ کے لئے تحریر کرتے ہیں، سنئے:۔

۱۔ خدا انسان نہیں جو جھوٹ بولے نہ آدمی زاد ہے کہ پشیمان ہو (گنتی ۲۳/۱۹) گویا ہر انسان جھوٹ بولتا ہے خواہ نبی ہو یا صدیق، کیا یہ آیت صحیح ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

۲۔ خدا پشیمان ہوا (خروج ۳۲/۱۴) یہ آیت پہلی آیت کے خلاف و متضاد ہے۔

۳۔ خدا دلگیر ہوا (پیدائش ۶/۶)

۴۔ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا (پیدائش ۶/۶)

۵۔ (خدا نے) ساتویں دن آرام کیا (خروج ۲۰/۱۱)

برق صاحب ان آیات سے ثابت ہوا کہ موجودہ تورات میں تضاد بھی ہے اور اللہ جلّ جلالہٗ کی توہین بھی، آپ حدیث کے لئے معیار مقرر کرتے ہیں کہ ایسی نہ ہو ویسی نہ ہو۔ کیا یہ شرائط تورات کے لئے ضروری نہیں اگر تورات میں اس قسم کی باتیں پائی جائیں تب بھی وہ من وعن تسلیم کی جائے لیکن حدیث کو غیر محفوظ کہا جائے کیا یہ انصاف ہے، اور سنئے:۔

۶۔ پھر جب اس (لوطؑ) نے ان سے بہت منت کی، تب وے (فرشتے) اس کی طرف پھرے، اور اس کے گھر گئے۔ اور اس نے ان کی مہمانی کی اور فطیری روٹی ان کے لئے پکائی اور انہوں نے کھائی۔ (پیدائش ۱۹/۳) فرشتے بقول آپ کے نورانی مخلوق ہیں ان کو روٹی سے کیا غرض، لیکن بایں ہمہ یہ چیز تورات میں ہے اور آپ تورات کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔

۷۔ اور خداوند نے ان کے بچھڑے بنانے کے سبب جسے ہارون نے بنایا تھا لوگوں پر مری بھیجی، (خروج ۳۲/۳۵) قرآن مجید میں ہے کہ بچھڑے کو سامری نے بنایا تھا اور تورات میں ہے کہ ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ کس کو صحیح سمجھیں اور کس کو غلط، پھر ایسے شرکیہ کام کی نسبت اللہ کے مقدس نبی کی طرف کس قدر شرمناک بہتان ہے اور نبی معظم علیہ السلام کی صریح توہین ہے۔ انصاف سے بعید ہے کہ حدیث کے لئے یہی معیار، معیارِ کذب ہو اور تورات کے لئے معیارِ صحت ؛۔

۸۔ نبوت ملنے کے بعد بھی ساؤل داؤد کا دشمن رہا، اور انہیں مارنے کی فکر میں رہا (۱۔سموایل باب ۲۰) کیا نبوت کی یہی شان ہے کہ نبی، نبی کا دشمن ہو۔

۹۔ داؤد علیہ السلام نے زنا کیا (۲۔سموایل۔ باب ۱۱)

۱۰۔ داؤد، جالوت کے بادشاہ اکیس سے ڈرے اور اس کے سامنے اپنی وضع بدلی۔ اور ان کے بیچ اپنے کو دیوانہ بنایا اور پھاٹک کے پلوں پر واہیات بات لکھنے لگا اور اپنے تھوک کو اپنی ڈاڑھی پر بہنے دیا۔ تب اکیس نے اپنے چاکروں سے کہا یہ آدمی تو سڑی ہے (۱۔سموایل ۲۱/۱۴)

۱۱۔ نوح مے پی کر نشہ میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا (پیدائش ۹/۲۱)

۱۲۔ اور لوط ضغر سے اپنی دونوں بیٹیوں سمیت نکل کر پہاڑ پر جا رہا۔ کیونکہ ضغر میں رہنے سے اسے دہشت ہوئی کا اور وہ اور اس کی بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندر آئے، آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم بستر ہوئیں، تاکہ اپنے باپ سے نسل برقرار رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ پر اس نے اس کے لیٹتے اور اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا، اور دوسرے روز ایسا ہوا کہ پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی آؤ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کے اس سے ہم بستر ہو کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات کو بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی اٹھ کے اس سے ہم بستر ہوئی۔ اور اس نے اس کے لیٹتے اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی ایک بیٹا جنی اور اس کا نام موآب رکھا وہ موآبیوں کا جو آج تک ہیں باپ ہوا۔ اور چھوٹی بھی ایک بیٹا جنی۔ اس کا نام بن عمی رکھا وہ بنی عمون کا جو آج تک ہیں باپ ہوا۔ (پیدائش ۱۹/۳۰-۳۸)

الغرض ان عبارات سے روز روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ تورات تحریف شدہ ہے، لہٰذا حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث بالکل صحیح ہے اور ضرور اس حدیث میں بیان کردہ صفاتِ نبوی اصلی تورات میں موجود تھیں۔

للہ الحمد

غلط فہمی قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ لکھ سکتے تھے اور نہ لکھی ہوئی چیز پڑھ سکتے تھے لیکن بخاری میں ہے وہ لکھ سکتے تھے، حدیث یوں چلتی ہے کہ حضور ذی قعدہ میں عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو اہل مکہ نے کچھ پابندیاں عائد کر دیں۔ اور اس سلسلہ میں ایک تحریری معاہدہ ہے جسے محمد رسول اللہ تسلیم کرتے ہیں، کفار مکہ نے رسول اللہ کے الفاظ پر اعتراض کیا.... آپ نے حضرت علی سے فرمایا کہ "رسول اللہ" کے الفاظ مٹا دو... علی نے جواب دیا خدا کی قسم میں آپ کے نام سے رسول کا لفظ کبھی جدا نہ کروں گا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کاغذ اٹھا لیا اور اس پر لکھ دیا۔ یہ وہ فیصلہ ہے (دو اسلام ص۱۹۴-۱۹۵)۔

ازالہ صحیح بخاری کی ایک مختصر حدیث لے کر برق صاحب نے اعتراض کیا حالانکہ اس میں کچھ عبارت محذوف ہے جو دوسری سند میں بالصراحت مذکور ہے جس کا حوالہ برق صاحب نے خود دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"بخاری کی ایک اور روایت (ج ۲ ص۱۳۵) بتلاتی ہے کہ حضور نے رسول اللہ کا لفظ کھرچ ڈالا تھا اور کاتب نے ابن عبداللہ کے الفاظ کا اضافہ کر دیا تھا اسی حدیث پر باقی محدثین اعتماد کرتے ہیں۔ اور تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے" (دو اسلام ص۱۹۵-۱۹۶)

لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ کھرچنے کے لئے اٹھایا۔ پھر اس نے (یعنی دوسری حدیث کی صراحت کے مطابق کاتب نے) لکھا، نہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا۔ برق صاحب کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ "کتب" کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھ لیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث اعتراض سے پاک ہے۔ ایک حدیث کہیں مختصر ہوتی ہے اور کہیں مفصل۔ صرف مختصر کو دیکھ کر اعتراض کر دینا مناسب نہیں۔

باب ۹

"آنحضرت کی تصویر حدیث میں"

غلط فہمی بخاری میں ہے :۔

عن عائشۃ قالت | حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام
کان النبی صلعم یقبل ویباشر | روزہ رکھ کر اپنی ازواج کے بوسے لیتے اور ان سے
وھو صائم | مباشرت فرمایا کرتے تھے (دو اسلام صلا ۲۰۱)

ازالہ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔
ان احادیث سے روزہ کا فلسفہ واضح ہو گیا۔ یعنی پورے تیس دن تک ہر قسم کی بدزبانی، بدکاری اور شہوت رانی سے دور رہ کر اپنے اخلاق اور روحانیت کو بلند کرنا اور اپنے آپ کو جفاکش بنانا (صلا ۲۰۰)

یہ ہے فلسفہ صوم، اب برق صاحب بتائیں کہ حدیث مذکور میں کون سی چیز ایسی ہے جو اس فلسفہ کے منافی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لفظ مباشرت سے غلط فہمی ہو گئی ہو تو اس کے متعلق عرض ہے کہ مباشرت کے معنی عربی زبان میں وہ نہیں جو عام اُردو اصطلاح میں لئے جاتے ہیں۔ عون المعبود شرح ابوداؤد میں ہے

مَعنَی الْمُبَاشَرَةِ ھٰھُنَا الْمَسُّ بِالْیَدِ مِنَ الْتِقَاءِ الْبَشْرَتَیْنِ (دو اسلام صلا ۲۳۹) | یعنی مباشرت سے یہاں صرف ہاتھ سے چھونا اور دو جسموں کا ملنا مراد ہے۔

بلکہ عربی زبان میں اس کے اصلی معنی بدن سے بدن ملانے کے ہی ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے امام شوکانی فرماتے ہیں :۔

اِنَّ الْمُبَاشَرَةَ فِی الْاَصْلِ الْتِقَاءُ الْبَشْرَتَیْنِ (نیل الاوطار باب | یعنی مباشرت اصل میں دو جسموں کے ملنے کو کہتے ہیں۔

تقبیل الصائم)
مزید برآں مباشرت کے معنی بالمشافہ، بلاواسطہ، روبرو کے بھی ہوتے ہیں اور ان معنوں میں یہ بکثرت استعمال ہوتا ہے مثلاً علامہ احمد محمد شاکر لکھتے ہیں :۔

وَيَحْتَمِلُ كَمَا قَالَ ابْنُ التُّرْكُمَانِيِّ أَنْ يَكُوْنَ سَمِعَ هٰذَا الْحَدِيْثَ مِنْ عُمَرَ مُبَاشَرَةً وَسَمِعَهُ عَنْهُ بِالْوَاسِطَةِ ۔	یعنی احتمال ہے جیسا کہ ابن ترکمانی نے کہا ہے کہ راوی نے اس حدیث کو حضرت عمرؓ سے "مباشرۃً" (بلاواسطہ، بالمشافہہ) بھی سنا ہو اور بالواسطہ بھی سنا ہو۔

(ترمذی جزاوّل مع شرح احمد محمد شاکر مطبوعہ مصر ص۳۱۸)

لہٰذا حدیث زیر بحث کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بحالت روزہ اپنی بیوی کے پاس اٹھتے، بیٹھتے تھے، ہاتھ لگاتے تھے اور پیار بھی کر لیا کرتے تھے۔ بتائیے ان معنوں پر کیا اعتراض ہے۔

غلط فہمی
"اس حدیث میں مباشرت سے کیا مراد ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی سنئے۔ آپ صحیح مسلم کی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فتح الملہم میں فرماتے ہیں :۔

المباشرة فوق السرة وتحت الركبة بالذكر والقبلة او المعانقة او اللمس وغير ذلك حلال باتفاق المسلمين ۔	یعنی آپ روزہ رکھ کر عورت کے ساتھ ناف سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے مباشرت کر سکتے ہیں یعنی اسے چھو سکتے ہیں، چوم سکتے ہیں گلے لگا سکتے ہیں اور آلہ تناسل کا استعمال کر سکتے ہیں"

(دو اسلام ص۲۰۱)

ازالہ
"مباشرت کے معنی آلہ تناسل کا استعمال اور روزہ میں اسے حلال سمجھنا" یہ صحیح نہیں اللہ تعالیٰ ایسے معنوں سے محفوظ رکھے۔

غلط فہمی
اس حدیث کے متعلق برق صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں :۔
"یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے اول روزہ کا مقصد شہوات کو ترک کرنا ہے نہ کہ بوس و کنار اور گھٹنوں سے نیچے آلہ تناسل کا استعمال" (دو اسلام ص۲۰۱)

ازالہ
حدیث مذکور میں شہوت کا کوئی ذکر نہیں بلکہ اس کی تردید ہے آپ نے پوری حدیث نقل نہیں فرمائی اس کے آگے حدیث میں یہ بھی ہے "كَانَ اَمْلَكَكُمْ لِاِرْبِهٖ" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہشات پر تم سب سے زیادہ قابو رکھتے تھے۔ مطلب ظاہر ہے کہ بغیر شہوت کے کبھی

اپنی بیوی کو پیار کر لیا کرتے تھے اور آپ میں اتنی قوت ضبط تھی کہ شہوت غالب نہیں ہو سکتی تھی اور شہوت رانی کا کوئی خطرہ نہیں تھا، حدیث کا مطلب صرف اتنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس اٹھتے بیٹھتے تھے اور پیار بھی کر لیا کرتے تھے۔ اچھا اب ہم آپ سے ایک سوال کرتے ہیں وہ یہ کہ کیا روزہ میں بیوی کو پیار کرنے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں ؟

۱۔ اگر ٹوٹتا ہے تو قرآن مجید سے دلیل دیجئے۔

۲۔ اگر نہیں ٹوٹتا تو کس دلیل سے ؟

اگر آپ یہ فرمائیں کہ نہیں ٹوٹتا تو پھر ہم بھی تو یہی کہتے ہیں اور دلیل میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں جس پر آپ کو اعتراض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فعل سے ثابت کر دیا کہ پیار کرنا مفسدِ صوم نہیں۔ اب کوئی تقویٰ وطہارت کا مدعی یہ کہے کہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ ایسا نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ یہ کام اس نے کیا ہے جو سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ مقدس تھا۔

غلط فہمی برق صاحب کو اس حدیث پر دوسرا اعتراض یہ ہے جو درج ذیل ہے۔

"دوم۔ یہ حدیث اوپر والی دو حدیثوں سے متصادم ہوتی ہے" (دو اسلام ص۲۰۱)

ازالہ ان دو حدیثوں میں شہوت رانی، جھوٹ اور غلط کاریوں سے بچنے کو روزہ کا مقصد بتایا گیا ہے اور اس حدیث زیر بحث میں ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں۔ لہٰذا تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

غلط فہمی تیسرا اعتراض برق صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"سوم۔ یہ حدیث قرآن سے ٹکراتی ہے قرآن کہتا ہے کہ ماہ رمضان میں رات کے وقت ہم تمہیں بیویوں سے متمتع ہونے کی اجازت دیتے ہیں... تم ان سے مباشرت کر سکتے ہو۔ (البقرہ) یعنی رات کے وقت مباشرت کی اجازت ہے لیکن یہ حدیث کھلی چھٹی دیتی ہے کہ دن ہو یا رات کام چلائے چلو" (دو اسلام ص۲۰۲)

ازالہ آیت " أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ " میں جماع کے لئے رفث کا لفظ استعمال ہوا ہے نہ کہ مباشرت کا لفظ۔ برق صاحب مباشرت کو جماع کے ہم معنی سمجھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور "کام چلائے چلو" جیسا طنزیہ فقرہ استعمال کر رہے ہیں آیت میں جہاں جماع کی طرف ارشاد فرمایا وہاں رفث استعمال فرمایا اور جب مباشرت کا لفظ استعمال فرمایا تو وہاں جماع کے لئے دوسرے الفاظ میں اشارہ کیا۔ برق صاحب نے پوری آیت نقل نہیں فرمائی حالانکہ اس کے آگے یہ لفظ ہیں:۔

بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ   یعنی رمضان کی راتوں میں عورتوں سے مباشرت کرو

اللّٰہُ لَکُمْ ۔ (البقرۃ : ۱۸۷)	اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اس کے لئے جدوجہد کرو۔

یعنی آیت بالا میں لفظ مباشرت کے بعد ”اولاد کی تلاش“ سے جماع کی طرف اشارہ کیا لفظ مباشرت کو جماع کے لئے استعمال نہیں فرمایا۔

غلط فہمی

”گناہ اور محرکات گناہ ہر دو سے بچنا ضروری ہے“

برق صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا، لیکن اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں

”کیا رمضان میں بوس و کنار جماع کا شدید محرک نہیں، اپنے آپ کو دیکھو، کسی سے پوچھو، اور انصافاً کہو کہ کیا آج تک کوئی شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے اور گلے لگانے کے بعد جماع سے بچ سکا ہے، روزے میں بوس و کنار کی ترغیب دینا اور پھر اس کے نتائج پر قابلِ عقوبت ٹھہرانا عجیب قسم کا مذاق ہے“ (دو اسلام صـ۲۰۲)

ازالہ

برق صاحب ایک بات انصافاً بتائیے۔ کیا جوان بیوی کا اسی گھر میں رہنا جہاں روزہ دار خاوند رہتا ہو جماع کا محرک نہیں ہو سکتا، یقیناً ہو سکتا ہے تو پھر اس یکجائی کو بھی محرک گناہ سمجھ کر کیوں نہ حرام قرار دے دیا جائے کیوں نہ بیوی سے کہا جائے کہ وہ رمضان کے مہینہ میں کسی اور جگہ چلی جاتے۔ ایک محرک سے بچانا اور دوسرے کو کھلی چھٹی دینا کون سا انصاف ہے۔ برق صاحب آپ نے جو سوال کیا ہے کہ کیا کوئی شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے کے بعد جماع سے بچ سکا ہے اس کا جواب اتنا ہی کافی ہے کہ ہاں بچ سکا ہے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے یہ اجازت ایسی ہے کہ مسلم ہمیشہ سے اس پر عمل پیرا ہیں لیکن کسی کے لئے یہ بات محرک جماع ثابت نہیں ہوئی۔ روزہ کا تقدس و احترام ہی اتنا قوی جذبہ ہے کہ کسی مسلم کو جماع کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور اگر آبھی جائے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا۔

برق صاحب حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے قرآن مجید کا بھی مطالعہ کر لیا کیجیے تاکہ حدیث پر اعتراض کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ارشاد باری ہے:۔

عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْھُنَّ وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا۔	اللہ کو معلوم ہے کہ تم لوگ روزے کی حالت میں اپنے حق میں خیانت کرتے تھے تو اللہ نے تم پر مہربانی کی اور تم کو معاف کر دیا لہذا اب تم رات کے وقت اپنی بیویوں سے مل سکتے ہو اور جو اولاد اللہ نے

(البقرۃ ۱۸۷) تمہارے مقدر میں لکھ دی ہے اس کے لئے
جدوجہد کر سکتے ہو۔ اور صبح صادق ہونے تک
کھا پی بھی سکتے ہو۔

برق صاحب نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آغاز اسلام میں رات کے وقت بھی بیویوں سے اختلاط ممنوع تھا۔ بعض صحابہ رک نہ سکے تو یہ پابندی دور کر دی گئی (دو اسلام صد ۲۰۲)

برق صاحب نے بعض صحابہ کو اس فعل کا مرتکب تسلیم کیا ہے، حالانکہ قرآن مجید کی آیت میں تمام صحابہ کو اس فعل کا مرتکب بتایا ہے۔ برق صاحب براہ کرم بتایئے یہ لفظ "بعض" کس قرآنی لفظ کا ترجمہ ہے اگر کسی قرآنی لفظ کا نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر انصافاً بتایئے کہ قرآنی آیت پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ کو لفظ "بعض" کا اضافہ کرنا پڑا تو کیا کسی حدیث پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ ایسا اضافہ نہیں کر سکتے۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ حدیث کے سلسلہ میں بھی آپ کا یہی رویہ ہونا چاہیئے اس طرح حدیث کے متعلق آپ غلط فہمی سے بچ جائیں گے۔

برق صاحب کیا بمصداق آیت بالا تمام صحابہ یا بقول آپ کے بعض صحابہ اللہ تعالے سے اتنا بے خوف ہو گئے تھے کہ جماع سے نہ بچ سکے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اتنا مہربان تھا کہ بجائے سختی کرنے کے رحمت کے ساتھ متوجہ ہوا گناہ کو معاف کر دیا اور اپنے حکم کی سختی کو محسوس کر کے اس حکم میں تخفیف کر دی، گویا نعوذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے اس تکلیف اور سختی مالا یطاق کا علم نہ تھا بعد میں علم ہوا تو ترمیم کر دی۔

برق صاحب اس آیت سے نہ صرف صحابہؓ یا بعض صحابہ کی توہین ہوتی ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی بھی توہین ہوتی ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ منکرین حدیث قرآن مجید کی اس عبارت پر تو خاموش ہو جاتے ہیں اور حدیث میں جہاں کہیں ایسی بات آتی ہے تو اسے لے اڑتے ہیں۔ مذاق اڑاتے ہیں۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی حدیث سے اللہ تعالیٰ کی یا صحابہ کی توہین ہوتی ہو تو وہ حدیث جعلی ہے۔ لیکن اگر کسی آیت میں اللہ تعالیٰ یا صحابہ کرام کی توہین کا مفہوم پایا جاتا ہے تو وہ قطعی الصحت ہے۔

برق صاحب!
آپ نے غور فرمایا یہ کیا طرفہ ماجرا ہے اور یہ کہاں کا انصاف ہے۔؟

برق صاحب کا خیال ہے کہ روزہ کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بیوی سے مباشرت کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے اور کیونکہ حدیث زیر بحث میں یہ فعل آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے لہٰذا یہ حدیث صحیح نہیں ہوسکتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ :۔

اول تو اس میں توہین کا کوئی پہلو ہی نہیں اس لئے کہ مباشرت کے معنے جو برق صاحب سمجھ رہے ہیں وہ سرے سے غلط ہیں ۔ مباشرت کے معنی پاس اٹھنے بیٹھنے کے ہیں اور پاس اٹھنے بیٹھنے سے توہین نہیں ہوتی ۔ دوم باب ہشتم میں ہم نے تورات کے متعدد اقتباسات نقل کئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی توہین کا پہلو نکلتا ہے انبیاء علیہم السلام کے متعلق ہے کہ وہ شراب پیتے تھے ۔ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں سے زنا کیا ۔ داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا وغیرہ وغیرہ ۔ کیا ان باتوں سے اللہ تعالیٰ وانبیاء کی توہین نہیں ہوتی ۔ اگر آپ فرمائیں کہ نہیں ہوتی تو پھر روزے میں پاس اٹھنا بیٹھنا جو اتنا قبیح بھی نہیں اس سے توہین کیسے ہوتی ہے ۔ اور اگر آپ فرمائیں کہ توہین ہوتی ہے تو پھر فرمائیے کہ اس توہین شدید کے باوجود آپ کے نزدیک تورات محفوظ اور قطعی الصحت ہو تو حدیث کیوں نہ ہو؟ آخر شراب خوری، زنا کاری، جیسے شدید گناہوں کے باوجود جو انبیاء علیہم السلام کی نسبت تورات میں بیان ہوئے ہیں آپ تورات کے محرّف ہونے کے قائل کیوں نہیں ؟ بات درحقیقت یہ ہے کہ آپ نے مقابلہ نہیں کیا ۔ غور نہیں فرمایا ورنہ یہ غلط فہمیاں پیدا نہیں ہوتیں ۔ یہ تو تھی تورات کی بات اب قرآن مجید کی باتیں سنیئے، قرآن مجید میں ہے ۔

يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (ھود : ۷۸)	لوط علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے زیادہ پاک ہیں

پھر ارشاد فرمایا :۔

هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ؕ (الحجر : ۷۱)	یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو ان سے کر لو ۔

کیا بظاہر ان آیات سے نبی کی توہین نہیں ہوتی کہ اپنی کافر، بدکار (خلافِ وضع فطری عمل کرنے والی) قوم کو اپنی بیٹیاں پیش کر رہے ہیں اور یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ یہ تمہارے لئے زیادہ پاک ہیں ۔ یعنی پاک تو وہ نوجوان مرد بھی ہیں لیکن یہ زیادہ پاک ہیں اگر اس آیت سے واقعی توہین رسول ہوتی ہے تو پھر کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت بھی کسی تحریف کا نتیجہ ہے (معاذ اللہ) آخر اس تفریق کی بھی کوئی وجہ ہے ؟ کیا غیر مسلم ایسے قرآن اور ایسی تورات کو تسلیم کرے گا اور اگر کوئی غیر مسلم ایسی آیتوں کو تسلیم کر لے گا اور ان پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کرے گا تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ وہ حدیث زیر بحث کو بھی تسلیم کر لے گا اور اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کرے گا ۔ اگر آپ کے نزدیک زنا کاری ،

شراب خوری قابل عفو ہے تو اپنی منکوحہ بیوی کے پاس اٹھنا بیٹھنا اور اس کو پیار کرنا کون سا ناقابل معافی جُرم ہے ۔

نوٹ :۔ ہمارے نزدیک حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں یا قوم کی بیٹیوں کو پیش کرنے سے منشاء یہ تھا کہ ان سے نکاح شرعی کر لیا جائے ۔ ظاہری الفاظ سے اعتراض کا پہلو نکلتا ہے لیکن منشاء کے اعتبار سے اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں جو لوگ ظاہری الفاظ پر اعتراض کرتے ہیں انہیں اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے ۔

اور سنیئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا ۔ (التحریم : ۱۰)

اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان فرماتا ہے وہ دونوں ہمارے صالح بندوں کی بیویاں تھیں ۔ پھر ان دونوں نے اپنے شوہروں کی خیانت کی ۔

شوہر کی خیانت سے بظاہر زنا ہی مراد ہو سکتا ہے اور اس پر ایک قرینہ بھی ہے ۔ اس لئے کہ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم : ۱۲)

اور مسلمین کے لئے اللہ مریم بنت عمران کی مثال بیان فرماتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی ۔

حضرت مریم کے سلسلہ میں شرمگاہ کی حفاظت کا ذکر کرنے اور اوپر کی آیت میں شوہر کی خیانت کا ذکر کرنے سے کیا یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ شوہر کی خیانت سے کنایۃً بدکاری مراد ہے اب فرمائیے کیا ان نبیوں کی بیویاں زناکار تھیں ۔ کیا اس آیت سے ان نبیوں کی توہین نہیں ہوتی

نوٹ :۔ ہمارے نزدیک خیانت سے مراد زنا نہیں بلکہ شرک اور مشرکین کی خفیہ سازشوں میں شریک ہونا مراد ہے ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۔

(الاحزاب : ۵۳)

جب نبی کے گھر میں تم لوگ کھانا کھا چکو تو چلے جایا کرو اور یہ مت کرو کہ وہیں بیٹھ کر بات چیت میں مشغول ہو جاؤ ۔ اس سے نبی کو تکلیف ہوتی ہے لیکن تم سے شرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا ۔

⁂

بتائیے یہ تکلیف کیا تھی ۔ ۵۶ سال کی عمر میں تنہائی کی اتنی سخت ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کا اظہار کرنا پڑا ۔ اور جو بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم شرم کی وجہ سے نہ کہہ سکتے تھے اللہ تعالیٰ نے کہہ دی ۔ بتائیے اس آیت سے توہین رسول ہوئی یا نہیں ؟ اگر ہوتی تو کیا یہ آیت آپ کسی غیر مسلم کو سنا سکتے ہیں ۔ اگر آپ نے سنا دی تو پھر وہ ہمارے نبی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آخر اس آیت کا کیا جواب ہے ؟ کیا وہی جواب جو آپ نے حدیث کو دیا ؟ اگر نہیں تو تفریق کی وجہ بتائیے اگر آپ تاویل کریں تو آخر تاویل کے لئے آیت ہی کیوں ہے حدیث کیوں نہیں ۔ برق صاحب قرآن سے تو بظاہر توہین رسول ہوتی ہے یہ حدیث ہی ہے جو ان آیات کو صحیح معنی پہنا کر توہین کو محو کر دیتی ہے ۔ معاذ اللہ نہ قرآن مجید میں توہین کا پہلو ہے نہ حدیث میں بس اللہ صحیح فہم عطا کرے تو غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں ورنہ اعتراض تو کس چیز پر نہیں ہوا اور کون سی چیز اس سے بچی ۔

غلط فہمی

یہی وہ حدیث ہے جس نے مجھے احادیث سے بدظن کیا اور اس کتاب کی محرک بنی ۔ میں نے اس حدیث پر ہر قسم کے آدمیوں سے تبادلہ خیالات کیا مثلاً علماء ، مُلّا ، پروفیسر ، معلم ، انگریزی تعلیم یافتہ اور عوام صحیح المذاق علماء نے کہا ادب کا تقاضا یہی ہے کہ خاموش رہیئے ۔ پروفیسر ، معلم ، اور انگریزی تعلیم یافتہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے اور عوام غضب سے کھولنے لگے کہ سرور کائنات کی ذات پہ یہ حملہ ؟ لیکن ملا ہر مقام پہ یہی کہتا نظر آیا کہ حدیث درست ہے اور حضور یہ کام کرتے تھے ۔

(دو اسلام ص ۲۰۳)

ازالہ

معلوم نہیں کس قسم کے علماء سے آپ کو سابقہ پڑا غالباً وہ بھی آپ کی اصطلاح میں مُلّا ہی ہوں گے کہ اتنی معمولی بات بھی آپ کو نہ سمجھا سکے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ نے پروفیسر معلم ، انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے مباشرت کے کیا معنی بتائے ۔ وہ بیچارے مباشرت کو اپنی اصطلاح میں جماع سمجھ بیٹھے ہوں گے اور اس وجہ سے تعجب کا اظہار کیا ہوگا ورنہ روزے کی حالت میں پاس اٹھنے ، بیٹھنے اور پھرنے سے تعجب ہونا خود تعجب انگیز ہے اب ذرا ان لوگوں کے سامنے تورات و قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات تلاوت کر کے ان سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتے ہیں اگر وہ کانوں پر ہاتھ رکھیں تو پھر تورات کو اصلی غیر محرف اور قرآن مجید کو محفوظ سمجھنے کا جو عقیدہ آپ رکھتے ہیں اس پر نظر ثانی فرما لیجئے گا ، اور اگر یہ نہیں کر سکتے (حالانکہ تورات کے متعلق ایسا کرنا لازمی ہے) تو پھر یہ کیجئے کہ احادیث صحیحہ سے جو بدظنی پیدا ہو گئی ہے اس پر نظر ثانی فرما لیجئے گا ۔ اگر اللہ تعالیٰ ، رسول

صحابہ کی توہین کے تورات وقرآن دونوں مرتکب ہیں تو پھر حدیث پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر وہ صحیح ہیں تو پھر یہ بھی صحیح ہے۔

صحیح فہمی

"رسول اللہ صلعم کا ہر عمل امت کے لئے واجب التقلید ہے"
(دو اسلام صہ ۲۰۳)

تائید

برق صاحب آپ کا یہ جملہ کتنا مؤمنانہ جملہ ہے اسی جذبہ سے آپ نے اپنی کتاب تحریر کی۔ ہمارے حسن ظن اور آپ کی اپنی تحریر کے مطابق معاذ اللہ آپ کی تحریر معاندانہ نہیں اس کی بنا صرف غلط فہمی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

غلط فہمی

مانا کہ رسول اللہ ضبط نفس کی نعمت سے بہرہ ور تھے لیکن امت میں کتنے ایسے لوگ موجود ہیں جو معانقہ وغیرہ کے بعد جماع سے رک سکیں گے
(دو اسلام صہ ۲۰۳)

ازالہ

برق صاحب آپ کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ آپ خود بھی اس بات کے قائل ہیں کہ مباشرت سے مراد جماع نہیں ہے معلوم نہیں پھر اعتراض کی کیا وجہ ہے غالباً مباشرت کے جو معنی دوسروں کے حوالے سے آپ نے نقل کئے ہیں وہ اس کے محرک ہیں اگر یہ صحیح ہے تو یہ سارا اعتراض دوسروں پر ہونا چاہیے، نہ کہ حدیث پر

اب رہی یہ بات کہ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت روزہ مباشرت کی ہے، لہذا ہر امتی پر واجب ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے، یہاں بھی آپ سے غلط فہمی ہو گئی اگر روزہ میں مباشرت کرنا روزہ کا کوئی رکن ہوتا اور اس فعل کا تعلق براہ راست دین سے ہوتا تو پھر بے شک ایسا کرنا ہر امتی پر واجب تھا۔ لیکن روزہ میں مباشرت کرنا نہ روزہ کا رکن ہے نہ اس کا تعلق براہ راست دینی امور سے ہے لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل امت کے لئے صورت جواز پیش کرے گا نہ کہ وجوب، پھر اس سلسلہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرما دی ہے کہ کون اس فعل میں میری اتباع کر سکتا ہے اور کون نہیں۔ جو شخص خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہے وہ اس معاملہ میں آپ کی اتباع کر سکتا ہے اور جو قابو نہیں رکھ سکتا وہ اتباع بھی نہیں کر سکتا۔ یعنی اس اجازت درخصت سے وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

فَاِذَا الَّذِیْ رَخَّصَ لَهٗ شَیْخٌ وَالَّذِیْ نَهَاهُ شَابٌّ (ابوداؤد کتاب الصوم، سکت علیه المنذری والحافظ
نیل الاوطار جزء ۴ صہ ۱۸۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے کو مباشرت کی اجازت دی اور جوان کو اس سے منع فرمایا۔

٭ ٭ ٭

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس فعل کی صرف رخصت ہے نہ کہ وجوب۔ پھر یہ رخصت بھی عام نہیں بلکہ مقید، غرض یہ کہ احادیث میں تو ہر چیز کی وضاحت ہے، اور اعتراض عدم تحقیق کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھیے کہ مباشرت مفسد صوم نہیں اس نوعیت سے عقیدۂ حدیث کی اتباع سب کرتے ہیں اور اس عقیدہ کا ہونا فرض و واجب ہے رہا اس کا محرک جماع ہونا تو اس سبب سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی جوان کو اس سے روک دیا ہے، اور جس کی خواہشات کمزور ہو چکی ہوں یا جو اپنی خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہو اس کو رخصت دے دی ہے اور کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی خواہشات پر ہر انسان سے زیادہ قابو تھا۔ لہذا آپ نے اس پر عمل کر لیا۔ اور قابو میں رکھنے والوں کے لئے فعلی اجازت بھی مہیا کر دی اب جو لوگ اسے ناجائز کہتے ہیں اور جن کے اقوال برق صاحب نے ص۱۰۴ پر نقل کئے ہیں وہ ایسی ہی حالت کو ملحوظ رکھ کر کہتے ہیں جس میں اندیشۂ تحریک جماع ہو ورنہ نہیں اور اس سلسلہ میں تمام بحثوں کا یہی خلاصہ ہے۔

غلط فہمی

"امام بخاری اور مسلم نے تو صرف بوس وکنار اور گھٹنوں سے نیچے استعمال آلت کی اجازت دی تھی، ابو داؤد ایک قدم اور آگے نکل گئے کہتے ہیں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ روزہ رکھ کر مجھے چومتے تھے اور میری زبان چوستے تھے۔ ایں گل دیگر شگفت" (دو اسلام ص۲۰۵)

ازالہ

برق صاحب انصاف سے بتایئے صحیح بخاری و صحیح مسلم میں گھٹنوں سے نیچے آلہ کے استعمال کی اجازت آپ نے کہاں دیکھی؟ براہ کرم اس کا جواب دیجئے گا ورنہ اپنی غلط فہمی کو دور کر لیجئے گا۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں یہ عبارت نہیں ہے یہ ایک ملّاجی کی تشریح ہے جس کو آپ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں پھر زبان چوسنے کا اضافہ امام ابو داؤد کی طرف منسوب کرنا کتنی بڑی غلط فہمی ہے حالانکہ امام ابو داؤد تو خود فرماتے ہیں:۔

هٰذَا الْإِسْنَادُ لَيْسَ بِصَحِيْحٍ ۔ یہ سند صحیح نہیں ہے۔

(ابو داؤد عربی مطبوعہ مجتبائی دہلی جلد اول حاشیہ ص۳۳۱

وکذا فی نصب الرایہ جلد ۴ ص۲۵۳)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "اس کی سند ضعیف ہے" (نیل الاوطار کتاب الصوم)

زیلعی لکھتے ہیں:۔

رَوَاهُ اَحْمَدُ فِي مُسْنَدِهٖ وَهُوَ حَدِيْثٌ ضَعِيْفٌ ۔ قَالَ ابْنُ عَدِيٍّ وَيَمُصُّ لِسَانَهَا لَا يَقُوْلُهُ اِلَّا مُحَمَّدُ بْنُ

یعنی اس کو احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور یہ ضعیف ہے ابن عدی فرماتے ہیں زبان چوسنے کے الفاظ کوئی بیان نہیں کرتا

دِينَارٍ وَقَدْ ضَعَّفَهُ يَحْيَى بْنُ مُعِيْنٍ وَسَعْدُ بْنُ أَوْسٍ قَالَ ابْنُ مُعِيْنٍ فِيهِ أَيْضًا بَصْرِيٌّ ضَعِيفٌ وَقَالَ عَبْدُ الْحَقِّ فِي أَحْكَامِهِ هٰذَا حَدِيثٌ لَا يَصِحُّ فَإِنَّ ابْنَ دِينَارٍ وَابْنَ أَوْسٍ لَا يُحْتَجُّ بِهِمَا

سوائے محمد بن دینار کے اور تحقیق اس کو امام یحییٰ بن معین نے ضعیف کہا ہے اور سعد بن اوس بصری کو بھی امام ابن معین فرماتے ہیں ضعیف ہے اور عبد الحق نے احکام میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ ابن دینار اور ابن اوس دونوں ہی ناقابل حجت ہیں۔

(نصب الرایہ ج ۴ ص ۲۵۲ فصل فی الا ستبراء)

برق صاحب محدثین تو اسے کھوٹا اور ناکارہ سکہ سمجھ کر مسترد کر رہے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ محدثین ایک سے ایک بڑھیا حدیث گھڑتے گئے (دو اسلام ص ۲۰۵) کہئے یہ محدثین پر الزام نہیں ہے، برق صاحب کسی پر الزام لگانے کے لئے وہ چیز پیش کی جاتی ہے جس کو وہ صحیح تسلیم کرتا ہو اور جس کو وہ تسلیم ہی نہ کرتا ہو اس کو بطور حجت پیش کرنا بعید از عقل ہے۔

غلط فہمی حذیفہ فرماتے ہیں روزہ رکھ کر جو شخص بیوی کا تصور باندھے اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے (دو اسلام ص ۲۰۴، ۲۰۵)

ازالہ برق صاحب یہ بھی کھوٹا سکہ ہے یہ قول حضرت حذیفہ پر اتہام ہے امام شوکانی لکھتے ہیں:۔

قَالَ فِي الْفَتْحِ وَاسْنَادُهُ ضَعِيفٌ (نیل الاوطار باب تقبیل الصائم)

یعنی حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔

غلط فہمی "سوال حضرت عائشہ نے اسود کو تو مباشرت سے روکا لیکن خود اس فعل کا ارتکاب کرتی رہیں یہ کیا؟"..... کیا جواب دیں اس سوال کا، نہ صرف اس فعل کا ارتکاب کرتی رہیں بلکہ دوسروں کو ترغیب دیتی ہیں؛..... محدثین کرام کی نیرنگیوں کو کون سمجھے ہر طرف اختلاف ہر جگہ تضاد" (دو اسلام ص ۲۰۵-۲۰۶)

ازالہ حضرت عائشہؓ خود اس فعل کا ارتکاب کرتی رہیں۔ یہ کس حدیث میں ہے؟ براہ کرم اس کا حوالہ دیا جائے مسئلہ زیر بحث کی اصلیت یہ ہے کہ جو شخص اپنی خواہش کو قابو میں نہ رکھ سکتا ہو اس کے لئے بحالت روزہ مباشرت منع ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان کو اس سے منع فرما دیا اور جو شخص اپنی خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہے اس کے لئے اجازت ہے اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ایسا کر لیا کرتے تھے اور اسی لئے آپ نے ایک بوڑھے کو اس کی اجازت دی۔ عبد اللہ جن کا ذکر برق صاحب کی ذکر کردہ عبارت میں ہے کیونکہ

روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے بالکل علیحدہ رہا کرتے تھے پاس تک نہ آتے تھے۔ ان کی بیوی نے حضرت عائشہؓ سے شکایت کی تو حضرت عائشہ نے مسئلہ سمجھانے کے لئے یہ بات کہی کہ تم اپنی بیوی کے پاس کیوں نہیں آتے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ تم اپنی بیوی کے پاس آسکتے ہو، پیار کر سکتے ہو، کھیل سکتے ہو۔ یہ راہبانہ زندگی تم نے کس سے سیکھی۔ عبداللہ کو اس پر تعجب بھی ہوا اور پوچھا کہ کیا پیار بھی کر سکتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہاں (موطا امام مالک) گویا حضرت عائشہؓ کا مقصد مسئلہ سمجھانا اور ان کی شدت کو ختم کرنا تھا نہ اس میں کوئی ترغیب تھی نہ کچھ اور، سیاق و سباق اور پس منظر کو سامنے نہ رکھنے سے ایسی غلط فہمیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ برق صاحب غالباً یہ سمجھے ہوں گے کہ بیوی کے ساتھ ہنسنا بولنا، پیار کرنا بغیر شہوت کے ہو ہی نہیں سکتا اور غالباً غلط فہمی کی اصل وجہ یہی ہے۔

غلط فہمی حیا عورت کی فطرت ہے کوئی عورت کسی صورت میں بھی شرمگاہوں (مردانہ ہوں یا زنانہ) کا ذکر نہیں کرتی۔ آج تک کسی بیوی نے اپنے شوہر سے مباشرت کی التجا نہیں کی اور نہ مرد کے سامنے کبھی عریاں بات کی، تو پھر ہم یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ حضرت عائشہؓ غیر مردوں کو اپنے گھر میں اور وہ بھی روزہ کی حالت میں بوس و کنار کی ترغیب دیتی تھیں۔ (دو اسلام صہ ۲۰۶-۲۰۷)

ازالہ بے شک حیا عورت کی فطرت ہے لیکن اظہار حق کے معاملہ میں حیا مذموم ہے یہی وجہ ہے کہ مسائل کے بیان میں ازواج مطہرات نے اخفائے حق سے کام نہیں لیا اور کنایوں میں مسائل کو حل کر دیا۔ یہ قطعاً صحیح نہیں کہ زوجہ مطہرہ نے شرمگاہوں کا ذکر کیا ہو اگر ایسی کوئی حدیث ہو تو بتائیے۔ پھر یہ بھی بتائیے کہ ڈاکٹری وطب یونانی کے کالجوں اور مدرسوں میں تناسل و توالد پر لیکچر دئیے جاتے ہیں یا نہیں۔ لیکچر دینے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں اور سننے والوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط جماعتیں ہوتی ہیں اور آج کل کا گندہ معاشرہ ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کسی نے کہا ہے کہ یہ کیا بے حیائی ہے بلکہ اب تو عام اسکولوں میں اس کی ابتدائی تعلیم لازمی ہو گئی ہے۔ ہر اسکول میں اعضائے تناسل کے متعلق پڑھایا جاتا ہے اس کی شکلیں تک کھینچی جاتی ہیں پڑھانے والی عورتیں ہوتی ہیں۔ پڑھنے والی بھی عورتیں ہوتی ہیں لیکن اس تعلیم سے ان دونوں کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہاں عورت کی فطرت کہاں چلی جاتی ہے۔

برق صاحب آپ بار بار لفظ مباشرت کو جماع کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں اس سے قارئین کو بڑی غلط فہمی ہوتی ہے۔

پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے غیر مردوں کو اپنے گھر میں بوس و کنار کی ترغیب دی

تھی۔ جس شخص سے حضرت عائشہؓ نے یہ بات کہی تھی آپ ہی کے بیان کے مطابق وہ حضرت ابوبکرؓ کے پوتے حضرت عبداللہ تھے (دو اسلام صد ۲۰۶) لہذا عبداللہ حضرت عائشہ کے حقیقی بھتیجے اور محرم تھے اور حضرت عائشہؓ ان کی حقیقی پھوپھی تھیں اب بتایئے کہ وہ محرم تھے یا نامحرم۔ معلوم نہیں آپ لکھتے وقت کچھ غور بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ اچھا اب یہ بھی بتائیے کہ ماں یا پھوپھی اپنے بچہ کو اسی قسم کے مسائل سے آشنا کرتی ہے یا نہیں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ بچہ مسئلہ کو غلط سمجھا ہو، حضرت عائشہ رضؓ نے عبداللہ کی غلط فہمی دور کر کے مسئلہ سمجھا دیا اور روزہ میں راہبانہ زندگی کو مہمل قرار دیا۔

غلط فہمی "ساری قوم میں حضرت عائشہ کو کیا پڑی تھی کہ مباشرت کی تلقین کرتی پھریں۔ آخر حضور علیہ السلام کے حرم میں دس ازواج اور بھی تھیں، ہر صحابی کے گھر میں ایک ایک بیوی تھی۔ خود صحابہ کے منہ میں زبان تھی پھر کیا وجہ ہے کہ مباشرت کی اکثر احادیث حضرت عائشہ سے منقول ہیں" (دو اسلام صد ۲۰۷)

ازالہ گویا برق صاحب کے خیال میں یہ حدیث صرف حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ یہ عدم تحقیق کا نتیجہ ہے یہ حدیث زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔

غلط فہمی "مجھے یوں نظر آتا ہے کہ دشمنان اسلام نے حضرت عائشہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقار کو کم کرنے کے لئے یہ احادیث وضع کیں" (دو اسلام صد ۲۰۷)

ازالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ بیویوں کے تو آپ بھی قائل ہیں (دو اسلام صد ۲۰۷) تو کیا یہ گیارہ بیویوں کا افسانہ بھی کسی دشمنان اسلام کا شاخسانہ ہے تاکہ اس سے کردار رسول پر بھرپور چوٹ پڑے اور آپ کا وقار ختم ہو جائے اور جب یہ نہیں تو اظہار مسائل سے وقار ختم نہیں ہوتا۔ یہ بالکل مرعوب ذہنیت ہے۔

یہ حدیث جب دوسرے صحابیوں سے بھی مروی ہے تو پھر صرف حضرت عائشہؓ کا نام لینا غلط فہمی ہے لہذا وضع کا شاخسانہ لغو ہے آخر دشمنان اسلام کے نام تو لیجیے۔ امام مالک نے ... اس کو ہشام بن عروہ، اور عروہ بن زبیر سے روایت کیا ہے۔ عروہ، حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے اور حضرت عائشہ کے حقیقی بھانجے اور تربیت یافتہ ہیں۔ ہشام انہی عروہ کے لڑکے، اور بہت بڑے امام ہیں۔ اب فرمایئے اس حدیث کے گھڑنے والے حضرت عروہؓ ہیں یا امام ہشام یا خود امام مالک ہیں۔ ان میں سے کس کو آپ دشمن اسلام سمجھتے ہیں؟ پھر اس کی یہی ایک سند نہیں بلکہ متعدد اسناد ہیں کس کس امام کو آپ دشمن اسلام سمجھیں گے کیا قرآن کی اس آیت "تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ"، (یعنی اے رسول تم اپنی بیویوں کی رضا کے جویا ہو) سے رسول اور ازواج کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچی؟ پھر کس کس

چیز کو آپ دشمنانِ اسلام کا کرشمہ قرار دیں گے۔

خُلاصہ

روزے کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس اٹھنا بیٹھنا اور خواہشات پر قابو رکھنے والے کے لئے پیار کرنا بالکل جائز ہے اس سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے نہ روزے میں کوئی خرابی آتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے منہ میں پانی لے کر کلی کرنا جس طرح منہ میں پانی لینے سے روزہ میں کوئی نقص نہیں آتا اسی طرح بیوی کو پیار کرنے سے بھی کوئی نقص نہیں آتا اور یہ مثال خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کو پیار کیا۔ پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

اَرَأَیْتَ لَوْ تَمَضْمَضْتَ بِمَاءٍ	یہ بتاؤ اگر تم روزے میں پانی سے کلی کرلیتے
وَاَنْتَ صَائِمٌ قُلْتُ لَا بَاْسَ بِذٰلِكَ	تو کیا ہوتا۔ میں نے کہا اس میں تو کوئی
فَقَالَ فَفِیْمَ (ابوداؤد کتاب	حرج نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر اس میں کیا
الصیام وسندہ صحیح نیل الاوطار	حرج ہے؟
جزء ۴ صـ۱۷۹)	

مطلب یہ کہ منہ میں پانی لینا اگرچہ پانی پینے کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن کیونکہ اس میں پانی پینے کی نیت نہیں ہوتی۔ لہذا روزہ میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح پیار کرنا جماع کا پیش خیمہ ہے لیکن جب پیار کرنے سے جماع و شہوت کی نیت نہیں ہوتی۔ تو ایسا پیار بھی روزہ میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتا۔

آپ کہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت ہی کافی تھی، عمل کرکے دکھانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ ہم کہتے ہیں اس کی بھی وجہ ہے لیکن اگر وجہ نہ بھی ہو تو جائز کام کرنے میں اعتراض ہی کیا ہے آپ بلاوجہ ڈر رہے ہیں، وجہ یہ ہے کہ مدعیانِ تقویٰ کے غلو کو توڑنا مقصود تھا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مدعیِ تقویٰ یہ کہہ دے کہ یہ کام تقویٰ کے منافی ہے لہذا مناسب نہیں۔ عورت سے دور رہنا ہی مستحسن ہے۔ اور اس طرح راہبانہ زندگی کی داغ بیل ڈالی جائے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایک شخص نے پیار کرنے کو مناسب نہیں سمجھا بلکہ آپ کے فعل کو ٹالنے کی کوشش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَتْقَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَخْشَاکُمْ	اللہ کی قسم مجھ میں تم سب سے زیادہ اللہ کا
(صحیح مسلم)	تقویٰ اور اس کی خشیت ہے۔

بلکہ یہاں تک فرمایا :۔

اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِحُدُوْدِ اللّٰہِ (رواہ عبدالرزاق باسناد صحیح۔ نیل الاوطار جز ۴ ص۱۸۱)
میں اللہ تعالیٰ کے حدود کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ محرمِ رموزِ شریعت تھے۔ لہٰذا جو کچھ آپ نے کیا وہ شریعت کے حدود کے اندر رہ کر کیا اور جو کچھ کیا وہ جائز تھا۔ نامناسب نہیں تھا آپ اور ہم اس کو نامناسب کہنے والے کون؟

غلط فہمی

"قرآن شریف میں مذکور ہے :۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ ھُوَ اَذًی فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِی الْمَحِیْضِ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰی یَطْھُرْنَ فَاِذَا تَطَھَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ۔ (البقرۃ)

لوگ آپ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ حیض ایک قسم کی غلاظت ہے اس لئے دورانِ حیض میں بیویوں سے دور رہیئے اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب مت جائیے اور پاک ہونے کے بعد ان سے مباشرت کیجئے۔

اس آیت میں دو حکم دئے گئے ہیں، اول حیض کی حالت میں عورتوں سے دور رہیئے، دوم ان کے قریب مت جائیے۔ ذرا دیکھیں حدیث نے اس قرب و دُور کی کیا تشریح کی ہے؟

عَنْ عَائِشَۃَ .... کَانَ یَاْمُرُنِیْ فَاَتَّزِرُ فَیُبَاشِرُنِیْ وَاَنَا حَائِضٌ۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حیض کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تہ پوش پہننے کا حکم دیتے اور اس کے بعد مجھ سے مباشرت کرتے تھے۔

یہ ہے قریب و دُور کی تشریح حدیث میں" (دو اسلام ص۲۰۷-۲۰۸)

ازالہ

آیت مذکور میں "اَذًی" وارد ہوا ہے برق صاحب نے اس کا ترجمہ غلاظت کیا ہے حالانکہ یہ لفظ اذیت سے بنا ہے یعنی حیض ایک قسم کی تکلیف ہے اور اس تکلیف کی حالت میں قربت مناسب نہیں ہے ہاں جب وہ اس تکلیف سے پاک ہو جائیں تو پھر ان کے پاس آؤ اس طریقہ سے جس طریقہ سے آنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ یعنی قانون فطرت کے مطابق نہ کہ خلاف وضع فطری کے طور پر، یہ ہے آیت کا منشاء اور مفہوم۔ آیت میں قربت سے مراد جماع ہے نہ کہ پاس اٹھنا بیٹھنا اور "فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ" (اللہ کے حکم کے مطابق ان کے

پاس اٹھ) اس پر قرینہ ہے۔ برق صاحب نے قرب کے معنی پاس بیٹھنے کے سمجھ لئے اور اتنی لمبی چوڑی بحث کر ڈالی۔ آیت میں جماع کی ممانعت ہے۔ حدیث میں پاس اٹھنے بیٹھنے کی اجازت، دونوں میں تعارض کہاں ہے۔ برق صاحب نے بار بار پاس اٹھنے بیٹھنے کے بجائے لفظ مباشرت استعمال کیا ہے حالانکہ وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ لفظ اردو میں دوسرے معنی رکھتا ہے اور غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے۔ برق صاحب کی تحریر جو کوئی پڑھے گا وہ یہی سمجھے گا کہ جماع کرتے تھے حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔

غلط فہمی

"احادیث میں بار بار آتا ہے:۔

وکان املککم لاربہ کہ حضور کو اپنی خواہشات پر کمال ضبط تھا

(بخاری و مسلم و موطا وغیرہ)

یہ عجیب قسم کا ضبط ہے کہ بقول بخاری و مسلم آپ نہ روزے میں مباشرت سے رکتے تھے نہ حیض میں" (دو اسلام صہ ۲۱۰-۲۱۱)

ازالہ

یہ جملہ کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی خواہشات پر کمال ضبط تھا" دوسری احادیث میں نہیں آیا ہے بلکہ معاشرت در حیض اور مباشرت در صوم کی احادیث ہی میں وارد ہوا ہے معلوم نہیں برق صاحب نے کس وجہ سے اس کو علیحدہ ذکر کیا ہے اس کلمہ سے ہی تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مباشرت کے معنی وہ نہیں جو ہماری اصطلاح میں لئے جاتے ہیں۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ آپ حالت حیض میں اور حالت صوم میں مباشرت فرمایا کرتے تھے اور آپ کو اپنی خواہشات پر مکمل ضبط حاصل تھا (بخاری و مسلم) حضرت عائشہ کے آخری الفاظ بتا رہے ہیں کہ مباشرت سے مراد جماع نہیں بلکہ پاس بیٹھنا مراد ہے۔ برق صاحب اس کے معنی جماع بتاتے ہیں اور یہی غلط فہمی کا اصل سبب ہے۔ حدیث کا مطلب صاف ہے کہ آپ مباشرت تو کرتے تھے لیکن کمال ضبط کی وجہ سے جماع نہیں کرتے تھے۔

غلط فہمی

"امام مالک نے بھی یہ احادیث نقل کی ہیں لیکن حضور کی طرف مباشرت منسوب نہیں کی۔ صرف بوسے کا ذکر کیا ہے بدیگر الفاظ امام مالک بھی یہ سمجھتے تھے کہ مباشرت کی نسبت حضور والا صفات کی طرف مرادف تنقیص ہے"

(دو اسلام صہ ۲۱۱)

ازالہ

"مباشرت" کے معنی پاس اٹھنے بیٹھنے کے ہیں اس لحاظ سے بوسہ کچھ مباشرت سے زیادہ ہی ہے لیکن برق صاحب مباشرت کے معنی جماع لے رہے ہیں اور اسی وجہ سے اس کو بوسہ سے زیادہ سمجھ کر موجب تنقیص سمجھ رہے ہیں۔ امام مالک کی موطا میں مباشرت کا لفظ استعمال نہیں ہوا،

یہ تو صحیح ہے لیکن جو اس کے معنی ہیں وہ موطا میں موجود ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ کے پاس حیض کی حالت میں لیٹنا، اور پاس اٹھنا بیٹھنا اسی کو تو مباشرت کہتے ہیں اور یہ چیز موطا میں موجود ہے جماع کے معنوں میں یہ لفظ نہ موطا میں ہے نہ کسی دوسری کتاب میں۔

غلط فہمی

"بخاری کی حدیث ہے:۔

عن عائشۃ قالت کنت اغتسل انا والنبی صلی اللہ علیہ وسلم من اناء واحد۔	حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے نہاتے تھے۔

مطلب یہ کہ حضور ازواج کے ہمراہ برہنہ غسل فرمایا کرتے تھے" (دو اسلام صہ ۲۱۱)

ازالہ

برق صاحب نے تمام حالات کا جائزہ نہیں لیا ورنہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

اول:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

كُنْتُ أَنَامُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِجْلَايَ فِي قِبْلَتِهٖ فَإِذَا سَجَدَ غَمَزَنِي فَقَبَضْتُ رِجْلَيَّ فَإِذَا قَامَ بَسَطْتُهُمَا وَالْبُيُوتُ يَوْمَئِذٍ لَيْسَ فِيهَا مَصَابِيحُ (موطا مالک باب ما جاء فی صلوٰۃ اللیل)	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لیٹی ہوتی تھی اور میرے پیر آپ کے قبلہ کی جانب ہوتے تھے پس جب آپ سجدہ کرتے تو میرے پیر کو دبا دیتے میں پیر سمیٹ لیتی پھر جب آپ کھڑے ہو جاتے تو میں پیر پھیلا دیتی اور ان ایام میں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔

یعنی تاریکی کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ آپ سجدہ کے لئے جھک رہے ہیں لہذا آپ کو پیر دبانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اگر اجالا ہوتا تو حضرت عائشہ آپ کو سجدہ کے لئے خود ہی جھکتا ہوا دیکھ لیتیں۔ دوسری حدیث سنیئے حضرت عائشہ فرماتی ہیں:۔

فَقَدْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً مِنَ الْفِرَاشِ فَالْتَمَسْتُهُ فَوَقَعَتْ يَدِي عَلَى بَطْنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوبَتَانِ (صحیح مسلم باب ما یقال فی الرکوع والسجود)	ایک رات کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہیں پایا تو میں نے ٹٹولا، میرے ہاتھ آپ کے تلووں پر لگے۔ آپ سجدہ کر رہے تھے اور آپ کے پاؤں مبارک کھڑے تھے۔

❁ ❁ ❁ ❁

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر میں اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ ایک

دوسرے کو دیکھنا محال تھا لہٰذا احادیث پر جو اعتراض ہے وہ کالعدم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھتے تھے حضرت عائشہ فرماتی ہیں:-

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ایسے وقت
لَیُصَلِّی الصُّبْحَ فَیَنْصَرِفُ النِّسَآءُ	پڑھتے تھے کہ عورتیں جب نماز پڑھ کر اپنی چادروں
مُتَلَفِّفَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ مَا یُعْرَفْنَ	میں لپٹی ہوئی واپس لوٹتی تھیں۔ تو
مِنَ الْغَلَسِ (موطا امام مالک باب	اندھیرے کے سبب سے پہچانی نہیں
وقوت الصّلٰوۃ وصحیح بخاری وصحیح مسلم)	جاتی تھیں۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد بھی اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ کسی کو پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ تو کھلی جگہ کا حال تھا۔ حجرہ کے اندھیرے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب نماز کے بعد کھلی جگہ میں اچھی طرح دیکھا نہیں جا سکتا تھا تو پھر بند حجرے میں شدید تر تاریکی میں کیا نظر آتا ہوگا۔ پس اس تشریح سے ثابت ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کو برہنہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے لہٰذا اعتراض فضول ہے۔

رہا برق صاحب کا یہ کہنا کہ یہ چیز سبق نہیں، دشمن کیا کہیں گے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان تو متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کرنا بھی نہیں تھا۔ دشمن کہتے ہیں جو کچھ کہتے ہیں۔ پھر کیا آپ اس واقعہ کو قرآن مجید سے نکال دیں گے۔ برق صاحب یہاں دوسرے کی نگاہ میں سبق نہ سبق کا سوال نہیں ہے۔ یہاں تو آپ کے افعال سے ضابطہ حیات تیار کروایا جا رہا ہے۔ یہاں مسائل وصل رہے ہیں۔ جائز اور ناجائز میں سنت کے ذریعہ امتیاز کروایا جا رہا ہے لہٰذا ہر وہ چیز ملے گی جس سے ضابطۂ حیات انسانی پر روشنی پڑتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رہبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندرونی حالات بھی منظر عام پر لائے گئے اور یہی تو ضابطہ کا کمال ہے اور ہم اس پر نازاں ہیں اور آپ اس سے شرمارہے ہیں۔

دوم: حدیث میں ہے کہ:

مِنْ اِنَاءٍ بَیْنِیْ وَبَیْنَہٗ وَاحِدٍ ۔	یعنی ہم ایک ہی لگن سے نہایا کرتے جو ہم دونوں
(صحیح مسلم عن عائشۃ)	کے درمیان رکھا ہوتا تھا۔

لہٰذا یہ لگن دونوں کے درمیان پردہ کا کام بھی کرتا تھا۔

خُلاصہ

انتہائی تاریکی میں دونوں نہاتے تھے، ایسا اندھیرا ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے، پھر دونوں کے درمیان لگن رکھا ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ دونوں ایک دوسرے کو برہنہ دیکھتے تھے،

بالکل غلط ہے۔

سوم : برق صاحب آپ نے یہ حدیث نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دونوں برہنہ نہایا کرتے تھے۔ براہِ کرم بتائیے کہ اس میں "برہنہ" کس لفظ کا ترجمہ ہے آخر اس اضافہ کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی؟ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ دونوں تہہ بند باندھ کر نہایا کرتے تھے دونوں کے درمیان پردہ پڑا ہوتا تھا تو کیا یہ اضافہ ناجائز ہوگا، اگر وہ جائز ہے تو یہ اس سے زیادہ جائز ہے۔ اور شایانِ شان بھی ہے کاش آپ نے بجائے اس اضافہ کے یہ اضافہ کر دیا ہوتا تو کتنا قرینِ انصاف تھا، حدیث میں برہنہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا اعتراض فضول ہے۔

برق صاحب تمام احادیث پر نظر ڈال کر کسی حدیث کا مطلب نکالا کیجئے تاکہ کبھی غلط فہمی

غلط فہمی

"اور سنیئے ابوسلمہ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت عائشہؓ کا بھائی، حضرت عائشہؓ کے پاس گئے ان کے بھائی نے ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح غسل فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے پانی سے بھرا ہوا ایک برتن منگوایا جس سے آپ نے غسل کیا اور سر پر بھی پانی ڈالا درمیان میں ایک پردہ لٹکایا ہوا تھا" (بخاری جلد ۱ ص ۳۹) سوال یہ ہے کہ آیا یہ دونوں اس پردے میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو غسل کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اگر جواب نفی میں ہے تو غسل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نمائش کرنے کا مقصد کیا تھا اور اگر اثبات میں ہے تو پھر" (دو اسلام ص ۲۱۲۔۲۱۳)

ازالہ

برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی۔ غسل کے معنی صرف نہانے کے نہیں، بلکہ غسل کے معنی نہانے کے پانی کے بھی ہیں اور ان معنوں میں یہ لفظ صحیح بخاری ہی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً حضرت میمونہؓ فرماتی ہیں

وَضَعْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غُسْلًا (صحیح بخاری کتاب الغسل)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے غسل رکھا یعنی نہانے کا پانی رکھا۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں اس حدیث کی جو سرخی ہے وہ خود اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے کافی ہے امام بخاری نے اس حدیث پر باب باندھا ہے۔

الغسل بالصاع ونحوہ	غسل تقریباً ایک صاع پانی سے کرنا چاہیئے۔

صحیح مسلم میں سرخی یہ ہے:۔

قدر المستحب من الماء فی غسل الجنابۃ	غسل میں کتنا پانی لینا مستحب ہے۔

اس بنا پر فَسَأَلَهَا عَنْ غُسْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے نہانے کے پانی کے متعلق سوال کیا اس سوال کے جواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا کیا ؟ وہ ان ہی الفاظ کے آگے مذکور ہے کہ "فَدَعَتْ بِإِنَاءٍ"، انہوں نے ایک برتن منگوایا اور اس برتن کے ذریعہ یہ بتادیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے پانی سے نہایا کرتے تھے لہذا حدیث مذکور میں غسل کی کیفیت کا بیان نہیں، بلکہ غسل کے پانی کا بیان ہے اس سے غسلِ رسول کی نمائش کرنا مقصود نہ تھا غسل کی کیفیت تو حضرت عائشہ نے زبانی بتائی تھی ابوسلمہ کہتے ہیں:۔

قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اغْتَسَلَ بَدَأَ بِيَمِيْنِهِ الخ (صحیح مسلم)	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل کرتے تو سیدھے ہاتھ سے شروع کرتے وغیرہ وغیرہ

نسائی میں اس طرح ہے کہ ابوسلمہ کہتے ہیں:۔

وَصَفَتْ عَائِشَةُ غُسْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْجَنَابَةِ قَالَتْ كَانَ يَغْسِلُ يَدَيْهِ ثَلَاثًا......	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی کیفیت بتائی تو کہا کہ آپ پہلے دونوں ہاتھ دھوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ کہ غسل کی کیفیت بتانے کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے غسل نہیں کیا۔ بلکہ جب انہوں نے پانی کی مقدار کا ذکر کیا تو ابوسلمہ وغیرہ نے تعجب کا اظہار کیا کہ اتنے کم پانی سے کیسے نہایا جا سکتا ہے تو حضرت عائشہ نے کہا یہ بالکل ممکن ہے اور اب میں نہانے جا رہی ہوں، اور اتنے ہی پانی سے نہاؤں گی پس انہوں نے پردہ ڈالا اور غسل فرمایا اور یہ ثابت کر دیا کہ اتنے پانی سے نہانا ناممکن نہیں۔ نہانے کا مقصد یہ تھا، نہ کہ وہ جو برق صاحب سمجھے۔

غلط فہمی چار نامحرم آنکھیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو غسل کرتا دیکھیں اور امام بخاری کو نہ غیرت آئے، نہ غصہ اور اس حدیث کو قول رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سمجھ کر اپنی کتاب میں شامل کرلیں،، کیا کوئی مسلمان یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی ایک پتلا سا پردہ تان کر سارے محلے کے سامنے نہائے اور شرعی غسل کا طریقہ بتائے۔ (دو اسلام ص ۲۱۳)

ازالہ برق صاحب یہ وہی مبالغہ اور رنگ آمیزی ہے جس کا ذکر آپ پہلے کر چکے ہیں ان میں سے کوئی بھی بات صحیح نہیں۔ دو آدمیوں کو چار آنکھ کہہ کر عجیب رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے آپ دو آدمی بھی کہہ سکتے تھے پھر آپ نے ان دونوں کو نامحرم کیسے بنا دیا۔ آپ کی نقل کردہ عبارت میں موجود ہے کہ میں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھائی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے (دو اسلام ص ۲۱۲-۲۱۳)

لہذا آپ ہی کی کتاب اور خود حدیث کے متن سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایک تو یقیناً حضرت عائشہؓ کے بھائی تھے اور محرم تھے۔ اب رہ گئے ابوسلمہ، تو ابوسلمہ بھی حضرت عائشہؓ کے رضاعی بھانجے تھے۔ لہذا دونوں محرم تھے، برق صاحب یہ تو بتائیے کہ یہ "پتلا سا پردہ تان کر سارے محلے کے سامنے نہائے" یہ کن الفاظ کا ترجمہ ہے:۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلعم قال اذا جلس بین شعبہا الاربع ثم جھدھا وجب علیہ الغسل وان لم ینزل (مسلم ج ۱ صہ ۴۸۵)	ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا، جب مرد عورت کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر زور لگانا شروع کر دے تو اس کے لئے نہانا ضروری ہو جاتا ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اب اس بحث کو جانے دیجئے کہ کتنی احادیث کی رُو سے غسل ضروری نہیں۔ (تفصیل گذر چکی ہے) حدیث کی زبان دیکھیے۔ ماشاءاللہ "کتنی پاکیزہ اور شُستہ" ہے (دو اسلام صہ ۲۱۴)

ازالہ

برق صاحب عربی عبارت تو بے شک "پاکیزہ اور شُستہ" ہے ناشائستگی تو ترجمہ نے پیدا کر دی ہے صحیح ترجمہ یہ ہے "جب کوئی مرد عورت کے چاروں شعبوں کے درمیان بیٹھ جائے پھر اس کے ساتھ کوشش کرے تو غسل فرض ہو جائے گا خواہ انزال نہ ہو" برق صاحب آپ نے جو ترجمہ کیا ہے اس سے بھی زیادہ ناشائستہ اور شرمناک ترجمہ ہوسکتا ہے۔ مترجم کی مرضی پر انحصار ہے چاہے جیسا ترجمہ کر دے۔ برق صاحب ذرا قرآن مجید کے مندرجہ ذیل کلمات پر غور فرمائیے:۔

(۱) خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ (۲) اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ (۳) فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا (۴) اَلَّتِىۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا (۵) نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٌ لَّـكُمۡ فَاۡتُوۡا حَرۡثَكُمۡ اَنّٰى شِئۡتُمۡ

کیا ان کلمات کے ناشائستہ اور حیاسوز ترجمے نہیں ہو سکتے؟ ہوسکتے ہیں لیکن یہ قصور ترجمہ کا ہوگا نہ کہ متن کا۔

غلط فہمی

برق صاحب لکھتے ہیں:۔

جب اللہ کے فضل و کرم سے حضور نے قلعہ خیبر کو فتح کر لیا تو کسی نے کہا، صفیہ بنت حیی بڑی خوب صورت لڑکی ہے اس کا خاوند جنگ میں مر چکا ہے اور وہ ابھی دلہن ہے یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے لئے پسند کر لیا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور خیال سے نہیں بلکہ صفیہ کی شہرتِ حسن سن کر اپنے حرم میں

داخل کر لیا تھا (دو اسلام صہ ۲۱۵)

ازالہ

برق صاحب حدیث کے مختلف اسناد سے بیان کردہ ٹکڑے آپ کی پریشانی کا سبب ہیں، آپ نے ان عبارتوں کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان عبارتوں کو متضاد سمجھ کر اعتراض کر دیا ہے۔

برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت صفیہ جنگ خیبر کے اسیروں میں شامل تھیں، ایک صحابی نے رسول اللہ صلعم سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آپ نے فرمایا، خود چن لو، اس نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا، بعد میں کسی نے کہا کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے اسے لونڈی بنا کر اس سے خدمت لینا ظلم ہے اس لئے حضور اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں۔ حضور نے یہ تجویز مان لی اور اسے آزاد کر کے نکاح کر لیا" (دو اسلام صہ ۲۱۴-۲۱۵)

یہ دونوں عبارتیں صحیح بخاری ہی سے ماخوذ ہیں۔ برق صاحب کو پہلی عبارت شایانِ شان نہیں معلوم ہوئی وہ دوسری کو صحیح سمجھتے ہیں اور پہلی کو غلط۔ حالانکہ دونوں صحیح ہیں، اور ایک دوسرے میں اسطرح پیوست ہیں جیسا کہ درج ذیل ہے۔

"حضرت صفیہ اسیروں میں شامل تھیں۔ ان کے حسن کا ذکر آپ کے سامنے ہوا یہ بھی کہا گیا کہ وہ ابھی دلہن ہیں یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ حضرت دحیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک لونڈی کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا لے لو انہوں نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا۔ بعد میں کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کا ذکر کیا اور آپ سے عرض کیا کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے اور آپ کے سوا کسی کے شایانِ شان نہیں اس لئے آپ اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز منظور کر لی اور انہیں آزاد کر کے نکاح کر لیا"

حدیث تو بالکل صحیح ہے برق صاحب کو خواہ مخواہ الجھن پیدا ہو گئی۔ کاش وہ ان عبارتوں کو ترتیب دے کر سمجھنے کی کوشش فرماتے۔ قصصِ قرآن مجید میں بھی یہی دقت پیش آتی ہے کوئی بات کہیں ہے اور کوئی کہیں، بظاہر تضاد نظر آتا ہے لیکن ترتیب عبارات سے یہ تضاد کالعدم ہو جاتا ہے (قرآن مجید کے اس ظاہری تضاد کو تفصیل سے دیکھنا ہو تو اس کتاب کا بیسواں باب ملاحظہ فرمائیے) مجملاً بطور مثال کے ایک آیت درج ذیل ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (البقرۃ: ۲۱۳)	سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ پس اللہ نے نبی بھیجنے شروع کر دیئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب لوگ ایک ہی صراطِ مستقیم پر متحد و متفق تھے۔ تو پھر نبی بھیجنے کی

کیا ضرورت پیش آئی، جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے جو دوسری جگہ مذکور ہے۔ یعنی "انہوں نے اختلاف کیا" لہٰذا آیت مذکورہ کا ترجمہ اس طرح ہوگا "سب لوگ ایک ہی جماعت تھے (پھر انہوں نے اختلاف شروع کر دیا) تو اللہ تعالیٰ نے (اس اختلاف کو رفع کرنے کی غرض سے) نبی بھیجنے شروع کر دئے۔

برق صاحب اس طرح منتشر عبارات کو ترتیب دے کر اعتراض دور کر لیا کیجئے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

عن قتادة عن انس بن مالك قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يدور على نسائه في الساعة الواحدة من الليل والنهار وهن احدى عشرة قال قلت لانس او كان يطيقه قال كنا نتحدث انه اعطى قوة ثلاثين رجلا۔	قتادہ کہتے ہیں کہ مجھے انس بن مالک نے بتایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دن ہو یا رات ایک ہی وقت میں اپنی گیارہ بیویوں سے مجامعت فرمایا کرتے تھے ہیں نے پوچھا رسول اللہ صلعم میں اتنی طاقت تھی کہا آپ میں تیس مردوں کی طاقت موجود تھی۔ (بخاری)

ملاحظہ کیا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دلچسپ تصویر۔ یہ حدیث صریحاً غلط ہے (دو اسلام ص۲۱۶-۲۱۷)

ازالہ

حدیث تو غلط نہیں ہے آپ "کَانَ یَدُوْرُ" کا ترجمہ غلط کر کے الجھن میں پڑ گئے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے "دورہ کرتے تھے" لہٰذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے دوسری حدیث میں اس کی تشریح موجود ہے:۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْصَرَفَ مِنَ الْعَصْرِ دَخَلَ عَلٰى نِسَآئِهٖ (بخاری کتاب النکاح)	یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عصر سے فارغ ہوتے، تو اپنی بیویوں کے پاس تشریف لے جاتے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

اِذَا صَلَّى الْعَصْرَ دَارَ عَلٰى نِسَآئِهٖ (صحیح مسلم کتاب الطلاق)	جب نماز عصر پڑھ چکتے تو اپنی بیویوں کے ہاں دورہ کرتے تھے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

قَلَّ يَوْمٌ اِلَّا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَطُوْفُ عَلَيْنَا جَمِيْعًا، فَيُقَبِّلُ وَ	حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر روزانہ ہم سب کے پاس

يَلْبَسُ مَا دُونَ الْوِقَاعِ ٥ (رواہ ابوداؤد وسکت علیہ الحافظ فتح الباری کتاب النکاح باب القرعۃ بین النسآء اذا اراد سفراً وروی نحوہٗ احمد وسندہٗ صحیح۔ بلوغ الامانی جز۱۶ صہ۲۳۸)

دورہ کیا کرتے تھے، آپ پیار کرتے، ہاتھ لگاتے تھے، لیکن جماع نہیں کرتے تھے۔

یعنی آپ روزانہ تمام بیویوں کے پاس ملاقات کے لئے اور ان کی خانگی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے دن رات یعنی چوبیس گھنٹوں میں ایک ساعت تھی جو سب کے لئے مشترک تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر بیوی کے پاس نو دن کے بعد پہنچتے، اور اتنے طویل عرصہ تک اس کی خبر نہ لیتے کہ کس حال میں ہے اور اس پر کیا گذر رہی ہے۔ برق صاحب اس مشترک وقت میں کسی بیوی کے ہاں ٹھہر جانا کوئی ناانصافی نہیں۔ اس وقت میں تو سب شریک تھیں اور یہ وقت باری میں شامل نہ ہوتا تھا۔

غلط فہمی

"قرآن کہتا ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کہ رسول تم جیسے بشر ہیں اور یہ بھی درست ہم جیسا قد، ہماری طرح ایک دل، ایک جگر، دو پھیپھڑے، نظام جسم ہم جیسا، کھانا پینا ہم جیسا ہو بہو ہم جیسے انسان، لیکن حدیث کہتی ہے کہ ان میں تیس مردوں کی طاقت تھی۔ (دو اسلام صہ۲۱۹)

ازالہ

برق صاحب ظاہری اعضاء کے لحاظ سے تو بے شک سب انسان ایک جیسے ہیں، لیکن کیا آپ کا خیال ہے کہ قوت جسمانی، قوت روحانی، بہادری، ہمت، عقل، حسن وغیرہ کے لحاظ سے بھی سب برابر ہیں؟ برق صاحب ایک پہلوان بھی آدمی ہے اور ایک کمزور بھی آدمی ہے کیا دونوں برابر ہیں، کیا ایک پہلوان میں دس، پندرہ معمولی آدمیوں کے برابر طاقت نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو یہ کیسے۔ جب کہ دونوں کے جسم میں ایک دل ایک جگر ہے وغیرہ وغیرہ۔ موسیٰ علیہ السلام بھی ایک آدمی تھے لیکن ایک تھپڑ سے ایک قبطی کو ہلاک کر دیا (قرآن مجید) اور ہم بھی آدمی ہیں لیکن کیا ایک تھپڑ سے کسی آدمی کو ہلاک کر سکتے ہیں۔ یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی آدمی تھے لیکن زنانِ مصر نے ان کو دیکھ کر ہاتھ کاٹ ڈالے تھے اور یہ کہا تھا کہ یہ انسان نہیں کوئی مکرم فرشتہ ہے (قرآن مجید)

برق صاحب! ایک نبی جس طرح روحانی قوت میں سب سے اعلیٰ ہوتا ہے اسی طرح جسمانی قوت میں بھی سب سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر رکانہ پہلوان مقابلہ پر آگیا تو وہ بھی خاک میں غلطاں نظر آیا۔ اگر کوئی ناقابلِ تسخیر چٹان سامنے آگئی، تو ایک ہی ضرب میں پاش پاش ہو گئی حالانکہ اس چٹان کو توڑنے سے صحابہ عاجز ہو گئے تھے۔ بہادری کا یہ عالم کہ احد اور حنین کے میدانوں میں اکیلے ڈٹے رہے۔ برق صاحب آپ اللہ کے رسول کی قوت کو عام انسانوں کے برابر سمجھ رہے ہیں، حیرت ہے ایک انسان دوسرے انسان سے متعدد

باتوں میں مختلف نظر آتا ہے، بعض آدمی ایسے بھی مل جاتے ہیں جو ایسے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے ہیں جو دوسروں کے لئے ناممکن ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ انسان ہوتے ہیں اور ایک ہی دل والے، برق صاحب آپ ہی کی تحریر کردہ عبارت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ نقل کر کے ہم آپ سے انصاف کے خواہاں ہیں ہمیں اس رسول ؐ پر ناز ہے جو تیس آدمیوں کی قوت رکھتے ہوئے بھی ہر ترغیب، ہر کشش، اور ہر گناہ سے دامن بچا کر نکل گیا تھا (دو اسلام ص۲۷)

غلط فہمی "حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تیس مردوں کی طاقت اور کوئی اولاد نہ ہو بات کیا تھی" (دو اسلام ص۲۱۹)

ازالہ برق صاحب! اولاد کا ہونا طاقت وصحت ہی پر منحصر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ إِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ (شوریٰ:۔۴۹)	اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔
أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّإِنَاثًا (شوریٰ:۔۵۰)	اور جس کو چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں دیتا ہے۔

خود ہمارے زمانہ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ باوجود قوت وصحت کے اولاد نہیں ہوتی۔ تعجب تو یہ ہے کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اولاد نہ ہونے پر تعجب ہے

غلط فہمی صحیح مسلم میں ایک روایت ہے کہ خدا تعالیٰ تین آدمیوں کو دگنا معاوضہ دے گا اول وہ یہودی یا عیسائی جو اپنے رسول پر ایمان لانے کے بعد حضور پر ایمان لے آئے۔ دوم۔ وہ غلام جو خدا اور آقا دونوں کے حقوق ادا کرے اور سوم وہ شخص جو لونڈی کو تعلیم وتربیت دے کر پہلے آزاد کرے اور پھر نکاح کرلے (صحیح مسلم جلد ا ص۹۹) یہ تھا رسول ؐ کا ارشاد، اب سوال یہ ہے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماریہ قبطیہ کو آزاد کر کے اس سے نکاح کیا تھا۔ اگر ایسا کیا تھا تو سیرت نگاروں نے آپ کا نام ازواج مطہرات میں کیوں نہ درج کیا۔ اگر نہیں کیا تھا تو دوسروں کو حکم کیوں دیا؟ اس لئے ماریہ قبطیہ کو گھر میں رکھنے اور اس سے ابراہیم کے پیدا ہونے کا افسانہ غلط ہے (دو اسلام حاشیہ ص۲۱۹-۲۲۰)

ازالہ برق صاحب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کہاں دیا ہے؟ آپ نے تو اس کام کا ثواب بیان فرمایا ہے آپ نے غلط فہمی سے ترغیب کو حکم سمجھ لیا۔ اب سوال یہ ہے کہ

آپ نے حضرت ماریہ قبطیہ کو آزاد کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب قرآن مجید میں موجود ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ نے دونوں چیزیں (قرآن وحدیث) سرسری طور پر دیکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ (الاحزاب:۔ ۵۲)	اے رسولؐ تمہارے لئے ان بیویوں کے بعد اور بیوی حلال نہیں نہ کسی اور کو تم ان میں کسی کے ساتھ بدل سکتے ہو خواہ وہ تمہیں کتنی ہی حسین کیوں نہ معلوم ہو، مگر ہاں لونڈی رکھ سکتے ہو۔

٭ ٭ ٭

اس آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روک دیا تھا لہٰذا آپؐ حضرت ماریہؓ کو آزاد کرکے بیوی نہ بنا سکے۔ الغرض حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے۔

غلط فہمی "میرا خیال ہے کہ حضورؐ نے مدینہ میں آکر ازواجِ مطہرات کو بطور شوہر استعمال ہی نہیں فرمایا تھا" (دو اسلام ص۲۲۳)

ازالہ یہ خیال قطعاً صحیح نہیں آپ کا یہ خیال تواتر کے خلاف ہے اگر اس طرح محض ظن وتخمین سے تواتر کا انکار ہونے لگا تو پھر قرآن مجید کا بھی انکار ناممکن نہیں رہے گا۔ برق صاحب اگر کوئی دشمنِ اسلام یہ کہہ دے کہ آپ کے پیغمبر نے جوان عورتیں اپنی گھر میں کیوں رکھ چھوڑی تھیں جب کہ وہ ان کی تسکین کے قابل نہ تھے۔ کیا یہ ان عورتوں پر ظلم نہیں تھا؟ کیا یہ انسانیت کا خون نہیں؟ کیا یہ عیسائی مذہب کی راہبہ عورتوں کی مماثلت نہیں؟ آخر ان عورتوں سے کیا کام لیا جاتا تھا؟ بتائیے ان سوالات کا آپ کیا جواب دیں گے یہی کہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اللہ ہی جانے۔

غلط فہمی "بے اندازہ مصروفیات بلا التعداد تفکرات، اور بے شمار پریشانیوں میں انہیں مباشرت کی سوجھ ہی کیسے سکتی تھی"۔ (دو اسلام ص۲۲۲)

ازالہ بے شک ان بے اندازہ مصروفیتوں کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی راہبانہ نہیں تھی۔ آپ نے دین ودنیا کو اس طرح سمو دیا تھا کہ ہمیں آپ کی اسی زندگی پر ناز ہے۔ کیا کوئی دوسرا انسان ایسا اسوہ پیش کرسکتا ہے۔ جو چیز قابلِ فخر ہے آپ اس سے شرمارہے ہیں۔

برق صاحب! احساس کمتری کو دل سے نکال دیجئے انشاء اللہ سب کام ٹھیک ہو جائیں گے دیکھئے ایک غیر مسلم پول برنٹن کیا لکھتا ہے؟

وہ تحریر کرتا ہے:۔

I could not but respect the wisdom of the Prophet Muhammad for so wisely teaching his followers to mingle the life of religious devotion with the life of the busy world. ("A search in the secret Egypt" By Paul Brunton Page 134.)

ترجمہ: "میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد کی دانائی کی تکریم کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنہوں نے اپنے متبعین کو اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ دینی زندگی کو دنیاوی مصروف زندگی کے ساتھ سمونا سکھا دیا۔"

غلط فہمی اس کا راوی انس رض ہے اور یہ وہی بزرگ ہیں جنہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بھی معلوم نہ تھی (دو اسلام صد ۲۱۷)

ازالہ حضرت انس رض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر معلوم تھی ان کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۶۳ سال تھی۔ (صحیح مسلم) باقی رہا یہ امر کہ اس حدیث میں گیارہ بیویوں کا ذکر ہے۔ حالانکہ آپ کی صرف نو بیویاں زندہ تھیں، دو کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ بے شک صحیح ہے لیکن اس میں غلطی حضرت انس رض سے نہیں ہوئی۔ اور کسی راوی نے دو لونڈیوں کو ملا کر گیارہ کہہ دیا ہے، حضرت انس رض سے اسی حدیث میں نو کی تعداد مذکور ہے معلوم نہیں صحیح بخاری سے اس حدیث کو نقل کرتے وقت برق صاحب نے اس کا آخری حصہ کیوں چھوڑ دیا، حالانکہ امام بخاری نے اس کو نقل ہی اس لئے کیا تھا کہ راوی کی غلطی ثابت کریں کہ اس نے اس روایت میں نو کے بجائے گیارہ غلطی سے کہا ہے، حضرت انس رض نے تو نو ہی کہا تھا۔ غرض کہ ہر بات کا جواب حدیث میں موجود ہوتا ہے۔ مگر برق صاحب تحقیقی نظر نہیں ڈالتے۔

غلط فہمی "حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ میرا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ برس کی عمر میں ہوا تھا" وبنی بی وانا بنت تسع سنین اور آپ نے مجھ سے نو برس کی عمر میں مجامعت کی... اتنی نابالغ بچی ہو، مہینہ بھر تپ محرقہ میں مبتلا رہ کر کانٹا ہو چکی ہو۔ کیا ایسی بچی مجامعت کی تاب لا سکتی ہے۔ (دو اسلام [illegible])

ازالہ

برق صاحب یہ وہی مبالغہ آمیزی اور رنگین بیانی ہے، جس کا آپ کو خود اعتراف ہے مباشرت کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں" یدور، کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں۔ "بنیٰ" کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں۔ آخر یہ مجامعت کا لفظ بار بار کیوں آجاتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ذرا تحقیق کر لیا کیجئے۔ ترجمہ مذکور میں مجامعت آپ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے "بنیٰ" کے معنی ہیں "شادی کر کے بیوی کو گھر میں لانا"۔ (مفتاح اللغات) لہٰذا صحیح ترجمہ یہ ہوا کہ نو سال کی عمر میں وداع ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ مختلف ممالک میں بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے۔ بلکہ ایک ہی ملک میں بلوغ کی عمروں میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ کا یہ خیال کہ حضرت عائشہؓ نابالغ تھیں غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ایک افریقی لڑکی کے ۹ سال کی عمر میں ۲۸ مارچ ۱۹۶۶ء کو بچہ ہوا۔ (اخبار ڈان مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۶ء) گویا وہ آٹھ سال کی عمر میں بالغ ہو گئی تھی۔

غلط فہمی

"سبرہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعہ کی اجازت طلب کی۔ آپ نے دے دی۔ میں اس عورت کے پاس تین راتیں ٹھہرا۔"

(مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۴۳)

تو پھر کیا حکم ہے ان خواتین کے متعلق جو پشاور سے چل کر ٹبی بازار میں کچھ ایسے ہی مقاصد کے لئے جاتے ہیں اور کئی کئی راتیں وہیں گذارتے ہیں (دو اسلام صفحہ ۲۲۴)

ازالہ

کتنی زبردست غلط فہمی آپ کو ہوئی، یہ اس وقت کا ذکر ہے جب متعہ کی ممانعت نہیں ہوئی تھی آپ نے خود لکھا ہے کہ جنگ خیبر میں اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کر دیا تھا (دو اسلام صفحہ ۲۲۴) لہٰذا پھر بھی اعتراض کرنا قرین انصاف نہیں۔ اسی طرح اوائل اسلام میں کافر عورتوں سے نکاح جائز تھا، شراب بھی عام طور پر پی جاتی تھی۔ بتدریج یہ چیزیں حرام ہوئیں لہٰذا حدیث پر اس سے کیا اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔

غلط فہمی

حضرت جابر کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم صلعم اور حضرت صدیق کے زمانہ میں مٹھی بھر آٹا دے کر عورتوں کو استعمال کیا کرتے تھے۔ اور اس حرکت سے ہمیں حضرت عمرؓ نے روکا تھا (صفحہ ۲۲۴-۲۲۵)

ازالہ

حرمت کے بعد جن لوگوں نے ایسا کیا یہ ان کی لاعلمی تھی جب حضرت عمر کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کی حرمت کا اعلان کروا دیا۔

غلط فہمی

حضرت جابر کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئے جن کے پاس قربانی کے لئے کچھ بھی نہیں تھا انہیں ذی الحجہ کی پانچویں تاریخ کو احرام توڑنے کی اجازت دی گئی چنانچہ ہم نے خوب جماع کیا اور پانچویں دن کے بعد

جب ہم عرفہ کے لئے روانہ ہوئے تو تقطر مذاکیرنا المنی" ہمارے اعضائے تناسل سے نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا۔ عام حالات میں جماع کے بعد تسکین آجاتی ہے۔ لیکن خدا جانے ان صحابہؓ نے کون سا کشتہ کھایا ہوا تھا کہ حج کے مقدس موقع پر بھی ان کا نطفہ اچھل اچھل کر زمین پر گر رہا تھا" (دو اسلام صفحہ ۲۲۵)

ازالہ برق صاحب! یہ رنگ آمیزی نہیں تو اور کیا ہے عربی عبارت اس شرمناک ترجمہ کی متحمل نہیں۔ بہرحال قصور عبارت کے مقصد کو نہ سمجھنے کا ہے۔ سنیئے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى وَيُوْتِرُ بِرَكْعَةٍ وَّيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْغَدَاةِ كَانَّ الْاَذَانَ بِاُذُنَيْهِ (صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل مثنٰی مثنٰی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت نماز پڑھتے تھے، اور ایک رکعت وتر پڑھتے تھے اور صبح کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے تھے گویا کہ اذان آپ کے کان میں ہوتی تھی۔

یعنی صبح کی سنتیں ایسے وقت پڑھتے تھے کہ اذان ختم ہوتی اور سنتیں شروع کر دیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اذان سنتے ہوتے تھے اور سنتیں پڑھنی شروع کر دیتے تھے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اذان اور سنتوں کے آغاز کے درمیان میں بہت کم وقفہ ہوتا تھا۔ گویا وقفہ کی قلت کو عبداللہ بن عمرؓ اس طرح ظاہر کر رہے ہیں۔ یہی وقفہ کی قلت آپ کی نقل کردہ حدیث میں ہے۔ یعنی ابھی کچھ دیر پہلے وہ صحبت کر چکے تھے اور اب احرام میں تھے اور صحبت کرنے اور احرام باندھنے کے درمیان بہت ہی قلیل وقفہ تھا۔ یہ الفاظ کہ ان کے مذاکیر پانی ٹپکا رہے تھے۔ وقفہ کی قلت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم صحبت کر چکے تھے اور اب حج کر رہے تھے۔ دورانِ حج پانی ٹپکانے کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ پانی ٹپکانا حج کے آغاز سے پہلے ہوا تھا۔ آپ نے جو ترجمہ کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس میں تحریف معنوی ہوئی ہے۔ گو نادانستہ ہوئی ہو۔ لفظ جماع سے پہلے "خوب" کا اضافہ بھی خوب ہے۔ !!! "نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا" یہ ترجمہ صحیح نہیں پھر اس میں "بدستور" کا اضافہ محاورہ عرب کے خلاف ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ صحبت اور پھر احرام باندھ لینے میں اتنا کم وقفہ تھا گویا پانی ابھی ٹپک رہا ہے۔

غلط فہمی وہ نہ یہ احادیث صحابہؓ کی سیرت کے مطابق اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم الشان کردار کے موافق۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآن کہتا ہے۔

تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۔
(دو اسلام ص۲۲۵-۲۲۶)

تم ان صحابہ کو دیکھو کہ ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع و سجود میں پڑے الطاف الٰہی کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں ۔

ازالہ ان ہی صحابہؓ کے متعلق آپ پہلے لکھ آئے ہیں :۔
" ان حالات میں ممکن ہے کہ کسی صحابی نے عمداً کسی حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں ص۴۵ ۔ اب بتائے آپ کا کون سا بیان صحیح ہے؟ کیا یہ بیان کہ صحابہ کرام قصداً تحریف کرتے تھے، آپ کی وارد کردہ قرآنی آیت کے عین مطابق ہے۔ کچھ تو انصاف اور تحقیق سے لکھا کیجئے۔ اسلام کے مزاج کے مطابق ترجمہ کیا کیجئے۔ آزاد ترجمہ اگر جائز رکھا گیا تو پھر کوئی من چلا قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے قحبہ خانہ کھولنے کی اجازت نکال لے گا۔

آیت یہ ہے :۔
وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔
(النور:۳۳)

اگر تمہاری لونڈیاں پاک دامن رہنا چاہتی ہوں تو ان کو دنیا کمانے کے لئے زنا پر مجبور نہ کرو۔
(سورۂ نور آیت نمبر ۳۳)

باب ۱۰

حدیث میں نماز کی صورت

غلط فہمی معراج کی حدیث نقل کرنے کے بعد برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
اس داستان کا خلاصہ یہ ہوا کہ امت رسولؐ کی استعداد کا علم نہ خدا کو تھا اور نہ حضورؐ کو۔ اگر موسیٰ علیہ السلام بیچ میں نہ پڑتے تو امت پر پچاس نمازیں فرض ہو جاتیں اور یہ امت صبح سے لے کر شام تک نمازیں ہی پڑھتی رہتی۔ نہ کما سکتی نہ کھا سکتی ۔۔۔۔ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عقل کی داد دیجئے۔۔۔ ماشاء اللہ کیا داستان تراشی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو خدا کا اور رسول علیہ دانش بنا ڈالا ہے۔ (دو اسلام صد ۲۲۹)

ازالہ بات درحقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم تھا کہ پچاس وقت کی نمازیں ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر احسان و کرم کرنا مقصود تھا، زیادہ بوجھ ڈال کر پھر اس کو کم کر دینے میں جو لطف و کرم ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اس کا تجربہ ہو یا جو علم نفسیات میں ماہر ہوں۔ قصور کو معاف کرنا دل کو خوش کرتا ہے۔ اس میں معاف کرنے والے کا تحمل اور اس کی شانِ عالیہ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ بھی قصور معاف کر کے بہت خوش ہوتا ہے۔ اور بندوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنے قصور معاف کرائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ (الزمر: ۵۳)

اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دے گا۔

⁘ ⁘ ⁘

بار بار فرماتا ہے:۔
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؕ

بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے:۔

⁘ ⁘ ⁘

ایک اور جگہ فرماتا ہے :۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ : ۱۸۵)
اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کرنا چاہتا ہے ، اور سختی کرنا نہیں چاہتا ۔

اسی طرح بوجھ ہلکا کر دینا بھی اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہے لیکن بندوں سے کہتا ہے کہ تم کہو ، کہ اے اللہ ہم پر زیادہ بوجھ نہ ڈالنا ۔ مثلاً ارشاد ہے :۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (البقرہ : ۲۸۶)
اے ہمارے رب ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو ہماری طاقت سے باہر ہو ۔

بات صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی ایسا حکم نہیں دینا چاہتا جو دشوار ہو بلکہ وہ تو آسانی چاہتا ہے ۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ بندے التجا کریں اور پھر میں تخفیف کروں ، اور اسی لئے اس نے ہمیں یہ دعا سکھائی ۔ نمازوں میں تخفیف بھی اسی بنا پر بندے کی التجا پر واقع ہوئی ۔

چلتے چلتے اس اعتراض کا جواب قرآن مجید سے بھی سنتے جائیے ۔ موسیٰ علیہ السلام کو نبی بنایا جاتا ہے ۔ وہ درخواست کرتے ہیں :۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هَارُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْ اَمْرِيْ ۝ (طٰہٰ)
اے اللہ میرے اہل میں سے میرا ایک وزیر بنا دے یعنی میرے بھائی ہارون کے ذریعہ مجھے قوت عطا فرما اور اسے میرے کام میں شریک کر دے ۔

بلکہ صاف صاف اس طرح دعا کرتے ہیں :۔

وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هَارُوْنَ ۝ (الشعراء : ۱۳)
میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میری زبان رکتی ہے اس لئے اے اللہ ہارون کو بھی رسالت سے سرفراز فرما ۔

کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم نہیں تھی ، جب موسیٰ علیہ السلام نے توجہ دلائی تو اللہ تعالیٰ کو بھی نعوذ باللہ محسوس ہوا ، کہ واقعی یہ کام اکیلے ان کے بس کی بات نہیں ۔ لہٰذا ہارون علیہ السلام کو بھی رسول بنا دیا ۔ ارشاد باری ہے :۔

قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (طٰہٰ ۳۶)
اے موسیٰ ہم نے تمہارا مطالبہ منظور کر لیا ہے ۔

قرآن مجید سے اس قسم کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں اور جب اس قسم کی باتوں سے قرآن مجید پر اعتراض نہیں ، تو حدیث پر اعتراض کیوں ؟ ایک مثال اور سنیئے ، ہم نمازیں پڑھتے ہیں ۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ)
اے اللہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا ۔

پھر ہم کہتے ہیں :-

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ٥ — ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، ان لوگوں کا راستہ نہیں جو مغضوب یا گمراہ ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نہیں جانتا کہ سیدھا راستہ کون سا ہے، ہم اللہ کو بتاتے ہیں کہ سیدھا راستہ کون سا ہے کہیں وہ غلطی نہ کر جائے۔ نعوذ باللہ۔ ایک اور مثال سنیئے:

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ٥ (المزمل: ۲۰) — اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے لہٰذا اس نے تم پر رحم کرنے کا ارادہ کیا پس اب تم جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔

بتائیے کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا۔ لبعد میں تجربہ سے معلوم ہوا تو تخفیف کر دی۔ بات یہاں بھی وہی ہے۔ یہاں بھی اصولِ لطف و کرم جلوہ فرما ہے۔ یعنی زیادہ بوجھ ڈال کر ہلکا کر دینا یہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اس طرح وہ اپنے بندوں پر ترحم خسروانہ کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ اور سنیئے ارشادِ باری ہے :-

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا (الانفال ۶۶) — اب اللہ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا اور اس کو معلوم ہو گیا (یا اس کو معلوم تھا) کہ تم میں کمزوری ہے۔

یعنی یہ حکم مسلمین کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ لبعد میں اس کو ہلکا کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا حکم پہلے دیا ہی کیوں گیا تھا۔ کیا ان آیات کی بنا پر قرآن مجید پر اعتراض کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر حدیث نے کیا قصور کیا ہے؟

غلط فہمی

"اور یہ آخری فقرہ بھی خوب ہے کہ "ہم اپنا قول نہیں بدلا کرتے"، تو پھر پچاس سے پچیس اور پچیس سے پانچ کیوں کیں" (دو اسلام ص ۲۲۹)

ازالہ

یہاں بات سے مراد احکام شریعت نہیں ہیں کیونکہ احکام شریعت تو بدلا ہی کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (البقرۃ: ۱۰۶) — جب ہم کسی حکم کو منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل دوسرا حکم دے دیتے ہیں۔

برق صاحب اس آیت پر وہی اعتراض ہو سکتا ہے جو آپ نے حدیث پر کیا ہے۔ یعنی پہلے ایسا حکم دیا ہی کیوں جاتا ہے جو چل نہیں سکتا یا جس سے بہتر دوسرا موجود ہوتا ہے۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوا کہ احکام شریعت منسوخ ہوا کرتے ہیں اور حدیث زیرِ بحث میں "قول" سے مراد احکام شریعت نہیں بلکہ حسنات کا وہ اٹل قانون مراد ہے جو اس آیت میں بتایا گیا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ (الانعام: ۱۶۰) جو نیکی کرے گا اس کو اس نیکی کا دس گنا ثواب ملے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم نے پچاس کی پانچ تو کر دیں لیکن ثواب ہم پچاس ہی کا دیں گے۔ کیونکہ ہمارا قانون یہی ہے کہ ہم دس گنا دیا کرتے ہیں، یہ قانون غیر متبدل ہے، بدلے گا نہیں، یہی مطلب ہے حدیث کے اس ٹکڑے کا "مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ"، کیونکہ اس فقرہ سے پہلے حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ ھِیَ خَمْسٌ وَھِیَ خَمْسُوْنَ یعنی بظاہر یہ پانچ ہیں، لیکن حقیقت میں یہ پچاس ہی کے برابر شمار ہوں گی اور اس طرح پچاس جو ہم نے فرض کی تھیں ان کی ادائیگی ہو جائے گی۔ دوسری روایت میں حدیث کے الفاظ اس قانون کی طرف صراحت سے اشارہ کرتے ہیں اور نہ بدلنے والی بات کی تفسیر کرتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:۔

یَا مُحَمَّدُ اِنَّهُنَّ خَمْسُ صَلَوَاتٍ کُلَّ یَوْمٍ وَّ لَیْلَةٍ لِکُلِّ صَلٰوةٍ عَشْرٌ مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ یَعْمَلْهَا کُتِبَتْ لَهٗ حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا کُتِبَتْ لَهٗ عَشْرًا۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان باب الاسراء)

اے محمدؐ! دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، ہر نماز کا ثواب دس کے برابر ہے (اور یہ اس قانون کے لحاظ سے ہے) کہ جس نے ایک نیکی کا ارادہ کیا اور عمل نہ کر سکا اس کے لئے ایک نیکی لکھونگا اور جس نے عمل کر لیا اس کے لئے دس نیکیاں لکھوں گا

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

الغرض نہ بدلنے والی بات یہ قانونِ حسنات ہے نہ کہ احکام شریعت۔

غلط فہمی

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے نیا وضو کیا کرتے تھے (بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۵)

تردید بالا

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ کے گھر میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر سو چکنے کے بعد جاگے، وضو کیا، نماز پڑھی، پھر آپ لیٹ گئے یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ اس کے بعد نماز کے لئے بلانے والا آیا۔ آپ اس کے ہمراہ مسجد کو چل دئے۔ اور وہاں جا کر وضو کئے بغیر نماز ادا کی۔ "بخاری" (دو اسلام صفحہ ۲۳۰)

ازالہ

برق صاحب یہ تردید یا تعارض نہیں ہے ہر نماز کے لئے نیا وضو کرنا، یہ آپ کا معمول تھا اور کبھی کبھی اسی وضو سے دوسری نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ عمل شاذ تھا اور وہ اکثر، لہٰذا بعنوائے "للاکثر حکم الکل"، حضرت انسؓ نے آپ کا معمول یہ بتایا کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کیا کرتے تھے۔ سنئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (النحل: ۱۱۱) — قیامت کے دن ہر شخص اپنے نفس کے معاملہ میں جھگڑتا ہوا آئے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ (المرسلات ۳۵، ۳۶) — قیامت کے دن لوگ بات نہ کر سکیں گے اور نہ انہیں اجازت ملیگی کہ اپنے عذر پیش کر سکیں۔

پہلی آیت میں ہے کہ انسان اپنے معاملہ میں خوب بحث کرے گا اور دوسری میں ہے کہ وہ بول بھی نہ سکے گا، کہ معذرت پیش کر سکے۔ کہئے کیا دوسری آیت پہلی آیت کی تردید کرتی ہے۔ نہیں دوسری آیت میں عام حالت کا بیان ہے، پہلی آیت اس کو خاص کرتی ہے۔ اسی طرح برق صاحب کی پیش کردہ پہلی حدیث کہ آپ نے نیا وضو نہیں کیا، عام حالت کو بیان کرتی ہے اور دوسری اس کی تخصیص کرتی ہے کہ اس خاص واقعہ میں ایسا بھی ہوا تھا، کہ آپ نے نیا وضو نہیں کیا اور یہ بھی جائز ہے۔ برق صاحب اگر آپ قرآن مجید کو غور سے پڑھ لیتے، تو احادیث میں تطبیق دینے کا ملکہ پیدا ہو جاتا اور یہ غلط فہمیاں نہ ہوتیں۔

دوسرے طریقہ سے

برق صاحب پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت کی نماز کے لئے آپ نیا وضو کرتے تھے۔ دوسری حدیث میں یہ ہے کہ رات کی نماز کے لئے آپ نے وضو کیا اور اسی وضو سے آپ نے صبح کی نماز پڑھی اس میں یہ کہاں ہے کہ عشاء کی نماز کے وضو سے آپ نے صبح کی نماز پڑھی۔ حدیث میں تو یہ ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد آپ سو گئے تھے، پھر اٹھے وضو کیا اور نماز پڑھی لہذا دونوں حدیثوں کوئی تعارض ہی نہیں۔ تعارض اس وقت ہوتا جب آپ [illegible] کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے۔

غلط فہمی

"اس حدیث سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ اول یہ کہ حضور ہر نماز کے لئے نیا وضو نہیں کرتے تھے۔ دوم یہ کہ نیند کے بعد وضو ضروری نہیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ رسولِ اکرم کی صرف آنکھیں سوتی تھیں اور دل جاگتا رہتا تھا اس لئے ان کے لئے وضو ضروری نہیں تھا۔ اور یہ ہدایت صرف امت کے لئے تھی۔ تو ملاحظہ کیجئے صحیح مسلم کا یہ قول:۔

کان اصحاب رسول اللّٰہ صلعم ینامون ثم یصلون ولا یتوضؤن۔ — کہ حضور کے صحابہ سو چکنے کے بعد وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

اصحابہ رضی اللہ عنہم کے دل بھی نبی علیہ السلام کی طرح جاگتے رہتے تھے" (دو اسلام صفحہ ۲۳۰-۲۳۱)

ازالہ پہلی بات کا جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے یعنی پانچوں نمازوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیا وضو کرتے تھے، اور ان میں سے کسی ایک نماز کے وضو سے دوسری نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یہی آپ کا معمول تھا سوائے اظہارِ جواز کے آپ نے اس کے خلاف کبھی نہیں کیا، لہٰذا برق صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے نیا وضو نہیں کرتے تھے۔

رہی دوسری بات کہ نیند کے بعد وضو ضروری نہیں، تو اس کے متعلق عرض ہے کہ جو حدیث آپ نے نقل فرمائی ہے اس میں ہے:۔

ثُمَّ اضْطَجَعَ ۔ پھر آپ لیٹ جایا کرتے تھے۔

لیکن صحابہ کے متعلق یہ نہیں ہے کہ وہ بھی لیٹ کر سویا کرتے تھے اور پھر وضو نہیں کرتے تھے۔ صحابہ کے متعلق جو الفاظ برق صاحب نے نقل فرمائے ہیں وہ ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں دیر کی، صحابہ مسجد میں انتظار کرتے رہے حتیٰ کہ اس انتظار کے دوران بعض لوگ اونگھنے لگے، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

حَتّٰی رَقَدَ نَاسٌ وَاسْتَيْقَظُوْا وَرَقَدُوْا وَاسْتَيْقَظُوْا (صحیح مسلم) ۔ حتیٰ کہ بعض لوگ سو گئے، پھر جاگے، پھر سو گئے، پھر جاگے۔

الفاظِ حدیث خود بتا رہے ہیں کہ بعض صحابہ اونگھ رہے تھے، سو جاتے تھے، پھر جاگ جاتے تھے اس میں لیٹ کر سونے کا کوئی ذکر نہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی صراحت ہے۔

حَتّٰی تَخْفِقَ رُؤُسُهُمْ ثُمَّ يُصَلُّوْنَ وَلَا يَتَوَضَّؤُوْنَ (رواہ ابوداؤد ورجالہ ثقات (تقریب) سکت علیہ الشوکانی نیل الاوطار جزاول صـ۱۶۹) ۔ صحابہ کے سر اونگھ کی وجہ سے جھک جاتے تھے اور پھر وہ بغیر (تازہ) وضو کئے نماز پڑھ لیتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کبھی بھی غفلت کی نیند نہ سوتے تھے کہ آپ کو وضو ٹوٹنے کا علم نہ ہو لہٰذا آپ کا وضو نہ ٹوٹتا تھا۔ غفلت کی نیند بیٹھے بیٹھے سونے سے نہیں آتی، لہٰذا ایسی حالت میں صحابہ کا وضو بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ لیٹ کر سونے سے غفلت طاری ہو جاتی ہے، لہٰذا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

فقہ بتلاتی ہے کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے (دو اسلام صـ۲۲۹) پھر اس کے بعد تعارض میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ غزوہ ذات الرقاع میں حضور ایک تیر سے زخمی ہو گئے اور خون بہہ نکلا۔ لیکن آپ اس حالت میں بھی نماز پڑھتے رہے۔

(دو اسلام صـ۲۳۱)

ازالہ برق صاحب ابھی تک تو آپ حدیث کو حدیث سے ٹکرا رہے تھے لیکن یہ آپ نے کیا کیا کہ اب فقہ کو حدیث سے ٹکرانے لگے۔ فقہ میں اکثر مسائل بے بنیاد و من گھڑت ہیں اور یہ مسائل قرآن و حدیث سے ٹکراتے ہیں۔ لہذا وہ مسائل خود مردود ہیں۔ ان کو حدیث کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ پھر فقہ سے مراد آپ کی حنفی فقہ ہے اور حنفی فقہ تو بیشتر مقامات پر حدیث سے ٹکراتی ہے لہذا وہ کوئی چیز نہیں۔

انتباہ

برق صاحب نے لکھا ہے کہ "حضور کے تیر لگا اور خون بہہ نکلا وغیرہ وغیرہ" یہ صحیح نہیں بلکہ ایک اور شخص کے تیر لگا تھا۔ اس کے خون نکلا، اور اس حالت میں بھی وہ نماز پڑھتا رہا (ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد ۱ ص ۳۲)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ایک ۱:۔ سوال:۔ کیا مجامعت کے بعد غسل ضروری ہے؟

کئی جواب:۔ زید بن خالد نے حضرت عثمان سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے اور انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ فرمایا شرم گاہ کو دھو ڈالے اور وضو کر لے، میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سنا تھا۔ (بخاری)

۲۔ دخول کے بعد غسل واجب ہو جاتا ہے (موطا ص ۲۲)

۳۔ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا..... غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو (صحیح مسلم)

۴۔ ابی بن کعب کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے اور انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے تو کیا وہ غسل کرے۔ فرمایا وہ صرف وضو کر کے نماز پڑھ لے۔ (صحیح مسلم)

ازالہ ا۔ حضرت عثمان کا جواب یہ ہے:۔

يَتَوَضَّأُ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلٰوةِ (صحیح بخاری) یعنی ایسا وضو کرے جیسا نماز کے لئے کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ سوال نماز پڑھنے کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ دوسری ضروریات کے لئے تھا، مثلاً کھانا پینا، چلنا، پھرنا وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

"تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ ثُمَّ نَمْ" — یعنی وضو کرو اور ذکر کو دھو ڈالو، پھر سو جاؤ۔

بلکہ یہاں تک فرمایا "حَتّٰی یَغْتَسِلَ اِذَا شَآءَ" پھر جب چاہے غسل کرے محض سونے کے لئے غسل کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ جُنُبًا فَاَرَادَ اَنْ يَّاْكُلَ اَوْ يَنَامَ تَوَضَّاَ وُضُوْءَهٗ لِلصَّلٰوةِ۔ (مسلم)	یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحالت جنابت جب کھانے یا سونے کا ارادہ فرماتے تو وضو کرتے جیسا کہ نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ علاوہ نماز کے دوسری ضروریات کے لئے صرف وضو کافی ہے۔ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کا مضمون واحد ہے اور یہی حکم ہے جو قیامت تک کے لئے باقی ہے یعنی نماز کے لئے غسل ضروری ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

حدیث نمبر ۴ ایک منسوخ حدیث ہے جس کو حضرت ابی بن کعبؓ نے بیان فرمایا ہے ابی بن کعب خود ہی فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا كَانَ الْمَآءُ مِنَ الْمَآءِ رُخْصَةً فِیْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ نُهِیَ عَنْهَا۔ (رواہ الترمذی وصححہ)	انزال سے غسل کرنا یہ رخصت شروع اسلام میں تھی، پھر ہم کو اس سے منع کر دیا گیا۔
ثُمَّ اُمِرْنَا بِالْاِغْتِسَالِ بَعْدَهَا (ابوداؤد)	پھر ہمیں اس کے بعد غسل کا حکم دیا گیا۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘

لہٰذا چاروں احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

غلط فہمی!

کیا سمجھے؟ دخول کے بعد غسل ضروری ہے یا غیر ضروری ہے۔ سمجھنا کیا ہے بھیا! یہ ہے وحی خفی۔ ہم وحی جلی کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ان مخفی اسرار کی تہ تک کیسے پہنچیں؟ (ص ۲۳۲)

ازالہ

برق صاحب یہ طنز آپ کو زیب نہیں دیتا یہ تو اپنے اصطلاحی مُلّا کے لئے رہنے دیجیے اگر آپ وحی جلی کو نہیں سمجھ سکتے تو پھر وہ بھی قابلِ اعتراض ٹھہری جس طرح کہ وحی خفی سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے قابلِ اعتراض ہے۔ برق صاحب یہ حقیقت ہے کہ وحی جلی کا سمجھنا آسان کام نہیں وحی جلی کے سمجھنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ وحی خفی کی تشریح میں اسے دیکھا جائے اگر ایسا نہ کیا جائے تو نہ صلوٰۃ کے معنی معلوم ہوں گے نہ عمرہ کے۔

غلط فہمی

کیا غسل سے بچے ہوئے پانی سے وضو جائز ہے؟

۱۔ ناجائز ہے۔ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ... عورت کے غسل سے بچے ہوئے پانی کو وضو

نھی ان یتوضأ الرجل بفضل طھور — کے لئے مت استعمال کرو۔
المرأۃ (ترمذی، ابنِ ماجہ)

۲۔ جائز ہے (الف)

عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یغتسل بفضل میمونۃ (مسلم جلد اول ص ۲۵۷)

ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضورؐ حضرت میمونہ کے غسل سے بچے ہوئے پانی سے نہایا کرتے تھے (دو اسلام ص ۲۴۴، ۲۴۳)

ازالہ

برق صاحب پہلی حدیث میں حکم عام ہے۔ دوسری حدیث میں اس کی تخصیص ہے یعنی یہ حکم میاں بیوی کے درمیان نہیں ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے محرم ہوتے ہیں پھر دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اس لئے اس قسم کی پابندی تکلیف مالا یطاق ہے۔ دونوں حدیثیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہیں۔ نامحرم کے بچے ہوئے پانی سے وضو نہیں کر سکتے اور محرم کے بچے ہوئے پانی سے وضو کر سکتے ہیں۔ برق صاحب یہ ایک نفسیاتی اور جنسی مسئلہ ہے وضو کرنے والے کو اس بچے ہوئے پانی سے ایک قسم کا تعلق ہو جاتا ہے اور ایک نامحرم اس تعلق کی وجہ سے اس پانی سے حظ اٹھا سکتا ہے یہ محض ایک جذباتی چیز ہے جو بغیر کافی تجربہ اور نفسیاتی و جنسی علوم میں مہارت پیدا کئے سمجھ میں نہیں آسکتی وضو ایک مقدس فریضہ ہے یا ایک مقدس فریضہ کا پیش خیمہ، لہٰذا اس میں کسی ایسے جذبہ کی آمیزش جس کا تعلق شہوات نفسانی سے ہو مناسب نہیں تھا اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔ اور چونکہ یہ چیز محرم کے بچے ہوئے پانی سے پیدا نہیں ہوتی، اس لئے آپ نے اپنے فعل سے اس پر مہرِ جواز لگا دی۔ کہئے اب کیا اعتراض ہے؟۔

غلط فہمی

کیا آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

۱۔ ٹوٹ جاتا ہے۔ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد نیا وضو ضروری ہے۔

۲۔ نہیں ٹوٹتا۔ ایک مرتبہ حضور نے ایک بکری کا بھنا ہوا بازو تناول فرمایا اور پھر وضو کئے بغیر نماز پڑھ لی۔ (دو اسلام ص ۲۴۳۔ ۲۴۴)

ازالہ

ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں پہلی حدیث منسوخ ہے۔ دوسری حدیث کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب پہلی حدیث کا حکم منسوخ ہو چکا تھا پہلی حدیث کے منسوخ ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے:۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ، کَانَ آخِرُ الْاَمْرَیْنِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حکم آگ پر پکی ہوئی چیز

تَرْكُ الْوُضُوْءِ مِمَّا مَسَّتْهُ النَّارُ رواہ ابوداؤد والنسائی وصححه النووی۔ نیل الاوطار جزء ۱ ص۱۹۳)

کھا کر وضو ترک کرنے کے متعلق تھا

غلط فہمی سوال یہ ہے کہ آیا وضو میں ہاتھ منہ اور پاؤں کو ایک ایک مرتبہ دھونا چاہیئے یا زیادہ، حدیث کا فیصلہ ملاحظہ ہو۔

۱۔ حضورؐ ایک مرتبہ دھوتے تھے۔

عن ابن عباس قال توضا النبی صلعم مرة مرة (بخاری۔ کتاب الوضوء)

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضور وضو میں اعضا کو ایک ایک مرتبہ دھوتے تھے۔

۲۔ دو، دو مرتبہ دھوتے تھے۔

عن عبداللہ بن زید ان النبی صلعم توضا مرتین مرتین (بخاری کتاب الوضوء)

عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور وضو میں اعضا کو دو، دو، مرتبہ دھوتے تھے۔

۳۔ تین تین مرتبہ دھوتے تھے۔

حضرت عثمان بن عفان فرماتے ہیں کہ حضور تین مرتبہ اعضا کو دھوتے تھے اور جو شخص اس طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (بخاری کتاب الوضوء) (دو اسلام ص۲۳۴)

ازالہ پہلی دونوں حدیثوں کی عبارت بتا رہی ہے کہ دونوں حدیثوں کا تعلق ایک خاص واقعہ سے ہے۔ برق صاحب سے (ان دونوں) کے ترجمہ میں غلطی ہوئی۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ایک ایک مرتبہ دھویا" "دو دو مرتبہ دھویا" نہ یہ کہ دھوتے تھے دونوں میں ماضی مطلق کا صیغہ ہے، نہ کہ ماضی استمراری کا۔ تیسری حدیث میں عادتِ مستمرہ کا بیان ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مستمرہ تو یہی تھی کہ آپ تین تین مرتبہ ہر عضو کو دھویا کرتے تھے اور یہی اصلی وضو ہے اسی پر وہ ثواب ہے جو حدیث نمبر ۳ میں مذکور ہے ہاں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے ایک یا دو مرتبہ دھو لیا ہے اس کی صورت محض جواز کی ہے۔ سنت کی نہیں۔ عرب کے بے آب وگیاہ ریگستانوں میں اکثر پانی کی قلت ہوتی ہے۔ لہذا جب کبھی پانی کی قلت ہوتی آپ نے دو مرتبہ یا ایک مرتبہ دھو کر وضو کر لیا اس کا تجربہ ہم کو کراچی کی زندگی میں اکثر ہوا ہے کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ نل سے پانی نہیں آتا جو تھوڑا بہت ہوتا ہے اسی سے وضو کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات دو، دو مرتبہ اور بعض اوقات ایک ایک مرتبہ ہر عضو کو دھونا پڑتا ہے اتنا پانی ہی نہیں ملتا کہ تین تین مرتبہ دھویا جائے۔ غیر کامل وضو کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہوتی

دوسری وجہ سنیے، حضرت اسامہؓ کہتے ہیں۔

دَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ عَرَفَۃَ حَتّٰی اِذَا کَانَ بِالشِّعْبِ نَزَلَ فَبَالَ ثُمَّ تَوَضَّأَ وَلَمْ یُسْبِغِ الْوُضُوْءَ فَقُلْتُ لَہُ الصَّلٰوۃَ۔ قَالَ الصَّلٰوۃُ اَمَامَکَ فَرَکِبَ فَلَمَّا جَآءَ الْمُزْدَلِفَۃَ نَزَلَ فَتَوَضَّأَ فَاَسْبَغَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ فَصَلَّی الْمَغْرِبَ (صحیح مسلم باب الافاضۃ من عرفات)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرفات سے چلے، جب گھاٹی میں پہنچے تو اترے، پیشاب کیا پھر وضو کیا، لیکن پورا وضو نہیں کیا۔ میں نے کہا نماز پڑھ لیجیے فرمایا نماز آگے چل کر پڑھیں گے پس آپ سوار ہوئے اور مزدلفہ پہنچ کر اترے، پھر آپ نے پورا وضو کیا، پھر اقامت ہوئی اور آپ نے مغرب کی نماز پڑھی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علاوہ نماز کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختصر وضو کر لیا کرتے تھے لیکن نماز کے لئے پورا ہی وضو کرتے تھے۔ لہٰذا اگر کسی حدیث میں مختصر وضو مذکور ہے تو ان دونوں وجہوں میں سے کسی ایک وجہ کی بنا پر تھا۔

غلط فہمی

"ہم ظہر، عصر اور عشاء کی نمازیں چار چار رکعت پڑھتے ہیں لیکن ... عمر بن خطاب فرمایا کرتے تھے کہ رات اور دن کی نمازیں دو دو رکعت ہے" (دو اسلام صفحہ ۲۳۵)

ازالہ

حضرت عمرؓ کے جس قول کو پیش کیا گیا ہے اس سے نفل نماز مراد ہے۔ اس سے نفل نماز مراد ہے اس قول کو فرض نماز کی طرف لے جانا زبردست غلط فہمی ہے حضرت عمرؓ سے متعدد احادیث میں ظہر، عصر اور عشاء میں چار رکعت ہی ثابت ہیں۔

ازالہ دوسرے طریقہ سے

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول سنداً بیان نہیں ہوا۔ بلکہ موطا میں بلا سند ہے لہٰذا اس بے سند چیز کو محلِ اعتراض میں لانا خود قابلِ اعتراض ہے۔ جو چیز ثابت ہی نہ ہو تو اس پر اعتراض فضول ہے۔

غلط فہمی

بخاری میں مذکور ہے، ابوجحیفہ کہتے ہیں کہ ایک دن دوپہر کے وقت حضور باہر تشریف لائے، پانی لایا گیا، وضو کیا... اور پھر صلوٰۃ ظہر و عصر کی دو دو رکعتیں پڑھیں

اس حدیث میں قطعاً یہ مذکور نہیں ہے کہ آپ سفر پر تھے اور اس لئے آپ نے نماز میں تخفیف کر لی تھی (دو اسلام صفحہ ۲۳۵-۲۳۶)

ازالہ

اس ہی حدیث میں آگے یہ لفظ ہیں " وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ " اور بطور سترہ کے آپ کے سامنے ایک برچھی کھڑی کر دی گئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ مسجد نبوی کا واقعہ نہیں ہے کیونکہ مسجد میں برچھی گاڑنا قرین قیاس نہیں ہے پھر اس سے ذرا اوپر ابو جحیفہ کی دوسری روایت ہے اس میں صاف مذکور ہے کہ :-

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى بِهِمْ بِالْبَطْحَاءِ وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْهِ الْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ۔ (صحیح بخاری ابواب سترۃ المصلی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مقام بطحا میں ظہر و عصر کی دو دو رکعت نماز پڑھائی، اس وقت آپ کے سامنے برچھی تھی اور آپ کے سامنے سے عورتیں اور گدھے گذر رہے تھے۔

بطحا مکہ میں ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ نے دو دو رکعت سفر میں پڑھائی تھیں۔ صحیح مسلم میں اور بھی زیادہ صراحت ہے، ابو جحیفہ فرماتے ہیں :-

ثُمَّ لَمْ يَزَلْ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ حَتَّى رَجَعَ إِلَى الْمَدِينَةِ۔ (صحیح مسلم باب سترۃ المصلی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دو، دو رکعت ہی پڑھتے رہے، یہاں تک کہ آپ واپس مدینہ منورہ پہنچے۔

دیکھا آپ نے احادیث تو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ سفر کا واقعہ تھا۔ اگر آپ تحقیق کرتے تو یہ غلط فہمی کیوں ہوتی۔

غلط فہمی

" ہم نماز عصر کے بعد نفل وغیرہ مکروہ سمجھتے ہیں اور یہی فیصلہ حضرت عمرؓ کا بھی تھا ...... لیکن حضرت عائشہ فرماتی ہیں :-

رکعتان لم یکن رسول اللہ یدعھما سرا و علانیۃ رکعتان قبل الصبح و رکعتان بعد العصر۔

کہ حضور نماز صبح سے پہلے اور نماز عصر کے بعد ہمیشہ دو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔"

(دو اسلام ص۲۳۶)

ازالہ

برق صاحب سے ترجمہ کرنے میں غلطی ہوئی۔ پہلے حضرت عائشہؓ کی حدیث سنئے :-

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيهِمَا وَلَا يُصَلِّيهِمَا فِي الْمَسْجِدِ مَخَافَةَ أَنْ يُثَقِّلَ عَلَى أُمَّتِهِ وَكَانَ يُحِبُّ مَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے اور ان دونوں کو مسجد میں نہیں پڑھتے تھے یعنی خفیہ ادا کرتے تھے۔ اس خوف سے کہ امت پر بوجھ نہ ہوجائے اور آپ امت پر

تخفیف پسند کرتے تھے۔ (صحیح بخاری کتاب المواقیت)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد ان دو رکعتوں کو آپ علانیہ اداہنیں فرماتے تھے۔ اب حدیث زیر بحث کا صحیح ترجمہ سنیئے۔

" دو رکعتیں ایسی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ علانیہ چھوڑتے تھے اور نہ تنہائی میں چھوڑتے تھے اور وہ دو رکعت فجر سے پہلے کی دو رکعت ہیں اور عصر کے بعد بھی دو رکعت آپ پڑھتے تھے " لفظ علانیہ بتارہا ہے کہ نہ چھوڑنا فجر کی سنتوں کے متعلق ہے۔ کیونکہ عصر کی سنتیں تو آپ علانیہ پڑھتے ہی نہ تھے۔

جو فیصلہ حضرت عمرؓ کا ہے وہی فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے۔ آپ نے بھی عصر کے بعد نوافل سے منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصر کے بعد دو رکعت پڑھنا آپ کے لئے مخصوص تھا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔

كَانَ يُصَلِّيْ بَعْدَ الْعَصْرِ وَيَنْهٰى عَنْهُمَا (ابوداؤد وسکت علیہ الشوکانی نیل جزء ۳ ص ۲۴)

آپ عصر کے بعد نماز پڑھتے تھے لیکن (امت کو) منع فرماتے تھے۔

لہذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

غلط فہمی " ہم قیام صلوٰۃ کے وقت اقامت میں ہر تکبیر دو دو مرتبہ کہیں لیکن مسلم میں ..... درج ہے "

حضرت بلال کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان کی تکبیریں دو دو مرتبہ اور اقامت کی صرف ایک مرتبہ کہے۔" (دو اسلام ص ۲۳۲)

ازالہ یہ بھی کوئی تعارض کی بات ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان و اقامت کے دو طریقے تعلیم کئے ہیں۔ لہذا دونوں صحیح ہیں " ہم ایسا کرتے ہیں " اور " فقہ میں ایسا لکھا ہے " ان جملوں سے حدیث پر کیا اعتراض ہے؟ اگر فقہ میں کوئی بات غلط ہو یا آپ غلط عمل کر رہے ہوں تو اس غلط مذہب اور غلط عمل کو چھوڑا جائے نہ کہ حدیث کو۔

غلط فہمی ہم پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سورت بھی پڑھتے ہیں لیکن مسلم میں درج ہے کہ ایک شخص نے ابوہریرہؓ سے پوچھا کہ کیا فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت پڑھنا ضروری ہے۔ کہا، اگر کوئی سورت پڑھ لے تو اچھا ہے ورنہ فاتحہ ہی کافی ہے اور ہمارے ائمہ فقہ کہتے ہیں کہ صرف فاتحہ سے نماز مکمل نہیں ہوتی "

(دو اسلام ص ۲۳۷)

ازالہ

غالباً آپ حنفی مذہب کے مطابق نماز پڑھتے ہیں، حنفی مذہب میں تو یہاں تک ہے کہ آخری دو رکعت میں کچھ بھی نہ پڑھے تو نماز ہو جائے گی۔ آپ اپنے مروجہ مذہب کی غلطی کو صحیح مان کر حدیث کو قابلِ اعتراض ٹھہراتے ہیں۔ یہ اصول ہی غلط ہے۔ حدیث کے مقابلہ میں فقہ کی بات مسترد کی جائے گی۔ حضرت ابوہریرہ کا یہ قول مقتدی کے لئے ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

لَا تَقْرَءُوا بِشَيْءٍ مِّنَ الْقُرْآنِ إِذَا جَهَرْتُ إِلَّا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَإِنَّهُ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِهَا (رواہ ابوداؤد وسندہ صحیح نیل الاوطار جز۲ صـ۱۸۲)

جب میں بلند آواز سے قرأت کروں تو قرآن میں سے کچھ بھی نہ پڑھو، مگر سورۃ فاتحہ، کیونکہ اس کے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوتی۔

غلط فہمی

ہم دعائے قنوت عشاء میں پڑھتے ہیں لیکن حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ دعائے قنوت نماز مغرب و فجر میں پڑھی جاتی تھی (دو اسلام صـ۲۲۷)

ازالہ

حضرت انسؓ کی حدیث میں قنوت نازلہ کا بیان ہے اور یہ اب بھی ضرورت کے وقت سنت ہے۔ وتر کا قنوت اس سے علیحدہ ہے آپ دونوں کو ایک سمجھ رہے ہیں

غلط فہمی

"ہمارا امام سبحانک اللھم وبحمدک … لا الٰہ غیرک دل میں پڑھتا ہے، لیکن مسلم میں عبدہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بلند آواز سے پڑھتے تھے،، (دو اسلام صـ۲۲۷)

ازالہ

حضرت عمرؓ تعلیم کی غرض سے ثنا بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ دارقطنی کی روایت میں صاف مذکور ہے۔

يُسْمِعُنَا ذٰلِكَ وَيُعَلِّمُنَا (دارقطنی صـ۱۳۵ وسندہ صحیح التعلیق المغنی)

یعنی ہمیں سناتے تھے اور سکھاتے تھے۔

غلط فہمی

بلکہ ایک روایت کے مطابق حضور اور ان کے صحابہ … سبحانک اللھم … کو چھوڑ جاتے تھے، انس کہتے ہیں کہ میں رسول کریم صلعم، ابوبکر، عمر اور عثمان کے پیچھے نماز پڑھتا رہا یہ حضرات نماز کا آغاز ہی سورہ فاتحہ سے کیا کرتے تھے۔ … افتتاح کے معنی ہیں آغاز کرنا، شروع کرنا اور شروع کا مفہوم یہی ہے کہ اس سے پہلے اور کوئی چیز نہ ہو۔ (دو اسلام صـ۲۲۷-۲۲۸)

ازالہ

برق صاحب حدیث میں تو یہ نہیں ہے کہ سورۂ فاتحہ سے نماز شروع کرتے تھے، لفظ ،،نماز،، آپ کی طرف سے ہے۔ حدیث میں اس طرح ہے:۔

يَسْتَفْتِحُوْنَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ — الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔

اس کے آگے ہے :-

لَا يَذْكُرُوْنَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فِيْ اَوَّلِ قِرَاءَةٍ وَلَا فِيْ اٰخِرِهَا۔ — نہ اس سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے، نہ آخر میں۔

دوسری حدیث میں وہ خود اس کی وضاحت کرتے ہیں :-

فَلَمْ اَسْمَعْ اَحَدًا مِّنْهُمْ يَقْرَأُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (صحیح مسلم) — میں نے ان میں سے کسی کو بسم اللہ الخ پڑھتے نہیں سنا۔

مطلب ظاہر ہے کہ قراءت بالجہر کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے، حتیٰ کہ بسم اللہ بھی ایسی آواز سے نہیں پڑھتے تھے کہ میں سن سکوں۔ لہٰذا حدیث میں ثنا پڑھنے کی نفی نہیں ہے، بلکہ ذکر یہ ہے کہ بلند آواز سے کیا چیز شروع کرتے تھے اور عدم ذکر سے عدم شے لازم نہیں آتا۔ برق صاحب کچھ تو اصول پر بھی غور فرما لیا کیجیے۔ غرض یہ کہ محض پڑھنے کی ابتداء ثنا سے ہوتی اور بلند آواز سے قرأت کی ابتداء سورۂ فاتحہ سے ہوتی۔

غلط فہمی

ہمیں نماز میں رکوع وسجود وقیام وقعود کے بغیر کسی اور عمل کی اجازت نہیں لیکن بخاری میں ہے "سہل بن سعد کہتے ہیں کہ جب مسجد نبوی کے لئے منبر تیار ہوا تو حضورؐ اس پر چڑھ گئے، منہ قبلہ کی طرف پھیر لیا، تکبیر کہی ...... پھر سجدے کے لئے زمین پر اتر آئے۔"

"ایک مرتبہ حضورؐ نے اپنی دختر زینبؓ کی بیٹی امامہ کو اٹھا کر نماز شروع کر دی۔"

"ابن عباس کہتے ہیں، حضورؐ رات کی نماز پڑھ رہے تھے میں بھی ان کے پیچھے بائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ آپ نے مجھے پکڑ کر دائیں طرف کر دیا۔" (دو اسلام ص۲۳۹)

ازالہ

برق صاحب یہ کس نے کہہ دیا کہ کوئی عمل جائز ہی نہیں کاش آپ حنفی فقہ ہی کو ملاحظہ فرما لیتے، ہاں ایسا عمل جائز نہیں جو ضروریات نماز سے نہ ہو، منبر پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروریات نماز سے تھا تاکہ لوگ نماز سیکھ لیں، سہل بن سعد کی روایت میں خود فخر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرما دی ہے۔ نماز کے بعد آپؐ نے فرمایا :-

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا صَنَعْتُ هٰذَا لِتَأْتَمُّوْا بِيْ وَلِتَعَلَّمُوْا صَلَاتِيْ (صحیح بخاری کتاب الجمعة) — اے لوگو! میں نے اس لئے ایسا کیا تھا کہ تم میری اقتدا کرو اور میری نماز سیکھ لو۔

(۲) جب بچہ کو سنبھالنے والا کوئی نہ ہو اور نماز بھی پڑھنی ہو تو اس کی یہی صورت ہے کہ بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے۔ نماز کو محض اس عذر سے ترک نہ کیا جائے امت کی عورتوں کے لئے یہ ایک آسانی بھی ہے اور ان کے عذر لنگ کا رو بھی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نواسی کو اٹھا کر نماز پڑھی، اور اپنے عمل سے اس حالت میں نماز کی ادائیگی کا طریقہ سکھا دیا، فللہ الحمد۔

(۳) بائیں سے دائیں طرف یا آگے سے پیچھے کر دینا یہ اب بھی جائز ہے، کیونکہ نماز کی ضروریات سے ہے معلوم نہیں برق صاحب نے اسے ناجائز کیسے سمجھ لیا۔

غلط فہمی

فقہا کے ہاں دوران نماز میں نمازی کے سامنے سے گذرنا ممنوع ہے بخاری میں ابوسعید سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص نمازی کے سامنے سے گذر رہا ہو تو اسے روکے، اگر نہ رکے، "فلیقاتلہ فانما ھو شیطان" تو اس سے باقاعدہ تلوار سے جنگ کرو اس لئے کہ وہ شیطان ہے۔

لیکن ابن عباس کہتے ہیں کہ "میں گدھی پر سوار ہو کر منیٰ میں پہنچا، رسول اللہ صلعم نماز پڑھا رہے تھے، میں کچھ نمازیوں کے سامنے سے گذر کر گدھی سے اترا... نماز میں شامل ہو گیا اور کسی نے برا نہ مانا۔ (ص۲۳۹)

ازالہ

فَلْیُقَاتِلْہُ کے معنی "باقاعدہ تلوار سے جنگ کرو" یہ کس حد تک صحیح ہیں؟ کیا یہ رنگینی اور مبالغہ آمیزی نہیں؟ سیدھے سادھے معنی یہ ہیں کہ اس سے لڑے۔

امام کا سترہ تمام مقتدیوں کے لئے کافی ہے، لہذا اگر کوئی شخص سترہ کے پیچھے سے مقتدیوں کے سامنے سے گذرے تو گذر سکتا ہے دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نمازی اور سترہ کے درمیان سے گذرے اسے روکنا چاہیئے اگر نہ رکے تو طاقت کے ذریعے سے واپس کر دے، لیکن اگر کوئی شخص کسی صف کے سامنے سے گذرے، ایسی حالت میں کہ امام کے سامنے سترہ ہو تو گذر سکتا ہے لہذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

غلط فہمی

عبداللہ بن عمر کا فیصلہ ہے.... کہ کسی چیز کے سامنے گذر جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی.... مسلم کی ایک حدیث ہے.... ابوہریرہؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ عورت، گدھا اور کتا سامنے آجائیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن حضرت عائشہ فرماتی ہیں.... کہ میں نماز میں حضورؐ کے سامنے پاؤں ان کی طرف پھیلا کر لیٹ جاتی تھی۔ (دو اسلام ص۲۳۹-۲۴۰)

ازالہ

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا جو فیصلہ ہے وہی حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

إِذَا وَضَعَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلَ مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ فَلْيُصَلِّ وَلَا يُبَالِي مَنْ مَرَّ وَرَاءَ ذٰلِكَ ۔

(صحیح مسلم)

جب تم میں سے کوئی شخص کجاوے کی پچھلی لکڑی کے مانند کوئی چیز اپنے سامنے رکھ لے تو نماز پڑھے اور جو کوئی سترے کے آگے سے گذرے تو اس کے گذرنے کی پرواہ نہ کرے ۔

دوسری حدیث میں آپ فرماتے ہیں :۔

لَا يَضُرُّهُ مَا مَرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ ۔

(مسلم)

پھر کوئی چیز بھی جو سامنے سے گذرے نقصان نہ دیگی ۔

ہاں اگر کوئی چیز سترہ اور نمازی کے درمیان سے گذرے یا سترہ نہ ہو پھر نمازی کے سامنے سے گذرے تو نماز قطع ہو جائے گی ، برق صاحب نے جو حدیث صحیح مسلم کے حوالہ سے نقل کی ہے ۔ اس کے آخری الفاظ نقل نہیں کئے ، آخری الفاظ یہ ہیں :۔

وَيَقِي ذٰلِكَ مِثْلُ مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ ۔

(صحیح مسلم)

(عورت ، گدھا اور کتا نماز کو قطع کرتے ہیں) اور اس قطع سے بچاتی ہے وہ چیز ، جو بطور سترہ سامنے رکھی ہو ، مؤخرۃ الرحل کے مثل ۔

اب حدیث میں اور ابن عمرؓ کے قول میں کوئی منافات و تعارض باقی نہیں رہا ۔

اب رہ جاتی ہے وہ حدیث جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے ، برق صاحب محرم عورت اور نامحرم میں بھی آخر فرق ہے ، پھر لیٹے رہنے اور گذرنے میں بھی فرق ہے ۔ گذرنے کی ممانعت ہے ، لیٹے رہنے کی نہیں ، آخر تعارض کی کون سی بات ہے پھر نبی اور غیر نبی کا فرق بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے ، اندھیرے اور اجالے میں بھی فرق ہے ، اختیار اور اضطرار میں بھی فرق ہے ۔ آپ نے کسی فرق کو ملحوظ نہ رکھا ، اگرچہ اصلی فرق محرم اور نامحرم ہی کا ہے ، نامحرم کے گذرنے سے خیالات پریشان ہوتے ہیں ، وسوسہ پیدا ہوتا ہے ، حضورِ قلب جاتا رہتا ہے اور یہی قطع صلوٰۃ ہے ، برخلاف اس کے اگر محرم سامنے سے نکلے تو خیالات میں پراگندگی پیدا نہیں ہوتی ، نہ حضورِ قلب قطع ہوتا ہے ، یہ نفسیاتی اور جنسیاتی مسئلہ ہے ، اس کے سمجھنے کے لئے ان علوم کی مہارت ضروری ہے ، یا پھر تجربہ درکار ہے ۔

غلط فہمی

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں :۔

كنت انام بين يدى رسول الله صلعم ورجلاى فى قبلته فاذا سجد غمزنى فقبضت

میں نماز میں حضور کے سامنے پاؤں ان کی طرف پھیلا کر لیٹ جاتی جب وہ سجدہ کرنے لگتے تو مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیتے چنانچہ میں پاؤں

رجلی فاذا قام بسطتهما والبیوت لیس فیها مصابیح۔ — سمیٹ لیتی اور جب وہ اٹھتے، تو پھر پھیلا دیتی اور گھر میں چراغ موجود نہیں تھا۔

(بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۵)

یہ اندھیرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ ابرو کو دیکھ لینا حضرت عائشہؓ ہی کا کمال ہو سکتا ہے،، (صفحہ ۲۴۰)

ازالہ یہ کمال تو آپ نے کیا کہ "غمزنی" کا ترجمہ "آنکھ سے اشارہ کر دیتے،، کر دیا، غلط فہمی کی حد ہو گئی "غمز،، کے معنی کسی چیز کو ہاتھ سے دبانا بھی ہے دیکھو منتہی الارب فی لغات العرب جلد ۳ صفحہ ۴۷۹ و مفتاح اللغات صفحہ ۵۹۷، المنجد صفحہ ۵۸۸

برق صاحب قطع نظر اس لغوی معنی کے اگر آپ احادیث ہی کا گہرا مطالعہ فرما لیتے، تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی، دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ خود ہی فرماتی ہیں:۔

غَمَزَ رِجْلِيَّ فَقَبَضْتُهُمَا (صحیح بخاری ابواب السترۃ) — آپ میرے پیروں کو دبا دیتے تھے میں ان کو سمیٹ لیتی۔

غلط فہمی "جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے مسلم والی حدیث پیش کی گئی تو آپ نے بگڑ کر فرمایا، تم لوگوں نے ہم عورتوں کو گدھوں اور کتوں جیسا سمجھ لیا، خدا کی قسم میں رسول اللہ صلعم کے سامنے چٹائی پر لیٹی ہوتی تھی اور وہ نماز ادا کیا کرتے تھے،، (مسلم)

بدیگر الفاظ حضرت عائشہ نے اس حدیث کی صحت سے انکار کر دیا ہے اور پھر بھی یہ صحیح مسلم کا جزو بنی ہوئی ہے (دو اسلام صفحہ ۲۴۰-۲۴۱)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، حضرت عائشہؓ کے سامنے حدیث بیان نہیں کی گئی بلکہ بعض لوگوں کا قول پیش کیا گیا۔ مثلاً عروہؓ کہتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا:۔

مَا يَقْطَعُ الصَّلٰوةَ فَقُلْنَا الْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ (صحیح مسلم) — نماز کو کیا چیز قطع کرتی ہے؟ ہم نے کہا عورت اور گدھا

دوسری حدیث میں ہے:۔

ذُكِرَ عِنْدَهَا مَا يَقْطَعُ الصَّلٰوةَ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) — حضرت عائشہؓ کے پاس اس چیز کا ذکر آیا جو نماز کو توڑتی ہے۔

غرض یہ کہ حضرت عائشہ کے سامنے لوگوں کی رائے پیش کی گئی۔ اس لئے انہوں نے اس کی تردید

میں حدیث سنائی کہ محض سامنے لیٹنے سے نماز منقطع نہیں ہوتی ۔ رہا عورت کا سامنے سے گذرنا جبکہ سامنے کوئی سترہ نہ ہو تو اس سے بے شک نماز منقطع ہو جاتی ہے ۔ حضرت عائشہ رضؓ نے اس سے انکار نہیں کیا بلکہ وہ تو خود اس مضمون کی حدیث روایت کرتی ہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

لَا یَقْطَعُ صَلٰوۃَ الْمُسْلِمِ شَیْءٌ اِلَّا الْحِمَارُ وَالْکَافِرُ وَالْکَلْبُ وَالْمَرْاَۃُ فَقَالَتْ عَائِشَۃُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَقَدْ قُرِنَّا بِدَوَابِّ السُّوْءِ (مسند احمد ورجالہ موثقون مجمع الزوائد جزء ۲ صـ۶۰)	مسلم کی نماز کو کوئی چیز منقطع نہیں کرتی سوائے گدھے ، کافر ، کتے اور عورت کے ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا ، اے اللہ کے رسولؐ ! ہمیں بُرے جانوروں کے ساتھ جمع کر دیا گیا ۔

غرض یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ صحیح مسلم کی حدیث کی تائید کرتی ہیں اور باوجود اظہار افسوس کے حدیث کو بعینہٖ روایت کرتی تھیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتی تھیں ۔

غلط فہمی ” عام مسلمان رکوع سے پہلے یا بعد ہاتھ نہیں اٹھاتے لیکن بخاری میں پوری بیک احادیث اس مضمون پر ملتی ہیں کہ حضور رکوع سے پہلے اور پیچھے نیز درمیانی التحیات سے اٹھ کر ہاتھ اٹھایا کرتے تھے ۔“ (دو اسلام صـ۲۴۱)

ازالہ عام مسلمانوں سے مراد آپ کی احناف ہیں جن کی ہندو پاکستان میں اکثریت ہے اور حنفی مذہب ہی سے آپ کو بھی تعلق ہے لہٰذا ہر ایسی چیز آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہے جو آپ کے مذہب میں نہیں ہے ۔ برق صاحب مذہب اسلام تو وہی ہے جو حدیث میں ہے ، باقی رہا کسی فرقہ کا اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا یہ ان کا اپنا فعل ہے ان کے کسی فعل سے اسلامی چیز پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ برق صاحب یہ گروہ بندیاں ہی ہیں جنہوں نے اسلام کو تباہ کیا ، یہ تقلید ہی کی بندشیں ہیں جنہوں نے فرقوں ، بدعات و خرافات کو جنم دیا ، آپ کو اسی تقلید کی وجہ سے رفع یدین نظر نہ آیا ۔ ورنہ رفع یدین نقلاً و عملاً متواتر ہے ، سنت ثابتہ ہے اور اسی پر جماعت المسلمین کا عمل ہے ، آپ کو صرف چار احادیث نظر آئیں ، حالانکہ صحیح بخاری میں بھی چار نہیں پانچ احادیث ہیں اور اگر آپ تحقیق کرتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ کئی سو احادیث و آثار اس باب میں صحیح ثابت ہوئے ہیں ۔

غلط فہمی ” ہم بلا وجہ ظہر و عصر اور عشاء و مغرب کی نمازوں کو جمع نہیں کر سکتے لیکن مؤطا میں ہے کہ حضور بغیر کسی خوف یا سفر کے بھی نماز ظہر و عصر اور مغرب و عشا کو اکٹھا کر لیا کرتے تھے ۔“ (دو اسلام صـ۲۴۱)

ازالہ برق صاحب آپ نے "صَلّٰی" کا ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ آپ نے ظہر وعصر کو جمع کیا، مغرب وعشاء کو جمع کیا" نہ یہ کہ "جمع کر لیا کرتے تھے" آپ نے ماضی مطلق کو ماضی استمراری بنا دیا۔ یہ صرف ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ دونوں نمازوں کو اپنے اصلی وقت ہی میں ادا کیا۔ وقت سے ہٹا کر کوئی نماز نہیں پڑھی گئی۔ عبداللہ بن عباسؓ جن کی حدیث برق صاحب نے نقل فرمائی ہے، وہی اس کی تشریح کرتے ہیں:۔

صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ ثَمَانِيًا وَّسَبْعًا جَمِيْعًا اَخَّرَ الظُّهْرَ وَعَجَّلَ الْعَصْرَ وَ اَخَّرَ الْمَغْرِبَ وَعَجَّلَ الْعِشَاءَ (نسائی کتاب المواقیت وسندہٗ صحیح)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ میں آٹھ اور سات رکعات اکٹھی پڑھیں آپ نے ظہر کو آخر وقت پڑھا اور عصر کو جلدی، مغرب کو آخر وقت میں ادا کیا، اور عشاء کو جلدی۔

غرض یہ کہ یہ جمع صوری تھی نہ کہ حقیقی یعنی بظاہر دونوں ایک وقت میں پڑھی گئی تھیں لیکن حقیقتہً دونوں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئی تھیں۔

غلط فہمی "فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ حائضہ روزے رکھے اور نماز نہ پڑھے۔

انّ الحائض تقضی الصیام ولا تقضی الصلوٰۃ۔	حائضہ روزے رکھے، لیکن نماز ادا نہ کرے (بخاری جلد ۲ صہ ۲۳۹)

لیکن حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ:

حضورؐ کی ایک زوجہ محترمہ حضورؐ کے ہمراہ معتکف ہو گئیں اس دوران میں انہیں حیض شروع ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ جب وہ نماز پڑھتی تھیں تو ہم ان کے نیچے برتن رکھ دیتے تھے۔" (صہ ۲۴۱-۲۴۲)

ازالہ برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ حائضہ روزے کی قضا کرے اور نماز کی قضا نہ کرے نہ یہ کہ بحالت حیض روزے رکھے، جیسا کہ برق صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔

دوسری حدیث میں "استحاضہ" کا ترجمہ "حیض" صحیح نہیں۔ حیض اور استحاضہ علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ برق صاحب دونوں کو ایک سمجھ بیٹھے۔ زوجہ مطہرہ استحاضہ کی حالت میں نماز ادا فرماتی تھیں نہ کہ بحالتِ حیض، حالت حیض میں نماز معاف ہے لیکن حالت استحاضہ میں نماز معاف نہیں ہے۔ استحاضہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ فَاِذَا اَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلٰوةَ وَاِذَا اَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّيْ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)	استحاضہ حیض نہیں ہے بلکہ ایک رگ کا خون ہے پس جب حیض شروع ہو تو نماز چھوڑ دو اور جب حیض چلا جائے تو خون دھو ڈالو اور نماز پڑھو۔

غلط فہمی

حضورؐ فرماتے ہیں کہ مجھے رکوع وسجود میں قرآن پڑھنے سے روک دیا گیا ہے (مسلم جلد ۲ صفحہ ۹۱)

لیکن حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ۔

حضور رکوع اور سجود میں قرآن کی یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ "سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح" (مسلم)

مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکم دے کر خود ہی اسے توڑ دیا کرتے تھے"

(دو اسلام صفحہ ۲۴۲-۲۴۳)

ازالہ

برق صاحب آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی آپ اس تسبیح کو قرآن مجید کی آیت سمجھ رہے ہیں حالانکہ یہ قرآن مجید کی آیت نہیں آپ نے قرآن مجید کا بہت ہی سرسری مطالعہ کیا ہے اور حدیث کا بھی اور اسی وجہ سے یہ غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ حدیث مذکور کے ترجمہ میں "قرآن کی آیت" آپ کا اضافہ ہے عربی متن میں یہ الفاظ نہیں ہیں اور کیونکہ یہ تسبیح قرآن مجید کی آیت نہیں ہے لہٰذا اعتراض کالعدم ہے۔

غلط فہمی

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نماز میں انسانی کلام جائز نہیں (مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۲۹)

لیکن ابوالدرداء روایت کرتے ہیں کہ۔

ایک مرتبہ نماز کے دوران میں حضور کے سامنے شیطان آگیا تو آپ نے تین مرتبہ کہا ... تم پر اللہ کی لعنت (مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۳۹)

یعنی حضور کے لئے نماز میں انسانی کلام جائز ہے اور دوسروں کے لئے ناجائز"

(دو اسلام صفحہ ۲۴۳)

ازالہ

بے شک نماز میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے کلام کرنا حرام ہے لیکن نمازی کا اللہ سے کلام کرنا جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابلیس کے سامنے آجانے پر کہا:-

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ	میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا کی کہ وہ شیطان کو دور رکھے۔ اور یہ شیطان سے پناہ مانگنا بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۶) — جب شیطان تمہیں ستائے تو اللہ کی پناہ طلب کرو۔

پھر شیطان سے پناہ مانگنا صرف آپ کے لئے ہی جائز نہیں، بلکہ آپ کی اتباع میں ہر ایک کے لئے جائز ہے اور اس کا آپ نے حکم بھی دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو صحیح مسلم کتاب السّلام باب التعوذ من شیطان)

غلط فہمی ہم دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ لیکن حضرت انس کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بارش کی دعا کے بغیر کسی اور دعا میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ (دو اسلام صـ۲۴۴)

ازالہ برق صاحب نے حدیث کا آخری جملہ چھوڑ دیا اور وہ یہ ہے:۔

فَاِنَّهٗ يَرْفَعُ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ اِبْطَيْهِ۔ (صحیح بخاری) — عموماً دعا میں آپ ہاتھ اتنے بلند کرتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی (لیکن دعاءِ استسقاء میں اس سے بھی زیادہ بلند کرتے تھے)

لہٰذا حضرت انس رضی اللہ عنہ کا منشاء یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دعا میں ہاتھ اتنے اونچے نہیں کرتے تھے جتنے دعاءِ استسقاء میں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے دوسری دعاؤں میں رفع بلیغ کا انکار کیا ہے نہ کہ مطلق رفع کا، برق صاحب کو بڑی زبردست غلط فہمی ہوئی۔

غلط فہمی ہم جوتے اتار کر نماز ادا کرتے ہیں لیکن سعید بن یزید الازدی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا... کیا حضور جوتوں سمیت نماز پڑھا کرتے تھے۔ کہا ہاں۔ (دو اسلام صـ۲۴۴)

ازالہ دونوں طرح سنت ہے اور دونوں طرح جائز ہے۔ اس میں کون سا تعارض ہے۔

غلط فہمی "ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ سجدے میں کتے کی طرح بازو مت کھولو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:۔

لا ینبسط ذراعیہ کالکلب — ایک نمازی سجدے میں کتے کی طرح بازو نہ کھولے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

لیکن ایک اور حدیث میں ہے کہ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں بازوؤں کو اتنا کھول لیتے تھے کہ ان کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی"(دواسلام صـ۲۴۴-۲۴۵)

ازالہ برقی صاحب نے پہلی حدیث کا ترجمہ صحیح نہیں کیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ سجدے میں کتے کی طرح باز و نہ بچھائے۔ اس میں کھولنے یا نہ کھولنے کا کوئی ذکر ہی نہیں لہذا کوئی تعارض نہیں، حنفی مذہب میں بھی سجدے میں باز و کھولنا سنت ہے اور عام لوگ بھی یہی کرتے ہیں۔ آپ کا عمل عام لوگوں کے بھی خلاف ہے، حنفی مذہب کے بھی خلاف ہے اور دین اسلام کے بھی خلاف ہے۔

غلط فہمی "ہم پہلی رکعت کے بعد سیدھے اٹھ جاتے ہیں لیکن مالک بن الحویرث کہتے ہیں .... کہ حضور دوسرے سجدے سے سر اٹھانے کے بعد پہلے آرام سے زمین پر بیٹھ جاتے اور پھر اٹھتے" (دواسلام صـ۲۴۵)

ازالہ پہلی رکعت کے بعد بیٹھنا سنت ہے اور یہی جماعت المسلمین کا معمول ہے، حنفی تقلیدی اس کا انکار کرتے ہیں اور بے دلیل انکار کرتے ہیں۔

غلط فہمی "حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ حضور . . . . . سب سے زیادہ مختصر اور مکمل نماز پڑھاتے تھے" (دواسلام صـ۲۴۵)

وہی انسؓ.... بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی، کہ جب وہ رکوع سے سر اٹھاتے تھے تو اتنی دیر کھڑے رہتے تھے کہ دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ آپ بھول گئے ہیں اور سجدہ کے بعد بھی یہی حالت ہوتی تھی"۔ (دواسلام صـ۲۴۶)

ازالہ پہلی حدیث میں ہے کہ آپ مکمل نماز پڑھتے تھے اور مکمل کی تشریح یہ ہے کہ قومہ اور جلسہ میں کچھ دیر ٹھہر جایا کرتے تھے یہ نہیں کہ تو چل میں آیا، اللہ اکبر، اللہ اکبر ہوتا رہتا ہے کہیں سکون ہے نہ اطمینان، نہ قومہ میں دعا پڑھی جاتی ہے نہ جلسہ میں، ان دعاؤں میں مشکل سے ۳۰ سیکنڈ لگتے ہیں۔ اگر یہ ۳۰ سیکنڈ بھی بہت لمبا وقفہ ہے تو پھر اللہ ہی حافظ ہے۔ ہاں جو لوگ جلدی جلدی اللہ اکبر، اللہ اکبر کرتے ہیں وہ یہی سمجھیں گے کہ شاید بھول ہو گئی۔ اور یہی ہمارا تجربہ ہے۔

برقی صاحب نے لکھا ہے کہ "آپ کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی" یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں، برقی صاحب نے غلط فہمی سے خود لکھ دیئے ہیں۔ قومہ میں سکون سے کھڑا ہو جانے اور جلسہ میں سکون سے بیٹھ جانے کو انہوں نے طولِ نماز سمجھ لیا۔

. . . .

غلط فہمی جو کسر باقی تھی، اسے ابو سعید الخدری پورا کرتا ہے کسی نے ابو سعید سے رسول اللہ صلعم کی نماز کے متعلق سوال کیا تو آپ نے کہا۔

کانت صلوٰۃ الظہر تقام فینطلق احدنا الی البقیع فیقضی حاجتہ ثم یاتی اھلہ فیتوضأ ثم یرجع الی المسجد و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الرکعۃ الاولیٰ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی کہ فرض کیجیے نماز ظہر شروع ہو چکی ہے ایک شخص پہلے بقیع میں جاتا ہے وہاں سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا ہے، وضو کرتا ہے پھر مسجد میں جاتا ہے اور حضور ابھی پہلی رکعت ہی پڑھا رہے ہوتے تھے

ازالہ اس حدیث میں بھی لمبی نماز کا کوئی ذکر نہیں آپ نے "تقام" کا ترجمہ "شروع ہو چکی" کرکے اور "فرض کیجیے" کے الفاظ کا اضافہ کرکے نماز کے لمبا ہونے کا مفہوم پیدا کر دیا لیکن صحیح ترجمہ صرف اتنا ہے کہ "نماز کی اقامت ہوتی" ظاہر ہے کہ اقامت میں کچھ وقت لگتا ہوگا۔ صف بندی بھی ہوتی ہوگی۔ پھر صف بندی کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام مشہور ہے، آپ کسی کو آگے کرتے کسی کو پیچھے کرتے پھر نماز شروع ہوتی ہوگی۔ لہٰذا اتنے عرصہ میں اگر کوئی شخص پیشاب اور وضو سے فارغ ہو کر آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی رکعت میں پاتا یہی حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں تقریباً تیس آیات تلاوت فرماتے تھے (صحیح مسلم) لہٰذا ثابت ہوا کہ نماز طویل نہیں ہوتی تھی اور نہ ایسی نامکمل ہوتی تھی جیسی آج کل ہوتی ہے۔ برق صاحب نے حضرت انسؓ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما کے متعلق جو خلافِ ادب الفاظ استعمال کئے ہیں اگر وہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں تو مناسب ہوگا۔

غلط فہمی بخاری کی حدیث ہے کہ "ابردوا بالصلوٰۃ" (نماز کو ذرا ٹھنڈے وقت میں پڑھو) لیکن بخاری ہی میں ایک اور حدیث ہے۔

"انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر اتنی جلدی پڑھ لیتے تھے کہ اگر ہم نماز پڑھ کر عوالی (مدینہ سے چار میل) سے بھی پھر آتے، تو سورج کافی اونچا ہوتا تھا۔ (بخاری ج ۱ صد ۷۷) انگریزی میل ۱۷۶۰ گز لمبا ہوتا ہے۔ اور عربوں کا پرانا میل ۲۴۵۵ گز۔ اس حساب سے عوالی اور مدینہ کا دو طرفہ سفر گیارہ میل اور ایک فرلانگ بنتا ہے جس پر درمیانی رفتار سے کم از کم چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔۔۔ بدیگر الفاظ حضور نماز عصر غروب آفتاب سے ساڑھے پانچ گھنٹے پہلے پڑھا کرتے تھے۔۔۔ قربان جاؤں اس وحی خفی پر۔

(دو اسلام صد ۲۴۷ - ۲۴۸)

ازالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کہ "نماز کو ٹھنڈے وقت پڑھا کرو" ، یہ ظہر کے متعلق ہے اور یہ اس لئے کہ آنے والوں کو دیواروں کا سایہ مل جائے۔ اور وہ بآسانی آسکیں، یہ حکم اس زمانہ کے لئے مخصوص ہے جب سخت گرمی کا موسم ہو ورنہ ٹھنڈا کرنے کے کیا معنی ہوں گے۔ برق صاحب نے اس حکم کو عصر کے متعلق سمجھا یہ ان کی پہلی غلط فہمی ہے حالانکہ حدیث میں ظہر کی صراحت موجود ہے معلوم نہیں لفظ "ظہر" برق صاحب کی نظر سے کیسے اوجھل ہو گیا۔

دوسری حدیث کا ترجمہ کرنے میں برق صاحب کو زبردست غلط فہمی ہوئی۔ صحیح ترجمہ ملاحظہ ہو۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ حَيَّةٌ فَيَذْهَبُ الذَّاهِبُ إِلَى الْعَوَالِي فَيَأْتِيهِمْ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھتے تھے جب کہ سورج بلند اور چمکدار رہتا تھا۔ پھر ایک جانے والا عوالی جاتا تھا اور ان کے پاس پہنچ جاتا تھا، ایسی حالت میں کہ سورج بلند ہوتا تھا۔

حدیث میں یک طرفہ فاصلہ کا ذکر ہے۔ برق صاحب نے دو طرفہ کر دیا۔ ایک طرف کا فاصلہ چار عربی میل ہوا اور یہ فاصلہ بآسانی ۱½ گھنٹہ میں طے ہو سکتا ہے۔ اس حساب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غروب آفتاب سے تقریباً ڈھائی گھنٹے پہلے نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ بالکل اسی وقت ہم خود آج کل نماز عصر ادا کرتے ہیں لہٰذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے۔

غلط فہمی ابو امامہ کہتے ہیں کہ میں اور عمر بن عبد العزیز نماز ظہر پڑھ کر معاً حضرت انس بن مالک کے ہاں چلے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ نماز عصر پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا یہ کیا؟ کہنے لگے کہ حضور کا وقت عصر یہی تھا۔

(دو اسلام صفحہ ۲۴۸)

ازالہ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے ان لوگوں نے ظہر کی نماز دیر سے پڑھی ہو گی یہ قصور ان کا ہے نہ کہ اصلی وقت کا، عصر کا اصلی وقت مغرب سے تقریباً ۲½ یا ۳ گھنٹہ پہلے شروع ہوتا ہے۔ آج کل عوام الناس جس وقت نماز پڑھتے ہیں وہ آخر وقت ہوتا ہے۔

انتباہ

اس کے بعد برق صاحب نے "چند اور اختلاف" کے عنوان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ دعائیں نقل فرمائی ہیں اور ان کو اپنے عمل یا احناف کے عمل سے متعارض سمجھا ہے۔ برق صاحب

بات یہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہیں اگر رکوع میں ایک سے زائد دعائیں ماثور ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سب غلط ہیں۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ دعائیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ آخر اس میں اشکال کی کون سی بات ہے۔ اشکال تو اس وجہ سے پیدا ہوا کہ آپ کو بچپن سے ان دعاؤں سے ناواقف رکھا گیا۔

غلط فہمی

"تو یہ ہے حدیث کی نماز! کیا آپ یہی نماز پڑھا کرتے تھے اگر نہیں تو کس منہ سے یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر حدیث نہ رہے تو نماز کا نام ونشان مٹ جائے، آپ حدیث کی نماز سے کوسوں بھاگتے ہیں اور پھر حدیث کو شارح صلوٰۃ بھی کہتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ بڑا معمہ کون سا ہے آپ یا آپ کی حدیث!" (دو اسلام ص ۲۵۱-۲۵۲)

ازالہ

آپ کی تمام غلط فہمیوں کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے لہذا حدیث کی نماز بالکل صحیح ہے اور اسی طریقہ سے افراد جماعت المسلمین نماز ادا کرتے ہیں، حدیث کی نماز سے کوسوں دور وہ بھاگتے ہیں جنہوں نے اپنے علیحدہ علیحدہ مذہب بنا لئے ہیں اور جو اپنے مذہب کی خاطر طرح طرح کے حیلوں اور بہانوں سے حدیث کو رد کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر فتنہ انکار حدیث کو جنم دینے والے یہی لوگ ہیں اور اس فتنہ کی پرورش کرنے والے وہ لوگ ہیں جو آج علی الاعلان میدان میں اتر آئے ہیں، برق صاحب اس جلی اور خفی انکار حدیث سے بچئے۔ فرقہ بندی سے علیحدہ ہو کر نماز کو سیکھئے۔ پھر آپ کو وہی نماز حاصل ہو گی جو حدیث میں ہے۔

باب ۱۱

بہترین عمل

غلط فہمی جب ملا نے دیکھا کہ مسلمان بننے کے لئے جان دینا پڑتی ہے تو اس نے بعض دیگر اعمال کی افضیلت پر احادیث گھڑنا شروع کر دیں اور جہاد کی وقعت کو گھٹا کر کہیں تو اسے تیسرے یا چوتھے درجے کا عمل بنا دیا اور کہیں اچھے اعمال کی فہرست ہی سے خارج کر دیا (ص ۲۵۶)

ازالہ برق صاحب قرآن مجید میں بھی ایسی متعدد آیات ہیں جن میں جہاد کا ذکر نہیں ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

۱۔ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ (حٰمٓ السجدۃ ۔ ۳۰)

جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ تعالےٰ ہے اور پھر اس پر جمے رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ تم نہ ڈرو، اور نہ غم کھاؤ اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

اس آیت کی رُو سے بس "رَبُّنَا اللّٰہ" کہہ لے اور اسی پر جما رہے، تو وہ جنتی ہے اس آیت کی رُو سے نہ مالی قربانی کی ضرورت، نہ میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دینے کی ضرورت، کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت بھی کسی مُلّا کی گھڑی ہوئی ہے۔؟

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ

مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتے اور وہ

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ (الانفال: ۲ تا ۴)

اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں۔ جو لوگ نماز کو قائم کرتے ہیں اور ہماری دی ہوئی دولت میں سے خرچ کرتے ہیں یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کیلئے ان کے رب کے پاس درجات ہیں، مغفرت ہے اور بہترین رزق ہے۔

اس آیت میں بھی جہاد کا ذکر نہیں، بس دل کو نرم بنالے، توکل کرے، نماز پڑھے، اور تھوڑا بہت کبھی خرچ بھی کرتا رہے خواہ اس خرچ کا محل کچھ ہی ہو، اللہ کے لئے خرچ کرنا بھی ضروری نہیں ہے بس وہ پکا مومن ہے، وہ حقیقی مسلم ہے، وہ جنت کا ٹھیکدار ہے، بتائیے اس آیت کے متعلق ہم کیا خیال قائم کریں؟

۳۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (المؤمنون ۱ تا ۱۱)

بے شک نجات پائی ان مومنین نے جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں اور جو لغو کاموں سے دور رہتے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے بیوی اور لونڈی کے کہ ان کے حق میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، ہاں جو ان کے علاوہ تلاش کریں وہ حد سے گذرنے والے ہیں اور جو لوگ امانتوں اور عہدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

برق صاحب! دیکھا آپ نے اعمال صالحہ کی کتنی لمبی فہرست ہے لیکن جہاد کا ذکر کہیں نہیں، سورۂ معارج میں کم و بیش انہی اعمال پر مشتمل پھر ایک لمبی فہرست ہے لیکن اس میں بھی جہاد کا ذکر نہیں باوجود اس کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ " اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ " (معارج: ۳۵) یہ لوگ جنت میں عزت والے ہوں گے ان طویل فہرستوں میں جہاد کا ذکر تک نہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ جہاد کوئی ایسی ضروری چیز نہیں جس کے بغیر جنت نہ مل سکے۔ بتائیے اب ان آیات کے متعلق ہم کیا خیال

قائم کریں۔ قرآن مجید میں اس قسم کی اور بھی بہت سی آیات ہیں، بخوف طوالت ہم نقل نہیں کر سکتے مشتے نمونہ از خروارے یہی کافی ہیں

غلط فہمی عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ سب سے بہترین عمل کون سا ہے فرمایا، نماز بہ پابندی وقت، اس کے بعد والدین کی خدمت اور اس کے بعد جہاد (صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۹) دیکھا آپ نے نماز کو کہاں رکھا اور جہاد کو کہاں جا پھینکا (دو اسلام صفحہ ۲۵۶)

ازالہ برق صاحب اوپر سورۂ مومنون اور سورۂ معارج سے اعمالِ صالحہ کی طویل قرآنی فہرستیں پیش کی جا چکی ہیں ان دونوں فہرستوں میں نماز سے آغاز ہوا ہے اور نماز ہی پر اختتام ہوا ہے گویا نماز پر بڑا زور دیا گیا ہے رہا جہاد تو اس کا ان طویل فہرستوں میں ذکر تک نہیں، اب بتائیے نماز زیادہ اہم ہے یا جہاد۔ اچھا وہ آیت سنیئے جس میں جہاد کو سب سے پیچھے ڈال دیا گیا ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۷۷)	بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ جو ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر قیامت پر، فرشتوں پر کتابوں پر اور نبیوں پر اور جس نے اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو یتیموں کو، مساکین کو، مسافروں کو، سائلین کو مال دیا اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کیا اور جس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور جو عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب عہد کر لیں، اور جو صبر کرنے والے ہیں غربت میں، بیماری میں اور جہاد میں، یہی لوگ ہیں جنہوں نے سچ کہا (صدقِ دل سے ایمان لائے) اور یہی متقی ہیں۔

برق صاحب دیکھا آپ نے کتنی طویل فہرست ہے لیکن جہاد فہرست کے اختتام پر ہے۔

غلط فہمی حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:۔

نری الجهاد افضل العمل افلا نجاهد قال لا لكن افضل الجهاد حج مبرور	کہ ہماری رائے میں جہاد بہترین عمل ہے کیا ہم جہاد نہ کریں، فرمایا نہیں، بلکہ حج بہترین جہاد ہے۔

چلو اہل عرب اور ہمارے امراد کی تو جہاد سے خلاصی ہوئی... بڑھیا جہاد والے کو کیا پڑی ہے کہ جان دے کر گھٹیا جہاد کرتا پھرے (دو اسلام صد ۲۵۶ - ۲۵۷)

ازالہ

برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے :۔
"ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افضل العمل ہے تو کیا ہم جہاد نہ کریں، آپ نے فرمایا تم عورتوں کے لئے بہترین جہاد حج مبرور ہے"
برق صاحب نے "لٰکِنَّ" کو "لٰکِنْ" سمجھ کر ترجمہ کیا اور یہی اصلی غلط فہمی ہے حدیث کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ازواج مطہرات اور عام عورتوں کے لئے حج ہی جہاد ہے ان کے لئے میدان کارزار میں مردوں کے دوش بدوش لڑنا اور کافر مردوں سے گتھا گتھم ہونا مناسب نہیں، برق صاحب سمجھے کہ گویا یہ حکم مردوں کے لئے ہے، نہیں، ہرگز نہیں، پھر حدیث سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ جہاد بہترین عمل ہے لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حج جہاد سے بہتر ہے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حج بھی ایک قسم کا جہاد ہے اور عورتوں کے لئے یہی جہاد بہتر ہے۔

غلط فہمی

کسی نے حضورؐ سے پوچھا کہ بہترین عمل کون سا ہے؟ فرمایا، خدا اور رسول پر ایمان، اس کے بعد جہاد اور اس کے بعد حج۔
اوپر والی حدیث کے مطابق بہتر عمل حج تھا اور اس کے بعد جہاد، اس حدیث کے مطابق حج سے جہاد بہتر ہے۔ (دو اسلام صد ۲۵۷)

ازالہ

اوپر والی حدیث کا ترجمہ آپ سے غلط ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کو یہاں بھی الجھن پیش آئی۔ اس حدیث میں عورتوں کے لئے حج کو بہتر بتایا گیا۔ اور اس حدیث میں حکم عام ہے یعنی مردوں کے لئے جہاد حج سے افضل ہے۔

غلط فہمی

"قرآن لاکھ چلائے کہ ہم جہاد کے بغیر جنت نہیں دیں گے... لیکن حدیث کہتی ہے کہ اللہ نمازی اور روزہ دار کو بہشت میں بھیجنے پر مجبور ہے" (دو اسلام صد ۲۵۸)

ازالہ

قرآن تو صرف ربنا اللہ کہنے پر جنت کی بشارت دیتا ہے، جنت میں لے جانے والے عملوں کی طویل فہرست بیان کرتا ہے، اور مکرر سہ کرر بیان کرتا ہے لیکن کہیں جہاد کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ بغیر جہاد کے جنت ہی میں نہیں، بلکہ جنت الفردوس میں داخل کر دیتا ہے۔
نمازی اور روزہ دار کے لئے جو الفاظ حدیث میں آئے ہیں وہ یہ ہیں :۔

كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ — اللہ پر حق ہے کہ وہ ان کو جنت میں داخل کرے

برق صاحب نے "كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ" کے معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مجبور ہے، سنیئے! اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:۔

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥ — ہم پر مؤمنین کی مدد کرنا حق ہے۔

(الروم: ۴۷)

برق صاحب آپ کے لحاظ سے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کی مدد کرنے کے لئے مجبور ہے تو کیا قرآن مجید پر بھی وہی اعتراض ہو گا جو حدیث پر کیا گیا ہے، اگر نہیں تو حدیث نے کیا قصور کیا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اعمال کی ادائیگی پر جنت کا وعدہ کیا ہے اور کیونکہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا، لہٰذا اس کے لئے وعدہ پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ بتایئے اب وہ وعدہ پورا کرے یا نہیں؟ اگر کرتا ہے تو گویا بقول آپ کے مجبور ہے اگر نہیں کرتا تو وعدہ خلافی ہوتی ہے۔

غلط فہمی

"ایک حدیث ملاحظہ ہو:۔

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل کون سا ہے۔ ایسا عمل جو تمہارے درجوں کو بلند کرے، جو سونے چاندی کی قربانی سے بہتر ہو، اور اس جہاد سے بھی اچھا ہو جس میں تم دوسروں کی گردنیں کاٹتے اور اپنی کٹاتے ہو۔ لوگوں نے کہا بتایئے، کہا اللہ کا ذکر"

سب سے زیادہ اللہ کا ذکر ایک بھکاری کرتا ہے جو ایک ایک سانس میں دس دس مرتبہ اللہ کا نام لے کر بھیک مانگتا ہے، تو گویا اس حدیث کی رُو سے بھکاری بہشت کے ٹھیکیدار اور سردار ہوں گے اور ہم تم سب ان کے خدمت گار۔"

(دو اسلام صہ ۲۵۸-۲۵۹)

ازالہ

برق صاحب اس حدیث کا جواب باب اول میں دیا جا چکا ہے یہاں آپ نے اسے دوبارہ نقل کر دیا ہے۔ اور قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ کہیں تو دخولِ جنت صرف ربنا اللہ کے ورد پر مل جاتی ہے اور کہیں اور اعمال کی ادائیگی پر جن میں جہاد کا ذکر نہیں، بتایئے ایک بھکاری جو صبح سے لے کر شام تک "ربنا اللہ" کا نعرہ لگائے وہ جنتی ہے؟ اگر ہے تو پھر کیا قرآن مجید پر بھی وہی اعتراض ہو گا جو حدیث پر ہے؟ درحقیقت یہ اعتراض ہی غلط فہمی پر مبنی ہے (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو)

غلط فہمی "یہ نہ سمجھیے کہ افضلیت جہاد پر حضور کا کوئی قول موجود ہی نہیں، بہتیرے ہیں لیکن ہمارے واعظین اور دینی راہ نما انہیں چھپائے رکھتے ہیں۔"

(دو اسلام صـ۲۵۹)

ازالہ برق صاحب جو لوگ چھپاتے ہیں وہ قابلِ مواخذہ ہیں لیکن داد دیجیے محدثین کو کہ انھوں نے جہاد کی افضلیت میں بے شمار احادیث اپنی کتابوں کی زینت بنادیں۔ اور ان کو مُلّا کی طرح چھپایا نہیں اور یہی وہ احادیث ہیں جن کو فخر کے ساتھ آپ نے صـ۲۶۰ اور صـ۲۶۱ پہ نقل فرمایا ہے۔

غلط فہمی "متقین کا مصدر ہے تقویٰ جس کے معنی ہیں حفاظت، بچاؤ، ڈیفنس، یعنی متقی لوگ وہ ہیں جن کا ڈیفنس مضبوط ہو جن کی سرحدیں مستحکم ہوں۔ جو مہیب عسکری طاقت کے مالک ہوں۔ اور جن کا کردار اتنا بلند ہو کہ ان پر کسی قسم کا حملہ نہ کیا جا سکے" (دو اسلام صـ۲۶۲)

ازالہ برق صاحب ہوسکتا ہے کہ متقی کی تعریف میں یہ اوصاف بھی شامل ہوں، بہرحال ذرا مندرجہ ذیل آیت بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں متقین کے کچھ اوصاف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں اور وہ آپ کے قیاسی اوصاف سے بہت زیادہ مستند ہیں۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ

(آل عمران ۱۳۳ تا ۱۳۵)

اپنے رب کی مغفرت کے لئے جلدی کرو اور اس جنت کی طرف بھی جلدی کرو جس کا عرض آسمان وزمین کی وسعت کے برابر ہے وہ جنت متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو خوش حالی اور تنگ حالی دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں اور وہ جو غصّہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کردیتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور وہ لوگ جو فحش کام کرنے کے بعد یا اور کوئی گناہِ عظیم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔

خلاصۂ باب

کسی آیت میں کسی نیک عمل کا ذکر ہے اور کسی آیت میں کسی کا، ان تمام آیات سے اعمال کی جو فہرست

تیار ہوتی ہے وہ اسلام ہے، بالکل اسی طرح کسی حدیث میں کسی عمل کی فضیلت مذکور ہے اور کسی میں کسی عمل کی، موقع اور محل کے لحاظ سے کہیں کسی کا ذکر ہے، اور کہیں کسی کی اہمیت، ان تمام احادیث سے جو اعمال کی فہرست تیار ہوگی وہ ایک مسلم کے لئے ضروری ہے۔ کسی ایک آیت یا کسی ایک حدیث کو موردِ طعن ٹھہرانا یا صرف اسی آیت یا حدیث کے عمل پر تکیہ کرلینا کسی عالم کا قول ہے نہ فعل۔ اگر کسی ملا نے ایسا کہا ہے یا کیا ہے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے جس حدیث میں ذکر کو جہاد سے افضل کہا گیا ہے وہاں ذکر میں وہ چیز بھی شامل ہے جس کو آپ کی اصطلاح میں "اللہ کا پروپگنڈا" کہتے ہیں یعنی توحید کی اشاعت، اللہ کی حاکمیت کا پرچار، قوانین الٰہیہ کی تبلیغ اور جب یہ چیزیں بھی ذکر اللہ میں شامل ہوں تو یقیناً وہ جہاد یعنی جنگ سے افضل ہے کیونکہ جہاد تبلیغ کے بعد آیا کرتا ہے۔ اگر تبلیغ نہ ہو تو جہاد کالعدم ہوگا، پھر جہاد میں جو تکلیف پہنچتی ہے وہ بہت کم عرصہ کے لئے ہوتی ہے لیکن تبلیغ میں جو مصائب اور تکالیف جھیلنی پڑتی ہیں وہ جہاد کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہیں، ایک آدمی تبلیغ کرتا ہے اور سب اس کی مخالفت کرتے ہیں، حکومت کے مظالم کا نشانہ صرف وہی ایک آدمی ہوتا ہے، نہ اس کے پاس دفاع ہوتا ہے نہ قوت، کہ وہ حکومت اور عوام کا مقابلہ کرسکے وہ بالکل مجبور ہوتا ہے اور خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کرتا ہے، یہ ہے اللہ کا ذکر، کہاں جنگ اور کہاں یہ؟

(تفصیل کے لئے باب اوّل ملاحظہ ہو)

باب ۱۲

اللہ کی عادت

غلط فہمی "سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بُری حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہے کہ مُلّا اور اس کا حدیثی اسلام۔"

(دو اسلام ص۲۶۶)

ازالہ یہ صحیح نہیں مسلمین کے زوال کا سبب حدیث نہیں بلکہ اس کا اصل سبب قرآن وحدیث کو غلط سمجھنا اور اس پر عمل نہ کرنا ہے۔ جتنی تحریکیں اب تک اصلاح کے لئے اٹھیں ان سب کا دستور العمل حدیث تھی لیکن باوجود اس کے ہر تحریک کی تاریخ جہاد فی سبیل اللہ سے لبریز ہے۔

برق صاحب آپ عبارت آرائی اور رنگین بیانی سے جہاد کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری سمجھنے لگتا ہے کہ سب کچھ جہاد ہی ہے گویا جہاد اسلام کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاد یعنی جنگ مقصدِ اصلی نہیں، بلکہ مقصد کے حصول اور بقا کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر یہ مقصد بغیر جہاد ہی کے حاصل ہو جائے تو آخر پھر جہاد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ جسے جہاد کرنے کی نوبت ہی نہ آئے خواہ وہ کہیں کا بھی رہنے والا ہو تو وہ جنتی ہے اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس کو آپ نے ص۲۵۵ پر صحیح بخاری کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے۔ ذرا غور فرمائیے آپ کا مقصد تھا حصولِ پاکستان۔ کیا آپ نے اس کے لئے کوئی جنگ لڑی ظاہر ہے کہ نہیں لڑی، بلکہ دوسرے ذرائع سے پاکستان حاصل ہو گیا تو بتائیے یہ کامیابی ہے یا نہیں؟ یا کامیابی جب ہی ہوتی کہ مخالفینِ پاکستان سے میدان کارزار میں لڑ کر پاکستان حاصل کیا جاتا، اسی طرح دین کے معاملہ میں اصلی مقصد اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ اور اس کا واحد الٰہ و حاکم ہونے کا عقیدہ منوانا ہے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کا انسداد کرنا ہے اگر کسی

لئے جنگ کی ضرورت پیش آئے تو جنگ بھی کی جا سکتی ہے اور اگر جنگ کے بغیر یہ چیز حاصل ہو جائے، تو فھو المراد جنگ کرنا اسلام کا اصلی مقصد نہیں بلکہ مسلم بحالتِ مجبوری جنگ کرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ (الحج: ۳۹)	مسلمین کو جنگ کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (البقرہ: ۱۹۰)	اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ (النسآء: ۷۵)	اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے، حالانکہ کمزور مسلم مرد، عورتیں اور بچے (جو ظالموں کے شکنجہ میں گرفتار ہیں) یہ دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نجات دے جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔

برق صاحب! یہ ہیں وہ حالات جن میں ایک مسلم تلوار اٹھاتا ہے، آپ چاہتے ہیں کہ وہ کچھ اور کرے ہی نہیں، بس لڑتا ہی پھرے گویا لڑنا ہی اصلی مقصد ہے۔ برق صاحب! اس تیسری آیت کو ذرا پھر پڑھئے اور غور سے پڑھئے، اس میں کمزور مسلمین کی دعا ہے بتلائیے یہ دعا قبول ہوئی تھی یا نہیں، اگر ہوئی تھی اور ضرور ہوئی تھی تو ماننا پڑے گا کہ دعا بھی کوئی اہم چیز ہے اور محض دعا سے بھی کام بن جایا کرتے ہیں ان کمزور مسلمین نے سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات دلوا دی، دعا ہی وہ چیز ہے کہ جہاں اور تمام وسائل مفقود ہوں وہاں وہی کام آتی ہے، بلکہ یہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کی ضرورت وسائل کی موجودگی میں بھی ضروری ہے، اور وسائل کے فقدان کی حالت میں بھی ضروری ہے۔ مسلمین نے میدان جنگ میں بھی دعا کی ہے اور یہ دعا قرآنِ مجید میں منقول ہے۔

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آلِ عمران: ۱۴۷)	اے اللہ ہم کو کافروں کے مقابلہ میں نصرت عطا فرما۔

دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دیتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وسائل کو تلاش نہ کیا جائے۔ وسائل کی تلاش بھی ضروری ہے اور دعا بھی ضروری ہے آپ بلا وجہ دعا کے مخالف

ہو گئے یہ ہے دعا کی حقیقت جو نہ صرف حدیث بلکہ قرآن مجید سے بھی ثابت ہے آپ دعا کے اصلی منشا سے اعراض کر کے اس کو ملا کے سر تھوپ رہے ہیں۔ جد وجہد کو چھوڑ کر دعا پر تکیہ کرنا یہ مُلّا کا شعار بھی اور بے شک یہ برا ہے لیکن مطلق دعا کا انکار، قرآن مجید کا انکار ہے، کیونکہ قرآنِ مجید دعاؤں سے مملو ہے۔

برق صاحب ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں اور قدیم زمانہ سے موجود رہے ہیں جو عدم تشدد کے حامل ہیں۔ جو جنگ وحرب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بغیر جنگ کے انہوں نے تبلیغ کی، ان کی اس تبلیغ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ چین وجاپان تک متاثر ہوئے اور ان کے مذہب کے ماننے والے آج بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں یہ کس طرح پھیلے، کس طرح ان کی حکومتیں قائم ہوئیں، یہ کون سی جنگ لڑے؟ کیا بغیر جنگ کے انہوں نے مقصد کو حاصل کیا یا نہیں؟ اگر کیا اور ضرور کیا تو آخر مقصد کے حصول کے بعد ذریعہ کی کیا اہمیت ہے؟ برق صاحب ذریعہ کو مقصد نہ بنائیے یہ لوگ جو عدم تشدد کے حامی ہیں اگر چاہیں تو ایسی ہی عبارت آرائی اور رنگینیٔ مضامین سے جنگ وجہاد کے پرخچے اڑا سکتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو محض مسجع ومقفیٰ عبارت سے مرعوب کر کے جہاد سے متنفر کر سکتے ہیں لیکن حقیقت عبارت آرائی میں نہیں ہوتی، نہ جہاد بے حقیقت چیز ہے نہ جہاد ہی سب کچھ ہے مثال کے لئے سنیئے، ستیارتھ پرکاش کے چودہویں باب کا مصنف قرآنی آیات پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "قرآن کا خدا اور پیغمبر دونوں جنگجو تھے جو لڑائی کا حکم دیتا ہے وہ امن میں خلل انداز ہوتا ہے۔ رہائی تو ادہرم کی لڑائی سے خوف کرنے سے ہوتی ہے" (ستیارتھ پرکاش باب ۱۴ صفحہ ۷۲)

ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

> "یہ تحریر محمد صاحب نے اس مطلب سے کی ہوگی کہ لڑائی میں نہ بھاگے اور اپنی فتح ہو اور مرنے سے کوئی نہ ڈرے اپنا اقبال بڑھے اور مذہب پھیلے" (صفحہ ۷۶)

برق صاحب دیکھا آپ نے یہ کس طرح قرآنی جہاد کا مضحکہ اڑا رہا ہے اور یہ تو آریہ مذہب کی کتاب کا حال ہے جو عدم تشدد کے قائل نہیں، اگر آپ بدھ مذہب اور جینی مذہب کے ماننے والوں کی کتابوں کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اس جنگ کو سب سے زیادہ برا عمل سمجھتے ہیں حتی کہ اس جہاد کا مذاق ہمارے زمانہ کے بہت بڑے سیاسی لیڈر گاندھی جی نے بھی اڑایا ہے، برق صاحب یہ ہے افراط تفریط، وہ جہاد کو لغو فعل سمجھتے ہیں اور آپ جہاد ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ ہو جہاں مسلمین کے زوال اور اس کے اسباب پر قرآن مجید سے استشہاد

کیا گیا ہے۔

غلط فہمی "دنیائے اسلام میں لاکھوں مساجد، ان میں لاکھوں مُلّا اور ہر مُلّا صبح و شام مسلمانوں کو مندرجہ ذیل اسباق دے رہا ہے۔"

(دو اسلام صہ ۲۶۶)

ازالہ اس عبارت کے بعد برق صاحب نے وہ اسباق درج کئے ہیں ہم یہ اسباق ذیل میں درج کر رہے ہیں اور ہر سبق کا جواب بھی ساتھ ساتھ دے رہے ہیں۔

غلط فہمی ۱۔ کہ صرف تم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو یہ امت بخشی بخشائی ہے

(دو اسلام صہ ۲۶۶)

ازالہ کسی عالم نے ایسا نہیں کہا۔

غلط فہمی ۲۔ کہ .... یہ دنیا مردار ہے جس کے طالب کُتّے ہیں۔"

(دو اسلام صہ ۲۶۶)

ازالہ اس کا مفصل و مدلل جواب تمہید میں ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی ۳۔ کہ "المؤمن لا ینجس" مومن جسم پر کتنی ہی غلاظت مل لے وہ ناپاک نہیں ہوتا (دو اسلام صہ ۲۶۶)

ازالہ "المؤمن لا ینجس" ایک حدیث کا ٹکڑا ہے برق صاحب درحقیقت اس حدیث پر اعتراض کر رہے ہیں جس میں یہ جملہ وارد ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں سنیئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

(التوبۃ: ۹۵)

جب تم واپس مدینہ منورہ پہنچوگے تو منافق اللہ کی قسم کھا کر اپنے عذر پیش کریں گے تاکہ آپ ان سے صرف نظر کریں بس آپ ان سے صرفِ نظر ہی کیجیے بیشک وہ لوگ ناپاک ہیں انکا ٹھکانا جہنم ہے یہ ان کے اعمال کی سزا ہے۔

کہیئے منافق اگرچہ کتنا ہی صابن سے نہائے ناپاک ہی رہے گا۔

۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ (التوبۃ: ۲۸)

اے ایمان والو! بات درحقیقت یہ ہے کہ مشرک نجس و ناپاک ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرک نجس ہوتا ہے مؤمن نجس نہیں ہوتا اور یہی حدیث کا مطلب ہے:۔

۳۔ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ

اور جن لوگوں کے دل میں مرض ہے تو اس نے

فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (التوبہ: ۱۲۵)
ان کی گندگی پر مزید گندگی کا اضافہ کر دیا اور وہ کفر کی حالت میں مریں گے۔

۴۔ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ (یونس: ۱۰۰)
اور اللہ تعالیٰ گندگی ان لوگوں پر ڈال دیتا ہے جو عقل نہیں رکھتے۔

برق صاحب یہ کون سی گندگی ہے؟ یہی وہ گندگی ہے جو مؤمن میں کبھی نہیں ہوتی یہی وہ روحانی گندگی ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے اب تو غالباً حدیث کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا۔

غلط فہمی

"۴۔ کہ صرف کلمہ پڑھنے سے بہشت مل جاتی ہے۔"
(دو اسلام صہ ۲۶۶)

ازالہ برق صاحب ایسا کہتا تو کوئی نہیں جو کہتا ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے، یہ ضرور ہے کہ بعض احادیث سے بظاہر ایسا مطلب نکلتا ہے اور غلط فہمی سے بعض لوگ اس کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ صرف کلمہ پڑھنے سے جنت مل جاتی ہے اور یہی غلط فہمی آپ کو بھی ہوئی۔

اچھا برق صاحب اب حدیث کا مطلب سنیئے، فرض کیجیئے دو شخص ہیں، ایک حکومت کا باغی ہے ملک میں فساد برپا کرتا ہے، فتنے اٹھاتا ہے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرتا ہے آخر گرفتار ہوتا ہے، کہیئے اس کے ساتھ حکومت کا کیا سلوک ہوگا؟ کیا اس کے لئے کوئی دائمی سزا نہیں ہوگی، ضرور ہوگی دوسرا شخص حکومت کا وفادار ہے غداری نہیں کرتا، اتفاقاً اس سے کوئی جرم ہو جاتا ہے، جرم کرتے وقت اس کی نیت سرکشی کی نہیں ہوتی بلکہ نادانی اور جہالت ایسی طاری ہوتی ہے کہ وہ مدہوش ہو جاتا ہے، اور جرم کر بیٹھتا ہے پھر یہ بھی گرفتار ہوتا ہے کہیئے کیا حکومت اس کو ویسی ہی سزا دے گی جیسے پہلے شخص کو دی ہے کیا اس کی سزا دائمی ہوگی؟ نہیں، ہرگز نہیں بلکہ حکومت اس کو سزا دے کر پھر رہا کر دے گی آخر ان دونوں میں امتیاز پیدا کرنے والی کیا چیز ہے؟ پہلا وفاداری کا عہد نہیں کرتا، دوسرا دل سے وفاداری کا عہد کرتا ہے، غداری کی سزا دائمی سزا ہے، وفاداری کے جذبہ کے ساتھ کسی جرم کی سزا دائمی نہیں۔ یہی بات ہے کہ جو شخص دل سے کلمہ پڑھ کر اتفاقاً گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے تو اس کا جرم اتنا وزنی نہیں کہ ابدالآباد تک جہنم میں رہنے والوں کے ساتھ وہ بھی ہمیشہ کے لئے دوزخ میں بند کر دیا جائے اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس کو غلط فہمی کی وجہ سے برق صاحب نے صہ ۲۷۴ صہ ۲۷۵ پر اعتراضاً نقل کیا ہے۔ اور وہ حدیث یہ ہے:۔

"حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا آپ نے فرمایا:۔

مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ
جب کوئی شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے اور اسکی موت

مات علی ذالک الادخل الجنۃ[1] اسی عقیدہ پر موتی ہے تو وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔

میں نے پوچھا اگر وہ زانی اور چور ہو فرمایا پھر بھی جنت میں جائے گا۔"

مذکورہ بالا توضیح کے بعد آپ نے اس حدیث کا مطلب سمجھ لیا ہوگا۔ اس حدیث کا مطلب وہ نہیں جو بطور خلاصہ آپ نے تحریر فرمایا ہے یعنی کلمہ پڑھتا جائے اور زنا اور سرقہ کے مزے بھی لوٹتا جائے، سیدھا جنت میں جائے گا" (دو اسلام ص ۲۷۵)

آپ کے خلاصہ سے سرکشی اور بغاوت ٹپکتی ہے اور سرکشی و بغاوت کی نیت سے اگر گناہ کیا جائے تو وہ معاف نہیں ہوتا۔ ہاں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اس کے احکام کا وفادار رہے اور پھر کبھی اتفاقاً گناہ ہو جائے تو یہ شخص اس عہدِ وفاداری کی وجہ سے قابلِ درگذر ہے اور کبھی نہ کبھی اپنے جرم کی سزا بھگت کر جنت میں چلا جائے گا اس حدیث کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ عہدِ وفاداری (یعنی کلمہ شہادت) کبھی نہ کبھی اس کو جنت میں پہنچا کر رہے گا خواہ سزا کے بعد یا بغیر سزا کے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جرم کو معاف بھی کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ (النساء:۔ ۱۱۶)

بیشک اللہ شرک کو نہیں بخشے گا اس کے علاوہ اور گناہوں کو بخش دے گا جس کے لئے چاہے گا۔

اس آیت کی روشنی میں حدیث کا مطلب سمجھنے کی کوشش کیجئے، حدیث کو نہ سمجھنے سے ساری خرابی پیدا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے سامنے اس قسم کی احادیث بیان کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے، مبادا وہ غلط مطلب سمجھ کر صرف کلمہ پر بھروسہ کرلیں، مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ بس شرک معاف نہیں ہوگا اور باقی گناہ تو انشاء اللہ معاف ہو ہی جائیں گے، خوب گناہ کرتا پھرے تو بتایئے اس میں آیت کا کیا قصور ہے قصور تو اس کی سمجھ کا ہے آیت میں دوسرے گناہوں کی معافی کا امکان تو ضرور ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اسی طرح حدیث میں کلمہ شہادت پڑھ لینے کے بعد دخولِ جنت کا امکان ہے۔ سزا کے معاف ہو جانے کی صورت میں یا سزا کی مدت ختم ہو جانے کے بعد، لیکن جو شخص کلمہ ہی نہیں پڑھتا یعنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہی تسلیم نہیں کرتا، یا کلمہ پڑھ کر غداری کرتا ہے یا اللہ کی حاکمیت کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اس حاکمیت میں شریک کرتا ہے۔ تو یہ صورتیں ایسی ہیں کہ ان کی موجودگی میں جنت میں جانے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا، آیت اور حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ شرک کی موجودگی اور وفاداری

---

[1] مشکوٰۃ

کے عہد کے فقدان کی صورت میں دخولِ جنت ناممکن ہے اور توحیدِ خالص اور وفاداری کے عہد کی موجودگی میں گنہ گار کا جنت میں جانا ممکن ہے، معافی کے بعد یا سزا بھگتنے کے بعد، اب اس حدیث کی تائیدِ مزید میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سنیئے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ	بے شک جن لوگوں نے ربنا اللہ کہا، پھر اسی
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ	پر جمے رہے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو ان
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا	سے کہتے ہیں، کہ بے خوف ہو جاؤ، غمگین نہ ہو اور
بِالْجَنَّۃِ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۰)	جنت کی بشارت سنو!

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف "ربنا اللہ" کہنے اور اسی پر جمے رہنے سے جنت مل جاتی ہے اور یہی حدیث کا مطلب ہے کہ صرف کلمہ پڑھنے اور اس پر جمے رہنے سے جنت مل جاتی ہے اگر آیت میں کچھ شرطیں محذوف ہیں تو وہی حدیث میں بھی ہوں گی اور اگر نہیں تو پھر جو اعتراض حدیث پر ہے وہی قرآن مجید پر ہوگا۔ اور اگر قرآن مجید پر اعتراض نہیں تو حدیث پر بھی نہ ہوگا۔

غلط فہمی "۵۔ فقہ و حدیث کے بغیر باقی تمام علوم ناپاک ہیں، سائنس گناہ اور کائنات میں غور کرنا کفر ہے"۔ (دو اسلام ص ۲۶۶، ۲۶۷)

ازالہ یہ کسی ملا ہی نے کہا ہوگا، کوئی عالم ایسی بات نہیں کہتا۔

غلط فہمی ۶۔ دنیا کا سب سے بڑا عمل رات کے وقت کے دو نفل ہیں رکعتین فی جوف اللیل خیر من الدنیا وما فیہا۔ رات کے وقت کے دو نفل دنیا وما فیہا سے بہتر ہیں (دو اسلام ص ۲۶۷)

ازالہ حدیث میں ان نفلوں کو دنیا وما فیہا سے بہتر فرمایا گیا ہے یہ نہیں کہ اس سے بڑا کوئی عمل نہیں، بہت سے اعمال ایسے ہیں جو دنیا وما فیہا سے بہت بہتر ہیں، برق صاحب نے جو تفضیل کل کا صیغہ استعمال کیا ہے یہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے یہاں اعمال کی تفضیل کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ ان دونوں نفلوں کا مقابلہ دنیا وما فیہا سے کیا گیا ہے، مطلب یہ کہ ان کا ثواب اتنا زیادہ ہے کہ ان کے سامنے دنیا و مافیہا ہیچ ہیں۔

غلط فہمی "۷۔ ہر نتھو خیرا خواہ وہ چنگیز ہو یا ہٹلر اگر ہم پر حکومت کر رہا ہے تو وہ ہمارا اولی الامر ہے اور اس کی اطاعت ہم پر فرض ہے"۔ (دو اسلام ص ۲۶۷)

ازالہ کسی ملا نے کہا ہوگا کوئی عالم ایسی بات نہیں کہتا۔

. . . .

غلط فہمی | ۸۔ "خرقہ دنیا کا بہترین لباس ہے .... (حدیث) تم پشم کا لباس پہنا کرو کہ ایمان کی لذت اسی میں ہے۔" (دو اسلام ص۲۶۷)

ازالہ | یہ بھی کسی مُلا کی گھڑنت ہے، کسی عالم نے اس موضوع حدیث کو تسلیم نہیں کیا۔

غلط فہمی | ۹۔ "فلاں دعا ایک لاکھ حج اور لاکھ شہیدوں کا ثواب دلاتی ہے۔"
(دو اسلام ص۲۶۷)

۱۰۔ "مرشد پکڑے بغیر نجات ناممکن ہے۔" (دو اسلام ص۲۶۷)

۱۱۔ اللہ نے تمام اختیارات فلاں مردے کے حوالے کر دئیے ہیں (دو اسلام ص۲۶۷)

ازالہ | یہ سب کسی ملا کی گھڑنت ہے کسی عالم نے ایسا کبھی نہیں کہا۔

غلط فہمی | "حصولِ علم، صحیح حدیث کی رُو سے کسی اجر کا مستحق ہی نہیں"
(دو اسلام ص۲۶۸)

ازالہ | ایسی کوئی حدیث نہیں ہے نہ برق صاحب نے اس حدیث کو نقل فرمایا۔

غلط فہمی | "ہر مرض، ہر افتاد، اور ہر حادثہ کا علاج دعا سے کیا جاتا رہا"
(دو اسلام ص۲۶۸)

ازالہ | مطلق دعا کا انکار قرآن مجید کا انکار ہے، تفصیل کے لئے اسی باب کے گذشتہ صفحات ص۳۵۶ تا ص۳۶۱ ملاحظہ کیجئے۔

غلط فہمی | غور کرو کہ دنیا میں ہماری کیسی کیسی سلطنتیں قائم ہوئیں بنو امیہ جو سندھ کے ریگستانوں سے فرانس تک چھائے ہوئے تھے بنو عباسیہ جن کی ہیبت سے ایک عالم لرزتا تھا، وہ تیموری جن کی بجلیاں دہلی پر چمکیں تو قسطنطنیہ پر جا گرتی تھیں
(دو اسلام ص۲۶۹)

ازالہ | برق صاحب جن لوگوں کا ذکر بڑے طمطراق سے آپ نے کیا ہے یہ سب لوگ انہی احادیث کے متوالے تھے لیکن بایں ہمہ وہ تخت و تاج کے مالک تھے ہاں جب یہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے احادیث کی روح سے ناواقف ہو گئے اور بقول آپ کے عیاش ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی داستان عظمت و حشمت کو افسانہ بنا دیا گیا اس میں حدیث کا کیا قصور ہے، اصلی حدیث والے تو حکومت کرتے رہے۔

غلط فہمی | "حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک ہی سواری پر سوار تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص منہ سے لا الہ الا اللہ

کہے گا اس پر جہنم کو حرام کر دیا جائے گا، معاذ نے پوچھا کیا میں سب کو یہ بشارت سنا دوں، فرمایا کہ لوگ اس پر اعتماد کر کے سست ہو جائیں گے، چنانچہ معاذ نے مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی''
(مسلم جلد ا صہ ۲۰۵)

''معاذ نے تو مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی اور اس لئے اس زمانہ کے لوگ اس سستی اور کام چوری سے بچ گئے جس کا خطرہ حضورؐ نے فرمایا تھا لیکن اب ہم کیا کریں یہ حدیث گزشتہ ساڑھے تیرہ سو برس سے ہمارے سامنے ہے، کروڑوں مسلمانوں کو کاہل بنا چکی ہے اور قیامت تک بناتی جائے گی کیا ہمارے علماء اس مرض کا علاج سوچیں گے''
(دو اسلام صہ ۲۷۲)

ازالہ برق صاحب اس زمانہ کے لوگ تو اس لئے سستی سے بچ گئے کہ وہ اس حدیث سے ناواقف تھے لیکن کیا حضرت معاذ بھی سستی سے بچے تھے یا نہیں اگر بچے تھے تو پھر دوسرے بھی بچ سکتے ہیں بشرطیکہ حدیث کا مطلب وہ بالکل اسی طرح سمجھتے ہوں جس طرح حضرت معاذ سمجھتے تھے، غلط مطلب نہ سمجھ بیٹھیں۔ اسی غلط فہمی کے انسداد کے لئے تو اس حدیث کی اشاعت عام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا تھا یعنی حدیث کا اصلی مطلب تو سستی اور کاہلی پیدا کرنیکا سبب نہیں تھا ہاں غلط فہمی اس سستی اور کاہلی کا سبب بن سکتی تھی، برق صاحب، پھر آپ نے یہ بھی سوچا کہ حضرت معاذ کی وفات کے بعد سے صدہا سال تک مسلمین کی شوکت و حشمت کا ڈنکا بجتا رہا اس کی کیا وجہ ہے کیا یہ لوگ بھی اس حدیث سے ناواقف تھے، نہیں بلکہ یہ لوگ بھی حضرت معاذؓ کی طرح حدیث کے اصلی مطلب سے واقف تھے۔ باقی جواب کے لئے اسی باب میں اوپر لکھا جا چکا ہے نمبر ۴ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں''۔

انتباہ

برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا، حدیث زیر بحث میں منہ سے ''لا الہ الا اللہ'' کہنے کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ دل کی گواہی کا ذکر ہے اور صحیح مسلم کی دوسری روایتوں میں اس کی تصریح بھی ہے پھر برق صاحب نے حضرت عبادہ بن صامتؓ اور حضرت معاذؓ کی احادیث کے متون کو بھی گڈمڈ کر دیا ہے حضرت معاذؓ کی حدیث کا متن بالکل دوسرا ہے، برق صاحب نے اسے نقل نہیں فرمایا بلکہ حضرت عبادہؓ کی حدیث کا متن حضرت معاذؓ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے۔

غلط فہمی ''اس حدیث کا مفہوم رسالت اور الوہیت کا زبانی اقرار تھا اور چونکہ زبانی اقرار کی اتنی بڑی جزا قوم کو بے عمل بنا سکتی تھی اس لئے آپ نے اس حدیث کو

بیان کرنے سے روک دیا تھا۔" (ص۲۷۲)

ازالہ حدیث کا اصلی مفہوم یہ نہیں تھا بلکہ دل سے گواہی دینا تھا حدیث کے الفاظ ہیں مَنْ شَھِدَ جس نے گواہی دی، دوسری حدیثوں میں اس کی صراحت موجود ہے ،

ارشاد باری ہے :۔

يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ (صحیح مسلم) یعنی جو شخص لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دے اور دل سے اس پر یقین کرے ۔

پھر دل سے اس پر یقین کر کے گواہی دینے کے تقاضے بھی اس میں شامل تھے کیونکہ لوگ اس کا مطلب غلط سمجھ کر اعمال چھوڑ دیتے اس لئے اس کی اشاعت کو روک دیا گیا اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ نہیں تھا کہ بے عمل آدمی جنت میں جائے گا ، اور اگر یہی ہوتا تو پھر روکنے کا کیا مقصد تھا ؟ لہذا حدیث کا اصلی مطلب کلمہ پڑھ کر کلمہ کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے ۔

غلط فہمی "ہمارے اس استدلال کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے ، ایک مرتبہ حضورؐ ایک باغ میں تشریف فرما تھے کہ آپ کے پاس ابوہریرہ جا پہنچے حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ جو شخص ملے اسے یہ بشارت دے دو ، کہ کلمہ پڑھنے والا داخلِ جنت ہوگا ۔"

(دو اسلام ص۲۷۳)

ازالہ اس حدیث کے ترجمہ میں جگہ جگہ غلطیاں ہیں ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا ، پھر اس حدیث میں مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ دل سے اس پر یقین ہو ۔ کے الفاظ موجود ہیں لہذا یہ حدیث برق صاحب کے استدلال کی تائید نہیں کرتی ، بلکہ تردید کرتی ہے مطلب اس حدیث کا بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ، اس حدیث پر مفصل بحث باب اول میں ملاحظہ فرمائیں ۔

غلط فہمی "حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرت کے پاس گیا آپ نے فرمایا ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علی ذلک الا دخل الجنۃ جب کوئی لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے اور اس کی موت اس عقیدہ پر ہو جاتی ہے تو وہ جنت میں چلا جاتا ہے الخ ۔ (دو اسلام ص۲۷۴، ۲۷۵)

ازالہ اس حدیث پر مفصل بحث اسی باب میں ۴ کی ذیل میں ص۲۶۳ تا ص۲۶۵ میں گذر چکی ہے ۔

غلط فہمی " ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز ، خائن ، زانی ، چور ، جھوٹی قسمیں کھانے والا اور احسان جتانے والا اور غرور سے دامن گھسیٹ کر چلنے والا بھی بہشت

میں نہیں جائے گا، لیکن دوسری طرف ہمیں بتایا جاتا ہے اگر چور اور زانی کلمہ پڑھتے رہیں
تو وہ یقیناً بہشت میں جائیں گے،، (دو اسلام صفحہ ۲۷۶)

ازالہ

برق صاحب احادیث میں سب کچھ ہے، جرموں کی سزا کا بھی بیان ہے اور ان کی معافی کا بھی ذکر ہے۔ اور یہ معافی کب ہو سکتی ہے اور کس حالت میں ہو سکتی ہے۔ اس کی بھی تفصیل احادیث میں موجود ہے لہذا جب تک تمام احادیث کا علم حاصل نہ ہو کوئی شخص حقیقت تک بآسانی نہیں پہنچ سکتا، یہی قرآن مجید کا حال ہے، قرآن مجید کی بعض آیات سے اسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس غلط فہمی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ اسلام کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے اگر ایسا ہو جائے تو پھر یہ آیات و احادیث غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتیں۔ بعض جرموں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے بعض کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بھی ہے اور بندوں سے بھی، اول الذکر میں اگر شرک نہ ہو تو معافی کا امکان ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا عہد دل سے ادا کرتا ہو صرف زبان سے نہیں اور جب معافی کا امکان ہو تو پھر دخولِ جنت کا بھی امکان باقی رہتا ہے مؤخر الذکر میں جب تک بندہ معاف نہ کرے نہ معافی کا امکان ہے نہ دخولِ جنت کا امکان، اور کیونکہ بندے کے معاف کرنے کا امکان بھی ہو سکتا ہے لہذا دخولِ جنت کا امکان بھی ہو سکتا ہے خلاصہ یہ ہوا کہ علاوہ شرک کے کوئی گناہ ایسا نہیں کہ اس کی وجہ سے جنت میں جانا ناممکن ہو جائے، دوسرے گناہ معاف بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی سزا بھی مل سکتی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر جرم کی سزا برابر ہو اور اگر شرک کی سزا جو سب سے بڑا اور ناقابلِ معافی گناہ ہے ابدالآباد جہنم ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ دوسرے گناہوں کی سزا ابدالآباد جہنم نہیں ہوگی اور ان گناہوں کی سزا بھگت کر ایک مسلم جنت میں داخل ہو جائے گا کسی حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ جرموں کی سزا ہی نہیں سزا ہے اور ضرور ہے اور یہی سزائیں آپ کی نقل کردہ احادیث میں موجود ہیں یہ احادیث ہر جرم کی سزا بیان کرتی ہیں ۔ لیکن یہ نہیں بتاتیں کہ مجرم سزا پاکر بھی جنت میں جائے گا یا نہیں دونوں احادیث اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں جرموں کی سزا بھی مقرر ہے یہ سزا مل بھی سکتی ہے اور سزا سے پہلے معافی بھی مل سکتی ہے غرض یہ کہ مجرم (مشرک نہیں) کبھی نہ کبھی یقیناً جنت میں جائے گا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم گناہ کریں اور یہ سمجھیں کہ معاف ہو ہی جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا گمان غلط ہو اور سزا بھگتنی پڑے اور سزا بھی ایسی کہ الامان والحفیظ۔ اس سزا کا تصور کرنے کے بعد ہم محض خوش فہمی کی بنا پر گناہ کرتے رہیں تو یہ عقل سے بعید ہے، کوئی صاحبِ عقل و ہوش ایسا نہیں کرے گا کہ معافی کی امید موہوم کی وجہ سے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دے اور خطرہ بھی ایسا کہ اس کے بیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، ہاں بے عقل و ناسمجھ لوگ تو یہی ایسا کر سکتے ہیں لہذا ان کے سامنے ان کی عقل سے بالاتر چیز بیان ہی نہیں کرنی چاہیئے یہی وجہ ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کس و ناکس کے سامنے ان احادیث کو بیان کرنے سے روک دیا ہے۔

برق صاحب ان احادیث کو غلط فہمی کی وجہ سے وضعی سمجھتے ہیں حالانکہ مندرجہ ذیل آیات ان احادیث کی تائید کرتی ہیں، کیا انہیں بھی موضوع کہا جا سکتا ہے؟ اگر تشریح و تاویل سے دوسرا مطلب لیا جائے گا تو پھر وہی مطلب حقیقت میں حدیث کا بھی ہوگا اب آیات سنیئے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النسآء:۔ ۱۱۶)	بے شک اللہ شرک کے علاوہ ہر گناہ جس کیلئے چاہے گا معاف کر دے گا۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ۔ (حٰمٓ السجدۃ:۔ ۳۰)	بے شک جن لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اسی پر جمے رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نہ ڈرو نہ غمگین ہو اور جنت کی بشارت سنو۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں سوائے شرک کے، رہی توبہ، تو توبہ سے تو دوسرے گناہ کیا، شرک بھی معاف ہو سکتا ہے۔

دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ "ربنا اللہ" کہنے والا جنت میں جائے گا۔ اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ "جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا جنت میں جائے گا" یہ ضرور ہے کہ "ربنا اللہ" کہنے کے بعد بھی چند شرائط ہیں جن کے بغیر صرف "ربنا اللہ" قابلِ قبول نہیں اور وہ سب اس قول کے تقاضے ہیں۔ اسی طرح لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے بھی چند تقاضے ہیں جن کے بغیر صرف "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" مفید نہیں پھر یہ بھی یاد رہے کہ کلمہ پڑھنے کے بعد بعض صورتیں ایسی بھی آجاتی ہیں کہ صرف کلمہ بھی کافی ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص مسلم ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ کسی فرض کی ادائیگی کا وقت آئے وہ شہید کر دیا جاتا ہے یا اتفاقاً اپنی طبعی موت مر جاتا ہے تو وہ شخص قطعی جنتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جنت کی کنجی کلمہ ہے جس نے اسے پڑھ لیا وہ جنت میں جائے گا۔

باب ۱۳

لفظ مغفرت کی تحقیق

غلط فہمی مغفرت کا ماخذ "مغفر" ہے، جس کے معنی ہیں چھپانا اور ڈھانکنا، ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہوتا ہے، جو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کوئی گناہ معاف نہیں ہو سکتا ہے، البتہ چھپ سکتا ہے۔
(دو اسلام صد ۲۷۹)

ازالہ برق صاحب کسی لفظ کے ایک معنی تو لغوی ہوتے ہیں اور ایک اصطلاحی، اب یہ کام اہل زبان کا ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ کہاں وہ کسی لفظ کو اصطلاحی معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں اور کہاں لغوی معنیٰ میں اور جہاں وہ کسی لفظ کو اصطلاحی معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں وہاں اس لفظ کے لغوی معنی لینا صحیح نہیں، مثلاً۔

(۱) "میں کیلا کھا رہا ہوں" اس جملہ میں "کھا رہا ہوں" اپنے اصلی اور لغوی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے لیکن اس جملہ میں، کہ

(۲) "میرا سر چکر کھا رہا ہے" "کھا رہا ہے" اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اس لئے کہ نہ سر کھاتا ہے، نہ "چکر" کوئی مادی چیز ہے جسے کھایا جا سکے لہٰذا دوسرے جملہ میں "کھانا" کے لغوی معنی لینا کسی طرح ٹھیک نہیں، بالکل یہی حالت لفظ مغفرت کی ہے، اصطلاحی طور پر یہ لفظ معافی کے معنیٰ میں استعمال ہو رہا ہے اور اب یہی اس کے عام فہم معنیٰ ہیں اور اگر اس کے لغوی معنی پر ہی اصرار کیا جائے "یعنی ڈھانک دینا" تو بھی مراد یہی ہے کہ کسی گناہ کو ڈھانک دیا گیا یعنی اب اس کے متعلق کوئی پوچھ گچھ نہیں ہو گی، اور اس لحاظ سے یہ معافی ہی کے مترادف ہوا۔

برق صاحب کا خیال ہے کہ گناہ معاف نہیں ہوتا اور اس سلسلہ میں انہوں نے چند مثالیں دی ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں

"سینکڑوں ایسے صحابہ ہو گذرے ہیں جنہوں نے آغاز میں حضور کی مخالفت کی . . . لیکن بعد میں حلقہ بگوش اسلام بن گئے اور ان کے پچھلے گناہ اس نئے عمل کے پیچھے چھپ گئے" (دو اسلام صہ ۲۷۹)

برق صاحب آپ کو مغلط فہمی ہوئی، کسی گناہ کا نتیجہ یہی نہیں کہ زمانہ حال میں واقع ہو وہ نتیجہ مستقبل میں بھی واقع ہو سکتا ہے جس زمانہ میں صحابہ کافر تھے گناہ کرتے تھے، ہو سکتا ہے کہ ان کو اس گناہ کی سزا مل گئی ہو اور بہت ممکن ہے کہ نہ بھی ملی ہو اور ظاہر یہی ہے کہ اکثر صحابہ کو ان کے کفر کے زمانہ میں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ خیر بحث اس سے نہیں کہ زمانہ ماضی میں کیا ہوا سوال یہ ہے کہ آیا زمانہ مستقبل میں بھی اس گناہ کی کوئی سزا مقرر ہے یا نہیں اگر ہے تو اس سزا کو ضرور اس کا نیا عمل چھپا دے گا اور یہ معافی نہیں تو اور کیا ہے، یہ کس نے کہا کہ زمانہ ماضی میں جو سزا اسے مل چکی ہے وہ معاف ہو جائے گی ہم تو یہ کہتے ہیں کہ زمانہ مستقبل میں جو عذاب آنے والا ہے وہ ٹل جائے گا۔

دوسری مثال برق صاحب یہ دیتے ہیں۔

"فرض کیجئے کہ ایک نوجوان کسی عادتِ بد میں مبتلا ہو کر صحت کا جنازہ نکال لیتا ہے پھر دفعتہً سنبھل جاتا ہے صحیح الجسم نوجوان بن جاتا ہے اس نے گویا تلافی مافات کر لی اور اس کے پچھلے گناہ چھپ گئے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پچھلا گناہ معاف ہو گیا ہے اس نے ایک گناہ کیا اور اس کی باقاعدہ سزا بھگتی، برسوں کمزوری اور بری صحت کا شکار رہا، عام نفرت کا نشانہ بنا۔ یہی اس گناہ کی سزا تھی جو وہ بھگت چکا اب اسے نیک اعمال کا صلہ مل رہا ہے" (دو اسلام صہ ۲۷۹ - ۲۸۰)

برق صاحب نے پھر وہی بات دہرائی ہے کہ ماضی میں وہ سزا بھگت چکا، سوال یہ ہے کہ اگر کچھ عرصہ اور وہ اپنی بری عادتوں کو جاری رکھتا تو کیا وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو جاتا، جس سے نجات ناممکن ہو جاتی اور اگر ایسی حالت میں وہ اپنی بری عادت کو چھوڑ بھی دیتا تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا، کیا یہ ترکِ بدعملی اس کو فائدہ پہنچاتی؟ نہیں بلکہ اس کی وہ بری عادت مستقبل میں بھی اس کے لئے عذاب بن جاتی اب بتائیے کہ اس مرحلہ تک پہنچنے سے پہلے اگر وہ تائب ہو گیا اور اپنی صحت کو ٹھیک کر لیا تو وہ مستقبل میں آنے والی اور نہ ٹلنے والی مصیبت سے بچ گیا۔ اس مستقبل میں آنے والی مصیبت کی طرف اس کے قدم اٹھ چکے تھے اور اس مصیبت کی عمارت کی بنیاد وہ رکھ چکا تھا لیکن اس کے سنبھل جانے کی وجہ سے یہ بنیاد بے کار کر دی گئی اور مستقبل کی ساری مصیبتیں ٹل گئیں۔ لہذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا گناہ معاف ہو گیا تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ مستقبل میں آنے والا عذاب معاف ہو گیا نہ کہ ماضی میں گذرا ہوا عذاب۔ برق صاحب ہمارا مطلب ہی نہ سمجھے، لہذا انہیں اعتراض

کرنا پڑا۔ غرض یہ کہ اگر کوئی شخص گناہ کرتا ہے اور اپنی زندگی میں اس سے توبہ کر کے نیک عمل کر لیتا ہے تو اس گناہ کی آنے والی سزا معاف ہو جائے گی۔ ہاں اگر وہ موت کے مرحلہ تک پہنچ گیا تو پھر نیک عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور تلافی مافات کی گنجائش نہیں رہتی، لہذا توبہ قبول نہیں ہوتی۔
اب رہی یہ بات کہ "کیا گناہ معاف ہوتا ہے یا نہیں" تو خود قرآن مجید اس پر شاہد ہے کہ گناہ معاف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ (الشوریٰ:۔ ۳۰)

جو مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اور بہت سے گناہ تو وہ معاف ہی کر دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض گناہوں کی سزا مل جاتی ہے اور بہت سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ان کی کوئی سزا ہی نہیں ملتی، نہ ماضی میں نہ مستقبل میں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:۔

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ؕ (الشوریٰ:۔ ۳۴)

(اللہ یہ تو کر سکتا ہے کہ) یا تو ان کے گناہ کی سزا میں انہیں تباہ کر دے یا یہ کہ بہت سے گناہ معاف کر دے۔

قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے "عَفُوٌّ" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی "معاف کرنے والا"، لہذا اس اسم گرامی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کر دے اور یہی حقیقت بھی ہے کہ وہ معاف کرتا رہتا ہے۔

غلط فہمی

"سینکڑوں ایسے صحابہ ہو گذرے ہیں جنہوں نے آغاز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، تکلیفیں دیں اور آپ پر چڑھائی کی، لیکن بعد میں حلقہ بگوش اسلام بن گئے اور ان کے پچھلے گناہ اس نیک عمل کے پیچھے چھپ گئے" (دو اسلام صفحہ ۲۷۹)

ازالہ

یہ تو تسلیم ہے کہ ان کے برے اعمال نیک اعمال کے پیچھے چھپ گئے لیکن سوال یہ ہے کہ ان بُرے اعمال کی سزا انہیں ملی یا نہیں۔ اگر نہیں ملی تو کیا دوزخ میں ان کو جانا پڑے گا اور اگر مل گئی تو کیا ملی؟ اگر آپ فرمائیں کہ وہ نادم ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ بس یہ ندامت ہی ان کی سزا ہو گئی تو یہ قطعاً تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اتنے بڑے بڑے گناہ کریں، صحابہ کو قتل کریں اور تکلیفیں پہنچائیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچائیں، بازارِ طائف میں آپ پر پتھروں کی بارش کریں، پھر زنا کرتے ہوئے، شراب پیتے ہوئے میدانِ کارزار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدمقابل پہنچ جائیں اور سزا انہیں کیا ملے، صرف ندامت، کیا اسے خلافِ عقل نہ کہیں گے برق صاحب؟

کیا یہ قرآن مجید کے خلاف نہیں؟ قرآن مجید تو کہتا ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۤؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (النساء۔ ۹۳)

جو شخص کسی مؤمن کو قتل کرے وہ ابدالآباد دوزخ میں رہے گا۔

بتائیے ایک شخص تو اس جرم میں ابدالآباد جہنم میں جلتا رہے اور دوسرا شخص اسی جرم میں صرف ندامت کے بعد چھٹکارا پا ئے کیا یہ ناانصافی نہیں؟ اگر ان صحابہ کا گناہ یعنی مؤمنین کو قتل کرنا معاف نہیں ہوا تو پھر لازماً ان کو وہی سزا بھگتنی چاہیئے جو قرآنی قوانین کے تحت مقرر ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کے لئے ندامت اور کسی کے لئے ابدالآباد جہنم کا عذاب، یہ تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے توبہ کر لی، گناہ معاف ہو گیا لیکن یہ نہیں ہو سکتا (بقول آپ کے) گناہ تو معاف نہیں ہوا لیکن سزا معاف ہو گئی۔ حیرت ہے کہ آپ ایک شخص کے حق میں صرف ندامت کو سزا سمجھ لیں اور دوسرے کے حق میں ابدالآباد جہنم، بات درحقیقت یہ ہے کہ ندامت تو کوئی سزا ہی نہیں، اصل سزا تو وہی جہنم کی سزا ہے اور وہ معاف ہو گئی لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ گناہ معاف ہو گیا۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

حضرت عثمان نے چند آدمیوں کو وضو کا طریقہ بتا کر کہا کہ رسول اللہ صلعم اسی طرح وضو کیا کرتے تھے، جو شخص اس طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے اس کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کرنے کے بعد وضو کر کے دو رکعت پڑھ لے تو گناہ معاف، یا کوئی طالب العلم سال بھر کام نہ کرے اور آخر میں دو رکعت نماز پڑھ لے سستی کا گناہ معاف، اور وہ پاس، یا کوئی شخص درخت سے کود کر ٹانگیں تڑوا لے اور فوراً دو رکعت نفل پڑھے تو گناہ معاف اور ٹانگیں واپس" (دو اسلام صد ۲۸۲)

ازالہ

برق صاحب نہ تو حدیث کو سمجھے۔ نہ اپنی مثالوں کو، یہ مثالیں اس حدیث پر چسپاں نہیں ہو سکتیں۔ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں، کبیرہ اور صغیرہ، اور یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں نہ کہ کبیرہ۔ (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیے)

پھر ایک اور لحاظ سے بھی گناہ کی دو قسمیں ہیں ایک صرف اللہ کا گناہ، دوسرے اللہ کے گناہ کے ساتھ بندہ کا گناہ، پہلا گناہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے کہ اسے چاہے تو معاف کر دے، اور چاہے تو اس کی سزا دے۔ مثلاً جب کبھی آپ سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو آپ فوراً یا کچھ دیر بعد اس سے معافی مانگ لیتے ہیں اور وہ معاف کر دیتا ہے تو اس معافی میں کوئی اشکال نہیں

نہ کوئی پیچیدگی ہے نہ وہ مثالیں اس معافی کے منافی ہیں جن کو برق صاحب نے اوپر نقل فرمایا ہے، (تفصیل کے لئے باب ۱۲ ملاحظہ فرمائیں) برخلاف اس کے دوسرا گناہ صرف اللہ کا گناہ نہیں بلکہ بندے کا بھی گناہ ہے، لہٰذا یہ گناہ معاف نہیں ہوتا جب تک بندہ معاف نہ کرے، یہ ہے اس قسم کی تمام احادیث کا خلاصہ۔

باپ کو قتل کرنا، باپ کا جرم ہے، باپ کے عزیز و اقارب کا جرم ہے پھر یہ کبیرہ گناہ ہے لہٰذا بہر دو صورت اس کے معاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کوئی طالب علم سال بھر کام نہ کرے تو اس نے اپنا سال ضائع کر دیا اب اگر وہ اپنی کاہلی پر نادم ہو جائے اور دوسرے سال محنت کرے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے مستقبل میں اس کے لئے سرخروئی کا امکان ہے لیکن ایک سال کا جو نقصان ہو چکا وہ ایسی سزا ہے جو ماضی میں اسے مل چکی اور جو سزا مل چکی اس کے معاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی ٹانگیں توڑ ڈالے تو اس کو اپنے غلط کام کی سزا مل چکی اور جو سزا مل چکی اس کی معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم کہتے ہیں کہ آنے والی سزا معاف ہوتی ہے، برق صاحب زمانہ ماضی کی سزاؤں کو بیچ میں لے آتے ہیں حالانکہ ان سے تو ہم بحث ہی نہیں کرتے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی چیز مشکل نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے، اگر وہ بندے کے گناہ معاف کرنے کا ارادہ ہی کرے تو پھر کیا چیز مانع ہو سکتی ہے، باپ کے اعزہ و اقارب بھی معاف کر سکتے ہیں اللہ تعالیٰ باپ کو بھی معافی دینے پر راضی کر سکتا ہے، جب اس نے خود قرآن مجید میں دعدہ فرمایا ہے کہ سوائے شرک کے وہ ہر گناہ کو معاف کر دے گا، تو پھر کیا امر مانع ہے، کہ باپ کا قتل معاف نہ ہو سکے اور یہ اس کی عادت اور قانون کے بھی خلاف نہیں، اس لئے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کو معاف کرنے کا قانون قرآن مجید میں موجود ہے۔

طالب علم ناکام ہوا اس نے سزا بھگت لی اگر سزا سے پہلے یعنی دوسرے الفاظ میں امتحان سے پہلے دعا کرتا تو بے شک اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ اس کے لئے کامیابی کا سبب پیدا کر دیتا لیکن امتحان ہو چکا، سزا مل چکی اب وضو کر کے دو رکعت پڑھنا کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ یعنی میدان محشر میں امتحان ہو چکا، سزا مل گئی اور اب دوزخ میں پہنچ کر کوئی شخص معافی مانگے تو بے فائدہ ہے۔

برق صاحب ہم کہتے ہیں کہ زندگی میں معافی مانگے اور آپ مثالیں ایسی دیتے ہیں کہ گویا مجرم دوزخ میں جا کر معافی مانگے، ظاہر ہے کہ دوزخ میں پہنچ کر معافی نہیں ہو سکتی اور ہم اس میں آپ سے متفق ہیں لیکن زندگی میں نیک اعمال کے صلہ میں معافی ہو سکتی ہے ہم کہتے ہیں کہ امتحان سے پہلے محنت کرے اور آپ ہمیں الزام دیتے ہیں کہ امتحان کے بعد محنت کرے، حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے ہمیں الزام

دیتے وقت براہ کرم اس فرق کو تو ملحوظ رکھ لیا ہوتا۔

مزید گذارش

برق صاحب فرماتے ہیں :۔

"مغفرت کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں اوّل اس گناہ سے بچنا، دوم تلافی مافات کے لئے صحیح اور فطری کوشش" (دو اسلام صـ۲۸۱)

برق صاحب ! ہمیں آپ سے اتفاق ہے اب یہ بتائیے کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کرکے آیندہ اس گناہ سے بچے تو ایک شرط تو مغفرت کی پوری ہو گئی۔ اب اگر وہ وضو کرکے دو رکعت نماز ادا کر لے تو یہ ایک نیک عمل ہوا، اور نیک عمل کے پیچھے بقول آپ کے پچھلے گناہ چھپ جایا کرتے ہیں لہٰذا یہ نیک عمل اس گناہ کو چھپائے گا۔ یہ نیک عمل اس بات کی ایک صحیح اور فطری کوشش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو جائے اور گویا یہ عمل تلافی مافات کا کام کرے گا۔ لہٰذا دونوں شرطیں پوری ہو گئیں۔ بتائیے اب بھی گناہ معاف ہوگا یا نہیں ؟ یہ ہے حدیث کا مطلب ! قرآن مجید تو اس سے بھی زیادہ عجیب بات کہتا ہے، سنیئے :

قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۔ تم حطۃ کہو تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔ (البقرہ :۔ ۵۸)

اگر صرف حطۃ (یا استغفر اللہ) کہنے سے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں تو دو رکعت نماز سے کیوں نہ معاف ہوں گے اور اگر کوئی تاویل یہاں چل سکتی ہے تو پھر وہی تاویل حدیث میں کیوں نہیں چل سکتی۔

حدیث کا صحیح مفہوم

ایک آدمی وضو کرنے بیٹھتا ہے۔ وہ وضو کیوں کر رہا ہے ؟ اس سے پہلے وہ کس مشغلہ میں تھا اسے کیوں چھوڑا ؟ اپنے وقت عزیز کو وضو میں کیوں صرف کیا ؟ کس چیز نے اس کو تمام کاروبار اور جرائم سے روک دیا اور دفعتہً رد کر دیا ؟ اب یہ تصور رب ہے جو اس کے ذہن میں آتا ہے وہ سوچتا ہے کہ میں بندہ ہوں میرا کوئی مالک ہے، میں مخلوق ہوں میرا کوئی خالق ہے، یہ وضو میں اس کے حکم سے کر رہا ہوں۔ اس کو راضی کرنے کے لئے کر رہا ہوں۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس سے پہلے میں فلاں گناہ کرکے اسے ناراض کر چکا ہوں حالانکہ اس وقت بھی میں اس کا بندہ تھا، وہ میرا آقا تھا، مجھ سے برا ہوا کہ میں نے اپنے خالق کو ناراض کیا، اب ندامت کا تصور پیدا ہوتا ہے وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور دو رکعت نماز ادا کرکے

اپنے مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، رحمتِ الٰہی جوش میں آتی ہے اور اس نادم بندے کو ڈھانک لیتی ہے، یہ ہے حدیث کا مطلب، غالباً اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا اور صرف یہی حدیث نہیں بلکہ اس قسم کی جتنی احادیث آپ نے نقل فرمائی ہیں سب سمجھ میں آجائیں گی۔

ہر نیکی انابت الی اللہ کا جذبہ پیدا کرتی ہے اس نیکی کی ادائیگی کے وقت بندے کو محسوس ہوتا ہے کہ میں کہاں ہوں، کیا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیئے یہ نیکی میں کس کے حکم سے کر رہا ہوں، کس کے فرمان سے کر رہا ہوں، کس کو خوش کرنے کے لئے کر رہا ہوں اس کو میں نے پہلے ناراض تو نہیں کیا ہے" اگر کیا ہے تو یہ مجھ سے اچھا ہوا یا برا ہوا، یہ تصورات اس کی کایا پلٹ دیتے ہیں اور اس کی برائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ ایک نیک اور صالح انسان کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ احادیث میں جگہ جگہ نیکیوں کی ترغیب دی گئی ہے بظاہر وہ نیکی اس قابل نہیں کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو سکے لیکن اس کے یہ ذہنی تصورات اور پھر ذہنی تبدیلی، گناہ سے نفرت، یہ ہے وہ چیز جو اس نیکی نے پیدا کی، لہذا مغفرت کا اصل سبب وہ نیکی ہی بنی، اس نیکی ہی نے اس کو دوسری طرف موڑ دیا اور اب وہ صراط مستقیم پر گامزن ہے" نیکی سے یہ تصور پیدا ہونا، گناہوں کا چھوٹنا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (العنکبوت ۔ ۴۵)	بے شک نماز بے حیائی اور تمام برے کاموں سے روکتی ہے۔

اب اگر کسی نمازی کی برائیاں دور نہ ہوں تو یہ اس کا قصور ہے کہ اس نے ایک نیک عمل تو کیا، لیکن اپنے ذہن کو نہیں بدلا۔ نماز پڑھتے وقت اس نے نہیں سوچا کہ وہ کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے جس وجہ سے وہ یہ کام کر رہا ہے کیا اس وجہ سے فلاں کام نہیں کرنا چاہیئے فلاں کام نہیں چھوڑنا چاہیئے یہ تصورات اس کے ذہن میں نہیں آئے اس کی نماز نے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، لہذا برائیاں دور نہ ہوئیں، اس میں نماز کا کوئی قصور نہیں نہ آیتِ قرآنی کا قصور ہے یہی حال ان تمام نیکیوں کا ہے جو احادیث میں بیان ہوئی ہیں اور جن میں مغفرتِ ذنوب کا تذکرہ ہے اگر ان نیکیوں کو کرنے کے بعد بھی نیکی کرنے والا برائیاں کرتا رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، نہ وہ تصورات آئے جو آنے چاہیئے تھے لہذا اس کو اس نیکی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس میں نہ حدیث کا قصور ہے نہ اس نیکی کا قصور ہے، بلکہ اس نیکی کے طریقۂ ادائیگی کا قصور ہے اس کی نیکی ان تصورات سے خالی رہی جو مغفرتِ ذنوب کا ذریعہ ہیں لہذا مغفرت نہ ہو سکی۔

برق صاحب حدیث کا مطلب تو اب سمجھ میں آگیا ہوگا اگرچہ قرآن مجید تو بغیر نیکی کے بھی مغفرتِ ذنوب کی خوشخبری سناتا ہے اور یہ آیات اس باب میں اور اس باب سے پہلے باب (۱۲) میں نقل ہو چکی ہیں

اگر بغیر نیکی کے بہت سے گناہ معاف ہوجایا کرتے ہیں تو پھر نیکی سے معاف ہوجانا کیا بعید ہے لہذا حدیث زیر بحث اعتراض سے بالکل پاک وصاف ہے، حدیث اپنی جگہ پر صحیح ہے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جب چاہے اور جس ذریعہ سے چاہے گناہ کو معاف کردے، حدیث کو سمجھنے کے لئے قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے ورنہ قدم قدم پر غلط فہمی سے سابقہ پڑتا ہے، مغفرتِ ذنوب پر ایک اور زاویہ سے بھی ہم بحث کر چکے ہیں براہ کرم باب اول ملاحظہ فرمائیے۔

غلط فہمی

گناہوں کا کتنا عجیب علاج بتایا ہے کہ قتل کرو، ہاتھ دھولو اور قتل معاف، اب خیر سے ہمارے علماء بیتاب ہے ہیں کہ پاکستان میں شریعت نافذ کرو، اگر اس طرح کی شریعت جاری ہوگئی تو پہلے ہی دن قیامت آجائے گی اس لئے کہ ہر آدمی قتل وزنا کے بعد ہاتھ پاؤں دھولے گا اور سزا سے بچ جائے گا (دو اسلام صفحہ ۲۸۴)

ازالہ

اللہ تعالیٰ گناہ سے بیزار ہے لہذا اس کے سدِ باب کے لئے کچھ طریقے اختیار کرتا ہے، پہلا طریقہ ہے "دوزخ کے عذاب سے ڈرانا" دوسرا طریقہ ہے "نیکیوں کے ذریعہ مجرم میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا"، تیسرا طریقہ ہے "سزا دینا"، کیونکہ پہلے دونوں طریقے ہر حالت میں کارگر نہیں ہوتے اس لئے بعض گناہوں کے روکنے کے لئے تیسرا ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے اور کچھ سزائیں دی جاتی ہیں تاکہ ان سزاؤں کے خوف سے وہ آئندہ گناہ کا مرتکب نہ ہو، یہ تیسرا طریقہ ایک اور وجہ سے بھی ضروری ہے وہ یہ کہ پہلے دو طریقوں سے صرف مجرم کی اصلاح کا امکان ہوتا ہے لیکن تیسرے طریقہ سے دوسروں کی بھی اصلاح ہوتی ہے ان کو عبرت ہوتی ہے، اور پھر ان کو اس جرم کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

تیسرا طریقہ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ بعض گناہوں سے دوسرے انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور جب تک ان کی حق تلفی دور نہ ہو، جرم کی معافی کوئی معنی نہیں رکھتی، لہذا اس حق تلفی کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ حق، حق والے کو مل جائے یا حق والا حق تلف کرنے والے کو سزا دلوا کر اپنا دل ٹھنڈا کرے اور اپنے مشتعل جذبات کو بجھادے ورنہ پھر ایک اور جرم کا امکان باقی رہ جاتا ہے۔ بلکہ اس سلسلہ میں جرائم کا ایک لامحدود سلسلہ قائم ہوجاتا ہے جو نسلاً بعد نسلٍ جاری رہتا ہے برق صاحب تو یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ معاف ہی نہیں ہوتا، سزا مل کر ہی رہتی ہے ہم پوچھتے ہیں دو آدمی قتل کرتے ہیں ایک مقتول کے وارث قاتل کو معاف کردیتے ہیں دوسرے مقتول کے ورثا قاتل کو قتل کروا دیتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں قرآن مجید سے ثابت ہیں تو پھر یہ بتائیے کہ اس دوسرے قاتل کو سزا مل گئی لیکن پہلے قاتل کو سزا کہاں ملی؟ دونوں برابر کے مجرم تھے ایک کو سزا نہیں ملی دوسرے کو ملی آپ یہ کہیں گے کہ اسے ندامت ہوئی ہم کہتے ہیں کیا تجھے ندامت بھی ہوئی یا نہیں، ورثاء نے اپنی طرف سے خود ہی معاف کردیا

اور اگر بالفرض ندامت بھی ہوئی، رسوائی بھی ہوئی تو یہ بتائیے کہ ایک ہی جرم کی سزا مختلف کیوں؟ ایک کو صرف ندامت و رسوائی کی سزا، دوسرے کو ندامت و رسوائی کے ساتھ قتل کی سزا اس سے ثابت ہوا کہ جرم ہو سکتا ہے اور معافی بھی مل سکتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر جرم کی سزا مل کر ہی رہے جب انسانوں میں یہ صفت پائی جاتی ہے کہ وہ معاف کر کے خوش ہوتے ہیں اور یہ ایک نفسیاتی چیز ہے تو پھر ارحم الراحمین عَفُوٌّ غفور معاف کر کے خوش کیوں نہ ہوگا، برق صاحب کیوں اللہ تعالیٰ کو آپ غضب کا مجسمہ سمجھتے ہیں کہ وہ گناہ کو معاف کرتا ہی نہیں اس کو اس وقت تک چین ہی نہیں آتا جب تک وہ سزا نہ دے لے یہ سراسر اس کی رحمت سے ناامید ہونے کی مثال ہے وہ فرماتا ہے:۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ٥ (الزمر:۔ ۵۳)	اے میرے گناہگار بندو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دے گا۔ بے شک وہ غفور ہے، رحیم ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

انسانوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ٥ (الشوریٰ:۔ ۴۳)	جو صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ بڑے عزم اور حوصلے کا کام ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

دوسری جگہ متقین کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ٥ (آلِ عمران:۔ ۱۳۴)	متقی وہ لوگ ہیں جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔
وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ٥ (حٰمٓ السجدۃ:۔ ۳۵)	یہ چیز خوش قسمت لوگوں کو ہی ملا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم دیتا ہے:۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آلِ عمران:۔ ۱۵۹)	آپ انہیں معاف کر دیا کریں اور ان کے لئے مغفرت طلب کیا کریں۔

جب معافی کی صفت اللہ تعالیٰ اپنے رسول میں دیکھنا چاہتا ہے، اپنے بندوں میں دیکھنا چاہتا ہے، اس صفت کو وہ پسند کرتا ہے تو وہ خود ارحم الراحمین ہو کر اس صفت سے متصف نہ ہو یہ ناممکن ہے نہ یہ اس کے شایانِ شان ہے بلکہ وہ ضرور معاف کرتا ہے، معاف کرتا رہتا ہے اور معاف کرنے کو

پسند کرتا ہے جیسا کہ ہم پہلے آیات قرآنی سے ثابت کر چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو یہ دعا سکھائی ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا۔ ہمیں معاف فرما، ہماری مغفرت فرما۔
(البقرۃ :۔ ۲۸۶)

اگر اللہ تعالیٰ معاف ہی نہیں کرتا تو معافی مانگنے کا حکم کیوں دیتا ہے، معافی مانگنے کا حکم دینے سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ کو معاف کرتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دعا کی بھی کوئی حقیقت ہے، دعا سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اگر دعا کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کیوں فرماتا کہ یہ دعا مانگو اس کے علاوہ بھی قرآنِ مجید میں متعدد دعاؤں کی تعلیم دی گئی ہے، لہٰذا دعا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور دعا مطلب برآری اور گناہوں کی معافی کے لئے ضرور اثر رکھتی ہے۔

باب ۱۴

مسئلہ شفاعت

غلط فہمی "قرآن مجید کے طول و عرض میں کہیں مذکور نہیں کہ آنحضرت صلعم محشر میں شفاعت کریں گے۔" (ص۲۸۵)

ازالہ قرآن مجید میں مقامِ شفاعت کا ذکر موجود ہے، ارشاد باری ہے۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (بنی اسرائیل:۔ ۷۹)

قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود میں کھڑا کرے گا۔

یہ مقامِ محمود ہی تو مقامِ شفاعت ہے۔

غلط فہمی "البتہ دنیا میں استغفار کا ذکر ضرور ہے، اگر یہ لوگ مغفرت طلب کریں اور رسول ؐ بھی ان کے لئے مغفرت مانگے تو پھر یہ اللہ کو تواب و رحیم پائیں گے۔" (قرآن)

"مطلب یہ کہ جو لوگ تلافی مافات کے لئے کمربستہ ہو جائیں اور حضور ان کی رہبری فرمائیں تو ان کے پچھلے گناہ چھپ جائیں گے۔" (دو اسلام ص۲۵۸)

ازالہ استغفار کے معنی رہبری کرنا یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ معنی لفظاً صحیح نہیں اس سے پہلے برق صاحب نے استغفار کے معنی چھپانے کے کئے ہیں (دو اسلام ص۲۷۹) معلوم نہیں کہ کون سے معنی صحیح ہیں؟ اچھا برق صاحب یہ تو بتائیے کہ وہ تلافی مافات بھی کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی رہبری بھی فرمائیں لیکن گناہ پھر بھی معاف نہ ہو، سزا مل کر ہی رہے تو پھر تلافی مافات کا نتیجہ کیا ہے۔ تلافی مافات سے آیندہ کی اصلاح ہو گئی گذشتہ گناہ کے لئے وہ تلافی کوئی فائدہ نہیں دے گی لوگ تو خیر پچھلے گناہ بھول جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ تو گناہ بھول بھی نہیں سکتا

اس سے کوئی چیز چھپ بھی نہیں سکتی، وہ بقول آپ کے سزا بھی ضرور دیتا ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ گناہ چھپ سکے نہ سزا ہی سے بچ سکے۔ یہ ہیں مغفرت کے لغوی معنی اختیار کرنے کا نتیجہ۔

غلط فہمی

"اس مضمون کے علاوہ شفاعت کا کوئی اور تخیل قرآن میں موجود نہیں بلکہ عدم شفاعت پر جا بجا اشارے ملتے ہیں" (دو اسلام صفحہ ۲۸۵)

ازالہ

برق صاحب آپ نے صرف وہ آیتیں ہی لکھی ہیں جن میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے لیکن وہ آیتیں تحریر نہیں فرمائیں، جن میں ایک شرط کے ساتھ شفاعت کا ثبوت ملتا ہے اور وہ شرط ہے "اذنِ الٰہی" ارشادِ باری ہے:۔

۱۔ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (البقرۃ:۔ ۲۵۵)

کون ہے جو اللہ کے ہاں سفارش کر سکے مگر اس کی اجازت سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کلیۃً شفاعت کی نفی نہیں ہے بلکہ اس شفاعت کی نفی ہے جو بغیر اجازت کے ہو، اس سلسلہ میں برق صاحب نے جو آیت پیش کی ہے وہ مع ترجمہ درج ذیل ہے:۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ

اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص اپنے آپ کو پیش کر کے دوسرے کو نہیں بچا سکے گا۔ جب کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔

(دو اسلام صفحہ ۲۸۵)

برق صاحب نے "وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ" کا ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "انسان کی طرف سے کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی" یعنی کوئی شخص چاہے کہ میں کسی کو اپنا سفارشی خود بنا لوں تو نہیں بنا سکتا۔ اس قسم کی شفاعت اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں ہوگی کہ مجرم خود کسی کو شفیع بنا کر لائے اور پھر اس کی سفارش کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ شفیع بنانے یا نہ بنانے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہوگا۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:۔

قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۝ (الزمر:۔ ۴۴)

کہہ دیجئے، تمام سفارشوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

دوسری آیت میں اس سے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ شفاعت کا ثبوت ملتا ہے۔

۲۔ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝

قیامت کے دن شفاعت نفع نہیں دے گی مگر ہاں اس شخص کو نفع دے گی جس کے لئے رحمٰن کی طرف سے سفارش کی اجازت مل جائے اور رحمٰن

(طٰہٰ :۔ ۱۰۹) اس کے لئے سفارش کو پسند فرمائے۔

تیسری آیت ملاحظہ فرمائیے :۔

لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَھْدًا ۝ (مریم :۔ ۸۷)

وہاں لوگوں کو شفاعت کا اختیار نہیں ہوگا مگر ہاں جس نے رحمان سے کوئی عہد لے لیا ہو۔

چوتھی آیت ملاحظہ فرمائیے :۔

وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی ۝ (الانبیآء :۔ ۲۸)

مکرم بندے بھی کسی کی سفارش نہیں کرسکتے مگر جس کے لئے اللہ کی رضا ہو۔

پانچویں آیت ملاحظہ فرمائیں :۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَہٗ (سبا :۔ ۲۳)

اللہ کے ہاں شفاعت نفع نہیں دے گی مگر اس کو جس کے لئے اللہ کی اجازت ہو۔

چھٹی آیت ملاحظہ فرمائیے :۔

وَلَا یَمْلِکُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنْ شَھِدَ بِالْحَقِّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ (الزخرف :۔ ۸۶)

اور اللہ کے علاوہ جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے مگر ہاں وہ جو حق کے ساتھ گواہی دیں اور انہیں علم بھی ہو (وہ سفارش کرسکتے ہیں)۔

مزید آیات مطالعہ فرمائیں :۔

۷۔ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِہٖ (یونس :۔ ۳)

کوئی سفارش نہیں کرسکتا مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بعد۔

۸۔ فَمَا تَنْفَعُھُمْ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیْنَ ۝ (المدثر :۔ ۴۸)

منکرین قیامت کو سفارش کرنے والوں کی سفارش کام نہ آئیگی۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ شفاعت نفع دے گی بشرطیکہ شفاعت کرنے والا شفاعت کی اجازت حاصل کرلے اگر اجازت مل گئی تو پھر نفع دینا بھی یقینی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ناانصافی اور ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہاں نجات اسی کو ملے گی جو نجات کا اہل ہوگا اور جو نجات کا اہل ہوگا اسی کے لئے شفاعت کی اجازت بھی دی جائے گی۔ برق صاحب نے جو حدیث شفاعت نقل کی ہے اسے پورا نقل نہیں فرمایا حالانکہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ موجود ہیں:۔

فَیُؤْذَنُ لِیْ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) پھر مجھے اجازت دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا:۔

اِشْفَعْ تُشَفَّعْ ۔ شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول ہوگی ۔

اس کے بعد حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

فَیَحُدُّ لِیْ حَدًّا (صحیح بخاری و صحیح مسلم) پھر اللہ میرے لئے حد مقرر کر دے گا ۔

٭ ٭ ٭ ٭

یعنی میں صرف ان لوگوں کی سفارش کرسکوں گا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ آپ ان لوگوں کی سفارش کرسکتے ہیں ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حق میں سفارش کی اجازت ہی نہیں ملے گی ، الغرض اللہ تعالیٰ کے علم وقانون میں جو لوگ نجات کے اہل قرار پاسکتے ہیں ، انہیں کے متعلق سفارش کی اجازت ہوگی ، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

اِلَّا مَنْ حَبَسَهُ الْقُرْآنُ ۔ (صحیح بخاری) (میری سفارش سے لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے) مگر وہ لوگ جن کو قرآن نے روک لیا (دوزخ سے نہیں نکالے جائیں گے)

٭ ٭ ٭ ٭

حدیث مذکور سے تین باتیں ثابت ہوئیں:۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے ، اور بغیر اجازت کے سفارش نہیں کریں گے ۔

۲۔ جن لوگوں کی آپ سفارش کریں گے ان کا تعین بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا ۔

۳۔ آپ ان لوگوں کی سفارش نہیں کرسکیں گے جو قانونِ الٰہی کے ماتحت ایسی سزا کے مستوجب ہیں جو معاف نہیں ہوسکتی ۔

بتائیے ان تینوں میں سے کون سی بات ایسی ہے جو قرآن مجید یا دوسری احادیث سے ٹکراتی ہے ۔

غلط فہمی "ابوہریرہؓ سے روایت ہے ..... کہ قیامت کے دن سب سے پہلے لوگ حضرت آدم کے پاس جائیں گے اور التجا کریں گے وہ کہیں گے کہ میں نے تو دانہ گندم کھا لیا تھا اس لئے اللہ کے سامنے جانے سے ڈرتا ہوں پھر ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے ، وہ کہیں گے کہ میں نے تین جھوٹ بولے تھے اس لئے مجھے معاف کرو ۔ آخر میں لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں گے اور آپ اللہ کے حضور میں روانہ ہوجائیں گے ۔

کیا دلچسپ حدیث تراشی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ابراہیم سے بھی

بڑھا دیا جن کی اتباع کا آپ کو بار بار حکم دیا گیا تھا (و فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا)۔
(تم موحد ابراہیم کے آثارِ قدم پر چلو) اور آپ پر تین جھوٹ بولنے کا الزام بھی لگا دیا،،
(دو اسلام ص ۲۸۷-۲۸۸)

ازالہ

پہلی غلط فہمی تو یہ ہے کہ آیت کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "تم اتباع کرو موحد ابراہیم کی ملت کا" اور ملت سے مراد اسلام ہے اور یہ اللہ کا دین ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اس اسلام کی پیروی کرو جو ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا نہ کہ وہ نام نہاد ملتِ ابراہیمی جس کو کفارِ مکہ یا اہلِ کتاب پیش کرتے تھے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ برق صاحب کے خیال میں ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے اور اس کے لئے بطور دلیل انھوں نے یہ آیت پیش کی ہے حالانکہ آیت ایک الزامی جواب ہے جو مشرکین عرب اور اہلِ کتاب کو دیا گیا ہے کیونکہ یہ لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ ہم دینِ ابراہیمی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اصلی دینِ ابراہیمی پر تو اے رسول تم ہو اور تم اسی اصلی ملت کی پیروی کئے چلے جاؤ۔ ان کے کہنے کی پرواہ نہ کرو۔ یہ لوگ مشرک ہیں اور ابراہیم علیہ السلام مشرک نہیں تھے پھر یہ دینِ ابراہیمی پر کیسے ہو سکتے ہیں اب آیت ملاحظہ فرمائیے:-

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا	(حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے
وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ	اور نہ عیسائی، بلکہ موحد مسلم تھے۔ اور وہ مشرکین
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ (آلِ عمران: ۶۷)	میں سے نہیں تھے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ اور اہلِ کتاب کے دعویٰ کو باطل کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا رسول ہی ابراہیمی دین پر ہے اور اپنے رسول سے کہہ دیا۔ کہ تم ان کی ملامت کی پرواہ نہ کرو اور اصلی دینِ ابراہیمی کی پیروی کئے چلے جاؤ۔

برق صاحب ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے:-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ	تمام رسولوں کو اللہ نے ہدایت دی تھی، پس
فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ :-	اے رسول تم بھی انہی کی ہدایت کی پیروی
(الانعام: - ۹۰)	کرو۔

یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تمام رسولوں کے نقشِ قدم پر چلنے کا حکم دے رہا ہے، بتائیے کیا سب رسول، نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوئے گویا جماعت مرسلین میں سب سے کم درجہ کے نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ غالباً آپ بھی تسلیم نہیں کریں گے، ابراہیم علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا راستہ ایک ہے۔ یعنی اسلام، بس

اس پر چلنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اس میں افضل و مفضول کا کوئی سوال نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں یا نہیں، تو یہ بات خود قرآن مجید سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ہ (بنی اسرائیل:۔ ۷۹)	عنقریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود میں کھڑا کرے گا۔
وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ہ (الاحزاب:۔ ۴۰)	آپ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے۔

خاتم النبیین کے الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ آپ سب سے افضل ہیں کیونکہ افضل سب کے بعد میں ہی آیا کرتا ہے بادشاہ کی سواری جب نکلتی ہے تو جلوس آگے آگے ہوتا ہے، اور بادشاہ سب کے آخر میں، مشاعرہ میں سب سے بڑے شاعر کو سب کے آخر میں اپنا کلام سنانے کا وقت دیا جاتا ہے، جلسہ عام میں سب سے زیادہ عالم کو سب کے آخر میں تقریر کا موقع دیا جاتا ہے۔ الغرض سب کے بعد میں آنے والا (عاقب) سب سے افضل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ۣالَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہ (الاعراف:۔ ۱۵۸)	(اے رسولؐ) کہہ دیجئے، اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں جس اللہ کی بادشاہت آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی۔
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا (سبا:۔ ۲۸)	(اے رسولؐ) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کیلئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقوام عالم کے لئے رسول ہیں، برخلاف اس کے آپ سے پہلے جتنے بھی نبی آئے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف رسول بن کر آئے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۔ (آلِ عمران:۔ ۴۹)	وہ بنی اسرائیل کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔

خود ابراہیم علیہ السلام جن کو برق صاحب افضل الانبیاء سمجھتے ہیں، اپنی قوم ہی کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ دوسری قوموں کی طرف دوسرے رسول بھیجے گئے تھے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ؕ (هود:۔ ۷۰)	جب ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کو دیکھا کہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے، تو ڈرے، فرشتوں نے کہا ڈرو نہیں، ہم لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں لوط علیہ السلام اپنی قوم کی طرف رسول تھے، اور وہاں ابراہیم علیہ السلام کی رسالت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (آلِ عمران:۔ ۳۱)	(اے رسول) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب بنا لے گا۔

بتایئے جس شخص کا متبع محبوب الٰہ ہے وہ خود کتنا بڑا محبوب ہوگا۔ لہٰذا اگر ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب ہیں۔

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے متعلق بہت کچھ ہے، کاش برق صاحب انہیں بھی تسلیم کریں۔

غلط فہمی

آپ پر جھوٹ بولنے کا الزام بھی لگا دیا،،
(دو اسلام صہ ۲۸۸)

ازالہ

جھوٹ کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے، ارشاد باری ہے:۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ ۝ (الانبیاء:۔ ۵۷، ۵۸)	ابراہیم علیہ السلام نے کہا اللہ کی قسم تمہارے جانے کے بعد میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا پس انہوں نے تمام بت توڑ ڈالے سوائے بڑے بت کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

پھر جب وہ مشرکین بت خانہ میں آئے تو بہت برہم ہوئے اور پوچھا:۔

ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ ۝ (الانبیاء:۔ ۶۳)	اے ابراہیم کیا ہمارے ان معبودوں کے ساتھ یہ حرکت تم نے کی ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا نہیں بلکہ یہ کام اس بڑے بت نے کیا ہے ان بتوں ہی سے پوچھو اگر یہ بولتے ہوں۔

یہ قرآن مجید کی آیات آپ کے سامنے ہیں اگر یہ جھوٹ نہیں تو معلوم نہیں پھر جھوٹ کس چیز کا نام ہے؟ اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر اعتراض کا رخ قرآن مجید کی طرف ہوگا، بتایئے کیا کیا جائے؟

غلط فہمی اچھا مان لیا کہ آدم نے دانہ کھایا.... لیکن حضرت عیسیٰ ؑ نے کیا قصور کیا تھا کہ انہیں شفاعت کی اجازت نہیں مل سکی.... یوسف علیہ السلام میں کیا کمی تھی۔ (دو اسلام صہ ۲۹۸)

ازالہ پہلی بات تو یہ یاد رکھیئے کہ عدم ذکر سے عدم شے لازم نہیں آتا، دوسرے یہ ضروری نہیں کہ ہر نبی اپنا قصور یاد کر کے ہی اس کام کا اپنے کو اہل نہ سمجھے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ بے قصور ہوں پھر بھی وہ اپنے کو اس کام کا اہل نہ سمجھیں۔ مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کے جواب میں صرف اتنا ہے کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے کسی قصور کا ذکر نہیں کیا پھر بھی خود کو اس کام کا اہل نہ سمجھا۔

حدیث میں صرف بڑے بڑے رسولوں کا ذکر ہے باقی کو بھی ان ہی پر قیاس کیا جا سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ حدیث میں فرداً فرداً لاکھوں پیغمبروں کے پاس جانا مذکور ہو، پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ خود ہی باقی انبیاء کے پاس نہ جائیں یہ سمجھ کر کہ جب اتنے بڑے نبیوں نے جواب دے دیا، تو دوسروں کے پاس جانا لاحاصل ہے پھر اس غلط فہمی کا جواب خود حدیث میں موجود ہے یعنی جب وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام اس شخص کی نشاندہی کر دیں گے۔ جس کے لئے یہ کام مخصوص ہے اس طرح وہ لوگ ان کی ہدایت کے مطابق سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے۔ اس وقت آپ کو شفاعت کی اجازت ملے گی اور آپ شفاعت کریں گے۔

غلط فہمی "حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ آپ اکرم الناس تھے... ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ سے کسی نے پوچھا کہ دنیا کا بہترین انسان کون ہے؟ فرمایا سب سے بڑا پرہیزگار، کہا میرے سوال کا یہ مطلب نہیں تھا، فرمایا تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام"۔ (بخاری جلد ۲ صہ ۱۵۲)

حیرت ہے کہ اس اہم کام یعنی شفاعت کے لئے دنیا کا بہترین انسان کیوں منتخب نہ ہو سکا (صہ ۲۹۸)

ازالہ حدیث مذکور میں خود اس غلط فہمی کا ازالہ موجود ہے اکرم الناس تو آپ نے اسی کو فرمایا جو سب سے زیادہ متقی ہو اور یہی قرآن مجید میں بھی ہے:۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات ۶-۱۳) یعنی اللہ کے ہاں اکرم الناس وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہو۔

ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے عقیدہ کے مطابق اور قرآن و حدیث کی صراحت کے موجب سب سے

زیادہ متقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں لہٰذا شفاعتِ کبریٰ کا حق سوائے آپ کے اور کس کو ہو سکتا ہے اب رہا یہ سوال کہ پھر یوسف علیہ السلام کس لحاظ سے اکرم الناس ہیں تو اس کی وجہ دوسری ہے وہاں مکرم سے مراد مکرم بلحاظِ نسب ہے اور یہ حدیث میں موجود ہے۔ صحابہ نے کہا ہم یہ نہیں پوچھ رہے تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔

فَيُوسُفُ نَبِيُّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنُ خَلِيْلِ اللّٰهِ ۔	بلحاظ نسب تو یوسف علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ خود بھی نبی، نبی کے بیٹے ہیں، نبی کے پوتے ہیں خلیل اللہ کے پڑپوتے ہیں ۔

⁂

بلحاظ نسب یوسف علیہ السلام کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ خود بھی نبی ہیں، اور ان کی تین پشتیں نبوت سے سرفراز ہیں، کیونکہ اللہ کے ہاں انساب کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ تقویٰ کی اہمیت ہے، لہٰذا شفاعت کبریٰ اسی شخص کو مل سکتی ہے جو تقویٰ کے زیور سے سب سے زیادہ آراستہ ہو۔

غلط فہمی

" اگر کسی طالب العلم کو ایک سال پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ امتحان میں کچھ لکھے یا نہ لکھے وہ بہر رنگ کامیاب ہو جائے گا تو وہ یقیناً کام چھوڑ کر آوارہ گردی شروع کر دے گا " (دو اسلام ص ۲۸۸)

ازالہ

طالب علم کام کرنا اس وقت چھوڑ سکتا ہے جب اسے کامیابی کا یقین ہو۔ شفاعت کے سلسلہ میں یقین نہ قرآن مجید سے حاصل ہوتا ہے نہ احادیث سے۔ بلکہ قرآن و حدیث کی تصریحات کی بناء پر اصل چیز جس پر شفاعت کا دار و مدار ہے وہ انسان کا اپنا عمل ہے۔ پس نجات دو چیزوں پر موقوف ہوئی۔ ایک عمل دوسرے شفاعت لہٰذا ایسا کون بے وقوف ہو گا جو صرف ایک شرط کو پورا کرے اور دوسری کو چھوڑ دے۔ حالانکہ شرطِ شفاعت تو شرطِ عمل ہی پر موقوف ہے حدیثِ شفاعت میں یہ چیز موجود ہے۔ یعنی جن کو قرآن روک لے گا ان کے حق میں شفاعت نہیں ہو گی تبائیے اب کیا اعتراض ہے؟

غلط فہمی

" رسول اللہ رو رہے تھے.... کہ اللہ نے جبریل سے کہا، اے جبریل! محمد (صلعم) کے پاس جاؤ اور اسے ہماری طرف سے کہو کہ ہم تمہیں تمہاری امت کے متعلق خوش کریں گے اور مغموم نہ ہونے دیں گے (مسلم) اس وعدہ کی رُو سے ہم سب کو جنت میں تو پہنچ ہی جانا ہے پھر کام کیوں کریں، نماز کیوں پڑھیں؟ روزے کیوں رکھیں اور جہاد کے خوف ناک مصائب کیوں برداشت کریں" (دو اسلام ص ۲۸۹)

ازالہ

ایک مسلم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشی میں خوش ہوتا ہے لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی چیز سے خوش ہوں گے جس چیز سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا، سفارش آپ انہی کی کریں گے جن کی سفارش کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا لہذا ایسا موقع تو کوئی آئے گا ہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفارش کرنا چاہیں اور سفارش قبول نہ ہو اور پھر سفارش قبول نہ ہونے پر آپ کو ملال ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خود اسی کی سفارش سے خوش ہوں گے جس کی سفارش کی اجازت ہوگی اور جس کی سفارش کی اجازت نہ ہوگی اس سے آپ خود بیزار ہوں گے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ امت کے بعض لوگوں سے آپ فرمائیں گے ۔

سُحْقًا سُحْقًا (صحیح بخاری و صحیح مسلم) دور ہو جاؤ، دور ہو جاؤ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں سے آپ کو نفرت ہوگی اور آپ سفارش ہی نہ کریں گے اور جن سے آپ کو محبت ہوگی وہ وہی لوگ ہوں گے جو اللہ کے بھی پیارے ہوں گے اور ان ہی کے حق میں سفارش قبول ہونے کے بعد آپ خوش ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۔ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۔ (البینۃ: ۷، ۸)	بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے وہ بہترین مخلوق ہیں ۔ ان کی جزا باغاتِ عدن ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ وہ اللہ سے راضی، اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا، یہ سب کچھ اس کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے ۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۔ (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)	اے نفس مطمئنہ جا اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی ، میرے بندوں میں داخل ہو جا ، اور میری جنت میں داخل ہو جا ۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ ہر صالح مؤمن کو اللہ تعالیٰ راضی کرے گا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سید الاولین والآخرین کو اللہ تعالیٰ راضی نہ کرے گا ضرور کریگا ۔ لہذا حدیث زیر بحث بالکل قرآن مجید کے مطابق ہے برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی ۔

دوسرا جواب

برق صاحب احادیث میں اگر شفاعت کا ذکر ہے تو احادیث میں یہ بھی ہے کہ آپ کا امتی کون ہے اور امت سے خارج کون ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا — جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

(صحیح مسلم)

✧ ✧ ✧ ✧

اسی طرح بے نمازی کو آپ نے کافر تک فرمایا ہے (ترمذی) قریب قریب یہی حال روزہ کا ہے جہاد کے متعلق فرمایا ہے کہ جو شخص نہ جہاد کرے نہ جہاد کا ارادہ رکھے تو یہ نفاق کی علامت ہے (صحیح مسلم) اب ان حالات میں یہ بتائیے کہ امتی کون ہے اور امت سے خارج کون ہے؟ بلکہ مختصر اور جامع الفاظ میں آپ نے فرما دیا۔

مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔ — جو میری سنت سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

مطلب یہ کہ جو شخص آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرتا ہے وہی امتی ہے اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ آپ کو ناخوش نہ کرے گا، بتائیے اب حدیث زیر بحث پر کیا اعتراض ہے؟

باب ۱۵

قرآن سے متصادم احادیث

غلط فہمی "حدیث ملاحظہ ہو.....

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ خدا کو ایک مان کر میری رسالت کا اقرار نہ کریں، اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند نہ ہو جائیں اگر وہ ان باتوں کو مان لیں تو پھر میں ان کی جان اور مال سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ ہاں جان و مال میں اللہ کے حقوق کسی طرح ساقط نہیں ہوں گے۔ (بخاری جلد ا صـ)

یہ حدیث کئی طرح سے محلِ نظر ہے:۔

اول:۔ قرآن حکیم نے بدامنی کو روکنے اور مظالم کے انسداد کے لیے جہاد کا حکم دیا ہے نہ کہ قرآن کی تعلیم زبردستی منوانے کے لئے۔" (دو اسلام صـ۲۹۲)

ازالہ اس غلط فہمی کا ازالہ خود برق صاحب کی تحریر میں موجود ہے۔ برق صاحب فرماتے ہیں۔

" قرآن میں بار بار یہی حکم دیا گیا ہے کہ ظالموں، بدعہدوں سے لڑو، لیکن اگر مندرجہ ذیل چار صورتوں میں سے کوئی صورت پیدا ہو جائے تو جنگ ختم کر دو۔

اوّل:۔ جب فتنہ اور بدامنی ختم ہو جائے:۔

دوم:۔ جب دشمن سے صلح ہو جائے۔

سوم:۔ جب وہ جزیہ دینے پر راضی ہو جائے۔

چہادم:۔ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۔ اور اگر وہ توبہ قبول کرنے کے بعد صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو پھر ان کے راستہ سے ہٹ جاؤ۔

(دو اسلام صـ۲۹۲، صـ۲۹۳)

برق صاحب یہ چوتھی وجہ جو آپ نے تحریر کی ہے وہی حدیث مذکور میں ہے، بلا وجہ آپ نے

اس حدیث کو مطلق سمجھ لیا ہے۔ میدانِ جنگ میں اگر کافر مسلم ہو جائیں اور اس کے عملی ثبوت کے لیے نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ایسے لوگوں سے لڑائی بند کرنی ہوگی۔ ہاں اگر وہ صرف دھوکہ دینے کے لئے مسلم ہوں تو حدیث میں اس کی بھی تشریح ہے، یعنی "حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ" اسلامی حکومت ظاہر کی بنا پر ان کو مسلم سمجھے گی اور ان کا اصلی حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔ اسلامی حکومت محض دھوکہ اور نفاق کے اندیشہ سے ان پر کفر کا اطلاق نہیں کرے گی بلکہ اصل معاملہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے گی۔

بالکل اسی طرح قرآنِ مجید میں بھی ہے جو وجہ دوم کے تحت برق صاحب نے لکھا ہے یعنی کافر اگر صلح کرنا چاہیں تو صلح کر لو یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کافروں نے دھوکہ دینے کے لئے صلح کی ہو تو ایسے موقع کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے آگے فرمایا "وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (انفال:۔ ۶۱) (یعنی صلح کر لو) اور اللہ پر توکل کرو ایسا نہ ہو کہ وہ صلح کرنا چاہیں اور تم دغا کے اندیشہ سے صلح نہ کرو۔ بلکہ صلح ان کے ظاہری مطالبہ پر ہی کر لی جائے اور دلوں کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے، حدیث زیرِ بحث میدانِ جنگ ہی کے متعلق ہے ورنہ "حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ" کے الفاظ نہ ہوتے کیونکہ میدانِ جنگ میں ایسا ہو سکتا ہے کہ دشمن دھوکہ دینے کے لئے مسلم ہو جائیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا حساب اللہ لے گا۔ تم ان کے ظاہری ایمان کو تسلیم کر کے لڑائی سے باز آجاؤ۔

برق صاحب قرآنِ مجید کی جو آیت آپ نے وجہ سوم میں نقل کی ہے وہ بھی حدیث مذکور کی تائید کرتی ہے مگر آپ نے اسے پورا نقل نہیں فرمایا۔ پوری آیت اس طرح ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ	ان اہلِ کتاب سے جنگ کرو جو اللہ پر اور قیامت
لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا	کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اللہ اور اس
حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ	کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور
دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	دینِ حق کی پیروی نہیں کرتے پھر ان سے جنگ اس
حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ	وقت تک جاری رکھو جب تک وہ ذلیل ہو کر جزیہ
صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبۃ:۔ ۲۹)	نہ ادا کریں۔

اس آیت میں جنگ جاری رکھنے کی تین وجہیں بتائی گئی ہیں۔

۱۔ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہ لانا۔

۲۔ حرام چیزوں کو حلال سمجھنا۔

۳۔ دینِ حق یعنی اسلام کی پیروی نہ کرنا۔

یعنی جن لوگوں میں یہ تین باتیں نہ ہوں ان سے لڑنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح

کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں سے لڑو اس لئے کہ وہ مسلم نہیں ہیں۔ اب یا تو وہ ان تینوں باتوں کو مان کر مسلم بن جائیں ورنہ جزیہ دینا قبول کریں۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلم کرنے کے لیے لڑنا فرض ہے اور جو کافر قوم اسلام قبول کرنا نہیں چاہتی تو پھر اس کو ذلیل ہو کر جزیہ دینے پر مجبور کیا جائے۔ ان دونوں باتوں میں سے ایک چیز انہیں مجبورًا اختیار کرنی ہوگی۔ یا اسلام یا جزیہ۔ بتائیے یہ آیت کیا کہتی ہے۔ کیا زبردستی مسلم بنانے کی ہدایت نہیں دیتی کیا یہ آیت زبردستی لوگوں کو محکوم بنانے کی ہدایت نہیں دیتی اگر اس میں ان دونوں باتوں کا حکم ہے تو پھر حدیث نے کیا قصور کیا؟ جو اعتراض بظاہر اس آیت پر ہے وہی بظاہر حدیث زیر بحث پر ہے برق صاحب غلط فہمی سے تو آیات میں بھی تصادم پیدا ہو سکتا ہے آخری باب میں اس بات کی قدرے تفصیل ہے کہ قرآنی آیات میں بظاہر کتنا تصادم ہے۔

دوسری آیت سنیئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً (التوبۃ: ۱۲۳)	اے ایمان والو! اپنے گرد و پیش کے کفار سے جنگ کرو اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہیئے۔

برق صاحب اوپر اور نیچے کی آیات پڑھ لیجئے اور پھر بتائیے کہ ان کافروں سے لڑنے کی کیا وجہ ہے؟ کوئی وجہ آپ کو نہیں ملے گی۔ پس اگر حدیثِ مذکور اور قرآنی آیات میں تضاد ہے تو یہ آیت بھی تو قرآن مجید سے ٹکراتی ہے اگر اس کا کوئی صحیح مقام ہے تو وہی صحیح مقام حدیثِ مذکور کا بھی ہے۔

اور سنیئے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التحریم: ۹)	اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

پوری سورۂ تحریم پڑھ جائیے آپ کو جنگ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ملے گی لہٰذا کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ یہ آیت بھی قرآن مجید سے متصادم ہے یا نہیں؟ براہِ کرم احادیث کو بالاستیعاب پڑھئے۔ اور پھر ان کی روشنی میں کسی حدیث کا مطلب سمجھئے، برق صاحب یہ وہ حدیث ہے جس کا ایک جز صحابہ کی موجودگی میں پڑھا گیا، پڑھنے والے "حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ" کہنے والے یعنی عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور جن کے سامنے پڑھی گئی، وہ مرکزِ ملت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، نہ مرکزِ ملت نے یہ کہا کہ میں اس کو منسوخ کرتا ہوں، نہ انہوں نے اور نہ کسی اور صحابی نے یہ کہا کہ یہ تو قرآن مجید کے بھی خلاف ہے یہ صحابہ کرام کی جماعت ہے جو اس حدیث کو تسلیم کرتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کی تعریف

برق صاحب بھی اپنی کتاب میں کر آئے ہیں اور جن کی تعریف قرآن مجید میں موجود ہے جن کو رضی اللہ عنہ کا خطاب دیا گیا۔ جن کے متعلق قرآن مجید کا دعویٰ ہے

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا (الفتح:۔ ۲۶)

اور تقویٰ کو ان کے ساتھ چمٹا دیا گیا ہے اور وہ اس کے زیادہ حق دار ہیں اور اہل بھی۔

برق صاحب جب ان سچے اور اسلام کا صحیح فہم رکھنے والے مسلمین نے اس کو قرآن مجید کے خلاف نہیں سمجھا تو آپ کیوں اس کو خلاف سمجھتے ہیں۔

غلط فہمی

"دوم حضور علیہ السلام نے معاذ بن جبل کو اہلِ بحرین سے جزیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ (بخاری جلد ۲ صہ ۱۳۱) حالانکہ وہ لوگ غیرمسلم تھے اور اس حدیث کی رُو سے ان کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے تھا" (دو اسلام صہ ۲۹۴)

ازالہ

یہ بھی غلط فہمی ہے جہاد کی تو اس وقت ضرورت ہے جب دشمن نہ اسلام قبول کرے، نہ جزیہ دے اور اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دشمن نے جزیہ دینا قبول کر لیا، لہذا جہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

غلط فہمی

"سوم۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ .... انہیں اسلام کی طرف دعوت دو۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہر غیر مسلم کو قتل کر دو اور جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے جنگ جاری رکھو،، (دو اسلام صہ ۲۹۴)

ازالہ

جنگ تو جاری تھی لہذا جنگ جاری رکھنے کی ہدایت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں بحالتِ جنگ آپ نے فرمایا کہ انہیں اسلام کی دعوت دینا، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو اچھا ہے تاکہ جنگ بحسن و خوبی اختتام کو پہنچے اور بلا وجہ خونریزی نہ ہو۔

غلط فہمی

"چہارم۔ مؤطا میں مذکور ہے۔ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر کہنے لگا کہ میں بیعت کو توڑتا ہوں تین مرتبہ یہی التجا دہرائی لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا تو آپ نے فرمایا۔ مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے جہاں خالص دھات باقی رہ جاتی ہے اور کثافت نکل جاتی ہے۔، (مؤطا صہ ۲۵۹)

اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرتد سے جنگ نہیں کی بلکہ خاموش رہے جس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام میں کسی کا مذہب بجبر تبدیل کرنے کی کوئی ہدایت موجود نہیں (دو اسلام صہ ۲۹۴-۲۹۵)

ازالہ

اس حدیث میں یہ کہاں ہے کہ آپ نے اس سے جنگ نہیں کی۔

دوم۔ اس حدیث میں یہ کہاں ہے کہ وہ سلطنت اسلامیہ ہی میں رہا، ہو سکتا ہے کہ وہ دار الحرب میں چلا گیا ہو اور آپ اس پر قادر نہ ہو سکے ہوں اور یہ بالکل قرین قیاس ہے اس لئے کہ اسلامی حکومت اس وقت تک صرف مدینہ ہی تک محدود تھی اور یہ اوائل اسلام کا زمانہ تھا، مدینہ کی آب وہوا خراب تھی اسی وجہ سے اس اعرابی کی صحت بھی خراب ہو گئی اور اس نے بیعت توڑنی چاہی کچھ عرصہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے مدینہ کی آب وہوا اچھی ہو گئی تھی۔

سوم۔ اس حدیث میں جو اصل مضمون ہے وہ برق صاحب نے چھوڑ دیا، اصل مضمون اس طرح ہے کہ اس کو مدینہ کی آب وہوا ناموافق ہوئی تو اس نے مدینہ سے باہر جانا چاہا اور بیعت واپس کرنے کے لئے کہا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ "اَصَابَ الْاَعْرَابِیَّ وَعْکٌ بِالْمَدِیْنَۃِ" یعنی وہ مدینہ میں کسی مرض میں مبتلا ہو گیا (صحیح مسلم باب المدینۃ تنفی شرارہا) پس ثابت ہوا کہ وہ شخص محض مدینہ سے باہر جانا چاہتا تھا لیکن آپ نے اس کی اجازت نہیں دی بلکہ خاموش رہے، حدیث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مدینہ میں رہنے کی بھی بیعت کی تھی، اس بیعت کو توڑ کر وہ چلا گیا، بتائیے اس میں ارتداد کا ذکر ہی کہاں ہے۔

غلط فہمی

"اور یہ حدیث بھی (وضعی ہے) "مَنْ بدل دینہ فاقتلوہ" کہ جو شخص اسلام چھوڑ جائے اسے قتل کر ڈالو" (دو اسلام ص ۲۹۵)

ازالہ

پہلا جواب۔ برق صاحب! کافر کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کرنا بہ از روئے آیت قرآنی ناجائز ہے، کسی مسلم کو اسلام پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرنا از روئے حدیث ضروری ہے یہ دو مختلف مسئلے ہیں، دونوں ایک نہیں، قرآن مجید میں جو کچھ ہے وہ بھی صحیح ہے اور جو کچھ حدیث میں ہے وہ بھی صحیح ہے وہ اپنی جگہ پر اور یہ اپنی جگہ پر لہٰذا تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تصادم وہاں ہوتا ہے جہاں مسئلہ ایک ہو اور حکم دو اور متضاد، یہاں مسئلے دو ہیں لہٰذا حکم بھی دو ہیں۔

پہلا مسئلہ:۔ کافر کو اسلام لانے کے لئے مجبور کرنا،

دوسرا مسئلہ:۔ مسلم کو اسلام پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرنا۔

پہلا مسئلہ:۔ "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ"، کے مطابق ہے اور دوسرا مسئلہ "مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ"، کے مطابق ہے لہٰذا حدیث قرآن مجید کے خلاف نہیں۔

دوسرا جواب

اس حدیث کی صحت کا ایک اور ثبوت بھی ہے اور وہ ہے تاریخی ثبوت، حضرت ابوبکر صدیق

رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے جنگ کی، یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے، اور محدثین کے اصول پر بھی یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، لہٰذا مسئلہ یہی ہوا کہ مرتد سے قتال ضروری ہے۔ اگر آپ اس مسلّمہ واقعہ کا بھی انکار کر دیں تو پھر یہ کہا جائے گا کہ آپ حقائق کا بھی انکار کر دیتے ہیں اور اس کی آپ سے توقع نہیں ہے۔

تیسرا جواب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝
(آلِ عمران:۔ ۷۲)

اور اہلِ کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ صبح کے وقت اس چیز پر ایمان لے آؤ جو ایمان والوں پر نازل کی گئی ہے اور شام کے وقت اس کا انکار کر دو، شاید مسلم بھی اس طریقہ سے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔

یہ بھی اہلِ کتاب کی ایک چال، مسلم ہو جانے کے بعد اگر پھر کوئی شخص دوبارہ کافر ہو جائے تو دوسروں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے، اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اسلام میں کوئی نہ کوئی ایسی خرابی ہے کہ مسلم ہونے کے بعد پھر لوگ اس سے منحرف ہو جاتے ہیں اور خود مسلم بھی یہ گمان کر سکتے ہیں کہ واقعی کوئی ایسی خرابی ہے کہ لوگ مسلم ہو کر پھر کافر ہو گئے، ان کے ایمان میں بھی تزلزل کا اندیشہ ہے اور کافروں کے مسلم نہ ہونے کا بھی خطرہ ہے اور یہ چیز اسلامی معاشرہ کے لئے بڑی خطرناک ہے اس سے اسلام کی ترقی رک جاتی ہے اور اگر کہیں مسلم ہو کر کافر ہو جانے والا شخص ذی حیثیت اور ذی علم ہو، تو پھر اس کا بہت ہی برا اثر پڑتا ہے۔ لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ اتنا بڑا آدمی، اتنا بڑا عالم جب اسلام سے برگشتہ ہو گیا تو ضرور کوئی مخفی خرابی ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام سے منحرف ہو گیا، یہ خطرہ کا بہت ہی خوفناک پہلو ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس سازش کی اطلاع اس آیت میں دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دینی قانون نافذ کر دیا کہ،

مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ (صحیح
بخاری، کتاب استتابۃ المرتدین)

جو مرتد ہو جائے اسے قتل کر دو۔

سازش کرنے والوں کے حوصلے پست ہو گئے اور اسلام ترقی کے مراحل طے کرتا چلا گیا، یہ ہے حدیث کا پس منظر، کتنا معقول قانون ہے اس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے معلوم نہیں اس قابلِ فخر قانون کو برق صاحب کیوں نہ سمجھ سکے اور کیوں اس کی افادیت کا اندازہ نہ لگا سکے، کافروں کی گہری

سازشوں کے سدباب کے لیے یہی قانون ہے۔ فللّٰہ الحمد۔

یہ خطرہ اسلام اور اسلامی معاشرہ کو ہر وقت درپیش ہے لہٰذا حدیث مذکور میں بیان کردہ یہ قانون بھی غیر متبدل ہے، اگر یہ قانون نہ ہو تو ارتداد کے دروازے کھل جاتے ہیں اس قانون نے ہمیشہ کے لئے ارتداد کا خاتمہ کر دیا اور اسلام کو تمام خطروں سے بچا لیا، یہ ہے اس حدیث کا سیاسی و نفسیاتی جائزہ۔

چوتھا جواب

کسی وقت بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن عناصر کسی مسلم کا ایمان خرید لیں یا دوسرے مذاہب کی تبلیغی جماعتیں محض روپیہ کے بل بوتے پر مسلمین کو مرتد کرنے لگ جائیں جیسا کہ آجکل ہمارے ملک میں ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں اس فتنہ کے انسداد کے لئے بھی ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کے پاس کوئی غیر متبدل قانون ہو جو اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے اور یہی وہ قانون ہے جو حدیث مذکور کی صورت میں ہمیں دیا گیا ہے، یہ ہے اس کا دینی پہلو۔

پانچواں جواب

اسلام ایک عسکری نظام ہے خانقاہی نظام نہیں ہے مسلمین کا بچہ بچہ اسلامی فوج کا سپاہی ہے، یہاں آپ کے کان تلواروں کی جھنکار سنیں گے، اور آپ کی آنکھ غازیوں کے جھرمٹ دیکھے گی جو شہادت کی لازوال دولت حاصل کرنے کے لئے جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود رہے ہیں، یہاں وہ پروانے نظر آئیں گے جو کسی کے جمال جہاں آرا پر رہ رہ کر قربان ہو رہے ہیں، برق صاحب آپ کے نزدیک تو جہاد ہی روح اسلام ہے لہٰذا اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا جائے گا وہ تو آپ کو پسند ہونا ہی چاہیئے۔ یہ تو صحیح ہے، کہ حکومت کسی شہری کو زبردستی فوج میں شامل نہیں کرتی اور یہ " لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ " کا ایک منظر ہے لیکن جب کوئی شخص خود فوج میں شامل ہو جاتا ہے تو پھر وہ خود فوجی خدمات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، اور اگر وہ خود فوجی خدمات سے علیحدگی اختیار کرے اور کسی فوجی ضابطہ کو ماننے سے انکار کر دے تو حکومت کا فوجی قانون اس کو برداشت نہیں کر سکتا، حکومت فوراً اس کو سزائے موت دے گی اور یہ " مَنْ بَدَّلَ دِیْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ "، کا منظر ہے۔

بالکل اسی طرح اسلام ایک فوجی نظام ہے، حکومت الٰہیہ کسی کو اس بات پر تو مجبور نہیں کرتی کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائے لیکن جب کوئی شخص خود بخود اس فوجی نظام میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو پھر اس کو علیحدگی کا اختیار باقی نہیں رہتا اور اگر کوئی شخص خود علیحدگی اختیار کرے تو اس کی سزا عام دنیاوی قانون کے لحاظ سے بھی اور دینی قانون کے لحاظ سے بھی موت کے سوا کچھ نہیں لہٰذا اس اسلامی عسکری نظام میں سے جس وقت بھی کوئی شخص نکلے گا اس کو موت کی سزا دی جائے گی، یہ ملازمت کی طرح عارضی چیز نہیں، بلکہ

یہ چیز دائمی ہے اور مسلم عہد سے لے کر لحد تک اسلام کا ایک سپاہی ہے وہ کسی وقت بھی خود اپنے آپ کو اس فوجی نظام سے علیحدہ نہیں کر سکتا اور کیونکہ فوج کا سپاہی مقررہ میعاد تک کے لیے ملازم ہوتا ہے، اس میعاد کے بعد حکومت اس کو علیحدہ کر دیتی ہے اور اگر وہ علیحدہ نہ کرے تو اس کا بھی اس کو اختیار ہے مطبیک اسی طرح جو شخص ایمان لا کر اسلامی عسکری نظام میں شامل ہو جاتا ہے وہ اپنی پوری زندگی اسلام کی وفاداری میں گذارنے کا عہد کر لیتا ہے لہذا اس مقررہ میعاد میں وہ خود علیحدگی اختیار کرنا تو کجا اگر وہ علیحدہ ہونے کی درخواست بھی کرے تو حکومتِ وقت کو اختیار ہے کہ اسے علیحدگی کی اجازت نہ دے، اس اختیار کے استعمال پر اعتراض صحیح نہیں۔

فوجی ملازمت کیونکہ عارضی ہوتی ہے لہذا حکومت سوچ سکتی ہے کہ اب فلاں سپاہی کو سبکدوش کر دیا جائے تو مضائقہ نہیں لیکن اسلامی فوج کی رکنیت عارضی نہیں بلکہ دائمی ہوتی ہے۔ لہذا حکومت کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کسی اسلامی سپاہی کو فوجی رکنیت سے علیحدہ کر دے، جو شخص اسلامی فوجی نظام میں داخل ہوتا ہے وہ اس معاہدہ کی پابندی کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ اب موت تک اس نظام سے وابستہ رہے گا اگر وہ اس معاہدہ کے ساتھ آنا نہیں چاہتا تو نہ آئے اس پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جب وہ آئے گا تو پھر اپنے معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور اگر کریگا، تو یقیناً موت کی سزا پائے گا۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرتد کو بہ حیثیت ایک ذمّی کے برداشت کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص فوج میں داخل نہ ہو شہری کی حیثیت سے رہ سکتا ہے وہ جہاں چاہے جائے آئے اس پر کوئی پابندی نہیں لیکن فوج میں داخل ہونے کے بعد اس کو اس قسم کی آزادی نہیں رہتی۔ وہ ایک ضابطہ کا پابند ہوتا ہے وہ فوجی اسرار سے واقف ہوتا ہے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، ذمی محض ایک شہری ہے اور مسلم ایک سپاہی ہے جو شخص مسلم ہے وہ گویا اسلامی فوج کے اسرار سے بھی واقف ہے اور جو ذمّی ہے وہ اسلامی فوج کا رکن بن ہی نہیں سکتا، لہذا وہ فوجی اسرار سے واقف بھی نہیں ہو سکتا لہذا کسی ایسے شخص کا جو فوجی اسرار سے واقف ہو، خود فوج سے نکل جانا بڑا اہم معاملہ ہے، یہ بغاوت کے مترادف ہے وہ شخص اسلامی عسکری ضابطہ کا انکار کرتے ہی دوسری صف میں کھڑا ہو گیا وہ کسی وقت بھی اسلامی نظام کے لئے خطرہ بن سکتا ہے لہذا اسلامی نظام کی بقا کی خاطر اس کا قتل ضروری ہو جاتا ہے اور یہی اس حدیث کا عسکری و سیاسی پہلو ہے، برق صاحب حدیث کیا ۔۔۔ ہے بہا ہے اسی قسم کے جواہر ہیں جو امام بخاری، امام مسلم وغیرہ نے اپنی کتابوں میں جمع کر دیے ہیں ان کی قدر

وہی کر سکتا ہے جو اس کا قدر دان ہو "قدر گوہر شاہ بداند یا بداند جوہری"، کیونکہ بمصداق "ہمارا تمہارا اللہ بادشاہ" اور بفحوائے حدیث پاک " لَا مَلِكَ اِلَّا اللّٰهُ"، کوئی بادشاہ نہیں سوائے اللہ کے، (صحیح مسلم) آپ بادشاہ تو بن نہیں سکتے، لہذا جوہری بننے کی کوشش کیجئے اور اگر جوہری بھی نہیں بن سکتے تو پھر کسی جوہری سے پوچھ لیا کیجئے مگر افسوس جو جوہری آپ کو ملا وہ آپ کا اصطلاحی ملا تھا۔

برق صاحب ایمان بالغیب، ایمان باللہ، ایمان بالرسول کا تقاضہ یہی ہے کہ جو کچھ ہمیں اللہ کی طرف سے بذریعہ رسول ملے، اس پر ایمان لائیں، اپنی عقلوں کو معیار نہ بنائیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو پھر ہمارا ایمان رسول پر نہ ہوا بلکہ عقل پر ہوا پھر عقلیں ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ ہیں ایک ہی بات کسی کی عقل میں آتی ہے اور کسی کی عقل میں نہیں آتی لہذا کسی ایک کی عقل کو معیار نہیں بنایا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ کسی حکم کی مصلحت کسی بھی شخص کی سمجھ میں نہ آئے لیکن اس کے باوجود ہمیں اس حکم کو تسلیم کرنا ہوگا اس لئے کہ وہ حکم اس ہستی کی طرف منسوب ہے جو مخفی مصالح سے واقف ہے، جہاں انسانی عقول کی رسائی نہیں ہو سکتی، ہمارا صرف اتنا فرض ہے کہ ہم یہ دیکھ لیں کہ جو حکم ہم تک پہنچ رہا ہے اس کا ذریعہ کیا ہے، اگر ذریعہ صادق القول معتبر، پرہیزگار لوگوں کا ہے تو پھر ہمیں اس کو تسلیم کرنا ہوگا، محض عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اس کا انکار کر دینا شکست خوردہ ذہنیت ہے، احساس کمتری و بے ایمانی ہے یا شقاق اور ہٹ دھرمی اور ہم چنیں دیگرے نیست کے سوا کچھ نہیں۔

باب ۱۶

غلامی اور اسلام

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"لارڈ ہیڈلے فاروق جب مسلمان ہوئے تو آپ نے انگلستان کی مسجد میں اسلام پر ایک تقریر کی جس میں اسلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں کہا :-

"قرآن میں ایک نقص بھی ہے کہ وہ حکومت کرنے کے تو سب گر بتاتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ اگر مسلمان غلام ہو جائے تو وہ کیا کرے، سارے قرآن میں غلام مسلمان کے لئے ایک ہدایت موجود نہیں۔"

بدیگر الفاظ لارڈ فاروق یہ کہہ گئے کہ قرآن جہاں بانوں کا دستور العمل ہے۔ نہ کہ غلاموں کا"

(دو اسلام ص ۲۹۶)

ازالہ

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں نہ غلاموں اور لونڈیوں کا تذکرہ ہے، نہ ان کے متعلق احکام ہیں جو کچھ ہے بس حدیث میں ہے لہٰذا حدیث ہی قابلِ اعتراض ہے لیکن اس میں برق صاحب کی زبردست غلط فہمی ہے بلکہ خوش فہمی ہے۔ لارڈ ہیڈلے نے بھی قرآن مجید کا سرسری مطالعہ کیا اور اسی طرح برق صاحب نے بھی، ورنہ قرآن مجید کا عالم ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے اب میں غلامی کے سلسلہ میں قرآنی آیات پیش کرتا ہوں، سنیئے :-

(۱) وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ (البقرۃ:۱۷۷)

نیکی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں مال خرچ کرے، اقرباء کو دے، یتامیٰ، مساکین مسافر اور سائلین کو دے اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلم غلام ہو سکتا ہے اور اس کو آزاد کرانے میں روپیہ خرچ کرنا نیکی ہے

اور یہ بھی انفاق فی سبیل اللہ کی ایک مد ہے :۔

۲۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ

(البقرۃ :۔ ۱۷۸)

اے ایمان والو! تم پر قتل کے معاملہ میں قصاص فرض کردیا گیا ہے، آزاد کے بدلے میں آزاد (قاتل) قتل کیا جائے، غلام کے بدلے میں غلام (قاتل) کو قتل کیا جائے اور عورت کے بدلہ میں قاتلہ کو قتل کیا جائے۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ قتل تو کرے آزاد اور سزا میں کسی غلام کو قتل کردیا جائے، یہ تفریق اسلام میں نہیں، جو قتل کرے وہی سزا بھگتے، اس آیت سے ثابت ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں غلام ہو سکتے ہیں اور ان کے لئے قانونِ قصاص وہی ہوگا جو آزاد مرد و عورت کے لئے ہے۔

۳۔ وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى یُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَتّٰى یُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ

(البقرۃ :۔ ۲۲۱)

مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو، جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ مؤمنہ لونڈی بہتر ہے مشرکہ سے اگرچہ وہ مشرکہ تم کو اچھی ہی کیوں نہ معلوم ہو، اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو، جب تک وہ مؤمن نہ ہو جائیں، مؤمن غلام بہتر ہے مشرک سے اگرچہ وہ مشرک تم کو اچھا ہی کیوں نہ معلوم ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلم معاشرہ میں مسلم لونڈیاں یا مسلم غلام ہو سکتے ہیں۔ اور ان سے آزاد مرد و عورت کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ

(النسآء :۔ ۳)

اگر تمہیں یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، نکاح کر لو، دو سے، تین سے، چار سے، اگر یہ اندیشہ ہو کہ بیویوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا لونڈی رکھ لو۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ لونڈیاں رکھی جا سکتی ہیں، ان سے صحبت کی جا سکتی ہے، ان کے درمیان مساوات رکھنا بھی لازم نہیں ہے :۔

۵۔ وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا

تم میں سے جن لوگوں کو آزاد مؤمنہ عورتوں سے نکاح کا مقدور

اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النسآء: ۲۵)

ہو وہ مومنہ لونڈیوں سے نکاح کر لیں، اللہ کو تمہارے ایمان کا خوب علم ہے، بعض تمہارے بعض سے ہیں یعنی تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، ان لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کیا کرو اور قاعدہ کے مطابق ان کا مہر بھی دیا کرو وہ لونڈیاں پاک دامن رہیں، خفیہ یا علانیہ بدکاری نہ کریں، پھر جب وہ منکوحہ بن جائیں، اور کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں تو ان کو آزاد عورتوں کی سزا کی نصف سزا دی جائے۔

اس آیت سے بھی ثابت ہوا کہ مسلم معاشرہ میں لونڈیاں ہو سکتی ہیں ان کے آقا ہی ان کے نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، ان لونڈیوں کو مہر بھی دینا چاہیئے وہ اگر زنا کریں تو ان کو نصف سزا دی جائے۔

کیا اب بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید لونڈی غلاموں کے احکام سے خاموش ہے۔

۶۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ . . . . وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النسآء: ۲۳، ۲۴)

تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں ..... اور شوہر والی عورتیں بھی حرام ہیں مگر لونڈیاں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں (یعنی وہ لونڈیاں جو میدان جنگ میں گرفتار ہو جائیں اور ان کے کافر شوہر دار الحرب میں زندہ ہوں)

۷۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا . . . . . . وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ (النسآء: ۳۶)

اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی قسم کا شرک مت کرو، والدین کے ساتھ احسان کرو... اور لونڈی غلام کے ساتھ بھی احسان کرو۔

۸۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (المعارج: ۲۹، ۳۰)

اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے بیویوں اور لونڈیوں کے، کہ ان کے ساتھ صحبت کرنے میں وہ ملامت کے مستحق نہیں۔

۹۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ

مؤمن عورتوں سے کہہ دیجیئے کہ اپنی نگاہیں

مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ	نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں
..... وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ	... اور اپنی زینت کو کسی پر ظاہر نہ کریں، سوائے
اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ	اپنے خاوندوں کے یا اپنے باپوں کے یا خاوند
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ	کے باپوں کے ... یا اپنے غلاموں کے۔

(النور :- ۳۱)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلم عورتیں اپنے غلاموں کے سامنے اپنی زینت کا اظہار کر سکتی ہیں، ان سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

۱۰۔ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (النور :- ۳۳)	دنیا کمانے کی غرض سے اپنی لونڈیوں کو زناکاری پر مجبور نہ کرو، خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ لونڈیاں پاک دامن رہنا چاہیں۔
۱۱۔ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ	اور جو لونڈی غلام مکاتب بننا چاہیں تو ان کو مکاتب بنا لیا کرو بشرطیکہ تم یہ سمجھو کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور اللہ کے دئے ہوئے مال میں سے ان مکاتبین کو بھی دیا کرو

(النور :- ۳۳)

۱۲۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ۔	اور جو غیر شادی شدہ ہوں ان کا نکاح کر دیا کرو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو صالح ہوں ان کا بھی نکاح کر دیا کرو۔

(النور :- ۳۲)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مؤمن لونڈی، غلام کو صالح ہونا چاہیئے اور یہ کہ صالح مؤمن بھی غلام ہو سکتا ہے، برق صاحب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غلاموں کو اپنے آقا کا عبد کہا ہے، اگر یہی بات حدیث میں ہوتی تو کیا ہوتا؟ کیا کہنے والا یہ نہ کہہ دیتا کہ کیونکہ یہ حدیث شرک کی تعلیم دیتی ہے لہٰذا یہ موضوع ہے جعلی ہے، بتائیے اب اس آیت کے متعلق کیا کہا جائے۔

۱۳۔ وَلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ .... اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ	کوئی حرج نہیں اگر تم اپنے گھروں میں سے کھاؤ یا اپنے باپوں کے گھروں میں سے کھاؤ ... یا ان کے گھروں میں سے کھاؤ جن کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہوں۔

(النور :- ۶۱)

۱۴۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ	بے شک فلاح پائی ان مومنین نے جو اپنی نماز

هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ ..... وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ (المومنون ۱، ۲تا۶)

میں عاجزی کرتے ہیں... اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے بیویوں اور لونڈیوں کے کہ ان کے بارے میں انہیں کوئی ملامت نہیں۔

۱۵۔ وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِن نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا (المجادلة ۱، ۳)

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اس کی تلافی کرنی چاہیں تو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا چاہیئے۔

۱۶۔ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۔ (المائدة ۱۔ ۸۹)

جو شخص قسم کھالے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مساکین کو اوسط درجہ کا کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے۔

غرض یہ کہ قرآن مجید میں اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں جن میں لونڈی غلاموں کے متعلق احکام بیان کئے گئے ہیں، چند آیات بطور نمونہ اوپر نقل کی گئی ہیں، ان آیات سے مندرجہ ذیل احکام نکلتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ لونڈی، غلاموں کی آزادی کے لئے روپیہ خرچ کرنا نیکی ہے۔
۲۔ اگر غلام کسی کو قتل کردے تو وہ غلام ہی قتل ہوگا نہ کہ آزاد آدمیوں میں سے کوئی دوسرا شخص۔
۳۔ مسلم، لونڈی غلام ہوسکتے ہیں اور ان سے آزاد مرد و عورت نکاح کرسکتے ہیں۔
۴۔ جنگ میں گرفتار ہونے والی لونڈیوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے اور ان میں مساوات کرنا لازمی نہیں، نہ ان کی تعداد مقرر ہے۔
۵۔ لونڈیوں سے صحبت کی جاسکتی ہے اگرچہ وہ شوہر والی ہوں اور شوہر ان کے دار الحرب میں ہوں۔
۶۔ مسلم لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔ لونڈیوں کو مہر بھی دینا چاہیے۔
۷۔ لونڈی، غلام اگر زنا کریں تو ان کو نصف سزا ملے گی۔
۸۔ لونڈی، غلاموں کے ساتھ نیکی کرنی چاہیئے۔
۹۔ آزاد عورتیں اپنے غلاموں کے سامنے آسکتی ہیں۔

۱۰۔ لونڈیوں کو دنیا کمانے کے لئے زنا پر مجبور کرنا منع ہے، خصوصاً جبکہ وہ پاک دامن رہنا چاہیں۔

۱۱۔ لونڈی غلام کو مکاتب بنانا چاہیئے بشرطیکہ اس میں بہتری ہو۔

۱۲۔ صالح لونڈی، غلام کا نکاح کر دینا چاہیے۔

۱۳۔ مالک اپنے غلاموں کے گھروں میں سے بغیر اجازت کھا پی سکتے ہیں۔

۱۴۔ ظہار، قتل خطاء اور قسم کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا فرض ہے، وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ کہ اتنے احکام موجود ہوتے ہوئے یہ دعوٰی کرنا کہ قرآن مجید میں مسلم لونڈی اور مسلم غلام کے وجود کا سرے سے ذکر ہی نہیں بڑی زبردست غلط فہمی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلم دوسرے مسلم کا غلام تو ہو سکتا ہے اور اس کا وجود بے شک قرآن مجید سے ثابت ہے لیکن ایک مسلم ایک کافر کا غلام نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قرآن مجید، آقاؤں کا دستور العمل ہے نہ کہ غلاموں کا (دو اسلام ص۲۹۶) مطلب یہ کہ کوئی مسلم کبھی محکوم ہو ہی نہیں سکتا، وہ ہمیشہ حاکم ہوگا، اور کافر محکوم اور اس وجہ سے قرآن مجید میں ایسا کوئی حکم نہیں کہ مسلم اگر غلام ہو اور کافر آقا ہو، تو وہ کیا کرے اس کا جواب سنیئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۱) وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ یَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (یوسف: ۲۱)	جس شخص نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا، اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کو اچھی طرح رکھنا شاید یہ ہمارے کام آئے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں۔

ظاہر ہے کہ یوسف علیہ السلام فروخت ہوئے اور عزیز مصر کے ہاں بہ حیثیت غلام کے رہے کیونکہ قرآن مجید سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عزیز مصر نے ان کو بیٹا بنایا تھا پھر کیا ہوا سنیئے:۔

۲۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (یوسف: ۲۲)	اور جب وہ جوان ہوئے تو ہم نے ان کو علم و حکمت عطا فرمائی (یعنی نبوت سے سرفراز فرمایا)

اس کے بعد اس عورت کے عاشق ہونے کا قصہ شروع ہوتا ہے پھر کیا ہوا سنیئے:۔

۳۔ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ (یوسف: ۳۰)	شہر کی عورتوں نے کہا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام سے خواہش کرتی ہے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ وہ غلام تھے ورنہ عورتیں ان کو بیٹا کہتیں۔

۴۔ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ۝ (یوسف:۳۹)	یوسف علیہ السلام نے کہا، اے قید خانہ کے ساتھیو! کیا کئی متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اللہ زبردست۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام قید خانہ میں بھی رہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک مؤمن کافروں کے ہاں قید ہو سکتا ہے۔

۵۔ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ۝ (یوسف:۵۵)	یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے ملک کے خزانوں پر مامور کر دیجئے، میں حفیظ اور امین ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مؤمن، کافر حکومت کا ملازم بھی ہو سکتا ہے۔

خلاصہ

آیات بالا کا خلاصہ یہ ہوا کہ مؤمن غلام بھی ہو سکتا ہے، قیدی بھی ہو سکتا ہے اور محکوم بھی، مؤمن غلام اور مؤمن قیدی کے متعلق ان آیات کی روشنی میں مندرجہ ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ مؤمن اگر غلام ہو جائے تو صالح زندگی گذارے، آقا کا وفادار رہے، خیانت نہ کرے، اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر رہے۔

۲۔ مؤمن اگر کافروں کے ہاں قید ہو جائے تو ایسے مقام میں بھی تبلیغ کرتا رہے۔

۳۔ مؤمن اگر محکوم ہو جائے تو امانت داری سے اپنے حاکم کے کام کی نگرانی کرے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے عزیز مصر مسلم ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ محض امکان سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی اگر وہ مؤمن تھا تو ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ہی ایمان لایا ہو گا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو نا ممکن ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کو غلام رکھے یا قیدی، اور اگر وہ کسی دوسرے پیغمبر پہ ایمان رکھتا تھا اور ان کی پیغمبری کا منکر تھا تو بھی وہ کافر ہوا، اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت تک یوسف علیہ السلام نبی نہیں ہوئے تھے تو پھر یہ بتایئے کہ وہ کب نبی بنائے گئے قرآن مجید سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ جوان ہوتے ہی حکم اور علم دے دئے گئے تھے اور یہ نبوت کے خصائص میں سے ہے، خصوصاً حکم تو صرف نبوت ہی کا خاصہ ہے نہ کہ مؤمن کا، قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ دونوں الفاظ صرف انبیاء

کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔ الغرض نبوت کے لیے ہی اس عورت کے عشق اور یوسف علیہ السلام کے قید و بند کی کہانی شروع ہوتی ہے پھر تاریخ سے جس کو برق صاحب مستند سمجھتے ہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عزیز مصر بت پرست تھا اس کے مکان کے ایک طاق میں بت رکھے رہتے تھے جب اس کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو زنا کے لئے بلایا تھا تو اپنے بتوں پر پردہ لٹکا دیا تھا لہٰذا یہ شبہ کہ عزیز مصر مسلم تھا لغو ہے، پھر قرآن مجید سے بھی اس کا کافر ہونا ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَھُمْ بِالْاٰخِرَةِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ (یوسف ۱۰۔ ۳۷، ۳۸)

یوسف علیہ السلام نے فرمایا میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ یہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ میں تو اپنے آباؤ اجداد ابراہیم، اسحاق، یعقوب کی ملت کی پیروی کرتا ہوں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ پوری قوم کافر تھی۔

دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ

دوسرا شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ شاہِ مصر مسلم ہو تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ۔ (یوسف ۱۰۔ ۷۶)

یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو اس بادشاہ کے دین کے مطابق قید نہیں کر سکتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کا قانون چل رہا تھا ورنہ یہ کہا جاتا کہ یوسف علیہ السلام کو جو شریعت دی گئی تھی اس کے مطابق وہ اپنے بھائی کو قید نہیں کر سکتے تھے پھر وہ قانون بادشاہ کی طرف منسوب نہ ہوتا، بلکہ اللہ کی طرف منسوب ہوتا، دوسرے یہ کہ اس صورت میں یوسف علیہ السلام اپنی منزل من اللہ شریعت کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتے تھے۔

قرآن مجید سے مومنین کے قیدی ہونیکا دوسرا ثبوت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّھُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ

اے رسول، کیا آپ نے بنی اسرائیل کی اس جماعت کو نہیں دیکھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک سپہ سالار مقرر کر

سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا

(البقرۃ :- ۲۴۶)

دیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں، نبی نے فرمایا جہاد فرض کر دینے کے بعد ڈر ہے کہ تم جہاد نہ کرو، کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کے راستہ میں نہ لڑیں، حالانکہ ہم اپنے وطن سے نکالے گئے اور ہماری اولاد ہم سے چھین لی گئی۔

یہ مؤمنین کی اولاد جو کفار کے قبضہ میں رہ گئی تھی کیا یہ وہاں جہانبانی کرتی تھی یا جہانداری؟ اگر مغلوب و مقہور تھے تو اسلام پر عمل کرتے تھے یا نہیں؟ ان کے متعلق قرآن مجید کیا ہدایت دیتا ہے اگر کوئی ہدایت نہیں دیتا تو پھر بتایئے کہ قرآن مجید ایک مکمل ضابطہ حیات ہے یا نہیں۔

تیسرا ثبوت

اب بھی اگر کچھ شبہ رہ گیا ہو تو اور سنیئے :-

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ

(النسآء :- ۹۲)

جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کو ایک مؤمن غلام آزاد کرنا چاہیئے اور اس کے ورثاء کو پورا فدیہ دینا چاہیئے۔ ہاں اگر وہ معاف کر دیں تو خیر، پھر اگر مقتول دشمن قوم سے ہو۔ لیکن مؤمن ہو، تو بھی ایک مؤمن غلام آزاد کرنا چاہیے، اور اگر مقتول کسی معاہد قوم سے ہو تو بھی ایک مؤمن غلام آزاد کرنا ہوگا، اور پورا فدیہ ادا کرنا ہوگا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ :-

۱۔ مؤمن غلام بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ مؤمن، دشمن و کافر قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے۔

۳۔ مؤمن کسی معاہد کافر قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دشمن قوم کا فرد تو وہی ہوگا جو دارالحرب میں رہتا ہو، جہاں اسلامی حکومت

نہ ہو بلکہ وہاں کی حکومت، اسلامی حکومت سے برسرِ پیکار رہتی ہو تو اب بتائیے وہ مؤمن جو دارالحرب میں کافروں کی حکومت کے ماتحت رہتا ہے مؤمن ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا وہ وہاں جہانبانی کرتا ہے یا محکوم بن کر غلامی کے دن گذارتا ہے اگر محکوم بن کر غلامی میں اپنی زندگی گذارتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ مؤمن کبھی محکوم ہو ہی نہیں سکتا نہ مؤمن کو قرآن مجید محکومیت سکھاتا ہے، بلکہ جہانبانی ہی جہانبانی سکھاتا ہے کتنی بڑی غلط فہمی ہے یہ چیز خوش نما تو ضرور ہے لیکن اس کا وجود ہمیشہ ممکن نہیں، کیا مسلم ہمیشہ حاکم ہی ہوتا ہے محکوم ہو ہی نہیں سکتا؟ اس آیت کی روشنی میں اور سورۂ یوسف وغیرہ کی روشنی میں یہ عقیدہ ہی سرے سے باطل ہے جو چیز آپ کو حدیث میں نظر آئی وہی قرآن مجید میں بھی موجود ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ کسی حدیث میں کسی مؤمن کے کافر کا محکوم یا غلام ہونے کا ذکر نہیں ہے برخلاف اس کے قرآن مجید میں مؤمن کے کافر کا غلام اور محکوم ہونے کی صراحت ملتی ہے۔ اگر حدیث قابلِ اعتراض ہے تو قرآن مجید کا مطالعہ فرمائیے تاکہ حدیث پر سے اعتراض خود بخود رفع ہو جائے۔

چوتھا ثبوت

اس سلسلہ میں ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۙ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلَا یَھْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ۙ فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ وَکَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۔ (النساء:۔ ۹۷ تا ۱۰۰)	جب فرشتے ایسے لوگوں کی روح قبض کرتے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے تو کہتے ہیں تم کس حالت میں تھے وہ کہتے ہیں ہم ملک میں کمزور تھے فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر کے چلے جاتے، بس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے مگر ایسے کمزور مرد، عورتیں، بچے جو کسی تدبیر پر قادر نہ ہوں، نہ ہجرت کی ان کے لئے کوئی سبیل ہو تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلم مغلوب ہو سکتا ہے اور ایسی حالت میں محکوم و مقہور بن کر رہ سکتا ہے، برق صاحب اس آیت پر آج کل کیسے عمل ہو سکتا ہے وہ کون سی جگہ ہے جہاں ہجرت کر کے جائیں اور پوری شریعت پر عمل کر سکیں، اور مزید برآں جہانبانی کے فرائض بھی انجام دے سکیں۔

دوسری بات یہ بھی غور طلب ہے کہ لارڈ ہیڈلے نے مسلم ہو کر کس ملک کی حکمرانی کی ؟ کہاں جہانبانی کی اور اگر وہ مسلم ہو کر بھی کافر حکومت کے محکوم بن کر رہے تو پھر مسلم ہونے سے فائدہ کیا ہوا ؟ مسلم تو محکوم ہوتا ہی نہیں، اب یا تو وہ کافر ہی رہے ان کا ایمان قبول کرنا عبث رہا اور یا یہ کہا جائے کہ ایک مسلم محکوم بھی ہو سکتا ہے ؟ کاش لارڈ ہیڈلے اس کا جواب دیتے ۔

غلط فہمی

"آج سے تیرہ سو برس پہلے شہنشاہان روما بھی اس قسم کے وسائل سے کام لیتے تھے۔ انہوں نے بیشمار علماء خرید رکھے تھے جن کا کام احادیث تراشی تھا" (دو اسلام صہ ۲۹۸)

ازالہ

یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، برق صاحب نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو محدثین نے کسی احادیث تراش کو نہیں چھوڑا۔ ہر ایک کی نشاندہی کر دی ہے براہ کرم فنونِ حدیث کا گہرا مطالعہ کیجیے۔

غلط فہمی

للعبد الصالح ..... ایک نیک غلام دگنے اجر کا مستحق ہے۔ اللہ کی قسم اگر جہاد و حج مانع نہ ہوتے تو موت تک غلام رہنا پسند کرتا۔

تو گویا یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ بہترین زندگی دوسروں کی غلامی ہے۔ یعنی ان کے پنکھے کھینچنا اور لکڑیاں کاٹنا ...... لوٹے صاف کرنا ..... لعنت ایسی زندگی پر" (دو اسلام صہ ۲۹۸ - ۲۹۹)

ازالہ

اس حدیث کو سمجھنے میں برق صاحب کو دو مغالطہ ہوئے پہلا مغالطہ تو یہ کہ جو الفاظ راوی حدیث کے تھے ان کو برق صاحب نے حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا دیا۔ دوسرا مغالطہ یہ کہ راوی کا جو منشاء تھا اسے صحیح طور پر سمجھ نہ سکے۔

پہلا مغالطہ

یہ قول کہ " اللہ کی قسم اگر جہاد و حج مانع نہ ہوتے تو میں موت تک غلام رہنا پسند کرتا،" حدیث نہیں ہے بلکہ راوی کا قول ہے صحیح مسلم میں راوی کا قول ہونے کی صراحت موجود ہے، کاش برق صاحب تحقیق کر لیتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

دوسرا مغالطہ

راوی حدیث نے ایسا کیوں کہا ؟ اس سلسلہ میں کچھ احادیث سنیئے ۱۔

۱۔ غلام سے اتنا ہی کام لیا جائے جتنی وہ طاقت رکھتا ہو۔ (صحیح مسلم)

۲۔ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں پس غلام کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو اس کو تکلیف دہ کام کرنے کے لئے نہ کہو، اگر کہو تو اس کی مدد کرو (صحیح بخاری و صحیح مسلم) گویا اس مشکل کام میں آقا اور غلام دونوں شریک ہوں۔

۳۔ جب خادم کھانا لے کر آئے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ (صحیح مسلم)

۴۔ غلام اگر اپنے مالک کی خیر خواہی کرے، اور اللہ کی عبادت اچھی طرح کرے تو اس کو دوہرا ثواب ہے (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

۵۔ جو شخص غلام کو طمانچہ مارے اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دے (صحیح مسلم)

۶۔ حضرت ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا میں نے کہا یہ اللہ کے لئے آزاد ہے، آپ نے فرمایا اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ میں جلتے (صحیح مسلم)

۷۔ ایک شخص نے پوچھا کہ خادم کو کتنی مرتبہ معاف کیا جائے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنہ)

۸۔ اگر غلام سے نباہ نہ ہو سکے تو اس کو بیچ دو اور اللہ کی مخلوق کو تکلیف نہ دو۔ (ابوداؤد، و رواۃ ثقات۔ تقریب)

یہ ہیں غلاموں کے حقوق، مسلمین نے ان پر عمل کر کے دکھایا، غلام اپنے مالکوں سے اتنی محبت کرنے لگے کہ آزاد ہو جانے کے باوجود انہوں نے اپنے مالکوں کو نہیں چھوڑا۔ ان ہی کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر مسلم ناز کر سکتے ہیں یہ ہے ان کا ضابطہ جس ضابطہ کے ماتحت وہ غلاموں کو رکھتے ہیں۔ کیا کوئی اور ایسی قوم ہے جو اس ضابطہ احادیث کے موافق اپنا ضابطہ بنا سکے اور پھر اس پر عمل بھی کر کے دکھا دے، افسوس جو چیز احادیث میں قابل فخر ہے آپ اسی پر اعتراض کرتے ہیں، غلاموں کا وجود آپ کو اچھا معلوم نہیں ہوتا، بالکل صحیح۔ ٹھیک اسی طرح اسلامی شریعت کو بھی غلاموں کا وجود اچھا معلوم نہیں ہوتا، اور اسی لئے شریعت نے موقع بموقع غلاموں کا آزاد کرنا فرض کر دیا۔ اور دیگر مواقع پر ترغیب دے کر اس کو بہت ہی بڑا نیک عمل بنا دیا۔ ان کو آزاد کرنے کی فضیلت میں بکثرت احادیث موجود ہیں:۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہوا کہ:۔

۱۔ غلام اگر نیک اور صالح ہو تو اسے دوہرا اجر ملے۔

۲۔ لونڈی زنا کرے تو اس کو نصف سزا دی جائے۔

۳۔ غلام اسی طرح رہے، کھائے اور پئے جس طرح مالک
بتائیے یہ زندگی کیا بُری ہے کہ دوسرا اجر اور نصف سزا۔ اور کھانے پینے کی تکلیف نہیں، بے فکری،
دل جمعی، مساوات، کون ہے جو اس ضابطہ پر قربان نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ راوی کی زبان سے یہ الفاظ
نکل گئے، یہ تو بہت ہی عمدہ زندگی ہے۔ کہ ایک مسلم کی غلامی میں دن کٹ جائیں، دنیا کا فکر نہ ہو، اور
عاقبت سُدھر جائے۔

یہ راوی کی ایک نیک خواہش ہے اور آپ اسے لغزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، راوی دین و دنیا
میں سکون و بے فکری کی زندگی کا مشتاق ہے۔ اور اس سکون و بے فکری کی خواہش وہ کر رہا ہے، کیا
دین و دنیا میں سکون تلاش کرنا کوئی غیر صحیح فعل ہے اگر نہیں تو پھر راوی کی اس پاکیزہ خواہش پر اعتراض کیسا فضول
ہے اس کو اس سکون کے لئے غلامی کی زندگی کو پسند کرنا پڑا۔ غلامی کی زندگی اس سکون و بے فکری
کا محض ایک وسیلہ ہے لہذا ایک بہت بڑے مقصد کے پیش نظر راوی نے غلامی کی زندگی کا اشتیاق
ظاہر کیا، لیکن ایک اس سے بھی زیادہ بڑے مقصد کی خاطر اس سکونِ زندگی کو قربان کر دیا اور آزاد رہنے
ہی کو ترجیح دی، گویا راوی کے نزدیک بھی آزادی کو غلامی پر ترجیح ہے۔ معلوم نہیں، کہ برق صاحب کیا
سمجھ بیٹھے، عاقبت کی فکر، قیامت کی دہشت، خوف اللہ، یہ چیزیں بعض اوقات انسان کو ایسی
خواہش کی طرف راغب کر دیتی ہیں کہ جس میں عاقبت کی فکر سے نجات مل جائے کوئی پھول بن جانیکی خواہش
کرتا ہے اور کوئی پتی۔ کوئی کہتا ہے ؎

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

برق صاحب راوی تو مسلم کی غلامی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے اور آپ اس کو غیروں کی غلامی
کی طرف کھینچ رہے ہیں کہاں مسلم کی غلامی اور کہاں کافر کی غلامی، آپ نے دونوں کو گڈمڈ کر دیا، مسلم
کی غلامی راحت ہی راحت ہے، کافر کی غلامی عذاب ہے، لعنت ہے، راوی تو مسلم کی غلامی کی خواہش
کرتا ہے لیکن پھر بھی اس نے غلامی کو اختیار نہیں کیا، آزادی ہی کو ترجیح دی، یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی کسی
وقت یہ کہہ دے کاش میں پھول ہوتا تاکہ لوگوں کے کام آتا، پھر مرجھا کر نابود ہو جاتا نہ حساب ہوتا نہ کتاب،
نہ عاقبت کی فکر ہوتی نہ دنیا کے مصائب میں الجھتا۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ ایسا کہنے والا پھول بننا ہی
پسند کرتا ہے۔ اور انسانی زندگی پر اس کو ترجیح دیتا ہے نہیں ہرگز نہیں یہ آرزو ہونا اور وہ بھی کسی خاص
مقصد کی خاطر اور بات ہے اور حقیقتہً اسے پسند کرنا اور بات ہے اس کی یہ نیک خواہش دراصل درسِ
عبرت ہے جو دوسروں کو بھی عاقبت کی فکر کی طرف برانگیختہ کرتی ہے غلامی کی خواہش کی طرف نہ جائیے
یہ خواہش درسِ عبرت ہے، کہ انسان دنیا اور آخرت کے سکون کا متلاشی رہے، عیش و راحت میں اللہ
تعالیٰ کو نہ بھول جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والے عیش و آزادی سے ایسی غلامی کو ترجیح دے جو

اللہ تعالےٰ کا بندہ بنا دے ، برق صاحب راوی کی یہ خواہش فائدہ اٹھانے کی چیز ہے نہ کہ اعتراض کرنے کی ۔

غلط فہمی "پھٹکار اس جعل ساز پر جس نے یہ حدیث تراش کر اسلام کے بنیادی مقصد پہ اس قدر خوف ناک حملہ کیا ، اور مسلمانوں کو سر پر جہانبانی سے اٹھا کر غلامی کے متعفن سنڈاس میں پھینکنے کی کوشش کی" (دو اسلام ص ۲۹۹)

ازالہ حدیث تو یہ ہے نہیں ! راوی کا قول ہے لہٰذا جعلسازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ، ہاں یہ سوچئے کہ نبی ہو ، اور قید میں رہنے کی خواہش کر رہا ہو ، محکومی کی زندگی گذارنا پسند کرے اور ملازم ہو جائے اور اپنے حاکم کے قانون پر چلتا رہے ۔ کیا یہ زندگی کسی نبی کے شایانِ شان ہے ؟ کیا یہ زندگی آپ کو پسند ہے ؟ اگر پسند نہیں تو پھر قرآنی آیات (یعنی سورہ یوسف) کے متعلق کیا خیال ہے ؟ کیا آپ کو یہ پسند ہے کہ مومن ہو کر دار الحرب میں رہے کمزوری و بے بسی میں زندگی گذارے یا اسلامی حکومت کے معاہد کافر قوم میں اپنی زندگی گذارے ، ان کا محکوم بن کر رہے ان کے قانون کی اطاعت کرے اگر یہ باتیں آپ کو پسند نہیں تو پھر سورہ نساء کی مذکورہ بالا آیات کے متعلق کیا خیال ہے ، اور ان آیات کے متعلق کیا خیال ہے جن آیات میں بنی اسرائیل کے غلام ہونے کا ذکر ہے لڑکیوں کے قتل کا ذکر ہے ، اولاد کے چھینے جانے کا ذکر ہے مسلمین کی بے بسی اور لاچاری کا ذکر ہے ، بتایئے کیا وہ مسلم تھے یا نہیں ؟ اگر تھے تو ان کی جہانبانی کہاں چلی گئی ؟

برق صاحب اگر غلط فہمی ہو جایا کرے تو اعتراض کرنے سے پہلے سوچ لیا کیجئے ، کہیں ایسا نہ ہو کہ اعتراض کی زد دور تک پہنچ جائے یا کہیں دار الٹا آپڑے ۔ یوسف علیہ السلام کا قید و بند کی زندگی کو ترجیح دینا اس لئے تھا کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتے تھے ، گویا ایک مبارک مقصد کی خاطر ایک گری ہوئی زندگی کو انہوں نے پسند کیا ، اسی طرح تبلیغ اسلام کی خاطر انہوں نے محکوم بننا پسند کیا اور وزارت مالیات و زراعت کے عہدہ کی خواہش کی ، گویا تبلیغ اسلام کے مبارک مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ایک گری ہوئی محکومیت کی زندگی کو پسند کیا ، اگر مبارک مقاصد کی بر آری کے لئے ایک پست قسم کی زندگی کو اختیار کرنا قابلِ اعتراض ہے تو پھر برق صاحب یہ اعتراض قرآنِ مجید پر ہوگا ۔ اب سوچ لیجئے ، اور اگر مبارک مقاصد کی خاطر ان آیات کی روشنی میں محکومیت اور قید و بند کی زندگی کو اختیار کرنا عیب نہیں بلکہ نیک عمل ہے تو پھر ایک مبارک مقصد کی خاطر غلامی کی زندگی کی خواہش کرنا کون سا عیب ہے کہ اس پر اعتراض کیا جائے ۔

برق صاحب جب آپ گھڑی ہوئی احادیث نقل کر رہے تھے تو ہم بھی آپ کے ساتھ تھے لیکن اب تو آپ صحیح احادیث نقل کر رہے ہیں اور صرف اس وجہ سے آپ ان پر اعتراض کر رہے ہیں کہ ان کا منشاء

نہیں سمجھے اور منشاء اور مطلب صرف اس لئے نہیں سمجھ سکے کہ قرآن مجید کو آپ نے غور سے نہیں پڑھا کوئی صحیح حدیث کسی قرآنی آیت کے خلاف نہیں ہاں غلط فہمی کی تو بات ہی دوسری ہے ۔

غلامی کا انسداد

غلامی کے انسداد کے متعلق کچھ لکھنا اگرچہ ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم بعض لوگوں کے شبہ کے ازالہ کی خاطر اس مسئلہ کو بھی ہم واضح کر رہے ہیں کہ اسلام کسی آزاد کو زبردستی غلام بنانے کی اجازت نہیں دیتا نہ کسی آزاد کو پکڑ کر غلام کی حیثیت سے بیچنے کی اجازت دیتا ہے حدیث میں اس کی سخت ممانعت ہے لہذا کسی آزاد کو غلام بنانا یا اس کو بیچنا تو مسلم کے لئے قطعاً حرام ہے اور نہ کوئی اسلامی حکومت اس بات کی اجازت دے سکتی ہے کہ اس کے ملک میں آزاد لوگوں کو پکڑ کر اغوا کیا جائے ، اور پھر ان کو غلام بنایا جائے اور بیچا جائے لہذا یہ جو مسائل قرآن و حدیث میں غلاموں کے متعلق بالتفصیل پائے جاتے ہیں ان لوگوں کے متعلق ہیں جو پہلے سے غلام چلے آ رہے ہوں یا اسلام کے جنگی قوانین کے ماتحت غلام بنا لئے جائیں، اس رسم کا کلی انسداد اس لئے نہیں کیا گیا کہ :۔

۱۔ دار الحرب میں اس پر پابندی لگانا اسلامی حکومت کے اختیار میں نہیں وہاں اگر آزاد کو پکڑ کر غلام بنا لیا جائے اور پھر اتفاقاً اس غلام کو اسلامی حکومت میں لا کر بیچا جائے ، تو اب اس پر پابندی لگانا اسلامی حکومت کے اختیار میں ہے ، حکومت چاہے تو غلاموں کی درآمد بند کر دے اور چاہے تو درآمد کی اجازت دے دے ، لیکن اجازت دے دینا زیادہ مناسب ہے اور اس کے بہت سے وجوہ ہیں ۔

اول :۔ اگر وہ اسلامی حکومت میں نہ بیچ سکیں گے تو پھر کسی کافر حکومت میں بیچیں گے اور لازماً وہ ایسا کریں گے اس لئے کہ ان کا تو پیشہ یہی ہے لہذا ایک فرد جو ایک اسلامی معاشرہ میں رہ کر اسلامی معاشرہ کا ایک فرد بننے والا تھا مسلمین اس سے محروم ہو گئے اسلامی ممالک میں ان کا خرید لینا ہی مناسب ہے تاکہ مسلمین کی تعداد بڑھتی رہے ۔ ایک کافر جو اگر اسلامی حکومت میں نہ خریدا جاتا تو کافر ہی مرتا اور ابدی عذاب میں گرفتار ہوتا، اس ابدی عذاب سے اس کو نجات دلانا انسانی و اسلامی فریضہ ہے پھر تبلیغ اسلام بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے اگر اس تبلیغ کا ایک ذریعہ یہ بھی ہو کہ کوئی شخص اسلامی معاشرہ میں چند دن گذار کر مسلم ہو جائے اور پھر اسلامی قانون کی رُو سے وہ بہت جلد آزاد بھی ہو جائے تو یہ کیا بُرا ہے ۔ ایسے غلام کو خرید لینا ہی بڑے دوررس نتائج و مصالح کا حامل ہے اور یہ اس مسئلہ کا دینی پہلو ہے ۔

دوم :۔ بردہ فروش غلاموں کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا سلوک کرتے ہیں، لونڈیوں کو بیچتے ہی نہیں

بلکہ ان کے ساتھ ہر قسم کی نازیبا حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں اور کراتے ہیں، ایک ہی لونڈی مختلف مقامات اور مختلف لوگوں کے ہاتھ بیچی جاتی ہے اور پھر وہ کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے، ہر جگہ، ہر خریدنے والا اس کی عصمت کو خراب کرتا ہے، اگر کوئی مسلم کسی ایسی لونڈی یا کسی مظلوم غلام کو خرید لے تو اس کے ساتھ یہ احسان ہوگا ظلم واستبداد کے پنجہ سے اسے نجات ملے گی ۔ مومن کی غلامی کے زیر سایہ اسے راحت وسکون اور پاک دامنی کی زندگی میسر ہوگی، کھانے، پینے اور لباس کے لحاظ سے اس میں اور آقا میں کوئی امتیاز نہیں ہوگا لہذا ایسے مظلوم غلام یا لونڈی کو خرید لینا انسانیت پر احسانِ عظیم ہے یہ ہے اس کا اخلاقی پہلو۔

سوم ۔ دوسرے نکاح پر قرآن مجید بھی پابندی لگاتا ہے اور برادری کا رسم ورواج بھی، کوئی شخص بہ مشکل ہی پہلی بیوی کی موجودگی میں اپنی بیٹی کو زوجیت میں دینا گوارا کرے گا اس طرح یہ ہوگا کہ مسلم صرف ایک ہی بیوی کر سکیں گے ۔ لونڈی کے سلسلہ میں یہ پابندی نہیں لہذا بآسانی لونڈی کو اپنی زوجیت میں لیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح تکثیر آبادی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اگر مسلم اس تکثیر آبادی کے مسئلہ کو اہمیت دیتے اور بیک وقت کئی نکاح کرتے رہتے تو آج ہندوستان میں انکی اکثریت ہوتی اور وہ کسی علاقہ سے نکالے نہ جاتے، حکومت انہی کے قبضہ میں رہتی، یہ ہے اس مسئلہ کا سیاسی پہلو۔

۲ ۔ جہاد قیامت تک کے لئے فرض ہے لہذا میدانِ جنگ میں قیدیوں کا مسلمین کے قبضہ میں آنا ہمیشہ جاری رہے گا اور کیونکہ یہ چیز بند ہونے والی نہیں لہذا غلامی کا کلی انسداد بھی نامناسب ہے یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے انہیں غلام بنایا ہی نہ جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے کرنے کا ہے نہ کہ ہمارے کرنے کا، ہم تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں اب رہی یہ بات کہ آخر اس میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت ہے تو اپنی مصلحت کو وہ خود ہی خوب جانتا ہے ۔ ہماری سمجھ میں صرف ایک بات آتی ہے کہ اس طرح غلام ولونڈی کی حیثیت سے کافروں کو اپنے پاس رکھنا تبلیغ اسلام کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ مسلمین کی صحبت میں رہنے والے غلام الا ماشاء اللہ سب کے سب مسلم ہو گئے، اور مسلم آقاؤں کے اخلاق کریمانہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی آقا کی خدمت سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کیا، ان ہی کی صحبت میں رہے، علم دین حاصل کیا، انہی میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جو علم وفضل میں آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور دین کے سچے خدمتگار ثابت ہوئے غلام بن کر آئے تھے اور مسلمین کے امام بن کر دنیا سے گئے ۔

یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر غلامی کا کلی انسداد نہیں کیا گیا، کچھ عرصہ ہوا کہ غلامی کے سلسلہ میں ایک صاحب سے گفتگو ہوئی، کافی بحث ہوئی، لیکن وہ اس مسئلہ کو اسلام کے لیے باعث ننگ ہی سمجھتے رہے، اس گفتگو کو چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک نام نہاد اسلامی مملکت کے خاص دار الحکومت میں ایک شخص اپنی سالی کو اغوا کر کے لایا اور اس کے ساتھ ناروا حرکات کا مرتکب ہوتا رہا، اس کو چکلے میں بٹھانے

پرمجبور کرتا رہا پھر کچھ دن بعد ایک بڑے افسر کے ہاں ملازم رکھ کر چلا گیا اس عورت نے کچھ سکون کا سانس لیا، مہینہ بھر بعد پھر آیا اس کو زبردستی تانگہ میں سوار کیا وہ روتی رہی چلاتی رہی، لیکن وہ دن دہاڑے افسروں کی بستی میں سے اسے کشاں کشاں لے گیا اور وہ سب دیکھتے رہے، اور حالات سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس عورت کی امداد نہ کر سکے۔ بالآخر ایک صاحب نے اسے خرید لیا، اور اس طرح اس کی جان بچی۔

اب بتائیے، یہ عورت ظلم ناروا اور بدفعلی کی لعنتوں سے بچ کر اگر ایک شخص کے رحم و کرم کے زیر سایہ اسلامی قانون کے عطا کردہ اختیار و جواز سے اس کی ماتحتی میں رہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے یا اس ظالم کے ماتحت چکلے میں بیٹھنا اس کے لیے بہتر ہے؟ اس واقعہ کے بعد پھر ان صاحب سے گفتگو ہوئی اب وہ اس مسئلہ کی اہمیت کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے کہ بیشک ایسے حالات میں لونڈی یا غلام کا خرید لینا بہت ضروری ہے، اور اس لونڈی یا غلام کے لئے یہ غلامی بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر ایسے ممالک میں اور ایسے حالات میں لونڈی، غلام کو نہ خریدا جائے۔ تو یہ انسانیت پر ظلم ہوگا۔

غلاموں کی رہائی کیلئے اسلام نے کیا کیا

مسلمین کو یہ تو اجازت دی گئی ہے کہ وہ غلام خریدیں یا میدانِ جنگ کے قیدیوں کو غلام بنا لیں لیکن پھر اسلام نے ساتھ ہی ساتھ ان کی آزادی کے ذرائع بھی فراہم کر دئیے، بلکہ بعض حالات میں ان کی آزادی کو فرض قرار دیا۔ اب اگر کسی مسلم کے قبضہ میں کوئی غلام آجاتا ہے تو اس کے لئے دو ہی صورتیں ہوتی ہیں:۔

اوّل:۔ یا تو اسے آزاد کر دے اور قرآن و حدیث میں اس کی ترغیب ہے۔ مسلم اس ترغیب سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ اور سینکڑوں غلام آزاد ہوتے رہے ہیں۔

دوم:۔ اسے غلام بنا کر رکھے، ایسے غلام کو آزادی کی منزل تک پہنچانے کے لئے بھی اسلام نے بہت سی سہولتیں مہیا کی ہیں مثلاً:۔

ظہار، قسم، قتل خطا وغیرہ کے کفارہ میں غلام آزاد کیا جائے۔

غلام کو طمانچہ مارے تو اسے آزاد کر دے۔

لونڈی سے بچہ پیدا ہو جائے تو آقا کی وفات کے بعد وہ آزاد ہے آقا کی زندگی میں بھی اس کو بیچنا منع ہے۔

سورج گہن کے موقع پر غلام آزاد کیا جائے۔

پھر مدبّر اور مکاتب کرنے کی تدابیر بتائی گئیں۔

غرض یہ کہ ان کی آزادی کے لئے کئی ذرائع مہیا کر دیئے، اور اگر وہ آزاد نہ بھی ہوں، تو ان کے ساتھ نیک سلوک کی وصیتیں فرمائی گئیں۔ مثلاً:۔

جو آقا پہنے وہی اسے پہنایا جائے، جو آقا کھائے وہی وہ کھائے اور آقا کے ساتھ بیٹھ کر کھائے اس کو بھائی سمجھا جائے اس کو مارا نہ جائے، اس کو ہلکا کام دیا جائے، اگر مشکل کام دیا جائے تو آقا اس کے ساتھ کام کرکے اس کی مدد کرے، وہ صالح ہو تو اس کا نکاح کر دیا جائے، وہ گناہ کر بیٹھے تو سزا آدھی ملے، نیکی کرے تو دوہرا اجر پائے، دنیا کی فکر سے آزاد ہو۔

یہ ہے مومن کے غلام کی زندگی! کیوں نہ اس پر آزادی نثار ہو اور کیوں نہ کسی راوی کے دل میں یہ خواہش گذرے کہ میں غلام ہوتا تو کیا اچھا ہوتا، مسلم جب غلام کو خریدتا ہے تو صرف ظلم ہی سے اس کو نجات نہیں دیتا بلکہ اس کو یہ زندگی عطا کر کے اس کے لئے جنت کا سماں پیش کرتا ہے، کیا مسلمین کو روکدیا جائے کہ وہ مظلوموں کو ایسی زندگی عطا کرنے سے باز رہیں اگر ایسا کیا جاتا تو یہ انسانیت پر ظلم کے مترادف تھا اور بے رحمی کا انتہائی خوفناک مظاہرہ۔

اسی وجہ سے اسلام نے غلامی کو کلیتہً مسدود نہ کر کے عاقبت اندیشی کا ثبوت دیا، ناعاقبت اندیش ہیں وہ لوگ جو غلامی کو ظاہری نگاہ سے دیکھتے ہیں نہ اس کے دینی پہلو پر غور کرتے ہیں نہ اخلاقی وانسانی پہلو پر۔ اور اسلام پر اعتراض کرنے لگتے ہیں کاش اعتراض سے پہلے وہ ہر مسئلہ پر کافی غور وخوض کر لیتے۔

نوٹ

صفحہ نمبر ۲۹۲ پر برق صاحب نے ایک حدیث کے متن کا کچھ حصہ چھوڑ دیا ہے، اور نیچے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "یہ لفظ نہ پڑھ سکا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب نے حدیث کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ لفظ کیا ہے جو ان سے پڑھا نہیں گیا پھر اگر صحیح بخاری میں پڑھا نہ جا سکا تھا تو کیا حدیث کی کسی کتاب میں پڑھا نہ گیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب باوجود ڈاکٹر ہونے کے تحقیقات سے روگردانی کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں، اللہ انہیں ہدایت دے اور معاف فرمائے۔

باب ۱۷

تقدیر

غلط فہمی اس مضمون پر قرآن میں بیسیوں آیات موجود ہیں اور نوع انسانی کی ہزارہا سالہ تاریخ پکار پکار کہہ رہی ہے کہ یہ دنیا دار المکافات ہے۔ جہاں صرف اپنی محنت کام آتی ہے اور بے عمل، بدعمل، کاہل اور سہل انگار افراد و اقوام کا انجام ذلت و رسوائی کے بغیر اور کچھ بھی نہیں (دو اسلام ص ۳۰۱)

یہ تھا تقدیر کا قرآنی تخیل، اب ذرا "حدیثی تخیل" ملاحظہ ہو۔

حضور فرماتے ہیں کہ نطفہ رحم میں پہنچ کر چالیس دن کے بعد منجمد سا خون بنتا ہے پھر وہ لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے کہ جاؤ اور لوتھڑے کے اعمال زندگی، رزق، موت اور سعادت و شقاوت کا فیصلہ ابھی لکھ لو۔ اور اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

اس حدیث تراش نے یہ نہ بتایا کہ جب ایک شخص کے اعمال، رزق اور سعادت کا فیصلہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی ہو جاتا ہے تو پھر اللہ نے انسانی ہدایت کے لئے اتنے پیغمبر کیوں بھیجے (دو اسلام ص ۳۰۲)

ازالہ برق صاحب یہ بتلائیے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بچہ کو پیدا کرتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا ہے کہ بچہ دنیا میں کیا کرے گا یا علم نہیں ہوتا اگر علم نہیں ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں، یہ تو ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کو علم ہوتا ہے تو پھر یہ بتلائیے کہ یہ علم ہونا اس انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس کے علم کے مطابق کام کرے، اگر مجبور کرتا ہے تو لکھ لینے کا پھر کیا قصور رہا، اور اگر یہ علم مجبور نہیں کرتا، تو پھر اس کا قبل از وقت لکھ لینا بھی مجبور نہیں کرتا۔ لہٰذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک و صاف ہے۔

اب اس حدیث کی تائید میں قرآنی آیات سنیئے، بعد میں ہم بتائیں گے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

۱۔ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ٥ (الانعام:۔ ۵۹)

اللہ جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہے اور جو کچھ سمندر میں ہے اور جو پتہ گرتا ہے اس کا بھی اس کو علم ہے اور زمین کے اندھیروں میں جو دانہ پڑا ہوا ہے وہ بھی اسے معلوم ہے اور کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں جس کا حال لوحِ محفوظ میں نہ ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے علم میں ہر چیز ہے لہٰذا اس کو یہ بھی علم ہوگا کہ بندہ اپنی زندگی میں کیا کرنے والا ہے اسی علم کی بنا پر اس نے سب کچھ لکھ لیا ہے اب اگر لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہونے پر اعتراض نہیں تو بوقتِ پیدائش قسمت میں لکھا جانے پر کیا اعتراض ہے۔

۲۔ وَاِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِکُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِیْدًا کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا ٥ (بنی اسرائیل:۔ ۵۸)

کوئی بستی ایسی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا عذاب شدید میں مبتلا نہ کریں، اور یہ سب کچھ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

۳۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ٥ (الحدید:۔ ۲۲)

جو مصیبت دنیا میں آتی ہے یا خود تم کو پہنچتی ہے وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب میں لکھی ہوتی ہے اور بے شک یہ چیز اللہ کے لئے آسان ہے۔

بتائیے جو مصیبت پہلے سے لکھی ہوتی ہے وہ تو آکر رہے گی اس کو ٹالنے کی کوشش بے سود ہے، اگر وہ ٹل جائے تو اللہ کا علم ناقص ہو جائے گا اور یہ ناممکن ہے۔

(۴) اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتٰبٍ (الحج:۔ ۷۰)

کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کو علم ہے ہر اس چیز کا جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے اور یہ سب کتاب میں مسطور ہے۔

۵۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ

زمین میں رہنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے، وہ جانتا ہے کہ کہاں اس کا مستقر ہے اور کہاں اس کی آخری آرام گاہ

مُّبِيْنٍ ۝ (ھود :۔ ۶) ہے، یہ سب کچھ روشن کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

اب اگر رزق بھی لکھا ہوا ہے تو پھر اس کی زیادتی کے لئے جد و جہد کیا معنی !!

۶۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (الحجر :۔ ۲۱)

اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم مقررہ مقدار ہی میں اس چیز کو نازل کرتے ہیں۔

اگر مقدار مقرر ہے تو پھر اس کی زیادتی کے لئے جد و جہد بیکار ہے۔

۷۔ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ وَلٰکِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا (انفال :۔ ۴۲)

اور اگر تم وعدہ کرتے تو وعدہ میں اختلاف ہو جاتا (اور پھر یہ کام نہ ہوتا) لیکن اللہ کو وہ کام کرنا تھا جس کا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تحریر کردہ فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لئے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ مسلمین اور کافروں کے مابین لڑائی ہو کر رہی یہ تحریر کردہ فیصلا اور اس کے لئے حالات کو سازگار بنانا تقدیر ہی تو ہے اور یہی حدیث میں ہے۔

۸۔ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (الانفال :۔ ۶۸)

اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے سے نہ لکھا ہوتا تو جو فدیہ تم نے لیا، اس پر عذاب عظیم نازل ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز تھی، جو لکھی ہوئی تھی۔ اگر یہ بات لکھی ہوئی تھی کہ ہم معاف کر دیں گے تو گویا یہ معافی ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی اور غالباً اسی وجہ سے عذاب ٹال دیا گیا غرض یہ کہ اس میں تقدیر کے لکھے جانے کا ثبوت ہے۔

۹۔ وَکَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِهٖ ۝ (یوسف :۔ ۲۱)

اس طرح ہم نے یوسف (علیہ السلام) کو ملک میں ٹھکانا دیا، یہ اس لئے کہ ہمیں اس کو احادیث کا علم سکھانا تھا اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہے۔

یعنی بھائیوں نے تو یوسف علیہ السلام کی ذلت کے لئے کیا کیا تدبیریں کیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کر لیا تھا کہ ایسا کرنا ہے وہ کر کے رہا اور ان کی تمام تدابیر بے کار ثابت ہوئیں، انھیں علم ملنا تھا، وہ مل کر رہا، انھیں نبوت ملنی تھی، وہ مل کر رہی، انھیں حکومت و عزت ملنی تھی وہ مل کر رہی، یہ تقدیر کا کتنا واضح ثبوت ہے اور تدبیر کی ناکامی کا کتنا زبردست مظاہرہ۔

۱۰۔ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا	اے رسول کہہ دیجئے کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی، مگر جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔
(التوبہ: ۵۱)	

اس آیت میں تقدیر کا کتنا کھلا ثبوت ہے اور حدیث مذکور کی کتنی زبردست تائید ہے، "تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ"، اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن سے تقدیر کا ثبوت ملتا ہے معلوم نہیں برق صاحب نے ان آیات کا مطالعہ کیوں نہیں فرمایا۔

تقدیر کا فائدہ

تقدیر سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ہم مجبور ہیں لہذا تدبیر کی ضرورت نہیں تو یہ تقدیر کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، نہ تقدیر کے مسئلہ کا یہ صحیح استعمال ہے ہاں اس کا ایک صحیح استعمال ہے اور وہ خود اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ؀ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ؀	جو مصیبت دنیا میں آتی ہے یا خود تم کو پہنچتی ہے وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب میں لکھی ہوتی ہے تاکہ کوئی نقصان ہو جائے تو تمہیں افسوس نہ ہو، اور جو چیز اللہ تمہیں دے اس پر اترا نہ جاؤ کیونکہ اللہ اترانے والے، تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔
(الحدید: ۲۲، ۲۳)	

اس آیت سے تقدیر کا استعمال معلوم ہو گیا وہ یہ کہ نقصان ہو جائے تو یہ نہ ہو کہ بس اس غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں بلکہ یہ کہہ کر تسلی کر لیں، کہ نقصان ہو گیا تو کیا ہوا، تقدیر میں ایسا ہی تھا اور اگر کوئی نعمت مل جائے تو یہ نہ سمجھے کہ یہ نعمت میری قابلیت کی بنا پر مجھے ملی ہے جیسا کہ قارون نے کہا تھا پھر وہ اس پر اترانے لگے اور اللہ تعالیٰ کو بھول جائے بلکہ اس طرح کہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، میں کس قابل ہوں، یوسف علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے نعمتِ الٰہی پانے کے بعد اسی قسم کے الفاظ کہے تھے اور یہ الفاظ قرآن مجید میں موجود ہیں۔

تقدیر کا اصلی مفہوم

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنا پر جو کچھ ہونے والا تھا وہ سب لکھ لیا ہے ہوتا سب کچھ اگرچہ

اس کے موافق ہے لیکن کرنے والا اس کام کے کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے اختیار سے کرتا ہے، بات صرف اتنی ہے کہ اس کا وہ فعل پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق اور ہماری دعائیں بھی کچھ اثر انداز ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن و حدیث میں اس کی صراحت ہے اس سے زیادہ اس مضمون پر کچھ لکھنا اور تقدیر کی گتھی کو سلجھانا اور اس کے پیچھے پڑ جانا اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے بفحوائے آیت "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" اس حکم کے بموجب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں،

برق صاحب! تقدیر کا مسئلہ پیچیدہ مسائل میں سے ہے اس پر زیادہ غور و خوض نہ کیجئے، البتہ لوگوں نے جو غلط نتیجہ اس سے نکال رکھا ہے اس پر جتنا چاہے افسوس کر لیجئے اور بس۔

باب ۱۸

متضاد احادیث

غلط فہمی "دوران تقریر میں (حضور نے) فرمایا، جو تین بچے پیدا کرے گی، اللہ اسے نارِ جہنم سے بچائے گا ایک عورت کہنے لگی اور دو بچوں والی؟ فرمایا دو والی بھی جنت میں جائے گی۔" (دو اسلام صـ۲۰۵)

ازالہ برق صاحب حدیث کا صحیح مطلب نہیں سمجھے "مَا مِنْكُنَّ امْرَأَةٌ تُقَدِّمُ ثَلَاثَةً مِنْ وَلَدِهَا" (صحیح بخاری کتاب العلم) اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "جس عورت نے تین بچے آگے بھیجے" (یعنی جس کے تین بچے مر گئے) اس عورت کو اس مصیبت پر صبر و شکر کرنے کا یہ اجر ملے گا کہ وہ بچے دوزخ سے بچانے کا سبب بن جائیں گے۔ اگر برق صاحب ذرا آگے دیکھتے تو ان کو اس روایت کے متصل وہ روایت بھی مل جاتی جس میں یہ لفظ ہیں "لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ" یعنی وہ بچے ایسے ہوں کہ بلوغ کو نہ پہنچے ہوں، یعنی معصوم ہوں کیا ان لفظوں کی موجودگی میں "تین بچے پیدا کرے گی" صحیح مطلب ہو سکتا ہے؟ پھر یہی حدیث کتاب الجنائز میں بھی موجود ہے۔ الفاظ یہ ہیں:۔

أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَ لَهَا ثَلَاثَةٌ مِنَ الْوَلَدِ ٥ (صحیح بخاری)	جس عورت کے تین بچے مر گئے۔

پھر اسی مضمون کی احادیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس سے پہلے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس روایت کے بعد صحیح بخاری کتاب الجنائز میں موجود ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

مَا مِنَ النَّاسِ مِنْ مُسْلِمٍ يُتَوَفَّى لَهُ ثَلَاثٌ لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ ٥	جب کسی مسلم کے تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

لَا يَمُوتُ لِمُسْلِمٍ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ — اگر کسی مسلم کے تین بچے مرجائیں ۔

الغرض حدیثوں میں "مرجاتے" کا ذکر ہے اور برق صاحب نے ترجمہ میں اس کے بجائے "پیدا کرنا لکھ دیا" اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ، برق صاحب نے بغیر تحقیق اور گہرے مطالعہ کے حدیث کا ترجمہ کیا ، اور غلط فہمی سے ترجمہ غلط ہو گیا ۔ کاش وہ پوری کتاب تحقیق کے بعد لکھتے ۔

غلط فہمی ایک طرف تو عورت کی عظمت کا یہ حقیقت افروز اعتراف ، اور دوسری طرف اس پرستار محبت کی یہ توہین کہ .... آں حضرتؐ فرماتے ہیں کہ میں نے جہنم کو دیکھا تو اس میں اکثر آبادی عورتوں کی نظر آئی ۔ یعنی ایک طرف تو دو بچوں والی ماؤں کو جنتی بنایا گیا ہے بلکہ ساری جنت ماں کے قدموں میں پھینکی جا رہی ہے اور دوسری طرف اس کے جہنمی ہونے کا بھی ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے ۔

(دو اسلام ص ۳۰۸)

ازالہ برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کو اگر ماں باپ کی خدمت کے صلہ میں جنت مل سکتی ہے تو وہ ماں ضرور جنتی ہے ، واہ یہ بھی خوب ہے نیک عمل تو کرے اولاد اور جنت میں جائے ماں ، گویا ماں کے ذمہ نہ کوئی حساب ہے نہ کتاب ، بس اولاد نے اس کی خدمت کی اور وہ جنتی ہو گئی ۔ برق صاحب اولاد کا جنت یا دوزخ میں جانا ، ان کے اپنے عمل کے باعث ہے اور عورت کا جنت میں جانا یا دوزخ میں داخل ہونا اس عورت کے اپنے عمل پر منحصر ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر دوزخ میں بہت سی عورتوں کو دیکھا تو اس کو اس مقصد سے عورتوں کے سامنے بیان کر دیا کہ وہ احسان فراموشی اور غیبت وغیرہ جرائم سے باز رہیں یہ ایک قسم کی ترہیب ہے اعتراض کی اس میں کیا بات ہے ؟

غلط فہمی چوریاں کریں تو مرد ، ڈاکے ڈالیں تو مرد .... بوڑھوں اور عورتوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کریں تو مرد .... لیکن جہنم میں جائیں تو عورتیں ، کیوں ؟ کیا اللہ کے عدل و انصاف کا یہی تقاضا ہے ۔"

(دو اسلام ص ۳۰۸)

ازالہ برق صاحب دنیا کی پوری آبادی میں کتنے مرد ہیں جو اس قسم کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں بمشکل دس میں سے ایک ، اچھا اب یہ بتائیے کہ دنیا کی آبادی میں کتنی عورتیں ایسی ہیں جو شرک و بدعات ، احسان فراموشی ، غیبت ، ترکِ نماز ، بدگمانی وغیرہ میں ملوث ہیں آبادی کے ہر گھر کی

عورتوں میں آپ کو یہ باتیں ملیں گی بہت کم ایسی عورتیں ہونگی جو ان لغویات سے بچی ہوں گی یہ باتیں، اگرچہ مردوں میں بھی ہوتی ہیں لیکن عورتوں کے مقابلہ میں بہت کم، نمازیں پڑھیں تو مرد، روزے رکھیں تو مرد، تبلیغ کریں تو مرد، جہاد کریں تو مرد، نبوت سے سرفراز ہوں تو مرد، ولی کامل ہوں تو مرد، عالم دین ہوں تو مرد، پھر کیوں نہ جنت میں مردوں کی کثرت ہو، برق صاحب ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتائیے کہ دوزخ میں کس کا تناسب زیادہ ہونا چاہیئے، مردوں کا یا عورتوں کا؟

غلط فہمی

"عورت کی نافرمانی کی مزید تشریح اس حدیث میں دیکھئے:۔

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو ہم بستری کے لئے بلائے اور وہ انکار کر دے اور شوہر ناراض ہو کر لیٹ جائے تو اس عورت پر فرشتے صبح تک لعنت برساتے رہتے ہیں"

"یہ تھا اصلی سبب، جس پر مولانا کو اتنی احادیث گھڑنا پڑیں، عورت کے انکار کی کئی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں" (دو اسلام صـ۳۰۹)

ازالہ

برق صاحب کو یہ حدیث اس حدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہے جس میں ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے یا جس عورت کے دو یا تین بچے فوت ہو جائیں تو اس کے لئے جنت ہے، بے شک عورت اگر بچوں کے مرنے پر صبر و شکر کرے تو اس ابتلا کا اجر اسے ملے گا اور اگر وہ ناشکری کرے اور اس جرم کا پلڑا بھاری ہو جائے تو پھر دوزخ نہیں تو اور کیا ملے گا، کیا یہ قرآن مجید کا اٹل قانون نہیں ہے، عورت کا مرد کے بستر پر آنے سے انکار کرنا بھی ایک قسم کی ناشکری ہے، نافرمانی ہے۔

برق صاحب کا یہ فرمانا کہ انکار کی کئی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں، بالکل ٹھیک ہے، لیکن حدیث میں یہ کہاں ہے کہ معقول وجوہات کی موجودگی میں انکار باعث لعنت ہے، برق صاحب کچھ تو غور کر کے لکھا کیجئے اچھا اگر کوئی معقول وجہ نہ ہو تو پھر کیا حکم ہے؟ کیا خاوند اس کے ہر قسم کے حقوق ادا کرے، اور جب اس کے حقوق ادا کرنے کا وقت آئے تو وہ بغیر کسی معقول وجہ کے انکار کر دے تو کیا یہ جرم قبیح نہیں ہے اگر ہے تو پھر کیا اعتراض ہے؟ یہ تو برابر کے حقوق ہیں، اگر مرد بیوی کا حق ادا کرنے سے انکار کر دے تو وہ مجرم ہوگا۔ اب قرآن مجید کی سنیے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (بنی اسرائیل ۲۳،) — ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ (النساء ع:-۳۴) — عورتوں کو بستر سے علیحدہ سلاؤ اور انہیں مارو۔

ایک جگہ تو ماں کی یہ عزت کہ احسان کرو، جھڑکی مت دو، اُف بھی نہ کرو اور دوسری جگہ اسی پیاری

اماں کے متعلق یہ ارشاد کہ اسے مارو، برق صاحب کیا یہ بھی تضاد ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ پیاری اماں کی سرخی جو آپ نے قائم کی ہے، جذبات کو توبھڑکا سکتی ہے، لیکن حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔

غلط فہمی

"جب حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اپنے عہدِ خلافت میں یزید بن ابوسفیان کو ایک فوج کا سپہ سالار بنا کر شام کی طرف روانہ کیا تو ساتھ مندرجہ ذیل ہدایات بھی دیں"

"کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کوئی پھل والا درخت نہ کاٹنا... کسی درخت کو ہرگز نہ جلانا۔

لیکن بخاری میں مذکور ہے:۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نضیر کے کچھ درخت جلادئیے تھے اور کچھ کاٹ کر رکھ دیئے تھے،" (صا۲۱)

ازالہ

برق صاحب نے ان دونوں واقعات کو متعارض احادیث کی حیثیت سے پیش کیا ہے پہلی غلط فہمی تو یہ ہوئی کہ برق صاحب پہلی روایت کو بھی حدیث ہی سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ وہ قولِ صحابی ہے، خیر، دوسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ وہ یہ سمجھے کہ یہ دونوں ہدایات ایک ہی جیسے مواقع کے لئے ہیں، لہٰذا ان دونوں میں تضاد ہے۔

بات یہ ہے کہ دونوں ہدایتیں علیحدہ علیحدہ مواقع اور محل سے تعلق رکھتی ہیں، علیحدہ علیحدہ کوائف اور حالات کے ماتحت ان دونوں پر عمل ہوگا جنگلوں یا شہروں کے درختوں کا بغیر کسی وجہ کے جلا دینا یا کاٹ دینا بے شک ممنوع ہے لیکن وہ درخت جو میدانِ جنگ میں واقع ہوں ان کے وجود سے اسلامی فوج کو نقصان پہنچتا ہو، اور دشمن فوج کو فائدہ پہنچتا ہو، جنگ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو تو بتائیے کیا ایسے درختوں کا کاٹنا بھی جرم ہے، نہیں، بلکہ جنگی مصالح کے مدنظر ایسا کرنا فرض ہے اب بتلائیے ان دونوں میں کیا تضاد ہے، پھر یہ درخت جو کاٹے گئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کاٹے گئے معلوم نہیں برق صاحب نے قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کئے بغیر اعتراض کیوں کیا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (الحشر:۔ ۵)	جو درخت تم نے کاٹے، یا جو تم نے کھڑے رہنے دئیے، تو یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتے تھے۔

لیجئے اب تک تو حدیث پر اعتراض تھا اب وہی اعتراض قرآن مجید پر آگیا، اب کیا کیا جائے؟

غلط فہمی پھر بلا وجہ اور بلا ضرورت درختوں کو کاٹنا ، مسافروں کو سائے ... سے محروم رکھنا یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان تھا ؟ اس لئے یہ حدیث قابلِ اعتماد نہیں ۔ (دو اسلام صا۳۱۱)

ازالہ بغیر کسی وجہ کے تو کاٹے نہیں گئے اگر آپ نے وجہ تلاش نہیں کی تو اس میں حدیث کا کیا قصور ہے ۔ یہ درخت اس لئے کاٹے گئے تھے کہ مسلم بغیر ان کے کاٹے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اور کافروں کو ذلت و شکست نصیب نہ ہوتی ۔ اگر تاریخ میں آپ نے نہیں پڑھا تھا تو قرآن مجید میں دیکھ لیا ہوتا اس کی وجہ تو خود قرآن مجید بتاتا ہے ۔

وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ۔ تاکہ اللہ فاسقوں کو ذلیل کرے ۔

(الحشر : ۵)

گویا درخت کاٹنے کی وجہ خود قرآنِ مجید میں موجود ہے یعنی کافروں کو شکست دینے اور ان کو ذلیل کرنا یہ ایک آسان ذریعہ تھا ۔ میدان جنگ کھل جانے سے مسلمین کے لئے لڑائی آسان ہوگئی اور ان کافروں کو بہت جلد شکست نصیب ہوئی ۔

غلط فہمی "ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک مہم پر روانہ کرنے سے پہلے فرمایا کہ اگر فلاں فلاں مل جائیں تو انہیں آگ میں جلا دینا ، سو جب ہم چل پڑے تو کہا ان لوگوں کو جلانا مت بلکہ قتل کر ڈالنا ، اس لئے کہ آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے ۔"

آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے لیکن ،

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ چند آدمی مدینہ میں آکر بیمار ہوگئے ، حضورؐ نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ سرکاری اونٹنیوں کا دودھ پئیں ۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا ۔ جب وہ شفایاب ہوکر تر و تازہ ہوگئے تو انہوں نے رکھوالے کو مار ڈالا ، اور اونٹنیوں کو ہانک کر چل دئے ۔

آپ نے انہیں مندرجہ ذیل سزائیں دیں ۔

(الف) پہلے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے ۔

(ب) پھر لوہے کی سلاخیں گرم کرکے ان کی آنکھوں میں پھیریں ۔

(ج) اس کے بعد انہیں گرم ریت پر پھینک دیا ، وہ تڑپ تڑپ کر پانی مانگتے رہے ، لیکن کسی نے نہ دیا اور ہلاک ہوگئے ۔

یہ بے رحمی رحمۃ للعالمین کی شان سے بعید ہے ۔ مزید برآں قرآن نے

قاتل کے لئے صرف سزائے موت تجویز کی ہے نہ کہ یہ تین سزائیں بیک وقت "

(دو اسلام صہ ۳۱۱)

ازالہ برق صاحب کے نزدیک ان دونوں احادیث میں یہ تعارض ہے کہ پہلی حدیث میں ہے کہ "آگ سے مت جلاؤ" اور دوسری میں ہے، کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوہے کی سلاخیں گرم کرکے آنکھوں میں پھیریں اور گرم ریت پر انہیں ڈال دیا برق صاحب ان دونوں میں فرق تو ضرور ہے، دوسری میں آگ سے جلانے کا کوئی ذکر نہیں، کہاں آگ میں جلا کر مار ڈالنا اور کہاں گرم سلائی پھیرنا۔ مگر خیر آپ کی خاطر ہم اس کو تضاد ہی مانے لیتے ہیں اب سنیئے:۔

پہلی حدیث میں ایک اسلامی قانون ہے کہ کسی شخص کو کسی سزا میں جلانے کا اختیار حکومت کو نہیں ہے، دوسری حدیث میں ایک قرآنی قانون پر عمل ہے اچھا اب یہ بتائیے کہ اگر کسی ظالم نے کسی شخص کو آگ میں جلا کر مارا ہو تو اس ظالم کی سزا کی نوعیت کیا ہوگی؟ قرآن کی آیت سنیئے:۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۔	جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اس ہی جیسی زیادتی کرو۔

(البقرۃ :۔ ۱۹۴)

بتائیے اس قرآنی حکم کی تعمیل فرض تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو پھر یہ جلانے کا عذاب اللہ کی طرف سے ہوا، بندوں کی طرف سے نہیں۔ بندوں نے تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی۔ اور اگر آپ یہ فرمائیں کہ اس جلانے والے ظالم کو صرف تلوار سے قتل کر دیا جائے۔ تو پھر ہم پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا یہ برابری کا قصاص ہے، کیا اس سزا سے خوفناک مظالم کا انسداد ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوفناک مظالم کے انسداد کے لئے اُسی جیسی خوفناک سزا ہونی چاہیئے، ورنہ ایک آدمی آگ میں جل کر جان دے اور دوسرا آناً فاناً تلوار کی ضرب یا بجلی کے جھٹکے سے مر جائے، کیا یہ انصاف کا خون کرنا نہیں ہے، کیا یہ قانونِ قصاص کا نقص نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ تو خود فرماتا ہے۔

وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۔	آنکھ کے بدلے آنکھ پھوڑی جائے، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت توڑا جائے اور اسی طرح تمام زخموں کا قصاص لیا جائے۔

(المائدۃ :۔ ۴۵)

بتائیے کیا قصاص کی یہ سزائیں بے رحمی کا مظاہرہ نہیں کرتیں، بے شک کرتی ہیں لیکن تمام بے رحمیوں کا انسداد یہی ایک ذریعہ ہے، اور اسی لئے رحیم و کریم اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ

"جیسا کرو ویسا بھرو" انہوں نے جیسا چرواہوں کے ساتھ کیا تھا ویسا ہی ان کے ساتھ کیا گیا حدیث میں موجود ہے۔

اِنَّمَا سَمَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْیُنَ اُولٰٓئِکَ لِاَنَّھُمْ سَمَلُوْا اَعْیُنَ الرِّعَآءِ (صحیح مسلم باب حکم المحاربین)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی آنکھوں میں گرم سلائی اس لیے پھروائی کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیری تھی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اَللّٰھُمَّ عَطِّشْ مَنْ عَطَّشَ اٰلَ مُحَمَّدٍ (نسائی ج۲، ص۱۵۰، کتاب المحاربۃ ورجالہ ثقات تقریب)	اے اللہ ان لوگوں کو پیاسا مار جن لوگوں نے آلِ محمد کو پیاسا مارا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے مسلم چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائی پھروائی تھی اور ان کو پیاسا مارا تھا لہذا قصاص میں ان کو یہ سزائیں بھی دی گئیں۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے:۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (المائدۃ:۔۳۳)	جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کر دئیے جائیں، یا پھانسی دئیے جائیں یا ان کے مخالف سمت کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔

دیکھا آپ نے قرآن مجید میں قتل کے علاوہ بھی سخت سزائیں ہیں، کیا یہ بھی بے رحمی ہے؟

الغرض جو کچھ مظالم انہوں نے کئے تھے وہی ان پر دہرائے گئے، لوٹ مار کی سزا میں قرآن مجید کے حکم کے ماتحت ان کے ہاتھ، پیر کاٹے گئے، قتل کی سزا میں قتل کیے گئے، آنکھوں میں سلائی پھیرنے اور دوسری زیادتیوں کی سزا میں بطور قصاص ان پر ویسی ہی سزا نافذ کی گئی اور اس طرح قرآن مجید کے ہر حکم پر عمل کیا گیا، یہ ہیں وہ عبرت ناک سزائیں جن سے امنِ عالم برقرار رہتا ہے، اور کسی کو کسی پر ظلم ڈھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ آپ سزاؤں کو تو دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ایک سزا اپنے جیسے سینکڑوں واقعات کا انسداد کرتی ہے۔ اگر ایک دفعہ کی بے رحمی سے متعدد بے رحمیوں کا استیصال ہوتا ہے تو یہ سودا بہت سستا ہے۔

نہ معلوم برق صاحب کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی اور اگر آپ اس کو اب بھی بے رحمی ہی سمجھیں تو کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ سو کوڑوں کی سزا بھی بے رحمی ہے، آنکھ کے بدلے آنکھ پھوڑنا بھی بے رحمی ہے، چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا بھی بے رحمی ہے کیا آپ ان تمام سزاؤں کو قرآن مجید میں سے نکال دیں گے؟ اگر نہیں تو پھر ان سب بے رحمیوں کے ساتھ اس حدیث کی سزاؤں پر بھی صبر کیجیے آپ کو رحم آتا ہے لیکن قرآن مجید کو دیکھئے کہ وہ سو کوڑوں کی سزا دیتے وقت رحم کرنے سے منع کرتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بے رحمی کا حکم دیتا ہے، ارشاد ہے :۔

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (النور : ۲)	اللہ تعالیٰ کی اس سزا کو نافذ کرتے وقت تم کو ان دونوں پر کسی قسم کا رحم نہیں آنا چاہیے اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ سزاؤں کا نافذ کرنا بے رحمی نہیں ہے اور اگر رحم آ بھی جائے تو اس رحم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزا کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

غلط فہمی

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔۔۔۔ تین چیزیں منحوس ہیں، گھوڑا، عورت اور مکان ۔۔۔۔ اس ارشاد کا مقصد تو یہی ہو سکتا ہے کہ لوگ ان منحوس چیزوں سے بچیں، لیکن لوگ کیسے بچ سکتے ہیں؟ جب خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گھوڑا، گیارہ بیویاں اور نو مکانات اپنے قبضہ میں رکھے تھے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھ بیٹھے کہ کیا یہ قول اسی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے ۔۔۔۔ جس نے فرمایا تھا کہ "نکاح میری سنت ہے" ۔۔۔۔۔۔ تو ہم کیا جواب دیں گے؟
(دو اسلام صد ۳۱۳، ۳۱۴)

ازالہ

ایک حدیث کی تشریح دوسری جگہ موجود ہوتی ہے اگر کہیں مجمل حدیث ہو تو غلط فہمی کا تو امکان ضرور ہے لیکن اس کا ازالہ دوسری حدیث سے ہو سکتا ہے۔ جو آگے پیچھے موجود ہوتی ہیں مگر اس کے لئے تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے، برق صاحب نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ ان ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دوسری جگہ اس حدیث کی تشریح موجود ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

اِنْ كَانَ الشُّؤْمُ فِیْ شَیْءٍ فَفِی الدَّارِ وَالْمَرْاَةِ وَالْفَرَسِ (صحیح بخاری)	نحوست اگر کسی چیز میں ہوتی تو ان تین چیزوں میں بھی ہوتی، گھر، عورت، گھوڑا۔

⁂ ⁂ ⁂

حضرت سہل ؓ کی روایت کا بھی یہی مضمون ہے ، الفاظ یہ ہیں :۔

اِنْ كَانَ فِيْ شَيْئٍ يَعْنِي الشُّؤْمَ — اگر نحوست کا کوئی وجود ہوتا تو ان تین چیزوں

فَالْمَرْأَةِ وَالْفَرَسِ وَالْمَسْكَنِ (صحیح بخاری) — میں بھی ہوتا ، گھوڑا ، عورت ، گھر ۔

اب اس حدیث کا پس منظر ملاحظہ فرمایئے ایام جاہلیت میں لوگوں کا خیال تھا کہ فلاں فلاں چیزوں میں نحوست ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باطل عقیدہ کی تردید ان الفاظ میں کر دی ، کہ نحوست کا کوئی وجود نہیں اگر ہوتی تو ان محبوب ترین چیزوں میں بھی ہوتی جن سے کنارہ کشی ناممکن ہے ، کیا نحوست کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑا جا سکتا ہے ، ہرگز نہیں ، جب یہ نہیں ہو سکتا تو پھر محض نحوست کے وہم سے دوسری چیزوں کو چھوڑنا لایعنی ہے ، یہ تو ہے حدیث کا منشا ، ہاں قرآن مجید میں ضرور نحوست کا ذکر ملتا ہے ، قوم عاد پر جو عذاب بھیجا گیا تھا وہ منحوس دنوں میں بھیجا گیا تھا ، ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُسْتَمِرٍّ ۝ — ہم نے ان پر دائمی منحوس دن میں سخت آندھی کا عذاب بھیجا تھا ۔

(القمر :۔ ۱۹)

غلط فہمی

"کیا جن عورتوں نے لاکھوں انبیاء و اولیاء پیدا کئے ، جن کی گود میں لقمانؑ و فلاطون کھیلے ..... وہ منحوس ہیں اور ہم مسعود" (دو اسلام صفحہ ۳۱۴)

ازالہ

یہ تو اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ عورت منحوس نہیں ہے اور یہ کہ برق صاحب حدیث کا مطلب غلط سمجھے ، تاہم ایک بات عرض ہے کہ کیا یہ عبارت محض جذبات کو بھڑکانے کے لئے نہیں ہے کیا اس میں مبالغہ و رنگینی نہیں ہے ، برق صاحب یہ عبارت اس طرح بھی ترتیب دی جا سکتی ہے ۔

"کیا جن عورتوں نے لاکھوں شیطان کے اولیاء پیدا کئے ، جن کی گود میں فرعون و ہامان کھیلے ، جنہوں نے کافر ، چور ، ڈاکو ، بدمعاش ، رہزن ، سفاک ، فجار ، شرابی لوگوں کو جنم دیا وہ مسعود ہیں ؟ کیا جن عورتوں نے ابولہب ، ابوجہل اور دیگر اشرار کو اپنے دودھ سے پرورش کیا کیا وہ منحوس نہیں ؟ اور سنیئے عزیز مصر کی زبان سے قرآن مجید کیا کہتا ہے ۔

إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ۝ — اے عورتو ! بے شک تمہارا مکر و فریب بہت زبردست ہوتا ہے ۔

(یوسف :۔ ۲۸)

کیا یہ ان ہی عورتوں کے متعلق ہے ، جنہوں نے بڑے بڑے انسان پیدا کئے تھے ، قرآن مجید کہتا ہے :۔

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ بے شک انسان بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔
(الاحزاب: ۷۲)

کیا یہ انہیں انسانوں سے متعلق ہے جن میں لاکھوں انبیاء اور اولیاء پیدا ہوئے، برق صاحب حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے ذرا قرآن مجید کا بھی مطالعہ کر لیا کیجئے، قرآن مجید کہتا ہے:۔

وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے
(الکھف: ۵۴)

کیا انسانوں کے زمرے میں انبیاء بھی شامل ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

غلط فہمی

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ جب نماز کے لئے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پادتا ہوا بھاگ جاتا ہے اور اذان کے بعد واپس آ جاتا ہے...... واپس آکر نمازی پر مسلط ہو جاتا ہے اسے بھولی ہوئی باتیں یاد دلانا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ نمازی بھول جاتا ہے اور اسے یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔

شیطان کا اذان کی عربی عبارت سے گھبرانا، لیکن نماز کی لمبی چوڑی دعاؤں کی پرواہ نہ کرنا، اور نمازی پر سوار رہنا ایک ایسی منطق ہے جو شاید کسی عقل مند کی سمجھ میں کبھی بھی نہ آئے"۔ (دو اسلام ص۳۱۴-۳۱۵)

ازالہ

اذان شعائرِ اسلام میں سے ہے، اعلائے کلمۃ الحق ہے، اللہ وحدہ لاشریک لہ کی توحید کا اعلان ہے اور اس اکیلے کی عبادت کی طرف دعوتِ عام ہے۔ یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر شیطان اذان سے دور بھاگتا ہے۔ یہ آواز اس کو بری لگتی ہے اس سے اس کو ڈر محسوس ہوتا ہے اور وہ خوفزدہ ہو کر بھاگتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اس دعوتِ توحید کا عام اعلان اس کے کان تک پہنچے، اسی طرح جب اقامت ہوتی ہے تو کیونکہ اس میں بھی وہی اعلان ہوتا ہے اس لئے شیطان دور ہو جاتا ہے۔ (برق صاحب نے لکھا ہے کہ "جب نمازی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے" حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "جب نماز کی اقامت ہوتی ہے")

اس کے علاوہ بھی اس میں کوئی اور مخفی راز ہو تو ہم کو کیا علم، ہم لوگ غیب پر ایمان لانے والے ہیں اور ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کو بے چون وچرا تسلیم کرتے ہیں، اس کے کنہ اور رموز سے واقف ہونا ہمارے لئے ضروری نہیں اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اس وقت تسلیم کریں جب وہ ہماری عقل میں آجائے تو پھر ہمارا ایمان عقل پر ہوا نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، بلکہ اس طرح تو رسول کی تکذیب ہوئی، کہ اگر کوئی بات ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہم یہ

کہہ دیں کہ ہمیں آپ کی یہ بات تسلیم نہیں اور گویا آپ نے جو بات ہمیں بتائی ہے وہ غلط ہے، کسی صحیح حدیث کو اس طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا، کیونکہ اس اصول پر تو قرآن مجید بھی پورا نہیں اترتا، قرآنِ مجید میں ہے کہ مرتے وقت فرشتے مرنے والے سے باتیں کرتے ہیں، وہ جواب دیتا ہے، (مثلاً سورۂ نساآء کی آیت نمبر ۹۷ ملاحظہ ہو) لیکن یہ چیز ہماری عقل میں نہیں آتی، تو کیا اس کو ہم تسلیم نہ کریں؟

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ برق صاحب نے اس کو مان لیا ہے۔ اس کے آگے وہ لکھتے ہیں:۔

غلط فہمی

"چلو مان لیتے ہیں کہ شیطان بلند آواز سے گھبراتا ہے اس لیے بھاگ نکلتا ہے لیکن یہ تو فرمایئے کہ اگر نماز میں بھول صرف شیطانی تسلط کی وجہ سے ہوتی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیوں بھول جایا کرتے تھے.... کیا یہ شیطان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تسلط پا سکتا تھا،" (ص ۲۱۵)

ازالہ

برق صاحب بھول شیطان کی طرف سے بھی ہوتی ہے اور فطرۃً بھی ہوتی ہے۔ بھول سے صرف اللہ تعالیٰ مستثنیٰ ہے، قرآن میں ہے:۔

لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى (طٰہٰ:۵۲) میرا رب نہ بھٹکتا ہے، نہ بھولتا ہے۔

شیطان کی طرف سے جو بھول ہوتی ہے اس کی مثال مندرجہ ذیل آیت میں ہے:۔

فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ۔ (الکہف:۔ ۶۳)

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نے کہا کہ میں **مچھلی کو بھول گیا، اور آپ سے اس کا ذکر** کرنا مجھے شیطان ہی نے بھلا دیا۔

دوسری آیت میں ہے:۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ ۝ (الکہف:۔ ۷۳)

موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ جو بھول مجھ سے ہوئی اس پر میری گرفت نہ کیجیے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی بھولتے تھے، ان کے ساتھی کی بھول شیطان کی طرف سے تھی، اور خود ان کی بھول فطرۃً واقع ہوئی تھی، اور اس لحاظ سے بھول کی دو قسمیں ہوئیں، لیکن دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ بھول جس طرح پہلی مرتبہ شیطان کی طرف سے تھی، دوسری مرتبہ بھی شیطان کی طرف سے تھی، تو پھر وہی اعتراض قرآن مجید پر ہوگا جو حدیث پر ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام پر شیطان تسلط پا سکتا تھا، ہم اس نتیجہ کے اخذ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بھول فطری تھی جو انسان کی

تخلیق میں شامل ہے۔

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نماز میں بھول شیطان کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے اور فطرۃً بھی ہو سکتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھول فطرۃً تھی نہ کہ شیطان کی وجہ سے اور یہ چیز اس حدیث میں بھی موجود ہے جس کا حوالہ برق صاحب نے دیا ہے۔ نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ	میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں، اسی طرح بھولتا
(صحیح بخاری وصحیح مسلم)	ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صراحت کردی کہ میری بھول انسانی فطرت کے تقاضے سے واقع ہوئی تھی، برق صاحب حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے پھر بھی آپ نے اس کو شیطانی بھول سمجھ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطری بھول کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ ۝	اور جب آپ بھول جایا کریں تو اپنے رب کا ذکر
(الکھف : ۲۴)	کیا کیجئے۔

اور سنئے قرآن کیا کہتا ہے؟

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوْبَ إِذْ نَادٰى	اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کیجئے، جب
رَبَّهٗ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ	انہوں نے اپنے رب سے کہا، کہ شیطان
وَّعَذَابٍ ۝	نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں مبتلا کر
(ص : ۴۱)	دیا ہے۔

بتائیے ایوب علیہ السلام رسول تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو ان پر شیطان کا تسلط کیسے ہوگیا، کیا شیطان ایوب علیہ السلام پر بھی تسلط و قابو پا سکتا تھا، بتلائیے اب کیا کریں۔ کیا اس آیت کو قرآن مجید سے نکال دیں، کیونکہ اس آیت سے ایک رسول کی توہین ہوتی ہے۔

آخر اس آیت کا ہم کیا جواب دیں، غیر مسلموں کو اس کا کیا مطلب بتائیں، برق صاحب درحقیقت غلط فہمی سے کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا ہے، اور اس کی زد میں صرف حدیث ہی نہیں قرآن مجید بھی آ سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسی غلط فہمیوں سے پناہ میں رکھے بلا وجہ حدیث پر اعتراض کرنے سے کیا فائدہ۔ جب غلط فہمی سے اس سے زیادہ بڑا اعتراض قرآن مجید پر ہو سکتا ہے۔

بقول برق صاحب "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" (دو اسلام ص ۳۱۹)

غلط فہمی

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی نے کہا کہ فلاں شخص دن چڑھے تک سویا رہا، آپؐ نے فرمایا کہ شیطان اس کے کانوں میں مُوت گیا اس لیے سویا رہا۔"

لیکن اسی جلد کے صفحہ ۱۷۷ پر یہ روایت دی ہوئی ہے

"عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سفر تھے، پچھلی رات تک ہم چلتے رہے، سحر کے قریب لیٹ گئے اور دیر تک سوتے رہے.... سب سے پہلے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے، آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سرہانے کھڑے ہو کر بلند آواز سے تکبیر کہنا شروع کر دی، چنانچہ آپؐ بیدار ہوئے اور نماز پڑھائی۔"

اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ حضورؐ کے دن چڑھے تک سوئے رہنے کی وجہ بھی وہی تھی جو اوپر والی حدیث میں دی گئی ہے تو بغیر اس کے کیا کہیں گے کہ استغفراللہ، استغفراللہ۔ (دو اسلام صد ۳۱۵-۳۱۶)

ازالہ

برق صاحب دونوں حدیثوں کا موقع محل علیحدہ علیحدہ ہے۔ آپ نے دونوں کو ایک ہی سیاق و سباق میں پیش کر دیا اور یہی اصل غلط فہمی ہے، پہلی حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

مَا زَالَ نَائِمًا حَتّٰی اَصْبَحَ مَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ قَالَ ذٰلِكَ رَجُلٌ بَالَ الشَّیْطَانُ فِیْ اُذُنِہٖ ۝ (صحیح بخاری)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر ہوا کہ فلاں شخص دن چڑھے تک سوتا رہا، نماز نہیں پڑھی، آپ نے فرمایا، اس شخص کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا۔

یہ اس شخص کا حال ہے جو دیر سے اٹھتا ہے، نماز نہیں پڑھتا تو گویا اس پر شیطان کا تسلط ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی اس مضمون کو ادا کیا ہے۔

وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَہٗ شَیْطٰنًا فَہُوَ لَہٗ قَرِیْنٌ ۝ (الزخرف: ۳۶)	اور جو اللہ کے ذکر سے غافل ہو جائے تو ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔

برق صاحب اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ ایوب علیہ السلام پر شیطان کو جو تسلط دیا گیا تھا کیا وہ بھی اسی قبیل سے تھا تو آپ کیا جواب دیں گے؟ کیا اس وقت بھی آپ استغفراللہ استغفراللہ کہہ کر خاموش ہو جائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نیند آئی اور آپ دیر سے اٹھے وہ ایک دن کا واقعہ ہے جو جہاد سے واپسی کے وقت سفر میں پیش آیا۔ کافی رات تک سفر جاری رہا اور اس کے بعد آپ اور صحابہ کرامؓ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے کیونکہ ساری رات کے تھکے ہوئے تھے۔ لہذا فطرۃً آنکھ دیر سے کھلی یہاں دیر سے آنکھ کھلنے کو اللہ کے ذکر سے غفلت برتنے پر کس طرح محمول کیا جا سکتا ہے اور جب اللہ کے ذکر سے غفلت نہیں تو شیطان کا تسلط کیسے ہو سکتا ہے، برخلاف اس کے جو شخص روزانہ خواب غفلت میں پڑا رہتا ہے اللہ کے ذکر سے جی چراتا ہے، جاگ کر بھی نماز نہیں پڑھتا، تو ایسے شخص پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے یہ ہے ان دونوں احادیث کا مطلب۔

غلط فہمی

"حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے "جب تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کے لئے بیٹھے تو وہ قبلہ کی طرف منہ نہ کرے۔ نہ پیٹھ... اور یہ بھی ملاحظہ ہو۔

عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں حضرت حفصہ (رضی اللہ تعالے عنہا) کے پاس والے مکان کی چھت پر چڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور علیہ السلام قبلہ کی طرف پیٹھ کرکے قضائے حاجت فرمارہے ہیں۔ کس کو صحیح سمجھیں؟

(دو اسلام ص۳۱۶)

ازالہ

دونوں کو صحیح سمجھئے، کیونکہ دونوں صحیح ہیں اور اپنے اپنے محل پر واجب التعمیل اور قابل عمل ہیں، ان ہی عبداللہ بن عمرؓ نے جن کی روایت آپ نے نقل کی ہے ان دونوں حدیثوں کے تعارض کو رفع کر دیا ہے غالباً وہ وضاحت آپ کی نظر سے نہیں گذری۔ ایک صاحب نے عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا کہ انھوں نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا، اور اس کو اپنے اور قبلہ کی درمیان کرکے پیشاب کرنے بیٹھ گئے، ان صاحب نے عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کیا اس سے منع نہیں کیا گیا، عبداللہ بن عمرؓ نے جواب دیا۔

بَلٰی اِنَّمَا نُهِیَ عَنْ هٰذَا فِی الْفَضَآءِ فَاِذَا كَانَ بَیْنَكَ وَبَیْنَ الْقِبْلَةِ شَیْءٌ یَسْتُرُكَ فَلَا بَأْسَ۔

(رواہ ابوداؤد وسندہ حسن۔ نیل الاوطار جزاول ص۴۳)

بے شک اس سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ ممانعت کھلی فضا میں ہے، اگر تمہارے اور قبلہ کے درمیان کوئی چیز ہے تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ ممانعت اس وقت ہے جب کوئی آڑ نہ ہو اور جب کوئی چیز سامنے ہو، تو پھر ممانعت نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے پاخانہ میں قضائے حاجت

فرمارہے تھے۔ لہٰذا آپ کے اور قبلہ کے درمیان دیوار حائل تھی۔

غلط فہمی

صعب بن جثامۃ اللیثی کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک گورخر بھیجا، آپ نے لوٹا دیا۔۔۔۔ اور فرمایا کہ میں نے احرام باندھا ہوا ہے ورنہ ضرور لے لیتا (مسلم ج ۲۔ ص ۲۲۳)

مطلب یہ کہ احرام میں شکار کا گوشت کھانا ناجائز ہے اب دیکھئے یہ حدیث :۔

"سال حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ابو قتادہ بھی تھا جس کے بغیر باقی سب نے احرام باندھا ہوا تھا۔ اثنائے سفر میں ایک گورخر نظر آگیا، ابو قتادہ سوار ہوکر اس کے پیچھے دوڑ پڑا، اور آخر اسے برچھے سے مار لیا، ذبح کرکے پکایا، اور صحابہ کو پیش کیا، صحابہ نے حضورؐ سے پوچھا کہ کیا ہم کھالیں فرمایا کھالو یہ حلال ہے" (مسلم ج ۲ ص ۲۲۶) (دو اسلام ص ۳۱۷)

ازالہ

آپ نے ان دونوں احادیث کو تعارض کی مثال میں پیش کیا ہے حالانکہ تعارض بالکل نہیں ہے پہلی حدیث سے جو نتیجہ آپ نے نکالا ہے وہ بھی صحیح نہیں، احرام میں شکار کا گوشت کھانا جائز ہے بشرطیکہ :۔

۱۔ خود شکار نہ کیا ہو

۲۔ شکار کے سلسلہ میں کسی قسم کی مدد نہ کی ہو یا اشارہ نہ کیا ہو اور

۳۔ شکار کرنے والے نے محرم کی نیت سے شکار نہ کیا ہو۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

صَیْدُ الْبَرِّ لَکُمْ حَلَالٌ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ مَا لَمْ تَصِیْدُوْہُ اَوْ یُصَادُ لَکُمْ (رواہ ابو داؤد وغیرہ وھذا احسن حدیث روی فی ھذا الباب۔

بری شکار کا گوشت حالت احرام میں تمہارے لئے حلال ہے۔ بشرطیکہ تم نے خود شکار نہ کیا ہو، یا شکار تمہارے لئے نہ کیا گیا ہو۔

نیل الاوطار جزء ۵، ص ۲۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی محرم کو پیش کرنے کے لئے اگر شکار کیا جائے تو وہ شکار اس محرم کے لئے حرام ہے۔ حضرت صعب نے جو گورخر آپ کو پیش کیا تھا وہ انہوں نے آپ ہی کے لئے شکار کیا تھا اور اسی وجہ سے اس کا ایک حصہ نہیں بلکہ سالم گورخر آپ کی خدمت میں پیش کردیا، اور اسی لئے آپ نے قبول نہیں فرمایا اور جو گوشت ابو قتادہ نے پیش کیا وہ کھالیا۔ اس لئے کہ وہ شکار آپ کی نیت سے نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا تطبیق کی صورت تو دونوں حدیثوں میں موجود ہے

لیکن برق صاحب نے تحقیق نہیں کی۔

غلط فہمی

"یہی حدیث ذرا آگے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

"... اور کچھ گوشت ہم حضورؐ کے پاس لے گئے آپ نے خود تو نہ کھایا، لیکن صحابہؓ کو اجازت دے دی" ذرا آگے اسی واقعہ کو یوں پیش کیا گیا ہے....

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، کچھ باقی ہے؟ صحابہ نے کہا صرف ایک ٹانگ باقی ہے۔ چنانچہ آپ نے وہ ٹانگ لی اور کھا گئے"

(دو اسلام صفحہ ۳۱۷-۳۱۸)

ازالہ

برق صاحب نے ان دونوں عبارتوں کو تضاد کی شکل میں پیش کیا ہے یعنی ایک جگہ ہے کہ آپ نے گوشت نہیں کھایا، دوسری جگہ ہے کہ آپ نے کھایا، برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں کون سی بات صحیح ہے، اور کون سی غلط؟ اس کے متعلق عرض ہے کہ "آپ نے خود تو نہ کھایا" کے الفاظ حدیث میں نہیں ہیں، آپ پوری صحیح مسلم پڑھ جائیے ایسے الفاظ آپ کو کہیں نہ ملیں گے جن کا یہ ترجمہ ہو، جو برق صاحب نے نقل کیا ہے، درحقیقت برق صاحب کو اس جگہ بڑا زبردست دھوکا ہوا ہے۔

غلط فہمی

"ایک ہی بات کو اتنی متضاد صورتوں میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا قیامت تک حقیقت کو نہ پا سکے، بایں ہمہ ہمارے مُلّا ہر طرف سے شور مچا رہے ہیں کہ یہ وحی ہے خبردار جو اس کی صحت و صداقت پر شبہ کیا ورنہ تمہیں کا فر بنا کر جہنم میں اوندھا لٹکا دیں گے" (دو اسلام صفحہ ۳۱۸)

ازالہ

"آپ نے خود تو نہ کھایا" حدیث میں نہیں ہے لہٰذا تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر ترجمہ بھی برق صاحب نے صحیح طور پر پیش نہیں فرمایا، بعض صحابہ پہلے ہی کھا چکے تھے اور بعض نے کھانے سے انکار کر دیا تھا پھر یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، صحابہ نے مسئلہ پوچھا، آپ نے فرمایا کھالو، صحابہؓ نے کھایا، کچھ دیر بعد آپ نے فرمایا، کچھ بچا ہے؟ لوگوں نے کہا ایک پنڈلی بھی ہے، آپ نے وہ پنڈلی لے کر تناول فرمالی، بتائیے اس میں کیا تضاد ہے؟ لہٰذا کیوں نہ کہا جائے کہ یہ وحی ہے اگر تضاد ہوتا تو وحی نہ کہتے جب تضاد نہیں تو پھر وحی ماننے میں کیا عذر ہے۔؟

پھر برق صاحب یہ بھی یاد رکھیئے کہ یہ پورا واقعہ وحی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس پورے واقعہ سے جو نتیجہ نکلا وہ یہ مسئلہ ہے کہ محرم بعض شرائط کے ساتھ شکار کا گوشت کھا سکتا ہے اور یہ مسئلہ ہے جو من جانب اللہ وحی ہے بتائیے اس مسئلہ کے وحی ہونے سے کیا امر مانع ہے۔

غلط فہمی حضورؐ کا فرمان ہے "احرام میں ایسے کپڑے مت پہنو جن پر زعفران یا اور کوئی خوشبو لگائی گئی ہو"۔

لیکن حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ احرام باندھتے اور توڑتے وقت میں حضورؐ پر خوشبو چھڑکا کرتی تھی۔۔۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ احرام میں خوشبو لگانا جائز ہے یا ناجائز
(دو اسلام ص ۳۱۸)

ازالہ پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حالت احرام میں ایسے کپڑے نہ پہنے جائیں جو زعفران یا ورس سے رنگے گئے ہوں۔ ورس ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے برق صاحب نے اس کا ترجمہ "کوئی اور خوشبو" کیا ہے یہ صحیح نہیں۔ اس حدیث میں خوشبو لگانے یا نہ لگانے کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری حدیث میں برق صاحب نے خلوق کا ترجمہ "خوشبو" کیا ہے یہ بھی صحیح نہیں۔ خلوق زعفران کی ایک مرکب خوشبو ہے اور کیونکہ حالت احرام میں زعفرانی کپڑے کی ممانعت ہے، لہٰذا آپ نے اس شخص کو کپڑے اتارنے کا حکم دیا (نہ کہ دھونے کا جیسا کہ برق صاحب نے ترجمہ کیا ہے) اور بدن پر جو خلوق لگی ہوئی تھی اس کو دھونے کا حکم دیا لیکن خوشبو کی وجہ سے نہیں بلکہ زعفرانی رنگ کی وجہ سے اور اس چیز کی صراحت حدیث میں موجود ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

اِغْسِلْ عَنْكَ اَثَرَ الصُّفْرَةِ ۔ — اپنے بدن سے زردی کا اثر دھو ڈالو۔

(صحیح مسلم)

اب جن حدیثوں میں ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو لگایا کرتے تھے ان میں اور ان میں کوئی تعارض نہیں برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھنے کے بعد خوشبو نہیں لگاتے تھے، بلکہ احرام سے پہلے خوشبو لگایا کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں صراحت سے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:۔

كُنْتُ اُطَيِّبُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَطُوْفُ عَلٰى نِسَائِهٖ ثُمَّ يُصْبِحُ مُحْرِمًا يَنْضَحُ طِيْبًا ۔
(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۸۹)

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشبو لگایا کرتی تھی پھر اس کے بعد آپ اپنی بیویوں سے ملنے جایا کرتے تھے، پھر صبح کو آپ احرام باندھ لیا کرتے تھے اور خوشبو کی مہک آپ کے بدن مبارک سے آیا کرتی تھی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام سے پہلے اگر خوشبو لگائی جائے اور خوشبو کی مہک احرام

باندھنے کے بعد بھی آتی رہے تو یہ جائز ہے، بلکہ سنت ہے۔

غلط فہمی

"ابوذر نے حضورؐ سے پوچھا کہ کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے فرمایا، ہاں، میں نے دیکھا وہ ایک نور ہے" (مسلم ج ۱ ص ۹۴)

لیکن یہی ابوذر اگلی حدیث میں کہتے ہیں۔

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ کو دیکھا تھا، فرمایا "ھُوَ نُورٌ انی اراہ" وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں"

یعنی ایک حدیث میں دیکھنے کی نفی ہے اور دوسری میں اثبات"

(دو اسلام ص ۳۱۹)

ازالہ

جس حدیث کو برق صاحب نے اگلی بتایا ہے وہ پہلی حدیث ہے اور جس کو برق صاحب نے پہلی حدیث کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہ اگلی حدیث ہے، برق صاحب نے دوسری حدیث کو پہلے نقل کیا اور پہلی کو بعد میں، بات درحقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ہی حدیث ہے جس کو برق صاحب دو حدیثیں سمجھ رہے ہیں اس حدیث کو امام مسلم نے تین سندوں سے بیان کیا ہے۔ حدیث زیر بحث کو حضرت قتادہؓ سے روایت کرنے والے تین محدث ہیں ایک محدث نے اس روایت کو مختصر کر کیا ہے اس اختصار ہی کی وجہ سے برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ امام مسلم نے اس غلطی کو دور کرنے کے لئے فوراً حضرت قتادہؓ کے دوسرے شاگردوں کی سندیں نقل کردیں اور یہ بتا دیا کہ پہلے صاحب کی روایت میں یہ نقص ہے جس کو دور کرلیا جائے۔ حدیث کے جس حصہ کو وہ صاحب چھوڑ گئے ہیں، دوسرے اصحاب نے اسے بیان کیا ہے اور وہ حصہ امام مسلم نے آگے بیان کیا ہے گویا اس طرح حدیث کا متن محفوظ ہوگیا۔ اب ذیل میں دونوں سندوں کے متن درج ذیل ہیں، مقابلہ کیجئے تضاد کہاں ہے؟

سند اول: حضرت ابوذر پوچھتے ہیں آپ نے اللہ کو دیکھا تھا، آپ فرماتے ہیں نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ" وہ نور ہے اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں۔

سند ثانی و ثالث:۔ ان سندوں میں وہ الفاظ جو پہلی سند میں رہ گئے ہیں، مذکور ہیں یعنی آپ نے یہ بھی فرمایا تھا" رَاَیْتُ نُوْرًا " میں نے ایک روشنی دیکھی تھی۔

ان تینوں اسناد کو ملا کر حدیث کا پورا متن اس طرح ہوا "نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ رَاَیْتُ نُوْرًا" وہ تو نور مجسم ہے میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں، ہاں میں نے ایک روشنی دیکھی تھی۔

امام احمد کی مسند میں یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی متن میں بیان ہوئے ہیں، الفاظ یہ ہیں:۔

"قَدْ رَاَیْتُ نُوْرًا اَنّٰی اَرَاہُ" میں نے ایک روشنی دیکھی تھی، اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔

(فتح ربانی مع بلوغ الامانی جز ۲ ص ۲۵۹)

(بحوالہ رجال الصحیح)

امام مسلم کی دانائی کی داد دینی چاہیئے کہ پہلے تو انہوں نے مختصر حدیث کو مکمل کیا، پھر مزید غلط فہمی کو دور کرنے کے لیئے فوراً اس روشنی کی تشریح میں جس کو آپ نے دیکھا تھا ایک اور حدیث نقل کر دی جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"حِجَابُہُ النُّوْرُ" اللہ کا حجاب بھی نور ہے۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو روشنی دیکھی تھی وہ حجابات کی روشنی تھی، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور کی روشنی، بتائیے کہاں تضاد ہے؟

برق صاحب نے جو یہ الفاظ نقل کئے ہیں "ہاں میں نے دیکھا تھا وہ ایک نور ہے" معلوم نہیں یہ کن الفاظ کا ترجمہ ہے، صحیح مسلم میں اس قسم کی کوئی عبارت نہیں جس کا یہ ترجمہ ہو، معلوم نہیں برق صاحب نے یہ ترجمہ کہاں سے نقل فرمایا ہے۔

غلط فہمی

"مشہور واقعہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی ایک زوجہ کے ہاں جا کر شہد کھایا چند دیگر ازواج نے سازش کر کے حضورؐ سے کہا کہ آپ کے منہ سے بد بو آتی ہے جس پر حضورؐ نے قسم کھائی کہ میں آیندہ شہد نہیں کھاؤں گا۔ اور معاً یہ آیت نازل ہوئی، اے رسول ایک حلال چیز کو حرام کرنے کے اختیارات تمہیں کس نے دئے ہیں کیا تم بیویوں کو خوش کرنے کے لئے یہ کر رہے ہو (قرآن)

اس واقعہ کو تجرید بخاری ص۵۰۶ کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے زینب کے ہاں شہد کھایا اور حضرت عائشہ و حفصہ نے سازش کی، لیکن ایک اور حدیث (تجرید البخاری ص۳۹۱) میں بتایا گیا ہے کہ شہد حفصہؓ کے ہاں کھایا گیا تھا، اور سازش حضرت عائشہؓ حضرت سودہؓ، اور حضرت صفیہؓ نے کی تھی، یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس پر تہدید بھی نازل ہوئی لیکن پھر بھی ہمارے راوی نہ بتا سکے کہ حقیقت کیا تھی کیا انہی روایات کو وحی کہا جاتا ہے" (دو اسلام ص۳۱۹-۳۲۰)

ازالہ

یہ سازش کس نے کی تھی؟ اگر یہ نہ معلوم ہو سکا تو کون سا دینی حکم ناقص رہ گیا، بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی، کہ سازش کرنے والی بیوی کا نام لوگوں کو معلوم نہ ہو، تاکہ کسی بیوی کو اس معاملہ میں دوسروں کے سامنے شرمندگی کا موقع نہ ہو۔ وہ ستار تو پردہ پوشی فرماتا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ راوی اسے ظاہر کر دیں اور صحیح نام بتا دیں، یہ ناممکن ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مصلحت و ستاری کے منافی ہے، قرآن مجید نے بھی ناموں کی صراحت نہیں کی، نہ واقعہ کی تفصیل بیان کی صرف ایک اصول اور حکم بیان کر دیا اور خاموش ہو گیا، اب بتائیے یہ اصولی حکم دین کی

جان ہے یا وہ تفصیلات ؟ قرآن وحدیث میں دین کی باتیں ہوتی ہیں اور جہاں تک دین وعبرت کی باتیں ہوتی ہیں وہاں تک ان میں تفصیل ہوتی ہے، اور جہاں اور جن باتوں سے دین وعبرت کا تعلق نہیں ہوتا، وہاں صرف اشارے ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات حقیقت کو بالکل مستور رکھا جاتا ہے، مثلاً اصحاب کہف کی تعداد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف اقوال بیان کئے اور پھر بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کتنے ہیں بس اتنا کہہ دیا کہ ان کی صحیح تعداد کو صرف اللہ ہی جانتا ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ تین مختلف غلط اقوال بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی صرف صحیح تعداد بیان کردی جاتی۔ تینوں مختلف اقوال کا بطلان بھی ہوجاتا، اور صحیح تعداد بھی معلوم ہوجاتی۔ اتنا اہم واقعہ لیکن پھر بھی قرآن مجید یہ نہ بتاسکا کہ وہ کتنے تھے کیا اب ہم یہ کہنے کے مجاز ہیں کہ یہی وہ وحی ہے جس پر ایمان لانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے ہرگز ہمیں یہ اختیار نہیں ہے کہ ایسی باتیں منہ سے نکالیں، قرآن مجید ایسی غیر ضروری چیزوں کو وقعت نہیں دیتا، تعداد کا تعلق دین سے نہیں ہے لہٰذا اس سے خاموشی برتی گئی تو کوئی اعتراض نہیں اسی طرح سازش کرنے والی بیوی کو آشکارا نہ کیا گیا، کیونکہ اس کا تعلق دین سے نہیں، اگر اس بیوی کا نام نہ بھی معلوم ہو تو بھی دینی احکام میں کسی قسم کا نقص نہیں آتا۔

برق صاحب جن احادیث کو وحی کہا جاتا ہے وہ تو وہ احادیث ہیں جن سے دینی احکام مستنبط ہوتے ہیں، جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول وفعل سے ہوتا ہے، بیویوں کا نام بیان کرنا یہ تو صحابہ کا فعل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام بیان نہیں کئے اب اگر یہ نام محفوظ نہ ہوں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض صحابہ کے گمان صحیح نکلے، انہوں نے اپنے قیاس سے نام تو بتائے لیکن قیاس ٹھیک نہیں تھا اور اللہ کو یہی منظور تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صحابہ کا ظن وتخمین اگر خلاف واقعہ ہو تو اس سے حدیث نبوی پر کیا اثر پڑتا ہے ؟

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ احادیث میں جو کچھ ہو بس صحیح اور مطابق واقعہ ہو تو یہ نہیں ہوسکتا یہ چیز تو قرآن مجید میں بھی نہیں ہے، قرآن مجید میں کافروں کے غلط اقوال نقل ہوئے ہیں، شیطان کا غلط قیاس موجود ہے، بلکہ یہاں تک ہے کہ "اَغْوَيْتَنِي" شیطان نے کہا کہ اے اللہ تو نے ہی مجھے گمراہ کیا پھر نہ تو قرآن مجید میں اس غلط قیاس کی تردید ہے نہ گمراہ کرنے کے الزام کی تغلیط، اسی طرح اصحاب کہف کی تعداد کے سلسلہ میں تین غلط اقوال نقل کئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

پس ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص غلطی کرے اور اس غلطی کو ایک سچا آدمی نقل کردے تو اس سچے آدمی پر کوئی حرف نہیں آتا، لوگوں کے غلط اقوال نقل کرنے سے قرآن مجید کو غلط نہیں کہہ سکتے، اسی طرح کسی شخص کی غلطی یا غلط فہمی بیان کرنے سے کتب حدیث غلط نہیں ہوسکتیں۔ صحابہ نے ناموں کے بتانے میں قیاس کیا، قیاس میں اختلاف ہوگیا، محدثین نے اس اختلاف کو نقل کردیا تو اس سے

نفسِ حدیث پر کیا اعتراض ہے، کسی شخص کے گمان کو وحی کسی نے نہیں کہا ہاں وہ حدیث وحی ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی دینی احکام کی تشریح میں قولاً و فعلاً صادر ہوئی ہے اور ایسی ہر حدیث بالکل محفوظ ہے اور اس پر ایمان لانا لازمی ہے۔

برخلاف اس کے کسی شخص کے قیاس پر ایمان لانا ضروری نہیں، خواہ وہ حدیث کی کتاب میں ہو یا قرآن مجید میں، مثلاً شیطان کا یہ قیاس کہ میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں یا یہ کہ مجھے اللہ نے گمراہ کردیا، ان قیاسوں کی صحت پر ہمارا ایمان نہیں ہے، ہمارا ایمان محض اللہ تعالیٰ کی خبر پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شیطان نے یہ قیاس کیا تھا اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ بعض صحابہ نے حضرت عائشہ کا نام بتایا تھا لیکن ان دونوں قیاسوں کی صحت پر ہمارا ایمان نہیں اور نہ ان غلط قیاسوں کے بیان کرنے والے یا نقل کرنے والی کتابیں ناقابلِ اعتبار ہیں اس طرح غلط گمانوں، غلط قیاسوں کو نقل کرنے سے کتاب غیر معتبر ہو جائے تو پھر یہ اعتراض قرآن مجید پر بھی ہوگا، نعوذ باللہ!

غلط فہمی

"صفحات گذشتہ میں ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ کس طرح حضرت جبریل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ بچپن میں چیر کر وہ حصہ کاٹ ڈالا تھا جس پر شیطان کا تسلط ہوا کرتا ہے اس واقعہ کے متعلق ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل چھت پھاڑ کر گھر میں اتر آیا تھا، اور اس نے آپ کا سینہ چیرا تھا۔

(مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۲۴)

چھت پھاڑنے کی بھی خوب کہی، ایک نوری مخلوق کہ جس کا نہ کوئی جسم ہے نہ وزن چھت پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر بالفرض وزن و جسم تھا تو کیا گھر میں داخل ہونے کے لئے کوئی دروازہ موجود نہیں تھا؟ سب کچھ تھا۔ (دو اسلام صفحہ ۳۲۰)

ازالہ

برق صاحب آپ نے یہ نہیں بتایا کہ رات کے وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا یا بند تھا، اگر بند تھا تو پھر چھت کو پھاڑ کر آنے میں کیا تعجب ہے، اگر بند نہیں تھا تو اس کا کیا ثبوت ہے حوالہ دیجئے:۔

دوسرا اعتراض برق صاحب کا یہ ہے کہ نوری مخلوق کے لئے دروازہ کی ضرورت ہی کیا ہے ہم کہتے ہیں کہ روشنی بھی تو ایک نور ہے، لیکن روشنی بغیر روشندان، سوراخ، دروازہ یا کھڑکی کے کمرہ میں داخل نہیں ہوتی، کیا کسی بند مکان میں آپ نے روشنی کو آتے دیکھا ہے؟ پھر روشنی کی شعاعوں کے لئے ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے وہ ہے واسطہ (Medium) سائنسدانوں نے واسطہ کو ضروری سمجھا اور جب ان کی سمجھ میں کوئی واسطہ نہیں آیا تو ایک فرضی واسطہ بنا بیٹھے جس کا نام انہوں نے ایتھر (Ether) رکھ لیا، بتائیے کیا نور کے لئے بھی کسی واسطہ کی ضرورت

ہے؟ سائنس تو یہی کہتی ہے کہ نور کے لئے شفاف واسطہ کی ضرورت ہے لہذا نوری مخلوق کے لئے بھی واسطہ کی ضرورت ہے، آخر یہ کیا مشکل بات ہے جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔

برق صاحب ذرا برق کو ملاحظہ فرمائیے کتنی غیر مرئی چیز ہے لیکن اس کو واسطہ اور راستہ کی ضرورت ہے جب تک اس کے لئے برقی موصل نہ ہو وہ گذر نہیں سکتی، اگر موصل ہو تو ٹھیک ورنہ وہ چھتوں کو پھاڑتی ہوئی دیواروں کو توڑتی ہوئی اپنا راستہ بنا لیتی ہے، اسی پر فرشتوں کو قیاس کر لیجئے اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی مصلحت کو اور چسپاں کر لیجئے، انشاء اللہ آپ کی سمجھ میں آجائے گا رہا حکم کوئی تو وہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے اس کے ذریعہ سے ہر ناممکن چیز ممکن ہو جاتی ہے، اس حکم سے اس وقت بحث نہیں اس وقت تو بحث سائنس کی روشنی میں ہو رہی ہے اللہ تو سب کچھ کر سکتا ہے لیکن عادت الٰہی یہی ہے کہ پہلے سبب پیدا کرتا ہے۔

غلط فہمی لیکن جب تک ہمارے علماء داستان میں ڈرامائی رنگ نہ بھر لیں، انہیں تسلی نہیں ہوتی (دو اسلام صفحہ ۳۲۰ - ۳۲۱)

ازالہ برق صاحب قرآن شریف میں ہے:۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ۔ (النمل:۔ ۴۰)	ایک ذی علم شخص نے کہا کہ میں ملکہ سبا کے تخت کو اتنی دیر میں لا سکتا ہوں جتنی دیر میں آپ کی پلک جھپکے (اتنی دیر میں وہ تخت آ گیا) تو اس کو دیکھ کر سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے۔

کیا یہ بھی ڈرامائی رنگ ہے؟ دوسری آیت ملاحظہ فرمائیے:۔

وَاٰتَیْنٰہُ مِنَ الْکُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَہٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ (القصص:۔ ۷۶)	ہم نے قارون کو اتنے خزانہ دئے تھے کہ آدمیوں کی ایک طاقت ور جماعت اس کی کنجیوں کے بوجھ کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

یہ تو کنجیوں کا حال ہے تو پھر خزانوں کے وزن کا اللہ ہی حافظ ہے کیا یہ بھی ڈرامائی رنگ ہے؟

برق صاحب قرآن شریف کو آپ غور سے پڑھ لیں تو کم از کم حدیث کے متعلق آپ کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، کیا مذکورہ بالا آیتوں کے بیان کو بھی آپ علماء کی رنگ آمیزی کہہ سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ حدیث میں ایسی بات آئی اور آپ کو تعجب ہوا۔

غلط فہمی "اسی واقعہ کو مالک بن صعصعہؓ خواب کا واقعہ بتاتے ہیں اور میرے خیال میں یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے" (دو اسلام صفحہ ۳۲۱)

ازالہ جب یہ بات تھی تو بلاوجہ آپ نے اس حدیث پر اعتراض کیا۔

انتباہ

برق صاحب نے اس شق صدر کو جو ایام طفولیت میں ہوا تھا اور اس شق صدر کو جو واقعہ معراج میں ہوا تھا، ایک ہی واقعہ سمجھا اور اسی لئے انہوں نے ان دونوں حدیثوں کو بطور تعارض نقل کیا ہے کیونکہ دونوں واقعات علیحدہ علیحدہ ہیں اس لئے تفصیلات میں فرق ہونے سے تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کاش لکھنے سے پہلے وہ اس پر غور کر لیتے۔

غلط فہمی ابوموسیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ مردوں میں بڑے بڑے کامل انسان ہوگذرے ہیں لیکن عورتوں میں آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران کے بغیر کوئی اور عورت درجہ کمال تک نہیں پہنچی اور یاد رکھو کہ جس طرح ثرید کھانوں کا سردار ہے اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا تمام عورتوں کی سردار ہے (بخاری جلد ۲ صہ ۱۶۱)

خلاصہ یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خیر النساء ہیں، لیکن ایک اور حدیث میں مذکور ہے۔

کہ امت عیسیٰ کی بہترین عورت مریم تھی اور میری امت کی بہترین خدیجۃ الکبریٰ ہیں (بخاری ۲ صہ ۱۶۴) یعنی خدیجۃ الکبریٰ خیر النساء ہیں۔

ایک اور حدیث میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جنتی عورتوں کا سردار قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو بخاری ۲ صہ ۱۴۲) اب ہم کیا سمجھیں کہ خیر النساء کون ہے؟ (دو اسلام صہ ۳۲۱)

ازالہ یہ تو صحیح ہے کہ پہلی حدیث کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تمام عورتوں سے افضل ہیں، تمام اگلی اور پچھلی عورتوں کی سردار ہیں اب دوسری حدیث کا مطلب سنیئے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

خَیْرُ نِسَآءِھَا مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَخَیْرُ نِسَآءِھَا خَدِیْجَۃُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ ہ قال ابوکریب واشار وکیع الی السماء والارض (صحیح مسلم)

(آسمان و زمین کی) بہترین عورت مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد ہیں۔

اس حدیث میں تو یہ نہیں ہے کہ حضرت خدیجہؓ تمام عورتوں کی سردار ہیں یا حضرت مریم تمام عورتوں کی سردار ہیں ہاں دونوں کا شمار دنیا کی بہترین عورتوں میں ہے۔

تیسری حدیث جو حضرت فاطمہؓ کے متعلق ہے اس میں حضرت فاطمہ کی منقبت میں تین قسم کے جملے ہیں جو ایک دوسرے کی تشریح کرتے ہیں۔

۱۔ سَیِّدَۃُ نِسَآءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ ٥	جنتی عورتوں کی سردار
۲۔ سَیِّدَۃُ نِسَآءِ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ ٥	اس امت کی عورتوں کی سردار
۳۔ سَیِّدَۃُ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ ٥	مؤمنین کی عورتوں کی سردار (یعنی اس حدیث کی روشنی میں ازواج مطہرات مستثنیٰ ہوگئیں)

تینوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت فاطمہؓ اس امت کے مؤمنین کی عورتوں کی سردار ہوں گی، حضرت عائشہ صدیقہؓ تمام عورتوں کی سردار ہوں گی اور حضرت خدیجہؓ روئے زمین کی بہترین عورتوں میں سے ہیں۔

دوسرا جواب

ان تینوں کا جواب ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے فرض کیجیے حضرت مریم، حضرت عائشہؓ، اور حضرت فاطمہؓ عورتوں کی سردار ہیں تو اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے، یعنی ایک کمانڈر ان چیف تمام فوج کا سردار ہوتا ہے وزیر دفاع بھی فوج کا سردار ہوتا ہے، وزیر اعظم بھی فوج کا سردار ہوتا ہے اور پھر بادشاہ یا صدر بھی فوج کا سردار ہوتا ہے ہر ایک کی سرداری میں فرق ہوتا ہے لیکن ہیں سب سردار، یہاں بھی اسی طرح آپ فرض کر سکتے ہیں کہ حضرت فاطمہ بھی سردار اور ان سے اوپر حضرت مریمؑ اور حضرت خدیجہؓ بھی سردار، اور ان سب کے اوپر حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی سردار، بتائیے اب کیا اشکال رہا، اس اشکال کو دور کرنے کے بعد ہم پوچھتے ہیں کہ اگر یہ گتھی نہ بھی سلجھے تو آخر یہ دین کا کون سا ایسا حکم ہے جس کو نہ سمجھنے سے عمل میں کوتاہی ہو گی اگر ان تینوں احادیث کا خلاصہ ہم اتنا ہی مان لیں کہ یہ چاروں عورتیں بہترین عورتیں ہیں تو بتائیے ہمارے ایمان میں کون سی کمی آجائے گی۔

تیسرا جواب

اچھا اب ان احادیث کا جواب قرآن مجید کی روشنی میں ملاحظہ فرمایئے، قرآن مجید میں ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ (آلِ عمران:۱۱۰) تم بہترین امت ہو۔

دوسری آیت میں ہے :۔

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (الجاثیۃ :۔ ۱۶) ہم نے بنی اسرائیل کو تمام عالم پر فضیلت دی تھی۔

"عالَمِیْنَ" جملہ "رَبُّ الْعَالَمِیْنَ" کا بھی ایک جز ہے، اور اس کا مفہوم کتنا وسیع ہے یہ آپ کو بھی معلوم ہے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ "خیر امت" امتِ محمدیہ ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ "خیر امت" امت موسوی ہے، اب بتلائیے کہ خیر امت (بہترین امت) کون ہے ؟ جو تطبیق کی صورت آپ یہاں پیدا کریں گے، وہی احادیث میں بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ پیدا کرنے کی کوشش کریں، برق صاحب اسی لئے تو ہم بار بار کہتے ہیں کہ حدیث کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کے بڑے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ فللہ الحمد۔

باب ۱۹

چند دلچسپ احادیث

غلط فہمی "آج گھر گھر ریڈیو موجود ہے، رات کے نو بجے پہلے ریڈیو کے پاس بیٹھ کر انگلستان لگا دیجیے پھر ٹوکیو، اور اس کے بعد امریکہ، آپ کو معاً یقین ہو جائے گا کہ زمین کا سایہ (رات) نصف دنیا پر ہے اور نصف دیگر پر آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، اس حقیقت کی وضاحت کے بعد اب ذرا یہ حدیث دیکھیے:۔

..."آپ نے فرمایا کہ سورج بعد از غروب خدا کی تخت (عرش) کے نیچے سجدہ میں گر جاتا ہے رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے، چنانچہ اسے دوبارہ مشرق سے نکلنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اسے اجازت نہیں ملے گی اور حکم ہو گا کہ لوٹ جاؤ، چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے نکلنا شروع کر دے گا" (دو اسلام صفحہ ۳۲۳)

ازالہ اگر سورج کے چلنے پر اعتراض ہے تو یہ تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا — سورج اپنے مستقر کی طرف چلتا رہتا ہے

(یٰس: ۳۸)

اور سائنس نے بھی سورج کی حرکت کو تسلیم کر لیا ہے:۔

اب رہا سجدہ کرنا، تو یہ بھی قرآن مجید سے ثابت ہے، سنیئے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَ	کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین کی تمام مخلوقات، سورج، چاند، تارے

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۔ (الحج :۔ ۱۸)

پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے آدمی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں ۔

لہٰذا سجدہ کرنے کا جو اعتراض حدیث پر ہے وہی قرآن مجید پر ہوگا، نعوذ باللہ منہ ۔

غلط فہمی

"اگر ہم رات کے دس بجے پاکستان ریڈیو سے دنیا کو یہ حدیث سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج عرش کے نیچے سجدہ میں پڑا ہوا ہے تو ساری مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنس دے اور وہاں کے تمام مسلمان اسلام چھوڑ دیں" (دو اسلام صہ ۳۲۴)

ازالہ

برق صاحب یہ عبارت اس طرح بھی تبدیل کی جا سکتی ہے کہ اگر ہم دن کے بارہ بجے بھارت ریڈیو سے یہ آیت دنیا کو سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج سجدہ میں پڑا ہوا ہے اور ہمالیہ پہاڑ بھی سجدہ میں پڑا ہوا ہے تو مغربی دنیا ہی نہیں ساری دنیا کھلکھلا کر ہنس دے اور پھر کیا کہے یہ آپ خود سوچ لیں ۔

برق صاحب آپ نے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح ہم سجدہ کرتے ہیں اسی طرح تمام مخلوق سجدہ کرتی ہے ، بس یہی اصلی غلط فہمی ہے ہر ایک مخلوق کی نماز، تسبیح، سجدہ علیحدہ علیحدہ ہے، اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :۔

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۔ (النور :۔ ۴۱)

ہر چیز اپنی نماز اور تسبیح کو جانتی ہے ۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۔ (الاسراء :۔ ۴۴)

لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے ۔

اب معلوم ہوا کہ سورج چاند اور پہاڑ وغیرہ سجدہ تو کرتے ہیں لیکن ان کے سجدہ کی کیفیت کا ہمیں علم نہیں، لہٰذا حدیث اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن کیفیت کا ہمیں علم نہیں کہ سورج سجدہ کس طرح کرتا ہے، عرش کے نیچے جانے کا کیا مطلب ہے ؟ اجازت چاہنے کا کیا مطلب ہے ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ ان باتوں کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں اور نہ ان کے پیچھے پڑنا چاہیئے ، برق صاحب آپ سائنس کی روشنی میں بھی اگر اس حدیث کا ترجمہ کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے ۔ آپ نے تو نہیں کیا لیکن ہم کئے دیتے ہیں ۔

اِنَّهَا تَذْهَبُ

سورج غروب ہو جاتا ہے ۔

حَتّٰى تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ	اور اللہ تعالیٰ کے شاہانہ حکم تکوینی اور شاہی قوانینِ حرکت کے ماتحت اطاعت وعبودیت کے ساتھ سربسجود رہتے ہوئے اپنی حرکت کو جاری رکھتا ہے ۔
فَتَسْتَأْذِنُ فَيُؤْذَنُ لَهَا	وہ ہر لمحہ ہر آن اذنِ الٰہی سے آگے بڑھتا رہتا ہے ۔
وَيُوْشِكُ أَنْ تَسْجُدَ	لیکن قیامت کے قریب ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ وہ انہی شاہی قوانینِ حرکت کے ماتحت آگے بڑھنا چاہے گا ۔
فَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا	لیکن اب اس کو آگے بڑھنے کی منظوری نہیں دی جائے گی ۔
فَيُقَالُ لَهَا ارْجِعِي مِنْ حَيْثُ جِئْتِ	اور اس سے کہا جائے گا کہ اب اس مستقر سے واپس ہوجا اور اسی طرف چلا جا جس طرف سے تو آرہا ہے { یہ مستقر یا (Turning Point) وہ جگہ ہے جہاں رُک کر وہ فوراً واپس ہوگا ۔ }
فَتَطْلُعُ مِنْ مَغْرِبِهَا الخ	پس وہ مغرب سے طلوع ہوگا ۔ (قرآنِ مجید کی آیت " وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا " کی یہی تفسیر ہے)

بتائیے ان معنوں میں کیا اشکال ہے ، برق صاحب بات درحقیقت یہ ہے کہ کچھ تو آپ سمجھے نہیں اور کچھ رنگ آمیزی سے ترجمہ کیا گیا ، مثلاً " رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے ،، حالانکہ متن میں یہ عبارت نہیں ہے ۔ پورا متن اوپر نقل کردیا گیا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

برق صاحب مذکورہ بالا معنی ہم نے مادّی لوگوں کی خاطر کر تو دئیے ہیں لیکن ہم تو اس حدیث پر بلا کیف ایمان لاتے ہیں اور اس کی تاویل کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں ۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ۔

حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ	ذوالقرنین جب وہاں پہنچے جہاں سورج غروب

وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ — ہوتا ہے تو دیکھا کہ وہ کیچڑ کے چشمہ میں غروب ہو رہا ہے۔ (الکہف: ۸۶)

اب آپ فرمائیں اس سائنس کے زمانہ میں ریڈیو پاکستان سے مغرب کے وقت یہ آیت اگر سنادی جائے تو کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ غلط فہمی سے بچائے، آمین۔

غلط فہمی

"ابن عمرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو، اس لئے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے (بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۳۴)

سورج کی موٹائی ساڑھے بتیس ارب میل ہے۔ اگر اتنی بڑی چیز شیطان کے دو سینگوں میں سما جاتی ہے...... اتنا بڑا شیطان کہاں کھڑا ہوتا ہوگا"

(دو اسلام صفحہ ۳۲۴)

ازالہ

برق صاحب کو بڑی غلط فہمی ہوئی، انہوں نے مادی عینک سے اس حدیث کو دیکھا ایسی حدیثوں پر بلاکیف و تاویل ایمان لانا چاہیئے، نہ کہ مادی دنیا کے فاصلے ناپنے لگ جائیں۔ حدیث کا مطلب اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم یہ فرض کریں کہ شیطان سورج کے سامنے اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ دیکھنے والے کو سورج اس کے دو سینگوں کے درمیان دکھائی دے اگر ہم اپنی دو انگلیوں کو علیٰحدہ کرکے آنکھ سے ذرا دور سورج کی طرف کرلیں تو سورج دو انگلیوں کے بیچ میں دکھائی دے گا۔ بس اسی طرح دو سینگوں کے درمیان میں بھی دکھائی دے سکتا ہے، اگرچہ ہماری آنکھیں ان سینگوں کو نہیں دیکھتیں، لیکن کیونکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاچکے ہیں، لہٰذا مخبر صادق کی اس بات پر بھی ہمارا ایمان بالغیب ہے، اگر ہم ہر بات پر مشاہدہ اور عقل کی رٹ لگائیں تو پھر "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" (قرآن مجید) کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم یہ یقین کرلیں کہ یہ شیطانی اوقات ہیں، ان ہی اوقات میں شیطان کے اولیاء طاغوت کی عبادت کرتے ہیں حدیث کے الفاظ ہیں۔

وَحِیْنَئِذٍ یَسْجُدُ لَهَا الْکُفَّارُ — اس وقت کفار سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

کیونکہ یہ وقت سورج پرستوں کی عبادت کا ہے اور ان سے مشابہت ناجائز ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمادی، یہ ہے عمل کی چیز اور اسی سے ہم کو کام ہے، باقی رہا اس حدیث کی تاویل تو وہ اللہ ہی کو معلوم ہے ہمیں اس سے کیا بحث، شیطان کے طول و عرض سے ہمارے عمل کا کوئی تعلق نہیں۔

جدید سائنس کے مطابق خلا کے فاصلے لامحدود ہیں۔ ایک ایک تارا سورج سے کئی گنا بڑا ہے اور وہ ایک سیکنڈ میں کروڑوں روشنی کے سال چلتا ہے اور روشنی کے سال کا ایک ایک سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کے برابر ہے۔ لہٰذا خلا کی پہنائیوں کا اندازہ لگانا بالکل ناممکن ہے اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ شیطان کے کھڑے ہونے کی جگہ اس فضا میں موجود ہے یا نہیں۔

برق صاحب اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ اس چشمہ کا طول و عرض کیا ہے جس میں از روئے قرآن مجید سورج غروب ہو جاتا ہے تو ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ کیا سورج کا چشمہ میں غائب ہو جانا آج کل کی سائنس کے مطابق ہے؟ جب اس مشاہدہ کی چیز اور مادی دنیا کے حوادثات کے متعلق قرآن مجید کا یہ بیان ہو اور بغیر تاویل کے اس کا صحیح مطلب سمجھا نہ جا سکتا ہو تو پھر جو حدیث روحانیت سے تعلق رکھتی ہو جس کا مشاہدے اور مادیت سے کوئی تعلق نہ ہو اس کو بغیر تاویل اس طرح ظاہر ترجمہ سے کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ انصاف کیجئے۔

غلط فہمی

"حدیث کا علم الافلاک آپ پڑھ چکے"

(دو اسلام ص۳۲۵)

ازالہ

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ بالکل سچ فرماتا ہے:۔

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّن كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۝ (الصافات ۱۔ ۶، ۷)	آسمانِ دنیا کو ہم نے ستاروں سے زینت دی ہے اور ان ستاروں کو سرکش شیطان سے حفاظت کا سبب بھی بنا لیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ (الملک ۔ ۵)	اور ان ستاروں کو ہم نے شیاطین کو مارنے کا آلہ بنایا ہے۔

بتائیے کیا سائنس بھی یہی کہتی ہے:۔

غلط فہمی

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جہنم نے خدا کے پاس شکایت کی، کہ میرا دم گھٹ چکا ہے اس لئے مجھے سانس لینے کی اجازت دیجئے۔ اللہ نے کہا تم سال میں صرف دو سانس لے سکتے ہو چنانچہ اس کی ایک سانس سے موسم گرما اور دوسری سے موسم سرما پیدا ہو گیا

(بخاری جلد ۲ ص۱۴۳)

لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ہر سال گرمیوں کے موسم میں صرف وہی علاقے اس سانس کی لپیٹ میں کیوں آتے ہیں جو خطِ استوا کے قریب ہیں "

(دو اسلام ص۳۲۶)

ازالہ ہو سکتا ہے کہ جہنم کا تعلق براہ راست ہماری دنیا سے نہ ہو بلکہ سورج سے ہو۔ اور سورج کا تعلق براہِ راست ہماری دنیا سے ہو، لہٰذا سردی، گرمی جو ہم محسوس کرتے ہیں وہ سورج کے اثر سے کرتے ہیں اور اسی کی طرف اس سردی گرمی کو منسوب کرتے ہیں، حدیث میں گرمی و سردی کے اصل سبب کا بیان ہے۔ دوزخ کے سانسوں کا اثر سورج قبول کرتا ہے اور پھر وہ اثر قرب و بعد کے لحاظ سے ہماری دنیا کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے۔

حدیث میں یہ نہیں ہے کہ موسم جہنم کے سانس سے پیدا ہوتے ہیں، حدیث میں تو صرف اتنا ہے کہ جاڑوں کے موسم میں جب سخت سردی اور گرمیوں کے موسم میں جب سخت گرمی پڑتی ہے تو اس کا سبب جہنم کا سانس ہوتا ہے (برق صاحب نے حدیث کا صحیح ترجمہ نقل نہیں فرمایا) یہ دونوں مواقع زیادہ سے زیادہ چند دن رہتے ہیں نہ کہ چار پانچ مہینے۔

ہمارا ایمان صرف مشاہدات اور تجربات پر ہی نہیں ہوتا بلکہ غیب پر بھی ہوتا ہے لہٰذا جو کچھ حدیث میں ہے اس پر بھی ہمارا ایمان ہے، صحیح تاویل کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں لہٰذا اس میں کوئی بھی اشکال نہیں، قرآن مجید میں بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر ہم ایمان بالغیب لاتے ہیں، خواہ وہ ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آنا، فرشتوں کا وجود، سدرۃ المنتہیٰ، ہوا کا سلیمان علیہ السلام کے تابع ہونا اور ان کے حکم سے چلنا، اصحاب کہف کا بے آب و دانہ صدہا سال تک سوتے رہنا، کھانے کا سو سال تک نہ سڑنا، حضرت خضر کا خلاف عقل و نقل اور بظاہر خلافِ شرع ایک معصوم بچے کو ایسے گناہ پر قتل کر دینا جس کا وہ ابھی مرتکب نہیں ہوا تھا، ستاروں سے شیطان کو مارنا وغیرہ وغیرہ، بس اسی طرح ہم اس حدیث پر بھی ایمان لاتے ہیں جہنم سے سورج کا کیا تعلق ہے یہ قدرت کا ایک خفیہ راز ہے جس کا کھوج ممکن ہے آیندہ کبھی سائنس کی روشنی میں لگایا جا سکے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ٹیلی ویژن، کہ اس میں اور جس کی وہ تصویر ہے اس میں کیسا خفیہ تعلق ہے اور آج سے پچاس سال پہلے ہم اس خفیہ راز سے قطعًا نا آشنا تھے۔

غلط فہمی حدیث کہتی ہے:۔

"اگر مکھی شربت وغیرہ میں گر جائے تو اسے پوری طرح غوطہ دے کر باہر نکالو اس لئے کہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفا"

مکھی بیت الخلاء سے اڑ کر آئی ہے، پر اور ٹانگیں غلاظت سے لتھڑی ہوئی ہیں اور

مولانا اس کے دوسرے پر میں شفا تلاش کر رہے ہیں (دو اسلام صد ۳۲۷ - صد ۳۲۸)

ازالہ

یہ تو سب مانتے ہیں کہ مکھی جب گندگی پر بیٹھتی ہے تو بہت سے جراثیم اس کے پر دں میں چمٹ جاتے ہیں، البتہ شک اس بات میں ہے کہ اس مکھی میں جراثیم کش دوا بھی ہے اس شک کی بنا لاعلمی پر ہے علامہ عبداللہ القصیمی لکھتے ہیں :۔

" موجودہ دور کے ایک مشہور ڈاکٹر نے ایک سال پیشتر "جمیعۃ الھدایۃ الاسلامیہ" میں ایک مفصل مضمون اس بارے میں نقل کیا تھا جس کا ماحصل یہ ہے :۔

" مکھی گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں پر بیٹھتی ہے جو ان جراثیم سے بھرے ہوتے ہیں جو طرح طرح کی بیماریوں کے پھیلانے کا باعث بنتے ہیں، ان جراثیم میں سے بعض اس کے پہلوؤں سے چمٹ جاتے ہیں اور کچھ اس کے پیٹ کے اندر پہنچ جاتے ہیں اس سے اس کے جسم کے اندر ایک زہریلا مادّہ پیدا ہوجاتا ہے اس مادہ کا نام اہل طب کی اصطلاح میں "مبعد البکتیریا" ہے لیکن اس مادّہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت سی بیماریوں کے جراثیم کو ختم کر دیتا ہے اور مبعد البکتیریا کے موجود ہونے کی صورت میں ان جراثیم کا زندہ رہنا یا انسانی جسم میں کچھ اثر کرنا ناممکن ہوجاتا ہے نیز مکھی کے ایک پر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ مبعد البکتیریا کو اس کے پیٹ سے ایک پہلو کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے، لہٰذا مکھی جب کسی کھانے یا پینے کی چیز پر بیٹھتی ہے تو پہلو سے چمٹے ہوئے جراثیم اس میں ڈالتی ہے تو مبعد البکتیریا میں سے جو مادّہ قریب ہوتا ہے ان جراثیم کو فنا کر دیتا ہے ان جراثیم سے بچانے والی سب سے پہلی چیز وہ مبعد البکتیریا ہے جسے مکھی اپنے پیٹ میں اپنے ایک پر کے پاس اٹھائے ہوتی ہے۔ لہٰذا چمٹے ہوئے زہریلے جراثیم کو ہلاک، اور ان کے عمل کو بے کار کرنے کے لئے یہ چیز کافی ہے کہ پوری مکھی کو کھانے میں ڈبو کر باہر پھینک دیا جائے" (یہ ہے موجودہ زمانہ کے ایک مشہور ڈاکٹر کے بیان کا خلاصہ)

اس کے علاوہ انگلستان کے مشہور طبی رسالہ (Doctorian Experiments) اپنے نمبر ۱۰۳۷ (شائع شدہ ۱۹۲۷ء) میں لکھتا ہے۔

" مکھی جب سبزیوں اور کھیتوں پر بیٹھتی ہے تو اپنے ساتھ مختلف بیماریوں کے جراثیم اٹھا لیتی ہے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ جراثیم مر جاتے ہیں اور ان کا اثر زائل ہوجاتا ہے اور ان کی جگہ مکھی کے پیٹ میں بکتر یوفاج نامی ایک مادّہ پیدا ہوتا ہے جو زہریلے جراثیم کو ختم کرنے کی خصوصیت رکھتا ہے اگر تم کسی نمکین پانی میں مکھی کے پیٹ کا مادّہ ڈالو تو تمہیں وہ بکتریو فاج مل سکتا ہے جو مختلف بیماریاں پھیلانے والے چار قسم کے جراثیم کا مہلک ہے اس کے

علاوہ مکھی کے پیٹ کا یہ مادہ بدل کر بکٹر لیفاج کے بعد ایک ایسا مادہ بن جائے گا جو چار مزید قسم کے جراثیم کو فنا کرنے کے لئے مفید ہو گا ،،

(بینات ترجمہ مشکلات الاحادیث النبویۃ ص۱۱۹ - ۱۲۰)

الغرض حدیث شک و شبہ سے پاک ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک علمی معجزہ ہے۔

غلط فہمی " یہ حدیث کسی ایسے ہی مکھی چوس مُلّا کی ایجاد معلوم ہوتی ہے۔
(دو اسلام ص۳۲۸)

ازالہ برق صاحب اگر بہت ہی قیمتی کوئی چیز آپ تیار کر رہے ہیں، مثلاً حلوا سوہن خمیرہ گاؤزبان عنبری، جواہر والا اور اتفاق سے جب وہ رقیق حالت میں ہو اس میں مکھی گر جائے تو انصاف سے بتائیے آپ کیا کریں گے کیا وہ ساری چیز آپ پھینک دیں گے یا مکھی نکال کر پھینک دیں گے اور وہ چیز استعمال کرلیں گے، پہلی صورت میں تو بہت بڑا نقصان ہو گا اور غالباً شاید ہی کوئی حلوائی یا دواساز کارخانہ ایسا کرے اور دوسری صورت میں اس چیز میں مضر جراثیم کی آمیزش ہوگی لہذا وہ چیز بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان پہنچائے گی، حدیث نے ایسے ہی موقع کے لئے آپ کو ایک سستا نسخہ دے دیا ہے کہ نہ مالی نقصان ہو اور نہ صحت کا نقصان، ایسے موقع پر آپ اس نسخہ کو استعمال کر سکتے ہیں اور اگر آپ اس کو پانی کے ہر گلاس پر استعمال کرنا چاہیں تو پھر آپ کو اختیار ہے حدیث آپ پر پابندی نہیں لگاتی۔

غلط فہمی "مرد کا نطفہ سفید ہوتا ہے اور عورت کا زرد، انزال کے بعد یہ ہر دو قسم کے نطفے مل جاتے ہیں اگر یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو تو بچہ پیدا ہوتا ہے ورنہ بچی۔ (مسلم جلد ۱ ص۴۶۸)

ماہرین تولید اس امر پر متفق ہیں کہ عورت کا نطفہ مقدار میں بے حد کم ..... اس میں چاہیئے تو یہ تھا کہ مجامعت سے ہمیشہ لڑکا پیدا ہوتا، لیکن حالت یہ ہے کہ لڑکیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں اور لڑکے کم" (دو اسلام ص۳۲۸، ص۳۲۹)

ازالہ برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا ہے۔ متن مع صحیح ترجمہ درج ذیل ہے۔

فعلا مَنِیُّ الرَّجُلِ مَنِیَّ	اگر مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ پر غالب
الْمَرْأَةِ أَذْكَرَا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَإِذَا	آجاتا ہے تو اللہ کے حکم سے لڑکا ہوتا ہے اور اگر
عَلَا مَنِیُّ الْمَرْأَةِ مَنِیَّ الرَّجُلِ	عورت کا نطفہ مرد کے نطفہ پر غالب آجاتا ہے تو
آنَثَا بِإِذْنِ اللّٰهِ (صحیح مسلم کتاب الحیض)	اللہ کے حکم سے لڑکی ہوتی ہے۔

یعنی اصل چیز جو کارفرما ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور یہی وہ راز ہے جس کے متعلق برق صاحب لکھتے ہیں :۔

"یہ فطرت کے وہ رموز ہیں، جنہیں کوئی ماہرِ فطرت آج تک نہیں سمجھ سکا۔"

(دو اسلام ص ۳۲۸)

اس موقعہ پر پہنچ کر ہم سوال کرتے ہیں کہ جب ان رموز کو آپ سمجھ ہی نہ سکے تو آپ نے حدیث پر اعتراض ہی کیوں کیا، دوسری بات یہ ہے کہ یہ غلبہ باذن الٰہی ہوتا ہے لہٰذا مقدار کو اس میں کوئی دخل نہیں اگر آپ نے علم کیمیا (Chemistry) پڑھی ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹائٹریشن (Titration) کرتے وقت ایک قطرہ ایک بہت بڑے محلول پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے لہٰذا غلبہ قوت کی نسبت سے ہوتا ہے نہ کہ مقدار کی نسبت سے۔

غلط فہمی

"خدوخال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے، مجامعت کے وقت اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر" (بخاری ج ۲ ص ۱۴۹)

"داد دیجئے اس ملا کو کہ فطرت کے ایک نہایت مخفی راز کو کس بے تکلفی صفائی اور آسانی سے بے حجاب کر دیا ہے" (دو اسلام ص ۳۲۹)

ازالہ

برق صاحب نے "سبق" کے معنی سبقتِ نزول کر دئیے حالانکہ یہ معنی صحیح نہیں دوسری حدیث میں اس کی تشریح ہے، ارشادِ گرامی ہے :۔

إِذَا عَلَا مَاءُ الرَّجُلِ مَاءَهَا — جب مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ پر غالب ہوتا ہے (تو بچہ باپ کے مشابہ ہوتا ہے)

(صحیح مسلم)

برق صاحب! اگر یہ مخفی راز ہے تو آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ حدیث قابلِ اعتراض ہے آپ اس کو حدیث کا علم التولید کہہ کر متعجب ہیں لیکن قرآن مجید کے علم التولید سے متعجب نہیں کہ بغیر مرد کے نطفہ کے بچہ پیدا ہو گیا۔

بچہ کی مشابہت ماں یا باپ سے ہونا، ایک ایسی بات ہے جس کو عام الفاظ میں ادا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ اگر آپ علم توالد و تناسل (Genetics) کے ابواب کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ والدین کی خصوصیات جو بچہ میں منتقل ہوتی ہیں اس کا طریقہ انتہائی دقیق ہے اور اس کا سمجھنا عام انسان تو کجا تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بھی جنہوں نے باقاعدہ علم الحیات کا مطالعہ نہ کیا ہو ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن اس پورے دقیق اور پیچیدہ طریق کا لب لباب یہی ہے کہ اگر مردانہ خصوصیات کے حامل ذرے (genes) غالب رہتے ہیں تو لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اگر اس کے برعکس ہو تو لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ ایک سائل نے جب اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

سوال کیا تو آپ نے ان عام فہم الفاظ میں اس گتھی کو سلجھا دیا، سائل کی بھی تشفی ہو گئی، اور حقیقت کے بھی خلاف نہ ہوا۔

غلط فہمی

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہو جو فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ اور ابلیس کی زد سے بالکل باہر ہو تو لیجئے نسخہ حاضر ہے:۔

ابن عباس رض حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، کہ جب کوئی شخص مجامعت کرنے لگے تو یہ دعا پڑھ لے" بسم اللّٰہ اللھم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقتنا" (اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو شیطان سے بچا) اس کی اولاد کو شیطان کبھی گمراہ نہیں کر سکے گا۔ (بخاری)

کتنی امرت دھارا قسم کی دعا ہے کہ نہ قرآن کی ضرورت باقی رہی نہ رسول کی، اس لئے کہ قرآن و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام تو ہدایت ہے اور جس بچے کے گمراہ ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہا ہو، قرآن و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے کس کام کے؟" (دو اسلام صفحہ ۳۳۰)

ازالہ

ہمارا کام دعا کرنا ہے، قبول کرنا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ۝ (المؤمن ۔ ۶۰)	مجھ سے دعا مانگو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرة ۔ ۱۸۶)	میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جس وقت بھی وہ مجھ سے دعا مانگے۔

لہٰذا اگر ایسے موقع پر جب کہ جذبات کی رَو میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے، کوئی شخص اللہ کو نہ بھولے اس سے گڑگڑا کر دعا مانگے تو کیا تعجب ہے کہ قبول ہو جائے اور اگر قبول ہو جائے تو بچہ کا شیطان سے محفوظ رہنا کیا مشکل ہے اور جو شخص شیطان سے محفوظ رہے گا اس ہی کے کام رسولؐ آئے گا، قرآن بھی آئے گا، حدیث بھی آئے گی اور جو شخص شیطان کے نرغہ میں پھنس گیا، پھر وہ ہدایت پا ہی کیسے سکتا ہے اس کے لئے تو اللہ اور رسولؐ اور ان کی ہدایت سب بے کار ہے قرآن مجید میں ہے:۔

وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ	جو رحمٰن کے ذکر سے غافل ہو جائے تو ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں، بس پھر وہی اس کا

قَرِیۡنٌ ۝ (الزخرف ۱۔ ۲۶) ساتھی ہوتا ہے۔
بتائیے اس شیطان سے بچنے کے لئے اللہ کو یاد کیا جائے یا نہیں اور اگر پھر بھی اعتراض باقی رہے تو یہ بتائیے کہ قرآن مجید میں "اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ" پڑھنے کا حکم کیوں دیا ہے؟

غلط فہمی

"مرغ کیوں بانگ دیتا ہے گدھا کیوں ہینگتا ہے.... شیر کیوں دھاڑتا ہے... ان تمام سوال کا حل تو مشکل ہے، البتہ ایک دو سوالات کے جوابات حاضر ہیں۔
ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب تم مرغ کی صدا سنو، تو اللہ سے فضل کی دعا مانگا کرو۔ اس لئے کہ اس وقت مرغ کو فرشتہ نظر آیا کرتا ہے اور جب گدھے کی آواز سنو، تو شیطان سے پناہ مانگو، اس لئے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے"۔ (دواسلام صد ۳۳۰-۳۳۱)

ازالہ

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مرغ کو رات کے وقت (مسند احمد) فرشتے دکھائی دیتے ہیں، اور جب وہ کسی فرشتے کو دیکھتا ہے۔ تو اس وقت اذان دینے لگتا ہے لہذا جب تم اسے اذان دیتے سنو تو اللہ کا فضل طلب کرو، قرآن مجید میں ہے:۔
هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ اللہ اور اس کے فرشتے تم پر رحمت بھیجتے ہیں۔ (الاحزاب ۱۔ ۴۳)
لہذا ایسے وقت میں فضل تلاش کرنا، جب کہ فرشتے فضل و رحمت تقسیم کر رہے ہوں زیادہ مناسب ہے اسی طرح گدھے کو رات کے وقت (مسند احمد) شیطان نظر آتے ہیں اور ان کو دیکھ کر اس پر بھی شیطنت سوار ہو جاتی ہے لہذا ایسے وقت میں جب کہ شیطان کی آمد و رفت ہو، شیطان سے پناہ مانگنا بہت مناسب ہے۔
یہ چیزیں امور غیب سے ہیں اور ان پر اعتراض لایعنی ہے، مرغ کا فرشتہ کو دیکھنا، اور گدھے کا شیطان کو دیکھنا بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جانوروں میں بعض باتوں کا ادراک انسان سے زیادہ ہوتا ہے۔ چیل کے انتہائی بلندی پر اڑنے کے باوجود مرغی کو اس کی موجودگی کا ادراک ہو جاتا ہے، اور بچوں کی حفاظت کے لئے عجیب سی آواز نکالتی ہے چیونٹی کی قوت شامہ، مور کی قوت سامعہ، اور چیل کی قوت باصرہ انسان سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں، مور میلوں دور کی آواز سن لیتا ہے چیونٹی بہت دور سے خوشبو سونگھ لیتی ہے، چیل بہت اونچائی سے چھوٹی سی بوٹی دیکھ لیتی ہے جب کوئی آفت آنے والی ہوتی ہے تو سیال گاؤں کے قریب اگر تمام

رات رو تے ہیں دیہاتیوں نے اس کا بارہا تجربہ کیا ہوگا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی شدید طوفان یا زلزلہ آنے والا ہوتا ہے تو اس کے آنے سے پہلے جنگلی جانور اس مقام کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جانوروں میں بعض غیر مرئی اشیاء کو دیکھنے یا محسوس کرنے کی قوت ہوتی ہے تو پھر کیا عجب ہے کہ مرغ فرشتہ کو دیکھ لیتا ہو، اور گدھا شیطان کو۔

غلط فہمی

"اگر کوئی شخص کسی محفل میں جا کر تین مرتبہ سلام کرے اور ہر بات کو تین تین مرتبہ دہرائے تو آپ اسے کب تک برداشت کریں گے ......

انس رض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ وہ تین مرتبہ سلام کہتے اور ہر بات کو تین مرتبہ دہراتے تھے" (دو اسلام ص۳۳۱)

ازالہ

برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ تین مرتبہ سلام کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ ایک شخص کو تین مرتبہ سلام کیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو باہر کھڑے ہو کر سلام کرتے اگر جواب مل جاتا تو خیر ورنہ دوسری مرتبہ سلام کرتے، اب بھی اگر جواب نہ ملتا تو تیسری مرتبہ سلام کرتے۔ اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ ملتا تو واپس چلے آتے۔ اور اگر پہلی مرتبہ سلام کرنے کے بعد جواب مل جاتا تو پھر ملاقات کے وقت دوسرا سلام کرتے اور پھر رخصت ہوتے وقت تیسرا سلام کرتے، اسی طرح جب آپ کو کوئی بات سمجھانی ہوتی تو اس کو تین مرتبہ دہراتے تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

جس حدیث کو برق صاحب نے نقل کیا ہے اس کے ذرا آگے یہ حدیث بھی ہے عبداللہ بن عمر رض کہتے ہیں کہ عصر میں ہم لوگوں کو دیر ہو گئی تھی لہذا ہم لوگ جلدی جلدی وضو کرنے لگے اور پیروں پر مسح کرنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو بلند آواز سے دو تین مرتبہ فرمایا:

وَيْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ ۔ یعنی خشک ایڑیوں کے لئے آگ ہے

(صحیح بخاری۔ کتاب العلم)

٭ ٭ ٭

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاص خاص جملے آپ مکرر سہ کرر ارشاد فرماتے تھے تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں اور سمجھ میں آجائیں، برق صاحب یہ دینی مسائل ہیں اور مسائل کو تین تین مرتبہ دہرانا۔ تاکہ سب لوگ سن لیں اور یاد رکھیں۔ قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ یہی مناسب ہے، یہ تقریر و تحریر نہیں جس میں یہ بات معیوب سمجھی جائے، اس تشریح کے بعد وہی حدیث جس کو برق صاحب نے مختصر نقل کیا ہے پوری سنئے:

عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ — حضرت انس رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی مسئلہ بیان فرماتے

أَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ وَإِذَا أَتٰى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا (صحیح بخاری)

تو تین دفعہ اس کو دہراتے تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور جب کسی قوم سے ملنے جاتے تو تین مرتبہ سلام کرتے ۔

اس تشریح کے بعد اعتراض تو رفع ہوگیا تاہم ہم چاہتے ہیں کہ قرآنِ مجید سے بھی اس کا جواب دے دیں، قرآن مجید میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو بار بار دہرایا گیا ہے آدم علیہ السلام کے قصہ کو سات مرتبہ دہرایا گیا ہے اور ہر مرتبہ وہی مضمون ، اسی طرح بہت سے انبیاء کے قصص بار بار دہرائے گئے ہیں، آخر یہ کیوں ؟ کیا یہ بھی عجیب ہے یا نہیں ؟ آپ کہیں گے الفاظ تو بدل گئے ہیں۔ تو یہ بھی صحیح نہیں ، بعض جگہ تو الفاظ بھی وہی ہوتے ہیں، مزید براں سورۂ قمر میں ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں ۔ پورے چار مرتبہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کو دہرایا ہے :۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کردیا ہے، ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے ؟

سورۂ مرسلات ایک چھوٹی سی سورت ہے اس میں ایک ہی جملہ

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

اس دن جھٹلانے والوں کے لئے خرابی ہے ۔

کو دس مرتبہ دہرایا گیا ہے اور تو اور سورۃ الرحمٰن جیسی چھوٹی سی سورت میں

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۔

کو ۳۱ مرتبہ دہرایا گیا ہے ۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ جس بات پر زور دینا مقصود ہوتا ہے وہی بار بار دہرائی جاتی ہے لہٰذا اس قسم کی تکرار اگر قرآن مجید میں ہو تو کوئی عیب کی بات نہیں اور اگر حدیث میں ہو تو بھی کوئی عیب کی بات نہیں ہے ۔

غلط فہمی

"حضور علیہ السلام کے بے شمار اقوال وخطبات ہمارے سامنے موجود ہیں ، کہیں بھی کسی بات کو تین تین مرتبہ دہرایا نہیں گیا"

(دو اسلام صفحہ ۳۳۱)

ازالہ

بے شمار کلمات ہیں جن کو آپ نے دہرایا ہے ایک مثال تو اوپر بیان ہوچکی اور مثالوں کے لئے کتب احادیث ملاحظہ فرمائیں :۔

غلط فہمی

"حذیفہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب آئے اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کردیا (بخاری ج ۱ صفحہ ۳٦)

امام بخاری میں ہی یہ جرأت تھی کہ اس معلم کائنات و مہبط الوحی کی طرف یہ فعل منسوب

کردیا ورنہ ہم تو حضور کے متعلق اس قسم کی کوئی بات خیال تک لانا گناہ سمجھتے ہیں"
(ص ۳۳۳)

ازالہ برق صاحب نے ترجمہ میں دو غلطیاں کی ہیں:۔
اوّل:۔ آپ نے حضرت حذیفہؓ کے سامنے پیشاب کیا حالانکہ یہ قطعاً صحیح نہیں بلکہ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں:۔

قُمْتُ عِنْدَ عَقِبِهٖ حَتّٰى فَرَغَ ۔	میں آپ کے پیچھے کھڑا رہا، یہاں تک کہ آپ فارغ ہوئے ۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دوسری طرف دیوار بھی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

فَاَتٰى سُبَاطَةَ قَوْمٍ خَلْفَ حَائِطٍ فَقَامَ ۔	یعنی آپ ایک قوم کے کھاد کے ڈھیر کے پاس آئے اور دیوار کے پیچھے آپ کھڑے ہو گئے

لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے دیوار کی طرف منہ کیا اور حضرت حذیفہ کو اپنے پیچھے کھڑا کیا اور پھر کھڑے ہو کر پیشاب کیا ۔

دوم:۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ برق صاحب نے "بَالَ" کا ترجمہ "پیشاب کردیا" کیا ہے، حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "پیشاب کیا"۔ برق صاحب اگر آپ کی مادری زبان اردو نہیں ہے تو خیر آپ قابل معافی ہیں ورنہ "بَالَ" کا ترجمہ "پیشاب کردیا" کر کے آپ نے حد ہی کردی کسی اردو دان سے پوچھ لیجئے کہ "پیشاب کیا" اور "پیشاب کردیا" میں کتنا بڑا فرق ہے ۔

برق صاحب کا اعتراض اس حدیث پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے متعلق ہے، یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرتے تھے اور سوائے ایک مرتبہ کے آپ کا کبھی کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ثابت نہیں ۔

برق صاحب آپ تو اسے معیوب سمجھ رہے ہیں لیکن ذرا کسی مغرب زدہ، تجدید مذہب کے دلدادہ شخص سے پوچھئے تو وہ اس حدیث کو سن کر خوش ہوگا اور مُلّا کو برا بھلا کہے گا کہ اس نے یہ پابندیاں لگا رکھی ہیں ورنہ حدیث میں تو کھلی چھٹی ہے ۔

غلط فہمی آپ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہوں گے کہ زلزلے آسمانوں میں بھی آیا کرتے ہیں اور اس زور سے کہ اللہ کا تخت تک کانپنے لگتا ہے .....
آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ سعد بن معاذ کی موت پر خدائی تخت کانپنے لگ گیا تھا ۔
سعد کی موت پر عرش کیسے ہل گیا تھا ؟ اسے سمجھنے کے لئے قیامت کا

انتظار کیجئے :۔ (دو اسلام ص۳۳۳)

ازالہ برق صاحب آپ نے صحیح بات کہہ دی یہ حدیث ایسی نہیں کہ اسے سمجھا جا سکے نہ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس طرح قرآن مجید میں آیاتِ متشابہات ہیں اور ان پر صرف ایمان لایا جاتا ہے اسی طرح بعض احادیث بھی متشابہات ہوتی ہیں اور ان پر صرف ایمان لایا جاتا ہے ان کے اصل مفہوم کا ادراک عقل انسانی نہیں کر سکتی، لہٰذا اس حدیث کو سمجھنے کی کوشش ہی آپ کو نہ کرنی چاہیئے، قرآن مجید میں ہے :۔

وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ — اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔
(ھود :۔ ۷)

بتلایئے اس آیت کو کس طرح سمجھیں، دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (الحاقۃ :۔ ۱۷) — قیامت کے دن تیرے رب کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔

بتایئے اس آیت کا کیا مطلب ہے کیا اللہ تعالیٰ تخت پر بیٹھتا ہے؟ کیا اللہ کو فرشتے اٹھا سکتے ہیں ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ ہم تو اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرتے ہیں آپ بھی ایسا ہی کیجئے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل :۔ ۳۶) — جس چیز کا علم نہ ہو، اس کے پیچھے نہ پڑو۔

لہٰذا ان چیزوں کے پیچھے پڑنا حرام ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (الدخان :۔ ۲۹) — ان کی موت پر آسمان اور زمین نہیں روئے۔

گویا بعض لوگوں کی موت پر زمین و آسمان روتے ہیں یعنی ان کو رنج و غم ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ عرش کے رنج و ملال کرنے پر تعجب کا اظہار کیا جائے جو مطلب اس آیت کا کیا جائے گا وہی مطلب حدیث کا بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اعتراض فضول ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عرش کا ہل جانا، کوئی محاورہ ہو، جو انتہائی غم کے موقع پر استعمال ہوتا ہو مثلاً انتہائی غم کے موقع پر یہ محاورہ "زمین کا پاؤں کے نیچے سے نکل جانا" استعمال ہوتا ہے

غلط فہمی "اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ سعدی نے گلستان سات زبانوں میں لکھی تھی تو آپ کیا سمجھیں گے؟ یہی کہ انہوں نے گلستان کے سات نسخے

تیار کیے تھے ایک فارسی میں دوسرا عربی میں .... وعلیٰ ہذا القیاس، لیکن اگر کوئی شخص فارسی کی گلستان کے متعلق یہ کہے کہ سات زبانوں میں لکھی ہوئی ہے تو آپ اسے یہی کہیں گے کہ سر پر ٹھنڈا پانی ڈال لو....

حضور نے فرمایا، کہ قرآن سات زبانوں میں اتارا گیا ہے (مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۶۳)

کیا سات زبانوں میں اتارنے کا مفہوم یہی ہے کہ ایک ہی آیت سات مختلف زبانوں میں اتری تھی۔ تو پھر وہ باقی چھ زبانوں کے قرآن کہاں چلے گئے،،
(دو اسلام صفحہ ۳۳۳، صفحہ ۳۳۴)

ازالہ

حدیث کا مطلب سمجھنے میں برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی ذیل میں متن حدیث مع ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

عَنْ أُبَيِّ ابْنِ كَعْبٍ قَالَ كُنْتُ فِي الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ يُصَلِّي فَقَرَأَ قِرَاءَةً أَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ ثُمَّ دَخَلَ آخَرُ فَقَرَأَ قِرَاءَةً سِوَى قِرَاءَةِ صَاحِبِهِ۔ (صحیح مسلم جلد اول باب بیان ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا، ایک شخص داخل ہوا اور نماز پڑھنے لگا۔ اس نے ایسی قرأت کی کہ مجھے بری معلوم ہوئی، پھر دوسرا شخص داخل ہوا، اس نے دوسرے طریقہ سے قرأت کی۔

حدیث مذکور سے صاف ظاہر ہوا کہ اختلاف پڑھنے کے طریقہ میں تھا، لب ولہجہ میں اختلاف تھا، ان پڑھنے والوں کا لہجہ قریش کے لب ولہجہ سے مختلف تھا، لہذا حضرت ابی بن کعب کو اس طرح پڑھنا ناگوار گذرا، پھر یہ قضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، آپ نے ان دونوں کی قرأت کو درست فرمایا۔

پھر آپ نے جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان کے ساتوں لہجوں میں قرآن مجید پڑھنے کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ایک اور حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔ (صحیح مسلم)

یہ قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہے پس جو قرأت تمہیں آسان معلوم ہو اس قرأت سے تم تلاوت کر سکتے ہو۔

اس حدیث کی بنا پر قرآن مختلف طریقوں سے آج تک پڑھا جاتا ہے، ہندوستان کی قرأت

علیحدہ ہے، مکی قرأت علیحدہ ہے، مصری قرأت علیحدہ ہے، علیٰ ہذا القیاس، مختلف ممالک میں مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے، ہماری اُردو زبان کو دیکھئے کہ یہ زبان تمام ہندو پاکستان میں بولی جاتی ہے لیکن دہلی اور یو، پی کے لہجہ میں ہر جگہ نہیں بولی جاتی۔ پنجابیوں کا لہجہ علیحدہ ہے، سرحدیوں کا علیحدہ ہے، بنگالیوں کا علیحدہ، اور حد تو یہ ہوگئی کہ حیدر آباد دکن کا لہجہ بالکل علیحدہ ہے، بعض لہجے ایسے ہیں کہ کانوں پر بار گذرتے ہیں، لہجے بدل رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود زبان ایک ہی ہے، برق صاحب نے لہجہ کو زبان سمجھ لیا۔ حالانکہ حدیث میں زبان کا کوئی ذکر نہیں۔ اور یہی غلط فہمی کا اصل موجب ہے۔

غلط فہمی "سینکڑوں حفاظ نے حضورؐ کی مقرر کردہ ترتیب کے مطابق قرآن مجید کو یاد کر لیا تھا اور ایک نسخہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں موجود تھا جو چمڑے کے ٹکڑوں پتھروں اور پتوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا۔ جب حضرت صدیقؓ کے زمانہ میں حفاظ قرآن کی ایک خاصی تعداد جنگ یمامہ میں شہید ہوگئی تو آپ نے نسخۂ رسول سے ایک نیا نسخہ تیار کرایا"

(دو اسلام ص ۳۲۵)

ازالہ یہ قطعاً صحیح نہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتب کیا ہوا قرآن مجید موجود تھا۔ یہ بھی قطعاً صحیح نہیں کہ اسی نسخہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک نیا نسخہ تیار کرایا تھا، یہ چیزیں بالکل بے ثبوت ہیں، برق صاحب نے بے حوالہ ان کو نقل کیا ہے بلکہ احادیث و تاریخ دونوں اس کی تکذیب کرتی ہیں۔

غلط فہمی "جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ مسجد نبوی میں ایک درخت تھا جس کے پاس کھڑے ہو کر حضورؐ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ جس روز منبر تیار ہوگیا اور آپ منبر پر چڑھ کر وعظ کہنے لگے، تو اس درخت نے رونا شروع کیا... حضورؐ منبر سے اُترے، اس درخت پر ہاتھ پھیرا اور وہ چپ ہوگیا"

"حضورؐ مکہ سے نکلے تو نہ ان کا گھر رویا، نہ کوئی درخت نہ پتھر۔ پھر اس مسجد والے درخت کو کیا خاص صدمہ پہنچا تھا" (دو اسلام ص ۳۲۶، ص ۳۲۷)

ازالہ برق صاحب یہ معجزہ ہے اور معجزے شاذ و نادر ہی صادر ہوا کرتے ہیں یہ نہیں کہ ساری زندگی ہی معجزہ بن جائے۔

غلط فہمی "رونے کے لئے احساس، دل، دماغ، پھیپھڑوں، گلے اور دقیق نظام جسمانی کی ضرورت ہے یہ سب کچھ اس درخت میں کہاں سے آگیا تھا"

(دو اسلام ص ۳۲۷)

ازالہ

برق صاحب قرآن مجید میں ہے :-

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ۔ (الانبیاء :- ۷۹)

اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا وہ پہاڑ تسبیح کیا کرتے تھے۔

پڑھنے کے لئے منہ کی، زبان کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو منہ اور زبان پہاڑوں میں کہاں سے آگئی تھی اور سنیئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ۔ (البقرۃ :- ۷۴)

اور بے شک بعض پتھر ایسے ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔

بتایئے ڈرنے کے لئے دل و دماغ کی ضرورت ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو پھر بغیر دل و دماغ کے پتھروں میں خشیت الٰہی کہاں سے آگئی، برق صاحب درخت کا رونا ایک معجزہ ہے۔ اگر درخت کے دل و دماغ اور پھیپھڑے ہوتے تو پھر اس کو معجزہ کون کہتا ؟ معجزہ تو اسی صورت میں ہے کہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہ ہو اور پھر درخت رو دے۔

موسیٰ علیہ السلام کے عصا پر غور کیجئے وہ کس طرح سانپ بن گیا تھا، اور سانپ بن کر تمام جادو کے سانپوں کو نگل گیا تھا۔ نگلنے کے لئے بھی منہ گلے پھیپھڑے اور احساس کی ضرورت ہے یہ چیزیں لکڑی کے عصا کو کہاں میسر ؟ معجزہ کہتے ہی اس بات کو ہیں، جو خلافِ عادت واقع ہو، لہٰذا درخت کے رونے پر اعتراض محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

غلط فہمی

" اگر آپ کہیں کہ یہ معجزہ تھا تو رسول صلعم نے کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا " هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا "۔ میں ایک انسان ہوں جس کا کام اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا ہے نہ کہ معجزے دکھانا " (دو اسلام ص ۲۳۷)

ازالہ

برق صاحب " نہ کہ معجزے دکھانا " کن الفاظ کا ترجمہ ہے۔ قرآن مجید کے متن میں تو ایسی کوئی عبارت نہیں کیا اسی طرح عصائے موسیٰؑ اور ید بیضاء کے معجزہ ہونے کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا کام بھی یہ نہیں تھا کہ معجزے دکھائیں۔

سورۂ بنی اسرائیل کو پڑھ کر دیکھئے، کفار مکہ نے کتنے معجزوں کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ کر دیجئے۔ وہ کر کے دکھایئے، آپ ہمارے سامنے آسمان پر سیڑھی لگا کر چڑھ جایئے وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ یہ کہہ دیں کہ معجزہ دکھانا میری قدرت میں نہیں میں تو صرف ایک انسان اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، معجزے دکھانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ ان مطالبات کو پورا کرنے سے عاجز نہیں وہ اس کمزوری سے پاک ہے وہ دکھا سکتا ہے وہ جب چاہے گا ان معجزات کا ظہور ہو جائے گا بغیر اس کی مشیت کے میں اس مطالبہ

کے پورا کرنے سے عاجز اور قاصر ہوں البتہ :۔

سُبْحَانَ رَبِّي (بنی اسرائیل :۔۹۳) میرا رب اس عجز سے پاک ہے۔

اس کے بعد یہ الفاظ ہیں :۔

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ میں تو بس ایک انسان اور رسول ہوں

(بنی اسرائیل :۔ ۹۳)

میرے ذمہ رسالت کے فرائض انجام دینے ہیں، مجھے اللہ تعالیٰ نے مختارِ کل بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے تمہیں معجزے دکھاؤں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے کفّار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کر دیا تھا اس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے اسی سورت میں بیان فرمادی ہے۔ ارشاد ہے :۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ	اور ہمیں معجزہ دکھانے سے یہ امر مانع ہے کہ ان
اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَيْنَا	سے پہلے لوگ معجزوں کو جھٹلا چکے ہیں، اور ہم
ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا	نے ثمود کو بطور معجزہ ایک اونٹنی دی تھی، لیکن
بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا	انھوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا اور ہم تو معجزے
تَخْوِيْفًا ۝ (بنی اسرائیل :۔ ۵۹)	تخویف کے لئے بھیجا کرتے ہیں۔

اس آیت سے واضح ہوگیا کہ پہلی قوموں نے معجزے مانگے، پھر معجزوں کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لائے اسی طرح یہ لوگ بھی ایمان نہیں لائیں گے اور کیونکہ معجزہ تخویف یعنی عذاب الٰہی کے لئے نہائیہ (Ultimatum) ہوتا ہے، لہذا اگر منہ مانگا معجزہ دکھا دینے کے بعد وہ قوم ایمان نہیں لاتی، تو پھر عذابِ الٰہی نازل ہوتا ہے۔ گذشتہ قوموں کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ہلاک کر دیا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو تباہ کرنا اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا اور کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ان میں سے کثر لوگ بعد میں ایمان لانے والے ہیں اور ابھی وقت مقررہ سے پہلے ایمان نہیں لا سکتے لہذا یہ بھی تکذیب کر دیں گے اور ہلاک ہو جائیں گے لہذا اللہ تعالیٰ نے ازراہِ ترحم، منہ مانگا معجزہ نہ دکھایا اور پوری قوم کو عام تباہی سے بچا لیا، ہاں جن لوگوں کو بعد میں شق القمر کا معجزہ دکھایا تو پھر انکو بہت جلدی بدر کے میدان میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی کہ پوری قوم کو شق القمر کے معجزہ میں شریک نہیں کیا بلکہ اس میں صرف وہی لوگ شریک تھے جن کی قسمت میں ایمان نہ تھا۔

پھر یہ بھی قطعًا صحیح نہیں کہ آپ نے کافروں کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا، ہاں منہ مانگا معجزہ نہیں دکھایا، اس لئے کہ وہ عذاب کے لئے نہائیہ ہوتا ہے دوسرے معجزوں کا ثبوت قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ ارشاد باری ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ۝ (یونس :۔ ۲۰)

کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا، آپ کہہ دیجئے کہ غیب کا علم اللہ کو ہے بس (معجزہ کیلئے) تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔

کافروں نے جلدی کی تو جواب دیا۔

سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ۝ (الانبیاء :۔ ۳۷)

جلدی نہ کرو میں عنقریب تم کو معجزے دکھانے والا ہوں۔

اس کے بعد معجزے دکھائے گئے، جن کا ذکر مندرجہ ذیل آیتوں میں ہے :۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۝ (القمر :۔ ۱، ۲)

قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا یہ لوگ تو جب کبھی کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض ہی کرتے ہیں اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

غلط فہمی

"مسلمانوں کے لئے معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی وہ تو پہلے ہی سے ایمان لا چکے تھے۔" (دو اسلام ص۳۲۷)

ازالہ

مسلمین کو معجزہ دکھانا ازدیادِ ایمان اور اطمینانِ قلبی کے لئے ہوتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ (البقرۃ :۔ ۲۶۰)

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے رب مجھے دکھا دے تو کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا، اللہ نے فرمایا کیا تو ایمان نہیں لایا؟ عرض کیا، ایمان تو ہے لیکن اطمینان قلبی کے لئے دیکھنا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا چار پرندے لو پھر انہیں اپنے سے ہلا لو، پھر ان میں سے ایک جزو ہر پہاڑ پر رکھ دو، پھر پکارو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان لو کہ اللہ زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہمارے لئے آسمان سے ایک

دسترخوان نازل فرما دے گا، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اگر تم مؤمن ہو۔ حواریوں نے جواب دیا۔

نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا۔ (المائدۃ: ۱۱۳)

ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں ہمارے دلوں کو اطمینان ہو جائے اور ہم سمجھ لیں کہ جو کچھ آپ نے بتایا بالکل سچ ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ معجزہ کا ظہور اطمینانِ قلبی اور ازدیادِ ایمان کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اور نہ صرف مسلم بلکہ نبی تک اس کی خواہش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی پھر ان کی امت نے بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی۔ تجلیات ربانی کا ظہور ہوا، پھر جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ بنی اسرائیل کو بہت سے معجزات دکھائے گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ۔ (البقرۃ: ۲۱۱)

بنی اسرائیل سے پوچھئے کہ ہم نے کتنے روشن معجزے ان کو دکھائے تھے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى۔ (البقرۃ: ۵۷)

اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ نازل فرمایا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ (الاعراف: ۱۷۱)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل پر پہاڑ کو اٹھا کر سائبان کی مانند کر دیا اور وہ سمجھے کہ اب یہ ہم پر گرنے والا ہے۔

غرض یہ کہ مسلمین کو بھی معجزے دکھائے جاتے رہے ہیں لہٰذا اعتراض لاعلمی پر مبنی ہے

غلط فہمی

"آیۂ وضو میں صرف ایک اختلاف کی بناء پر کہ کسی نے "اَرْجُلَكُمْ"، کو "اَرْجُلِكُمْ" پڑھ دیا، پورا ایک فرقہ پیدا ہو گیا۔" (دو اسلام ص۳۳۶)

ازالہ

جی نہیں صرف یہی اختلاف نہیں وہ تو پورے قرآن مجید کو صحیفۂ عثمانی کہتے ہیں موجودہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔

العرض قرأت کے معمولی اختلاف سے فرقہ پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں تقلیدی اختلاف سے ہو سکتا ہے۔

غلط فہمی "ام شریک راوی ہیں کہ حضورؐ نے چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تھا اس لیے کہ یہ اس آگ کو پھونکوں سے بھڑکاتی تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھینکا گیا تھا۔ (بخاری ص ۱۵۲/۲)
بھلا حضرت ابراہیمؑ نے چھپکلی کا کیا بگاڑا تھا؟ .... اس کے تنفس میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ آگ کے شعلوں میں ذرہ بھر بھی اضافہ کرسکتا"
(دو اسلام ص ۳۲۷)

ازالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ جانور فویسق یعنی موذی ہیں ان کو حرم میں بھی قتل کردیا کرو، چوہا، بچھو، چیل، کوا، اور پاگل کتا۔ (صحیح بخاری)

اسی طرح حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:۔

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِلْوَزَغِ الْفُوَيْسِقُ ۔ (صحیح بخاری کتاب بدء الخلق)	یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھپکلی کو بھی فویسق فرمایا۔

جس طرح ان پانچ جانوروں کے موذی ہونے کی وجہ سے قتل کا حکم دیا، اسی طرح چھپکلی کے موذی ہونے کی وجہ سے اس کے بھی قتل کا حکم دیا۔ جیسا کہ حضرت سعدؓ اور حضرت ام شریکؓ کی روایتوں میں صاف مذکور ہے: یعنی

أَمَرَ بِقَتْلِهِ (صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب خیر مال المسلم غنم)	آپ نے اس کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔

ام شریکؓ کی ایک روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:۔

أَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزَغِ وَقَالَ كَانَ يَنْفُخُ عَلَى إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ (صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا)	آپ نے چھپکلی کو مار ڈالنے کا حکم دیا اور آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی آگ کو پھونکتی تھی۔

اس حدیث سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قتل کی وجہ آگ پھونکنا ہے۔ بلکہ قتل کی وجہ تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی یعنی اس کا فویسق (زہریلا، موذی) ہونا، ہاں یہ اس کی خباثت کا مزید ثبوت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر پر آگ پھونکتی تھی۔ اگر صرف آگ پھونکنا قتل کا سبب ہوتا تو الفاظِ

حدیث اس طرح ہوتے " اَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزْغِ فَاِنَّہٗ کَانَ یَنْفُخُ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ "
جیساکہ مندرجہ ذیل حدیث میں ہے :۔

اُقْتُلُوْا ذَا الطُّفْیَتَیْنِ فَاِنَّہٗ یَلْتَمِسُ	آپ نے فرمایا ذوطفیتین سانپ کو قتل کردیا کرو
الْبَصَرَ (بخاری جزء ۲ صـ ۱۲۵)	کیونکہ وہ آدمی کو اندھا کردیتا ہے ۔

دیکھیئے یہاں قتل کا سبب بیان کیا تو " فَاِنَّہٗ " فرمایا اور چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تو " فَاِنَّہٗ "، نہیں فرمایا۔ ہاں اس کے قتل کے ساتھ ایک دینی جذبہ کو ملحق کردیا۔ تاکہ اس جذبہ کے ماتحت اس کے قتل میں سعی بلیغ کی جائے، یہ جملہ معطوفہ کا نفسیاتی پہلو ہے ۔

بھلا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھپکلی کا کیا بگاڑا تھا یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی پوچھے کہ بھلا حضرت آدم علیہ السلام نے ابلیس کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے ان کو بہکایا، اس کی ذلت تو اللہ تعالیٰ نے کی تھی کہ سجدہ کرنے کا حکم دیا اور پھر اس کو سجدہ کرنے سے باز رکھا جیساکہ خود ابلیس نے کہا تھا۔

فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ	اس لئے کہ تو نے مجھے بہکایا میں ان کے
صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ ہ	لئے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ جاؤں
(الاعراف :۔ ۱۶)	گا۔

بتائیے آدم علیہ السلام کا کیا قصور تھا، ابلیس نے بہکانے کا الزام اللہ تعالیٰ پر لگایا اللہ تعالیٰ نے کہیں قرآنِ مجید میں اس الزام کی تردید نہیں کی تو اب بتائیے آدم علیہ السلام تو بے قصور تھے، پھر ابلیس نے ان سے اور ان کی اولاد سے بدلہ کیوں لیا، یہی وہ فطری شیطنت تھی جس نے چھپکلی کو مجبور کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی آگ کو پھونکے ان کا قصور ہو یا نہ ہو اس کے اس فعل سے فطری شیطنت ظاہر ہوتی ہے بعض جانور فطرۃً شریف ہوتے ہیں مثلاً گھوڑا، اور بعض جانور فطرۃً بدطینت ہوتے ہیں، مثلاً گرگٹ، بچھو وغیرہ، چھپکلی کی کوشش کتنی ہی ناکام سہی لیکن اس نے حتی المقدور کوشش کی یہ اس کی نیت ہے جو اس کے باطن کی خباثت کا پتہ دیتی ہے اور نیت ہی پر تمام اعمال کا دارومدار ہے، کامیابی اور ناکامی سے نیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غلط فہمی

" ایک اور حقیقت ملاحظہ ہو۔

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے جبریلؑ کو دیکھا تھا اس کے چھ سو پر تھے (صحیح بخاری)

صرف ابن مسعودؓ میں کیا خوبی تھی کہ انہیں جبریل نظر آیا، کسی اور صحابی کو کیوں دکھائی نہ دیا۔ یہ چھ سو پر آپ نے کیسے گن لئے تھے اور جبریل کے لئے پروں کی ضرورت

ہی کیا تھی؟ وہ ایک نوری جسم ہے، پرواز نور کی فطرت ہے جس طرح ہوا، آگ اور بادلوں کو پروں کی ضرورت نہیں ہوتی اس طرح نور بھی وسائلِ پرواز سے بے نیاز ہوتا ہے۔" (دو اسلام ص ۳۳۸)

ازالہ برق صاحب کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے متعلق نہیں کہا تھا کہ میں نے جبریل کو دیکھا۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا تھا، پوری حدیث اس طرح ہے:۔

سَمِعْتُ زِرًّا عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ كَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهٖ مَا أَوْحٰى قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ أَنَّهٗ رَاٰى جِبْرِيْلَ لَهٗ سِتُّ مِائَةِ جَنَاحٍ	امام شیبانی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت زر کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت "فکان قاب قوسین او ادنیٰ الخ" کی تفسیر میں بیان کرتے ہوئے سنا کہ اس آیت میں جس طرف اشارہ ہے وہ جبریل ہیں اور یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو دیکھا تھا ان کے چھ سو پر تھے۔

دوسری حدیث اسی کے آگے کتنے صاف الفاظ میں ہے، امام شیبانی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت زر سے اس آیت " (فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى)" کے معنی پوچھے تو حضرت زرؓ نے فرمایا:۔

أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ أَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى جِبْرِيْلَ لَهٗ سِتُّ مِائَةِ جَنَاحٍ	ہمیں ابن مسعودؓ نے خبر دی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کو دیکھا تھا ان کے چھ سو پر تھے۔

(یعنی بمصداقِ آیہ کریمہ دو کمان بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ حضرت جبریل سے تھا نہ کہ اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری تفسیر سورۃ النجم)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت مراد ہے نہ کہ رویتِ ابن مسعودؓ کاش برق صاحب تحقیق فرما لیتے۔

دوسری بات جو برق صاحب نے کہی وہ اس سے بھی زیادہ بڑی غلط فہمی ہے کاش وہ قرآنِ مجید کو غور سے پڑھتے، فرشتوں کے پروں کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے سنئے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا أُولِيْٓ أَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ	سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے اور جس نے فرشتوں کو پیغام رساں بنایا ہے، جن فرشتوں کے دو دو

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝	تین تین، چار چار پر ہوتے ہیں بلکہ اللہ پیدائش میں زیادہ کرتا ہے جتنا چاہتا ہے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
(فاطر:۔ ۱)	

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بازو ہوتے ہیں، دو، تین، چار اور زیادہ بھی برق صاحب یہ بھی آپ نے خوب کہا کہ ہوا، آگ اور بادلوں کو پروں کی ضرورت نہیں ہوتی کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ چیزیں بھی آسمان تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ان کی رسائی محدود ہے اگر یہ چیزیں بے پر کے اڑاتی ہیں تو پھر ہوا آسمان تک کیوں نہیں پہنچ جاتی کیوں پانچ چھ میل کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ آگ سطح زمین سے بے تعلق نہیں ہوتی، ان چیزوں کا اوپر جانا بھی ایک خاص اصول کا پابند ہے، وہ اس اصول سے آزاد نہیں۔

غلط فہمی

"حضرت ابو ہریرہؓ حضورؐ سے راوی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ اسی برس میں ہوا تھا" (بخاری جلد ا ص۱۵۳)

"راوی نے یہ نہ بتایا کہ پورے اسی سال تک اس مبارک کام میں کون سی رکاوٹ حائل رہی جو وفات سے عین پہلے دور ہوئی اور آپ باں ضعف و پیری حجام کے سامنے جا بیٹھے ختنہ کا مقصد صفائی، صحت اور جنسی لذتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی برس کے بعد یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے، تو پھر ختنہ کا فائدہ؟" (دو اسلام ص۳۳۸)

ازالہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک کافر گھرانے میں پیدا ہوئے لہذا بچپن میں ختنہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر نبوت ملی تو توحید کا وعظ شروع کر دیا، تمام انبیاء علیہم السلام کا یہ دستور رہا ہے کہ پہلے انہیں صرف توحید کی اشاعت کا حکم ہوتا ہے اور سارا زور اسی پر صرف ہوتا ہے دوسرے احکام بہت بعد میں نازل ہوتے ہیں، مکہ معظمہ میں ایک طویل مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی صرف توحید کا درس دیتے رہے، دوسرے شرعی احکام بہت بعد میں نافذ ہوئے لہذا ابراہیم علیہ السلام کو بھی توحید کی تبلیغ میں کافی عرصہ لگا۔ اور جب اسی سال کے ہوئے تو اور احکام شرع کے ساتھ ختنہ کا حکم بھی ملا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۔	اور جب ابراہیم علیہ السلام کے رب نے چند باتوں میں ان کی آزمائش کی تو وہ ان سب میں پورے اترے۔
(البقرۃ:۔ ۱۲۴)	

ختنہ کے حکم کی تعمیل میں بھی وہ پورے اترے اور ختنہ کر لی، ہر حکم کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک وقت مقرر ہے اور اس حکم کے لئے یہی وقت مقرر تھا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے دیکھئے ابراہیم

علیہ السلام اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ جاتے ہیں لیکن اس وقت
کعبہ کی تعمیر نہیں کرتے، حالانکہ اس وقت اس کی زیادہ ضرورت تھی پھر ایک عرصہ دراز کے بعد ان کو
اس بچے کے ذبح کا حکم ہوتا ہے پھر کافی عرصہ کے بعد وہ کعبہ تعمیر کرتے ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام بھی
اس کام میں ان کی مدد کرتے ہیں پھر اس کو پاک صاف رکھنے کا حکم ملتا ہے یہ سب باتیں قرآن مجید میں
موجود ہیں اور بتدریج انجام پا رہی ہیں۔ اسی طرح ختنہ کا حکم بھی مصلحتِ الٰہی کے مطابق اپنے وقت پر ملا
اسّی سال کی عمر اس زمانہ میں کچھ زیادہ عمر سمجھی نہیں جاتی تھی، قرآنِ مجید میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام
نے صرف تبلیغ میں ۹۵۰ سال صرف کئے، ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کئی سو سال تک زندہ رہے
ہوں اور اس سلسلہ میں تاریخی شواہد بھی ملتے ہیں لیکن ہم کیونکہ تاریخ پر اعتبار نہیں کرتے لہذا انہیں
بطور حجت پیش نہیں کرتے۔ برق صاحب تاریخ پر کافی اعتبار کرتے ہیں لہذا اس سلسلہ میں انہیں
تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ تسلی ہو جائے اگر تاریخ کا یہ بیان صحیح ہے کہ انہوں نے ۷۵ سال کی عمر
میں ہجرت کی تو اسّی سال کی عمر میں ختنہ بالکل قرینِ قیاس ہے کیونکہ ہجرت کے بعد ہی احکام شریعت کا
نزول شروع ہوا ہو گا۔

ختنہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام بوڑھے نہیں تھے، نہ وہ کسی حجام کے سامنے بیٹھے
بلکہ انہوں نے اپنی ختنہ خود کی، حدیث کے الفاظ ہیں۔

اِخْتَتَنَ اِبراھیم علیہ السلام — حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کی۔

لہذا حجام کے سامنے بیٹھنا ایک مفروضہ تھا جو غلط نکلا۔

اب برق صاحب کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ اسّی سال تک اس کام میں کیا رکاوٹ تھی
ورنہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جوانی میں کیا رکاوٹ تھی کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے
اور جب دونوں ماں باپ بوڑھے ہو گئے اور صرف بوڑھے ہی نہیں بلکہ حضرت سارہؑ
کے الفاظ میں:۔

عَجُوزٌ عَقِيمٌ (الذاریت ۱-۲۹) — میں بوڑھی بانجھ ہو چکی ہیں۔

تو ایسے وقت میں حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے، بھلا عورت بانجھ ہو اور خاوند بوڑھا
ہو (جیسا کہ قرآن مجید میں ہے) تو بچہ کیسے ہو سکتا ہے، برق صاحب یہ چیز بھی تو سائنس کے خلاف
ہے عقل کے خلاف ہے، فطرتِ انسانی اس سے ابا کرتی ہے لیکن قرآنِ مجید میں ایسا ہی ہے،
اب بتائیے کس ملا کو برا کہیں، ہم کہتے ہیں کہ کسی کو برا کہنے کی ضرورت نہیں ہر چیز کا انکار کیجئے اور
قرآن کو تسلیم کیجئے اور اس طرح حدیث کو بھی تسلیم کیجئے۔ اگر سائنس، عقل اور فطرت انسانی کے خلاف
قرآن مجید کو صحیح تسلیم کرنا لازمی ہے تو پھر حدیث نے کیا قصور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی مصلحت

اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ہم سب کو ایسے معاملات میں خاموش رہنا چاہیئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایمان سلب ہو جائے۔

غلط فہمی

"ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت سلیمان نے کہا کہ آج رات میں اپنی تمام بیویوں جن کی تعداد ایک سو ایک یا ننانوے تھی، مجامعت کروں گا ہر بیوی سے ایک شہسوار پیدا ہو گا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا کسی نے کہا انشاء اللہ بھی ساتھ کہئے لیکن آپ نے پروانہ کی، چنانچہ تمام بیویوں کے پاس گئے اور بغیر ایک کے کوئی حاملہ نہ ہوئی"

حضرت سلیمان عہد تاریخ کے انسان ہیں، عام انسانوں جیسا قد، اتنی ہی عمر اور طاقت ہم یہ کیسے یقین کریں کہ وہ پوری ایک سو بیویوں کے ساتھ مجامعت کی طاقت رکھتے تھے۔ پھر یہ بھی تو سوچیئے کہ اگر ایک بیوی کے ساتھ مجامعت کے لئے کم از کم پندرہ منٹ درکار ہوں تو تمام کے پاس جانے کے لئے پچیس گھنٹے چاہئیں" (دو اسلام ص۳۳۸، ص۳۳۹)

ازالہ

برق صاحب قرآن مجید کہتا ہے:۔

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا:۔ ۱۲)

(ہوا سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دی گئی تھی) وہ صرف صبح کے وقت ایک مہینہ کی مسافت طے کیا کرتی تھی اور شام کے وقت بھی ایک مہینہ کی مسافت طے کرتی تھی۔

اگر سلیمان علیہ السلام عہد تاریخ کے انسان ہیں تو بتائیے عہد تاریخ میں کہیں آپ کو ایسا تخت ملا ہے کہ ہوا اس کو اڑا کر لے جائے، کیا اس زمانہ میں ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے تھے؟ کیا اس کا کوئی ثبوت ہے؟ ہرگز نہیں اور سنیئے:۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ (النمل:۔ ۴۰)

ایک شخص نے جس کو کتاب کا علم تھا، کہا کہ میں ملکہ سبا کے تخت کو آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لا دوں گا۔

کیا ایسا کوئی آدمی عہد تاریخ میں ملتا ہے جس میں یہ کمال ہو، کیا تورات یا قرآن مجید کا کوئی عالم ایسا ہے، جس نے کبھی ایسا کر کے دکھایا ہو، تیسری آیت سنیئے، سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ۔ (النمل:۔ ۱۶) ہم کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

کیا عہد تاریخ میں کوئی انسان ایسا ہے جس کو پرندوں کی بولی آتی ہو، اگر یہی باتیں حدیث میں ہوتیں تو برق صاحب آپ کو غلط فہمی ہو جاتی اور آپ یہ فرما دیتے کہ ہمارے علماء جب تک حدیث میں ڈرامائی

رنگ نہ بھردیں، انہیں مزا نہیں آتا، یہ تو قرآن مجید ہے اسے کیا کہا جائے غرض یہ کہ اس قسم کی عجیب و غریب باتیں حضرت سلیمان میں اور ان کے اصحاب میں پائی جاتی ہوں تو کیا تعجب ہے کہ ان میں بے انتہا مردانہ قوت بھی ہو اور وہ بہ یک وقت سو بیویوں کے پاس جا سکتے ہوں۔

دوسرا اعتراض برق صاحب کا یہ ہے کہ ۲۴ گھنٹے کی رات میں یہ کیسے ممکن ہے، برق صاحب نے اس کام پر کم از کم پندرہ منٹ لگائے ہیں حالانکہ وہ اس سے کم بھی لگا سکتے تھے اگر اوسطاً تین منٹ کا حساب رکھا جائے تو کل وقت ۱۰۰ × ۳ = ۳۰۰ منٹ = ۵ گھنٹے یعنی ۲۴ گھنٹوں میں سے صرف ۵ گھنٹے صرف ہوں گے ، ۹ گھنٹے پھر بھی فاضل بچ جائیں گے غرض یہ کہ حساب کے لحاظ سے بھی حدیث پر کوئی اعتراض نہیں۔

انتباہ

ترجمہ میں برق صاحب نے "لَمْ یَقُلْ" کا ترجمہ "آپ نے پروا نہ کی" کیا ہے حالانکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آپ نے انشاء اللہ نہ کہا اور انشاء اللہ نہ کہنا بھول کی وجہ سے تھا جیسا کہ حدیث میں ہے:۔

قُلْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ فَنَسِیَ۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان والنذور) — کسی نے ان سے کہا انشاء اللہ کہئے لیکن وہ انشاء اللہ کہنا بھول گئے۔

اور یہ بھولنا بھی مشیت الٰہی کے ماتحت تھا، تقدیر الٰہی یہی تھی۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ (یوسف:۔ ۲۱)

اگر تعداد ازواج پر اعتراض ہے تو سنیئے اکثر بادشاہ متعدد حرم رکھا کرتے تھے اور یہ کوئی غیر معروف بات نہیں ہے جس پر اعتراض کیا جا سکے۔ اعتراض تو ناجائز اور غیر معروف کاموں میں ہوتا ہے، پھر ازواج کی کثیر تعداد کا ذکر تو تورات میں بھی موجود ہے اور جس کو برق صاحب بالکل من وعن محفوظ سمجھتے ہیں لہٰذا حدیث بھی محفوظ ہے، ورنہ یہ اعتراض تورات پر بھی ہوگا، اگر یہ اعتراض ہو کہ سلیمان علیہ السلام دنیادار بادشاہ نہیں تھے کہ دنیاوی عیش وعشرت کے سامان جمع کرتے، بلکہ رسول تھے لہٰذا ان کی زندگی عام انسانوں سے بالاتر نہیں ہو سکتی، تو یہ اعتراض بھی صحیح نہیں اس لئے کہ سلیمان علیہ السلام کے محل کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ محل بھی اتنا شاندار کہ اس کا فرش بھی شیشہ کا تھا، ارشاد باری ہے:۔

قِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الصَّرْحَ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ — ملکہ سبا سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ جب ملکہ نے اسے دیکھا تو اس کو پانی سمجھا

عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ (النمل: ۴۴)

اور اپنی پنڈلیاں کھول دیں ، (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا ، یہ تو شیشہ کا محل ہے ۔

محل کے ذکر کے ساتھ ان کے خاصے کے گھوڑوں کا ذکر بھی قرآن مجید میں ہے ۔ سنئے :-

إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝ فَقَالَ إِنِّيْٓ أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ .. الخ (ص)

شام کے وقت جب سلیمان (علیہ السلام) کے سامنے خاصے کے گھوڑے پیش کئے گئے تو کہنے لگے میں اس مال سے صرف اس لئے محبت کرتا ہوں کہ اس کے ذریعہ ذکر رب یعنی دین حق کا دفاع کرسکوں (پھر وہ گھوڑے دوڑتے ہوئے بہت دور نکل گئے) یہاں تک کہ پوشیدہ ہوگئے تو فرمایا ”انہیں میرے پاس واپس لاؤ“ (جب وہ واپس آئے) تو ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے ۔

غرض یہ کہ مذکورہ بالا آیتوں سے ثابت ہوا کہ سلیمان علیہ السلام شاہانہ کروفر سے رہا کرتے تھے اگر اس شاہانہ کروفر پر کوئی اعتراض نہیں تو بیویوں یا حرموں کی کثیر تعداد پر کیا اعتراض ہے ، حرموں کی کثیر تعداد بھی شاہانہ کروفر کا ایک جزو ہے :-

غلط فہمی کہاں تک گنوں صاحب ! بات لمبی ہو رہی ہے ، ورنہ صحاح ستہ میں اس نوع کی سینکڑوں اور احادیث موجود ہیں (دو اسلام ص ۳۳۹)

ازالہ اول تو آپ نے چن چن کر تمام مشکل احادیث کو جمع کردیا اور اللہ کے فضل سے ہم نے ان سب کا جواب قرآنِ مجید اور عقل سلیم کی روشنی میں دے دیا اب اس قسم کی احادیث باقی تو نہیں ہیں لیکن اگر آپ کے خیال میں کچھ اور احادیث باقی رہ گئی ہیں تو پیش کیجئے انشاء اللہ اطمینان بخش جواب دیا جائے گا ۔

غلط فہمی ”میرا مقصد احادیث پر تنقید نہیں ہے“ (دو اسلام ص ۳۳۹)

ازالہ ہمارا بھی خیال ہے کہ تنقید آپ نہیں کر رہے ہیں بلکہ آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے

غلط فہمی ” بلکہ یہ دکھانا ہے کہ جن مجموعوں کو ”صحیح“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان میں ایسے ایسے اقوال بھرے پڑے ہیں جنہیں سن کر تہذیب کانوں پر ہاتھ

دھرے ۔ عقلِ سلیم بلبلا اٹھے اور کتابِ الٰہی کلیۃً مقام کر رہ جاتے ،،
(دو اسلام صہ۳۳۹ صہ۳۴۰)

ازالہ ان تمام احادیث کا جواب قرآنِ مجید ، تہذیب اور عقل و سائنس کی روشنی میں دیا جاچکا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ان مجموعوں میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں جس پر کسی قسم کا اعتراض کیا جا سکے ۔

غلط فہمی ،، نمونہ آپ نے دیکھ لیا ، انصافاً کہئے کہ ان اقوال کو وحی سمجھ کر ان پر کیسے عمل کریں ،، (دو اسلام صہ۳۴۰)

ازالہ نمونۃً ہم نے بھی قرآنی آیات پیش کر دی ہیں جو ان احادیث کے مماثل ہیں بلکہ ان سے زیادہ حیرت انگیز کچھ اور آخری باب کے جواب میں انشاء اللہ پیش کریں گے اگر یا ہیں ہمہ ان آیات کو وحی سمجھ کر عمل کیا جا سکتا ہے تو پھر ان احادیث کو بھی وحی مان کر عمل کیا جا سکتا ہے ،،

غلط فہمی ،، اور اس دستور العمل کو کیسے چھوڑ دیں جس کی ہر ہدایت روشن ، ہر لفظ حقیقت ہر حرف صداقت ،، (دو اسلام صہ۳۴۰)

ازالہ چھوڑیئے نہیں ، بلکہ احادیث کی روشنی میں اس کا مطلب سمجھئے ۔ یہ نہیں کہ صلوٰۃ کے معنی بقول محمد احمد شبلا ، پریڈ کر لئے جائیں یا پھر بقول غلام احمد پرویز ،، نظام ربوبیت ،، کر لئے جائیں بلکہ اس کے معنی وہی کئے جائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں اور جس پر امت متواتر عمل کرتی آئی ہے ، قرآنِ مجید چند اوقات میں نماز فرض کرتا ہے لیکن ان اوقات کی تشریح اور تعداد حدیث میں آتی ہے لہٰذا قرآنِ مجید کو بھی پکڑیئے اور حدیث کو بھی ، نماز پڑھیئے لیکن پانچ وقت وعلیٰ ہذا القیاس ۔

سوالات

ا برق صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن کی ہر ہدایت روشن ہے ہم بھی مانتے ہیں لیکن کیا غلط فہمی کی بنا پر ہم سوال کر سکتے ہیں کہ یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِىْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ — ہم مجرموں کے دلوں میں اسی طرح یہ بات ڈال دیتے ہیں (کہ وہ رسولؐ کا مذاق اڑائیں)
(الحجر :۔ ۱۲)

اس میں کون سی روشن ہدایت ہے ؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ڈالتا ہے کہ وہ رسولؐ کا مذاق اڑائیں ؟

۲۔ برق صاحب فرماتے ہیں " قرآن کا ہر لفظ حقیقت، ہر حرف صداقت" ہم بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن کیا ہم غلط فہمی سے پوچھ سکتے ہیں کہ " کٓهٰیٰعٓصٓ " کے ان پانچ حرفوں میں کیا صداقت ہے؟ ان حروف کی کیا حقیقت ہے؟

۳۔ برق صاحب فرماتے ہیں " ہر حکم دنیوی و اخروی فلاح کا ضامن " ہمارا بھی اس پر ایمان ہے لیکن کیا ہم غلط فہمی سے پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں جو حکم ہے کہ :۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۔ (البقرۃ : ۱۹۶)	اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے ۔

اس میں کیا دنیاوی مفاد ہے ؟ جوئیں سر میں پڑجائیں تو بھی نہ منڈائے بلکہ یہاں تک ہے کہ :۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ ۔ (البقرۃ : ۱۹۶)	اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا سر میں جوئیں وغیرہ پڑجائیں تو سر منڈانے کا فدیہ دے ۔

یعنی ایسی مجبوری کی حالت میں بھی سر منڈانے کا جرمانہ ادا کرے آخر اس میں کیا راز ہے ؟ پھر یہ حج کا حکم اضاعتِ مال کا سبب نہیں ؟ کیا حج میں ایک مکان اور دو پہاڑوں کا طواف توحید کے منافی تو نہیں ؟

۴۔ برق صاحب فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید کا ہر قول تمام شبہات سے وراء الوراء، ہم بھی اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن کیا ہم غلط فہمی سے پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کا یہ حکم کہ تم پر نماز چند اوقات میں فرض ہے تو یہ اوقات کتنے ہیں اور کون کون سے ہیں ؟ کیا جس صلوٰۃ کے متعلق قرآن مجید میں سینکڑوں مرتبہ حکم یا ترغیب دی گئی ہو اس کی کوئی ترکیب بھی اس میں موجود ہے ۔؟

۵۔ برق صاحب فرماتے ہیں کہ " ہم نے قرآن مجید کی ہر بات کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھا، فطرت کی میزان میں تولا اور اعمال خدا سے اس کا مقابلہ کر کے دیکھا ہمیں ہر جگہ صرف حقیقت اور ٹھوس حقیقت نظر آئی " (دو اسلام صہ ۳۴)

برق صاحب بات تو صحیح ہے لیکن کیا ہم غلط فہمی سے سوال کر سکتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ایک آدمی پلک جھپکنے میں تختِ بلقیس کو ہزاروں میل دور سے کیسے لے آیا تھا ؟ عیسٰے علیہ السلام بغیر باپ کے کیسے پیدا ہو گئے تھے ۔ گہوارہ میں انہوں نے کیسے بات کی تھی ؟ والدہ کے بڑھاپے میں اور بانجھ ہونے کے باوجود حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کیسے پیدا ہو گئے تھے ؟ قارون کا آخر کتنا خزانہ تھا کہ ایک بڑی جمعیت بھی اس کی کنجیاں اٹھانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی یوسف علیہ السلام میں وہ کون سا حُسن تھا کہ تمام عورتیں اُن پر فریفتہ ہو گئی تھیں اور ان کو دیکھ کر اتنی بدحواس

ہو گئی تھیں کہ اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے کیا یہ سب چیزیں سائنس اور فطرت کے مطابق ہیں اور اگر ہیں تو یقین رکھیئے، احادیث میں بیان کردہ عجائبات بھی ٹھوس حقائق ہیں اور سائنس اور فطرت کے عین مطابق ہیں اگرچہ ظاہر میں خلاف ہی کیوں نہ معلوم ہوں ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو سکے تو اس میں حیرت و استعجاب کی کونسی بات ہے آخر ہماری عقلیں بھی تو ناقص ہیں رسول پر ایمان لانا عقل کی ٹھوکروں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

۶۔ برق صاحب فرماتے ہیں "قرآن حقائق سے بحث کرتا ہے" ہمیں اس سے اتفاق ہے لیکن کیا ہم غلط فہمی سے پوچھ سکتے ہیں کہ ذوالقرنین کا سورج کو کیچڑ کے چشمہ میں ڈوبتے دیکھنا کون سی حقیقت ہے؟ کیا یاجوج ماجوج قوم تاریخی حقیقت ہے؟ کیا حضرت خضرؑ کا معصوم بچہ کو قتل کر دینا حقائق میں سے ہے؟ کیا جرم سے پہلے اس بچے کا قتل حقائق میں سے تھا؟ اس کو پیدا کرنے میں کیا مصلحت تھی کہ پیدا کر کے قتل کرا دیا۔

اگر ان سب باتوں کے باوجود جو بظاہر اچھی نظر نہیں آتیں قرآن مجید، قرآن مجید ہے تو اس سے کم درجہ کی باتوں پر جو غلط فہمی احادیث میں ہوتی ہے اس غلط فہمی سے احادیث پر کوئی آنچ نہیں آتی وہ بھی قرآنی حقائق ہی بیان کرتی ہے ہمارے نزدیک حقائق ہی وہ ہیں، جو قرآن و حدیث میں ہیں اور ان حقائق کے خلاف اگر کوئی بات کہیں ملے تو وہ باطل ہے، دھوکہ ہے، خواہ وہ قرآنی و حدیثی حقائق عقل کے خلاف نظر آئیں؛ تاریخ کے خلاف معلوم ہوں، سائنس کے معیار پر پورے نہ اتریں، میزان فطرت کے مخالف ہوں۔

حق و صداقت کا معیار ایک مؤمن کے لئے صرف قرآن و حدیث ہے نہ کہ ان کو چھوڑ کر دوسری چیزیں، اگر دوسرے معیاروں پر پورا اترنے کے بعد ہم نے قرآن و حدیث کو مانا تو پھر یہ ایمان بالغیب نہیں جس کا قرآن مطالبہ کرتا ہے بلکہ اپنی عقلِ ناقص، غلط تاریخ، نامکمل سائنس پر اصل ایمان ہے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی [illegible] ان چیزوں [illegible] نہ ہو تو صحیح ورنہ غلط، یہ ایمان کی شان نہیں اس معیار پر پرکھ کر تو ہر کس و ناکس کی بات تسلیم کی جا سکتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہی کیا باقی رہا، یہ تو کفر کی شان ہے مؤمن کے لئے قرآن و حدیث کی بات عینِ ایمان ہے اور وہ اپنی صداقت کے لئے غیر کی محتاج نہیں ہے ایمان کی تکمیل ہی جب ہوتی ہے کہ ہم ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو مانیں ہماری عقل تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ قرآنِ مجید ایسا ہونا چاہیئے تھا، اس طرح اس کی ترتیب ہوتی، مضامین میں تسلسل ہوتا تکرار نہ ہوتی۔ وغیرہ وغیرہ مگر کیا کریں اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت کے مطابق جیسا ترتیب دے دیا ہمیں تو اب اسی پر ایمان لانا ہے اور اگر اس حالت میں ایمان نہیں لانا تو پھر اللہ تعالیٰ کو بھی ہمارے ایمان کی پرواہ نہیں۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف : ۲۹)

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔

باب ۔ ۲۰

"صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا"

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

خلفائے راشدین احادیث کو ڈھونڈھ کر جلاتے رہے" (دو اسلام ص ۲۴۱)

ازالہ یہ بالکل غلط ہے، تفصیل کے لئے باب اوّل ملاحظہ ہو اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ بتائیے کہ یہ احادیث کہاں سے آگئیں جن کے متعلق آپ کے باب کا عنوان ہے "صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا،، (دو اسلام ص ۲۴۱)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابت احادیث سے منع فرما دیا تھا،، (دو اسلام ص ۲۴۱)

ازالہ یہ بھی صحیح نہیں، تفصیل کے لئے باب اوّل ملاحظہ ہو اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے، تو پھر "موجودہ ذخیرہ احادیث کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر ہوئی تو کیا جس کام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا ہو اس کام کے کرنے پر ناز کرنا کسی مسلم کے لئے زیبا ہے"۔

برق صاحب لکھتے ہیں،

"یہ تمام تفاصیل حدیث میں ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا خزانہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں (ص ۲۴۳)

برق صاحب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کریں اور آپ اس پر ناز کریں، غور فرمائیے :۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اڑھائی سو برس تک احادیث ہر کہ دمہ کی زبان پر جاری رہیں اور بگڑتے

بگڑتے خدا جانے کیا سے کیا بن گئیں" (دو اسلام ص۲۴۱)

ازالہ یہ بھی صحیح نہیں، تفصیل کے لئے باب اوّل اور باب دوم ملاحظہ فرمائیں، غلط فہمی کی بنیاد عدم تحقیق ہے۔

قولہ

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں" (دو اسلام ص۲۴۱)

تائید

بالکل صحیح فرمایا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں، اوّل یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف صحیح ہو، یعنی ہم بدلائل ثابت کرسکیں کہ یہ قول حضور کی زبان مبارک سے واقعی نکلا، ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں البتہ ظن غالب یہ ہے کہ بعض اقوال صحیح ہوں گے۔" (دو اسلام ص۲۴۱)

ازالہ بے شمار احادیث یقینی طور پر صحیح ہیں اور اگر آپ اسے تسلیم نہیں کرتے تو خیر ظن غالب ہی سہی، یہ کیا کم ہے، قرآن مجید کے متعلق بھی صحیح یقین کا کون سا خارجی ذریعہ ہے، یہاں بھی وہی شکوک ہیں اور وہ بھی کئی اعتبار سے خصوصًا ایمان کا دعوٰی کرنے والے ایک بہت بڑے فرقہ کا اس کی صحت سے انکار کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

برق صاحب کیا اسی اسلام پر آپ کو ناز ہے، جس کے رسول کا ایک قول بھی یقینی طور پر صحیح و محفوظ نہیں، براہ کرم غور کیجئے:۔

قولہ

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"دوم۔ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (ص۲۴۱)

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تائید

ہم آپ کی تائید کرتے ہیں، احادیث کے سلسلہ میں الفاظ اتنے ضروری نہیں جتنا کہ ان کا مفہوم، اس لئے کہ الفاظ کا مدعا قرآنِ مجید کی تفسیر ہے۔ اگر قرآنِ مجید کی آیات کا صحیح مطلب سمجھ میں آگیا، تو بس کافی ہے، مدعا پورا ہوگیا۔ مفہومِ حدیث اگر محفوظ ہے، تو مقصود حاصل ہوگیا، یہ بھی کیا کم ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس صورت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا پڑے گا کہ حدیث قرآن سے تو نہیں ٹکراتی (وغیرہ وغیرہ) (دو اسلام صہ ۲۴۱)

ازالہ اس کا جواب آگے آرہا ہے

غلط فہمی برق صاحب حدیث کی صحت کے لئے چند شرائط مقرر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"پس ہر ایسی حدیث صحیح ہے خواہ اس کا راوی ابوہریرہ ہو، یا بابا رتن" (دو اسلام صہ ۲۴۲)

ازالہ صحیح بات تو بالکل بے شک وشبہ صحیح ہے خواہ اسے بیان کرنے والا کوئی ہو اگر اس بات کی صحت کسی دوسرے ذریعہ سے ثابت ہو چکی ہے تو پھر اگر کوئی کذاب و دجال بھی اس کو بیان کرے تو وہ بات اس کے بیان کرنے سے جھوٹ نہیں ہو جائے گی اس کی صحت کے لئے دوسرے شواہد ہیں اور ان ہی کی وجہ سے وہ صحیح ہے، ہاں اگر کسی بات کی صحت کے لئے دوسرے شواہد موجود نہ ہوں اور بات ایسی ہو کہ اس کے قبول کرنے میں بظاہر کوئی حرج بھی نہ ہو تو ایسی بات ہرگز کسی کذاب کے بیان کرنے سے قبول نہیں کی جائے گی، یہاں دیکھا جائے گا کہ راوی ابوہریرہؓ ہیں یا بابا رتن، اگر ابوہریرہؓ ہیں تو قبول کی جائے گی اور اگر بابا رتن ہے تو مسترد کر دی جائے گی، مثلاً بابا رتن اگر یہ بیان کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ "ظہر کی نماز میں سورۂ نساء پڑھا کرو" یہ بات ایسی ہے کہ برق صاحب کے پیش کردہ تمام معیاروں پر پوری اترتی ہے کیا ہم اس کو تسلیم کرلیں؟ برق صاحب ایسے موقع پر آپ ضرور سوال کریں گے کہ بابا رتن ثقہ بھی ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو آپ اس حدیث کو فرضی قرار دیں گے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بابا رتن کو کذاب تسلیم کرنے کے بعد بھی آپ اس حکم کو امت کے سر پہ رکھ دیں، لہٰذا یہ کہنا کہ سچا اور جھوٹا راوی دونوں برابر ہیں بالکل لغو ہے۔

دوم:۔ ہر سچی بات کو تسلیم کرنے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ وہ سچی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمائی ہے ہر اچھی بات کو خواہ مخواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تو منسوب نہیں کیا جا سکتا ایک عالم کے منہ سے نکلی ہوئی سچی بات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلی ہوئی بات میں ایک مومن کے لئے تو بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات میں جو تقدس اور خیر ہے وہ دوسرے کی بات میں کہاں ہو سکتا ہے اور اگر دونوں برابر ہوں تو پھر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بھی اچھی اور سچی ہے لیکن میں اس معاملہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ زیادہ قرینِ مصلحت ہے۔ لہٰذا میری پیروی کرو نہ کہ حدیثِ رسول ؐ کی۔ بتائیے کیا ایک مومن اسے برداشت کر سکتا ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر کوئی انگریز کہہ دے کہ خدا ایک ہے، چوری، زنا اور قمار بازی گناہ ہیں، تو کیا کسی مسلمان میں یہ جرأت ہے کہ وہ ان اقوال کے صحیح ہونے سے انکار کرے"

(دو اسلام ص ۳۴۲)

ازالہ

کوئی مسلم ان کا انکار نہیں کرے گا اس وجہ سے کہ یہ باتیں اس کے بیان کرنے سے پہلے قرآن مجید میں موجود ہیں، اور قرآن مجید پر اس کا ایمان ہے یہ اس انگریز کی تصدیق نہیں ہے بلکہ درحقیقت قرآنِ مجید کی تصدیق ہے اگر وہ انگریز

۱۔ قیامت کے متعلق ایسی باتیں بیان کریں جو قرآن و حدیث میں نہیں ہیں۔

۲۔ میدان محشر کے حالات بیان کرے۔

۳۔ دوزخ کے عذاب کا حال بیان کرے۔

۴۔ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرے۔

۵۔ نماز عید اور جمعہ کے فضائل بیان کرے۔

۶۔ نماز استسقاء کے لئے بعض شرائط بیان کرے۔

۷۔ آئندہ واقعات کی پیشین گوئی کرے۔

۸۔ گذشتہ اخبار کو بیان کرے۔

۹۔ ساتوں آسمانوں کے رنگ بیان کرے۔

۱۰۔ تاروں کی مخلوقات کا ذکر کرے۔

۱۱۔ نماز کے نواقض میں کچھ اضافہ کرے۔

۱۲۔ صفا اور مروہ کے طواف کو لغو کہے اور اسے شرک بتائے یا

۱۳۔ صفا و مروہ کے گرد طواف کرنے کو صحیح قرار دے اور ان کے مابین دوڑنے کو بلحاظِ

لغت اور بلحاظ قرآن مجید غلط قرار دے وغیرہ وغیرہ

اوران چیزوں کی وضاحت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ کی ہو تو بتائیے کیا ان سب چیزوں کو ہم تسلیم کرلیں صرف اس لئے کہ یہ باتیں قرآن مجید سے نہیں ٹکراتیں نہ تاریخی اور جغرافیائی حقائق کے خلاف ہیں نہ حقائق کونیہ کا انکار کرتی ہیں۔ برق صاحب ہمارا تو حسنِ ظن یہی ہے کہ آپ بھی یہ باتیں تسلیم نہیں کریں گے کیونکہ ان باتوں کی صحت کے لئے راوی کا ثقہ ہونا ضروری ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ اور بابارتن کی مرویات میں بڑا فرق ہوگا، چہ نسبت خاک را با عالم پاک، یہ دو اور دو چار والا معاملہ نہیں کہ جو کہے تسلیم کرلیا جائے پھر دو اور دو کو بھی تسلیم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی فرمایا ہو کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں یا آپؐ اپنے اصحاب کو حساب سکھایا کرتے تھے۔ ہر صحیح بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، آخر یہ بھی تو غلط بیانی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ غلط بیانی کو ہم صحیح تسلیم کرکے خود بھی غلط بیانی کے مرتکب ہوں اور خلاف واقعہ بات یعنی کذب کو صدق سمجھ لیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔

ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ بیان کرے کہ نیوٹن کے حرکات قوانین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تھا یا فلوجسٹن کے نظریہ احتراق پر ہمفری ڈیوی سے بہت پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرب کاری لگائی تھی تو کیا آپ ان باتوں پر صرف اس لئے یقین کرلیں گے کہ یہ باتیں صحیح ہیں، میں دعوٰی سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ یقین نہیں کریں گے بلکہ سند و ثبوت طلب کریں گے پس ثابت ہوا کہ صحیح بات کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا اور اگر کوئی کریگا تو اس کو اپنی ثقاہت اور سند ثابت کرنا ہوگی، ورنہ اس کی بات مسترد کردی جائے گی خلاصہ یہ ہوا کہ اصل چیز راوی کی ثقاہت اور سند ہے نہ کچھ اور۔

قولہ

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارے محدثین اسناد و روایت پر تکیہ کرتے رہے اور انہیں کرنا بھی چاہیے تھا" (دو اسلام صـ ۳۴۲)

تائید

بہت خوب! آپ نے بہت صحیح بات کہی اور اسی کو ہم مذکورہ بالا عبارت میں ثابت کرچکے ہیں،

قولہ

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

" آخر کسی قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے لئے روایت کا سلسلہ ضروری تھا " (ص ۳۴۲)

تائید

ہم بھی آپ کی تائید کرتے ہیں لیکن ایک بات دریافت طلب ہے وہ یہ کہ اگر کسی قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے لئے سلسلۂ روایت ضروری ہے تو پھر یہ سلسلۂ روایت سچوں کا ضروری ہے یا جھوٹوں اور کذابوں کا سلسلہ بھی کافی ہے۔ غالباً آپ یہی کہیں گے کہ جھوٹا اور سچا کیسے برابر ہو سکتا ہے اگر جھوٹوں کا سلسلہ کافی اور مستند سمجھا جائے تو پھر اس سلسلہ اسناد کی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پھر تو سلسلہ اسناد کا پیش کرنا یا اس کا مطالبہ کرنا ہی لغو اور لا یعنی ہے، اگر بات یہ ہے اور درحقیقت یہ ہے تو پھر صادق اور کاذب راوی برابر نہیں ہو سکتے اور اسی بنا پر حضرت ابوہریرہ رض اور بابا رتن کی مرویات برابر نہیں ہو سکتیں۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

" حضور پر بذریعہ وحی صرف قرآن نازل ہوا تھا " (دو اسلام ص ۳۴۳)

ازالہ

ہم تمہید میں ثابت کر چکے ہیں کہ احادیث بھی بذریعہ وحی نازل ہوتی تھیں۔ تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں۔ ذیل میں ہم کچھ مزید معروضات پیش کرتے ہیں، انصاف فرمائیں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (اٰلِ عمران: ۴۲، ۴۳)	اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بیشک اللہ نے تمہیں منتخب کر لیا ہے اور تمہیں پاک کر دیا ہے اور تمام دنیا کی عورتوں پر تمہیں برگزیدہ کیا ہے (تو) اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری کرتی رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ سجدہ اور رکوع کرتی رہو۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ :۔

ا۔ حضرت مریم کے پاس فرشتے آیا کرتے تھے۔

۲۔ فرشتے حضرت مریمؑ سے باتیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام حضرت مریم کو پہنچایا کرتے تھے۔

۳۔ شرعی احکام بھی فرشتوں کے ذریعہ حضرت مریم کے پاس آیا کرتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان فرشتوں کے ذریعہ جو پیغاماتِ الٰہیہ اور احکام شرعیہ حضرت مریم کو پہنچتے تھے کیا وہ اللہ کی کتاب تھی جو حضرت مریم کو دی گئی تھی اور کیا اس کتاب کے ذریعہ حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ نے قوم کی اصلاح اور اس کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا؟ کیا حضرت مریم، اللہ تعالیٰ کی رسول تھیں، کیا وہ نبیہ تھیں؟ کیا وہ قوم کو تبلیغ کرتی تھیں ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً برق صاحب کو بھی اس سے اتفاق ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ کتاب اللہ کے علاوہ بھی فرشتوں کے ذریعہ وحی آیا کرتی تھی، اور جب ایک غیر نبی پر فرشتوں کا نزول ہو اور وحی آئے تو کیسے ممکن ہے کہ ایک اولوالعزم نبی پر سوائے قرآن مجید کے فرشتوں کا نزول نہ ہو اور سوائے قرآن مجید کے دوسری وحی نہ آئے۔ الغرض کتاب اللہ کے علاوہ بھی وحی آتی رہی ہے اور آسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ (آلِ عمران:۔ ۴۵)	اور جب فرشتوں نے کہا اے مریمؑ اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتا ہے، ایک بیٹے کی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔

گویا اللہ تعالیٰ بار بار حضرت مریم کی طرف وحی بھیجتا رہا، حضرت مریم پوچھتی ہیں کہ بغیر باپ کے بیٹا کیسے ہوگا۔ جواب ملتا ہے:۔

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (آلِ عمران:۔ ۴۷)	اللہ تعالیٰ اسی طرح پیدا کرے گا وہ جو چاہے پیدا کرسکتا ہے۔

پھر جب انہیں دردِ زہ شروع ہوا تو فرمایا:۔

اَلَّا تَحْزَنِيْ (مریم۔ ۲۴)	اے مریم غمگین نہ ہو۔

پھر ارشاد فرمایا:۔

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (مریم:۔ ۲۵)	اے مریمؑ کھجور کے تنے کو ہلاؤ۔ تم پر تازہ کھجوریں جھڑیں گی۔

پھر ارشاد فرمایا:۔

فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا — کھاؤ، پیو اور خوش رہو۔

(مریم : ۲۶)

غرض یہ کہ مختلف حالات میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ حضرت مریم پر وحی بھیجتا رہا اور یقیناً یہ کتاب اللہ کی وحی نہیں تھی، اور سنیے۔

إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّكَ مَا يُوحَى ۝ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ (طٰہٰ : ۳۸، ۳۹)

اور (اے موسیٰ) جب ہم نے تمہاری والدہ کی طرف وحی کی، جو کی وہ یہ کہ اس بچہ کو تابوت میں رکھ کر دریا میں بہادو۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے پاس بھی وحی آیا کرتی تھی اور یقیناً یہ وحی تورات میں نہیں تھی بلکہ تورات سے پہلے نازل ہوئی تھی اور تورات کے علاوہ تھی، دوسری جگہ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوسَى أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ (القصص : ۷)

اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کی طرف وحی بھیجی کہ ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تمہیں خوف ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا اور نہ ڈرنا، نہ غمگین ہونا ہم تمہارے پاس انہیں واپس لے آئیں گے اور ہم ان کو رسول بنائیں گے۔

کیا ان آیات میں صراحت کے ساتھ وحی کا ذکر نہیں۔ یہاں وحی کو دل میں ڈالنے کے معنوں میں ہرگز نہیں لیا جا سکتا اس لئے کہ اس میں وعدہ ہے، اور آئندہ کی خبر ہے اور یہ چیز بغیر وحی اصطلاحی کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

نتیجہ

اگر غیر نبی کے پاس کتاب الٰہی کے علاوہ وحی آسکتی ہے تو ایک نبی کے پاس بھی کتاب الٰہی کے علاوہ وحی آسکتی ہے آخر اس میں اشکال ہی کیا ہے؟ تمہید میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن وہاں اس زاویہ سے اس پر بحث نہیں ہوئی تھی لہذا اس کی تکمیل یہاں کر دی گئی۔

غلط فہمی

"چونکہ قرآن میں صرف مہمات مسائل سے بحث کی گئی ہے اور چھوٹی چھوٹی تفاصیل کو انسانی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام غیر الہامی مسائل میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کرتے تھے"

(دو اسلام صـ ۳۴۳)

....

ازالہ کسی دینی معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا اور نہ کوئی دینی کام مشورہ سے طے پایا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز مشورہ سے طے کی گئی، نمازوں کی رکعات، نمازوں کی ہیئت، کیا یہ سب مشورہ سے طے ہوئیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ نماز کے تمام طریقہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، ارشاد ہے:۔

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ (البقرۃ:۔ ۲۳۸، ۲۳۹)	نمازوں کی حفاظت کرو خصوصاً بیچ والی نماز کی اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے رہا کرو، پھر اگر دشمن کا خوف ہو تو سوار یا پیدل جس طرح ہو سکے نماز پڑھ لو، لیکن جب امن ہو تو پھر نماز کو اسی طرح طریقہ سے ادا کرو جس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھایا ہے اور جس طریقہ کو تم نہیں جانتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حالتِ امن میں نماز پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے جس طریقہ سے نماز ادا کی جاتی ہے اور اس طریقہ سے نماز کی ادائیگی بحالتِ خوف ممکن نہیں، اگر یہ طریقہ مشورہ سے طے پایا تھا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب نہ کرتا، نہ یہ فرماتا کہ اس طریقہ کو تم تو جانتے ہی نہ تھے پس معلوم ہوا، کہ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے سکھایا، اور بذریعہ وحی سکھایا، لہٰذا قرآن مجید کے علاوہ وحی کا آنا ثابت ہے۔

غلط فہمی اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ حضورؐ کی ہر حرکت، ہر قول اور ہر اقدام تابع وحی ہوا کرتا تھا تو پھر "شَاوِرْهُمْ" (تم صحابہ سے مشورہ کر لیا کرو) کی ہدایت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے (دو اسلام ص۳۴۳، ص۳۴۴)

ازالہ "شَاوِرْهُمْ" کے آگے "فِي الْاَمْرِ" ہے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ سیاست میں مشورہ کا حکم دیا جا رہا ہے نہ کہ دین میں، امور سیاست میں بھی صرف اس شعبہ میں مشورہ کا حکم ہے جس کا تعلق قوانین دینیہ سے نہیں بلکہ جو شعبہ امورِ دنیا اور مصالحِ ملکی سے تعلق رکھتا ہے ان میں مشورہ کا حکم ہے، مثلاً ان احکام میں مشورہ نہیں لیا گیا کہ

کن کافروں سے لڑا جائے، کب اور کن مہینوں میں لڑا جائے، لڑائی میں کون کون سے کام ناجائز ہیں حرم میں لڑا جائے یا نہیں، حرام مہینوں میں اور حرم میں کس حالت میں جنگ جائز ہے، ان اصول واحکام کا تعلق براہ راست قوانین الٰہیہ سے ہے لہٰذا ان احکام میں کوئی مشورہ نہیں لیا گیا۔

آپ فرمائیں گے کہ یہ احکام تو قرآنِ مجید میں موجود ہیں لیکن قرآنِ مجید میں یہ تفصیل کہاں ہے کہ

عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو مت قتل کرو، پھل دار درخت مت کاٹو، ناک، کان و دیگر اعضاء مت کاٹو آگ میں مت جلاؤ، سفیر کو قتل نہ کرو، جاسوس کو قتل کر دو، وغیرہ وغیرہ، ان تمام احکام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا، ہاں مشورہ لیا تو صرف یہ لیا کہ مدینہ میں رہ کر لڑیں یا باہر نکل کر۔ ظاہر ہے کہ اندر رہ کر لڑنا، یا باہر جا کر لڑنا یہ کوئی اصولی و دینی حکم کی حیثیت نہیں رکھتا، اس کا تعلق دنیاوی مصالح سے ہے، لہٰذا اس پر مشورہ لیا گیا، اور مشورہ پر عمل بھی کیا گیا۔ دینی احکام میں قطعاً کبھی آپ نے مشورہ نہیں لیا، نہ زکوٰۃ کے نصاب کے متعلق مشورہ ہوا، نہ زکوٰۃ کی مقدار کے متعلق، نہ عیدین کے انعقاد کے سلسلہ میں مشورہ ہوا، نہ نمازِ استسقاء کے متعلق، نہ نمازِ کسوف کے متعلق، ان میں سے کوئی کام بھی مشورہ کی بنا پر مقرر نہیں ہوا۔

یہاں تک کہ امیر المومنین اور حکمران کی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو آپ بغیر صحابہ کے مشورہ کے حکمران بنے تھے۔ اور جب کبھی آپ نے سپہ سالار اور گورنر مقرر کئے تو کبھی مشورہ نہیں لیا بلکہ اگر لوگوں نے کسی کی سپہ سالاری پر اعتراض بھی کیا تو آپ نے اس اعتراض کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بلکہ جو چاہا عمل کیا اور ہمارے لئے یہ دستور العمل مرتب فرما دیا کہ اگر حاکم وقت کسی شخص کو کسی عہدہ کے لئے مناسب سمجھے تو رعایا کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس میں مداخلت کرے۔ یہ مقام اصولِ دین ہے۔ ان اصولِ دین کے سلسلہ میں کسی سے مشورہ نہیں لیا گیا پھر خلفائے راشدین ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کردہ اصول اور سنن کی ہی پیروی کرتے رہے انہوں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ یہ اصول و فروع کیونکہ مشورہ سے طے ہوئے تھے لہٰذا مشورہ ہی سے پھر طے کئے جا سکتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اذان کے متعلق مشورہ کیا گیا، ہم کہتے ہیں کہ مشورہ کی حیثیت شروع میں بالکل دنیاوی تھی یعنی لوگوں کو اطلاع کرنے کا ذریعہ کیا ہونا چاہئے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ اس اطلاع و اعلان کو بھی دینی حیثیت دے دی جائے۔ لہٰذا بذریعہ وحی و بذریعہ خواب اس اعلان و اذان کی تعلیم دی گئی اور اسی وحی کی بنا پر اذان مشروع ہوئی۔

اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ جزئیات کو آپ نے مشورہ سے متعین فرمایا، پھر بھی اس نافذ شدہ مشورہ کو ماننا شرعاً لازم ہے اس لئے کہ اس مشورہ پر اللہ تعالیٰ کی نگاہ تھی اگر وہ مشورہ غلط ہوتا تو فوراً بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی جیسا کہ اسیرانِ بدر کے سلسلہ میں بذریعہ وحی اصلاح کی گئی، اور آئندہ کے لئے اس مشورہ کے مطابق عمل کرنے سے روک دیا گیا۔

غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے مشورہ کرنا، اور اس مشورہ کے مطابق لائحہ عمل

بنانا اور پھر اس لائحہ عمل کے خلاف وحی کا نہ آنا یہ بھی وحی ہی کی ایک صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لائحہ عمل کو شرف منظوری بخش کر برقرار رکھتا ہے لہذا بالغرض محال جو تفصیلی احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مرتب کئے، یا مشورہ کے بعد نافذ فرمائے، بہرحال ان کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہیں لیکن کسی دوسری تفصیل و تشریح کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے یا نہیں، صحیح ہے یا نہیں لہذا ایسی غیر یقینی چیز کے مقابلہ میں یقینی چیز کو چھوڑ دینا یقیناً حق سے انحراف کرنا ہے اور یہ عقلاً بھی محال ہے اور نقلاً بھی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:-

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (النجم :- ۲۸)	محض گمان سے حق کو ذرا سا بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔

جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ یقیناً حق ہے اور اس کو چھوڑنا یقیناً اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لائحہ عمل کو چھوڑنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لائحہ عمل کو چھوڑنا یقیناً گمراہی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان فرمادیا ہے:-

وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ (الاعراف :- ۱۵۸)	رسول کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت یاب ہوجاؤ۔

غلط فہمی حدیث میں کئی ایسے واقعات موجود ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ کہا، صحابہ نے کچھ اور مشورہ دیا اور وحی نے صحابہؓ کی تائید کردی (دو اسلام صہ ۳۴۴)

ازالہ حدیث میں ایسا ایک بھی واقعہ موجود نہیں، جس میں وحی نے صحابہ کی تائید کی ہو اور آپ کی تردید کی ہو، اسیران بدر کا جو واقعہ آپ نے پیش کیا ہے وہ اس کی نظیر نہیں اس واقعہ میں تو جو کچھ طے پایا وہ صحابہ کی اکثریت کا فیصلہ تھا اور وحی نے اقلیت کی تائید کی تھی، یعنی اکثریت کے فیصلہ کو وحی الٰہی نے اصولاً رد کردیا تھا، اس واقعہ سے تو الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشورہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اکثریت کی رائے غلط بھی ہوسکتی ہے اور صحیح بھی لہذا اس کا فیصلہ کہ صحابہؓ کا مشورہ صحیح ہے یا غلط، بذریعہ وحی ہوگا، اگر بذریعہ وحی تردید نہ ہو تو وہ فیصلہ صحیح سمجھا جائے گا اور اگر بذریعہ وحی اس کی تردید ہوجائے تو وہ فیصلہ غلط سمجھا جائیگا گویا اصل اہمیت اللہ تعالیٰ کی منظوری کو ہے اب خواہ وہ اس منظوری کو بذریعہ وحی جلی ظاہر فرمادے یا بذریعہ وحی خفی یا محض خاموشی سے اس کو برقرار رہنے دے۔

غلط فہمی "اسیرانِ بدر کا واقعہ آپ کے سامنے ہے کہ حضورؐ نے فدیہ لینے کا فیصلہ کیا تھا حضرت فاروق نے قتل کا مشورہ دیا اور اللہ نے حضرت عمرؓ کی تائید فرمادی" (دو اسلام صفحہ ۳۴۴)

ازالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا، اور کثرت آراء کے فیصلہ پر فدیہ لیا گیا، حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ قتل کر دیا جائے لیکن ان کا مشورہ اکثریت کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ اب اگر مشورہ کو دینی حیثیت حاصل تھی تو پھر وحی نے اکثریت کے خلاف فیصلہ کیوں دیا؟

اکثریت کا فیصلہ غلط تھا اور کیونکہ معاملہ محض دنیاوی تھا لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ذاتی رحم و کرم کی بنا پر کثرتِ رائے سے اتفاق فرمایا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مشورہ سے کیا ہوا فیصلہ ناپسند فرمایا، کیونکہ اس وقت یہ فیصلہ دینی سنت اختیار کر رہا تھا وہ یہ کہ فدیہ لے کر چھوڑنے کے شرائط کیا ہونے چاہئیں۔ اور کب فدیہ لے کر چھوڑا جا سکتا ہے اگر اس فیصلہ پر اللہ تعالیٰ خاموش رہتا تو یہ سنت بن جاتی کہ کسی حالت میں بھی اسیرانِ جنگ کو قتل کیا جا سکتا ہے یا فدیہ لے کر رہا کیا جا سکتا ہے، حالات کے تقاضے سے اس میں کوئی ردو بدل نہیں ہو سکتا، ہر حالت میں اکثریت کا فیصلہ نافذ ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ نہیں ہر حالت میں مشورہ پر عمل نہیں ہو گا، بلکہ ہم اصولِ دین کی حیثیت سے یہ بات نافذ کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل نہ دیا جائے اور خوب خون ریزی کے بعد اسلامی حکومت کا رعب غالب نہ ہو جائے، اس وقت تک اسیرانِ جنگ کو رہا نہ کیا جائے۔

برق صاحب آپ اس واقعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے حجت شرعیہ نہ ہونے کے منافی سمجھ رہے ہیں حالانکہ اس واقعہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فیصلہ خواہ وہ مشورہ کے بعد ہو یا بغیر مشورہ کے صحیح ہوتا تھا اور اگر صحیح نہیں ہوتا تھا تو فوراً وحی کے ذریعہ اس کی تصحیح کر دی جاتی تھی لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلوں پر اللہ تعالیٰ کی مہرِ تصدیق ثبت ہے اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے فیصلے سمجھے جاتے ہیں اگر یہ فیصلے غلط ہوتے تو اللہ تعالیٰ کبھی خاموش نہ رہتا، اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو دیکھتے رہنا، غلط فیصلہ پر ٹوک دینا وحی قولی ہے، جلی ہو یا خفی، صحیح فیصلہ پر خاموش رہنا یہ وحی تقریری ہے اور حدیث کا ایک بہت بڑا حصہ اس وحی تقریری پر بھی مشتمل ہے،

علاوہ اس تقریری وحی کے بے شمار مرتبہ قولی وحی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتی تھی اور یہ قرآنِ مجید کے علاوہ تھی، اس کا انکار تواتر کا انکار ہے اس قسم کی احادیث جن میں وحی کا نزول موجود ہے

حدِ تواتر کو پہنچ چکی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ بھی وحی آیا کرتی تھی، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ ہو۔

غلط فہمی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صرف اہم قوانین وضوابط سے بحث کی ہے اور غیر اہم مسائل انسانی اجتہاد پر چھوڑ دئے ہیں آنحضرت صلعم تمام ایسے معاملات میں اجتہاد سے کام لیا کرتے تھے اور احادیث کا بیشتر حصہ انہی اجتہادات پر مشتمل ہے۔
(دو اسلام صہ ۳۴۴)

ازالہ ہمیں اس کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں اگر آپ نے بعض مسائل میں اجتہاد سے فیصلہ کیا ہے، تو بھی ان کے حق ہونے میں شبہ نہیں ان کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا سکوت سند ہے اور یہ وحی تقریری ہے اور جس طرح وحی قولی حجت شرعیہ ہے اسی طرح وحی تقریری بھی حجت شرعیہ ہے۔ اگر آپ کا اجتہاد غلط ہوتا تو وحی قولی سے راہ نمائی نازل ہوتی جیسا کہ ایک دو مرتبہ ہوا اور کیونکہ ساری زندگی میں وو ایک ہی اجتہادی غلطیاں ہوئیں اور وہ صحیح کر دی گئیں لہٰذا اب آپ کی پوری زندگی میں کوئی غلطی نہیں۔ آپ کے اجتہادات بالکل صحیح ہیں اور وہ قرآن مجید کی ایسی تشریح ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہم بے کھٹکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی پیروی کر سکتے ہیں، اور وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (اعراف: ۱۵۸) کے مطابق ہدایت یاب ہو سکتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جس کو عصمتِ انبیاء کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور یہی وہ معصوم ہستیاں ہیں جن کو منتخب کر کے اللہ تعالیٰ ہمارے لئے نمونہ مقرر فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نمونہ کو چھوڑ کر دوسرے کو نمونہ بنانا اللہ تعالیٰ کے کام میں مداخلتِ بے جا ہے اور یہی شرک فی الرسالت ہے، رسولؐ کے اقوال و افعال پر اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے اور بعض احکام براہِ راست وحی کے ذریعہ رسولؐ تک پہنچتے ہیں لہٰذا رسول کا ہر قول و فعل وحی الٰہی ہوتا ہے، شریعت ہوتا ہے حکم الٰہی ہوتا ہوتا ہے اگر رسول کے اقوال و افعال کے علاوہ یا ان کو چھوڑ کر دوسرے کے اقوال و افعال کو مشعلِ ہدایت بنایا جائے تو گویا اس کے اقوال و افعال کو احکام الٰہی کا درجہ دینا ہے اور یہ شرک فی الحکم ہے اور شرک فی الرسالت ہے۔ تقلید کی بدعت بھی اسی شرک فی الرسالت و شرک فی الحکم کے ذیل میں آتی ہے۔

غلط فہمی یہ فرض کر لینا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملکہ اجتہاد سے عاری تھے اور وحی کے بغیر نہ کچھ سوچ سکتے تھے نہ کچھ کر سکتے تھے، رسالت پناہ کی انتہائی توہین ہے، اگر کوئی شخص آپ کے متعلق یہ کہہ دے کہ آپ ہر معاملہ میں اپنے کسی

دوست یا بیوی کے مشورہ پر چلتے ہیں تو کیا آپ اسے اپنی توہین نہیں سمجھیں گے۔
(دو اسلام ص۳۴۴ ص۳۴۵)

ازالہ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ یہ قرآن مجید تو اللہ کا کلام ہے لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ کوئی ایسی جامع و مانع کتاب تصنیف کر دیتے جو دوسرے مصنفین کی تصانیف پر بھاری ہوتی معلوم ہوا کہ وہ خود تو نہ کچھ لکھ سکتے تھے نہ بول سکتے تھے، بس وحی کے تابع تھے وحی آگئی تو بات کر لی "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" کا مصداق تھے تو بتائیے کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قابلیت پر طنز نہ ہوگا کیا اسے آپ کی توہین نہ تصور کیا جائے گا۔

برق صاحب! محض رنگ آمیزی سے کام نہیں چلتا، حقیقت، حقیقت ہے، اسے بدلا نہیں جا سکتا، یہ قرآن مجید کی آیات آپ کے سامنے ہیں، یہ حقائق ہیں ان کی رُو سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بغیر وحی کے آپ بات ہی نہ کرتے تھے اب اگر یہ توہین ہے تو وہ بھی توہین ہے کہ بغیر وحی کے آپ قرآن مجید کی تشریح و تفصیل نہ کرتے تھے، برق صاحب بیوی کی راہنمائی میں کام کرنا تو توہین ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی کو توہین سمجھنا عقل سے بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی ہی تو رسول کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے اور آپ اس کو توہین سمجھ رہے ہیں۔

تعجب ہے کہ آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ ہر کام صحابہ کے مشورہ سے کیا کرتے تھے اور اس کو توہین نہیں سمجھتے لیکن اگر کوئی دوسرا یہ کہتا ہے کہ آپ ہر کام اللہ کے مشورہ سے کرتے تھے تو آپ اس کو توہین سمجھ لیتے ہیں یعنی صحابہ کے مشورہ کا پابند تو قابلِ تعریف اور اللہ تعالیٰ کے اشارات کا پابند قابلِ توہین، اللہ کے لئے انصاف کیجئے۔

پھر ہم یہ کب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملکہ اجتہاد سے عاری تھے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ آپ کے اجتہادات پر اللہ تعالیٰ کی نظر تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھے لہٰذا وہ حجت شرعیہ ہیں بتائیے اس میں کیا الجھن ہے؟

غلط فہمی ہمارے علماء نے بھی سرورِ کائنات کے متعلق کچھ اس قسم کا تصور قائم کر رکھا ہے کہ ان کا ہر قول وحی تھا۔ یعنی روٹی مانگتے (آخر یہ بھی قول ہے) تو وحی کا انتظار کرتے اگر یہ پوچھنا ہوتا کہ "میرا جوتا کہاں ہے"، تو جبریل کی راہ دیکھتے رہتے کہ وہ آئے میرے لئے فقرہ تجویز کرے اور میں بولوں۔ (دو اسلام ص۳۴۵)

ازالہ یہ غلط بحث ہے سوال ہے دینی احکام کا، قرآن مجید کی تشریحات کا، اس سے روٹی مانگنے اور جوتا پوچھنے کا کیا تعلق ہے؟ احکام قرآنی کی تشریح میں آپ جو کچھ

فرماتے تھے وہ یا تو وحی قولی ہوتا ہے یا وحی تقریری، اور ان وحیوں کے مجموعہ کو علماءِ دین نے وحی خفی کا نام دے دیا ہے۔ آپ چاہیں تو خفی کے بجائے کچھ اور کہہ دیجئے مگر بہر حال ہے وہ وحی۔

علماء کے متعلق برق صاحب کو غلط فہمی ہوگئی، علماء کا تو صرف اتنا قصور ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا، اس کو دوہرا دیا۔ یہ تصور کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی تھا اللہ تعالیٰ کے کلام سے ماخوذ ہے، اب آپ جو کچھ چاہیں اللہ تعالیٰ کو کہیئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ۝ (النجم: ۳، ۴)	اور رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا، وہ جو کچھ بولتا ہے وحی ہوتی ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی ہے بتائیے اب بھی آپکے ہر قول کو وحی ماننے سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

ہر مرتبہ جبریل کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے القا کیا وہی لفظ زبان پر آگئے یہ بھی تو وحی کی ایک قسم ہے۔

برق صاحب کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وحی کی بس ایک قسم ہے یعنی قولی، حالانکہ وحی کی کئی قسمیں ہیں، قولی (الفاظ کا نزول) فعلی (جبریل علیہ السلام کا کسی کام کو کر کے بتانا مثلاً نماز کا طریقہ اور اوقات نماز کی تعلیم اسی قسم میں شمار ہے) تقریری (آپ کے تمام اجتہادات، بعض فیصلے وتشریحات اسی کے ذیل میں آتے ہیں) برق صاحب کو غالباً اس وحی کا خیال نہیں رہا ورنہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں) القاء والہام، خواب اور بالمشافہ کلام بھی نبی کے لئے وحی کی قسمیں ہیں۔

غلط فہمی

"قرآن کے بغیر حضورؐ کو اور چیز بذریعہ وحی نہیں دی گئی تھی":

أُوْحِيَ إِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهٖ (قرآن)	تمہیں گناہوں سے بچانے کے لئے مجھے بذریعہ وحی یہ قرآن دیا گیا ہے (دو اسلام ص۲۴۶)

ازالہ

برق صاحب قرآن مجید کی آیت تو آپ کی تائید نہیں کرتی، اگر کوئی یہ کہدے کہ حضرت خالدؓ صحابی ہیں، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حضرت جابرؓ صحابی نہیں اسی طرح مذکورہ بالا آیت سے یہ تو ثابت ہے کہ قرآن مجید وحی ہے لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ "حدیث" وحی نہیں ہے بلکہ سورۂ نجم کی آیات جو ہم نے ابھی اوپر نقل کی ہیں ان سے صاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا ہر قول وحی ہے، لہذا حدیث بھی وحی ہے۔

برق صاحب آخر ان آیات کے مضمون کو تسلیم کرنے سے آپ کیوں گریز کرتے ہیں آخر یہ بھی تو قرآن کی آیات ہیں آپ کہیں گے کہ پھر آپ کے بعض قول غلط کیوں نکلے، ہم کہتے ہیں کہاں نکلے

قرآنی تشریحات میں آپ کا ایک قول بھی غلط نہیں نکلا، اور جو دو ایک اجتہادات یا فیصلے غلط نکلے وہ قرآنی تشریحات کے سلسلہ میں نہیں تھے۔ بلکہ اس سلسلہ میں قرآنی آیات کا نزول ہی بعد میں ہوا، گویا کہ قرآنی قانون کی عدم موجودگی میں کیا ہوا فیصلہ غلط نکلا، نہ کہ قرآنی قانون کی روشنی میں کیا ہوا فیصلہ غلط نکلا۔

دوسرے یہ کہ جو غلط فیصلہ ہوا وہ قائم کب رہا؟ اس کو برقرار کب رکھا گیا، فوراً اس کی تصحیح ہوگئی لہٰذا جو قول یا فیصلہ آپ کا برقرار رہنے دیا گیا، وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا، اور جو تصحیح کے بعد برقرار رکھا گیا وہ بھی صحیح ہوا، لہٰذا آپ کا ہر وہ قول جو باقی رہنے دیا گیا یا برقرار رکھا گیا وہ وحی ہے اور یہی ان تمام آیات میں تطبیق کی صورت ہے:۔

تیسرے یہ کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہی اس میں غلطی نہیں ہوئی، غلطی کا امکان صرف اجتہادات میں ہو سکتا ہے اور ایسا صرف دو ایک مرتبہ ہوا اور فوراً اس اجتہاد کو وحی تقریری کے ذیل سے نکال کر وحی جلی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی اس تنقیدی نظر کی وجہ سے آپ کے اجتہادات بھی غلطی سے پاک رہے، اور اس طرح یہ اجتہادات مع دوسرے اقوال و افعال کے جو پہلے ہی غلطی سے پاک تھے، دینی نمونہ قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۔ ۲۱)

بے شک رسول اللہؐ کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

غلط فہمی

اس مضمون پر ایک مشتبہ سی حدیث بھی ملتی ہے۔

ابو جحیفہ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس قرآن کے بغیر کوئی اور وحی موجود ہے فرمایا خدا کی قسم، اس صحیفہ کے بغیر اور اس فہم کے بغیر جو وحی کے متعلق ہر مسلمان کو حاصل ہے ہمارے پاس کوئی اور وحی موجود نہیں (بخاری جلد ۲ ص ۱۱)

میں نے اس حدیث کو مشتبہ اس لئے کہا کہ اس میں حضرت علیؓ قرآن کے بغیر ایک اور صحیفہ کو بھی الہامی سمجھتے ہیں۔ نسائی میں اس صحیفہ کی تفصیل یہ دی ہوئی ہے کہ حضور علیہ السلام نے اہل بیت کے لئے چند خاص وصایا ارشاد فرمائی تھیں، جو اس صحیفہ میں درج تھیں اور جسے حضرت علیؓ نیام ذوالفقار میں رکھا کرتے تھے علامہ صنعانی کہتے ہیں کہ یہ وصایا جعلی تھیں اور ان کا واضع حماد بن عمرو النصیبی تھا۔ سیوطی فرماتے ہیں کہ بعض وصایا عبداللہ بن زیاد بن سمعان نے تراشی تھیں (تذکرۃ الموضوعات ص ۸) (دو اسلام ص ۲۴۶ - ص ۲۴۷)

ازالہ

برق صاحب یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ جہاں کوئی روایت آپ کے مفروضہ کے خلاف ہوئی آپ نے اسے مشتبہ کہہ دیا حالانکہ یہ حدیث آپ کے مفروضہ کہ "خلفائے راشدین احادیث کو جلاتے رہے" کے خلاف نصِ قاطع ہے اور آپ کے اس مفروضہ کے بھی خلاف ہے کہ "ڈھائی سو سال تک احادیث لکھی نہیں گئیں۔"

برق صاحب نے جو عبارت بحوالہ نسائی لکھی ہے درحقیقت اس میں یہ عبارت سرے سے ہے ہی نہیں، معلوم نہیں برق صاحب نے نسائی کا حوالہ کیسے دے دیا۔ نسائی میں البتہ اس صحیفہ کا ذکر موجود ہے جو حضرت علیؓ نے خود مرتب فرمایا تھا اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منظور شدہ تھا۔ نسائی میں اس صحیفہ کا ذکر جو وصایائے نبی کے نام سے موسوم ہے قطعاً نہیں ہے یہ صحیفہ بے شک جعلی ہے، صحیفہ "وصایائے نبوی" حضرت علیؓ کا لکھا ہوا نہیں ہے بعد میں کسی شخص نے وضع کیا ہے۔

تذکرۃ الموضوعات جس کا حوالہ برق صاحب نے دیا ہے اس میں بھی "وصایائے نبویؐ" ہی کا ذکر ہے، اس ہی صحیفہ "وصایائے نبویؐ" کو تذکرۃ الموضوعات کے مصنف نے جعلی کہا ہے۔ اس صحیفہ کے جعلی ہونے سے وہ صحیفہ جو خود حضرت علیؓ نے لکھا تھا کیسے جعلی ہو سکتا ہے وہ تو کتبِ صحاح میں موجود ہے، اور "وصایائے نبویؐ" کتب صحاح کے مؤلفین ہی کے نزدیک جعلی ہے، کمال ہو گیا کہ برق صاحب نے دونوں کو ایک سمجھ لیا۔

غلط فہمی

"بہر حال اس حدیث سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ قرآن اور اسی صحیفہ کے بغیر کوئی اور وحی موجود نہیں اس لئے احادیث کو وحی خفی کہنا نہ عقلاً درست ہے اور نہ نقلاً" (دو اسلام ص ۳۴۷)

ازالہ

حضرت علیؓ کے متعلق سبائی جماعت نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ان کے پاس وصایائے نبویؐ ہیں جو اور لوگوں کے پاس نہیں ہیں اور یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ حضرت علیؓ تمام مسلمین میں کوئی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اسی شبہ کو دور کرنے کے لئے لوگوں نے آپ سے سوال کیا، مثلاً ابو جحیفہ سوال کرتے ہیں۔

هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ قَالَ لَا إِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ أَوْ فَهْمٌ أُعْطِيَهُ رَجُلٌ مُسْلِمٌ أَوْ مَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ	کیا آپ کے پاس کوئی خاص کتاب ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا نہیں، سوائے کتاب اللہ کے اور اس سمجھ بوجھ کے جو ہر مسلم کو ملتی ہے اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے (پھر انہوں نے اس صحیفہ کی احادیث سنائیں)
(صحیح بخاری کتاب العلم)	

ابو ابراہیم تیمی کے سوال پر حضرت علیؓ جواب دیتے ہیں:-

مَاعِنْدَنَا شَيْئٌ اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ وَهٰذِهِ الصَّحِيْفَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (صحیح بخاری باب حرم المدینۃ)	ہمارے پاس کچھ نہیں سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفہ کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے دستیاب ہوا ہے۔

جس حدیث کا ترجمہ برق صاحب نے نقل فرمایا ہے اس میں بھی یہ سوال ہے ۔

هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْئٌ مِنَ الْوَحْيِ اِلَّا مَافِي الْكِتَابِ (صحیح بخاری)	کیا آپ کے پاس کتاب اللہ کے علاوہ بھی کوئی وحی ہے ؟

حضرت علیؓ نے جواب دیا "نہیں، سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفۂ احادیث کے" یعنی یہ جو مشہور ہو گیا تھا کہ حضرت علی کو وحی کی ایک خاص قسم عطا ہوئی ہے، جو عام مسلمین کو نہیں ملی، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی تردید فرما رہے ہیں۔ کہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفہ کے، اور اس صحیفہ میں فلاں فلاں احادیث ہیں، یعنی کوئی خاص چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔

یہ غلط بات جو سبائی جماعت نے تراش لی تھی، اس کے متعلق لوگ اپنے شبہات دور کرنے کے لئے سوال کر رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور اس کی تردید کر دی۔

فرمایا:۔

مَنْ زَعَمَ اَنَّ عِنْدَنَا شَيْئًا نَقْرَءُهُ اِلَّا كِتَابَ اللّٰهِ وَهٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ فَقَدْ كَذَبَ ۰ (صحیح مسلم باب فضل المدینۃ)	جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی خاص کتاب ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفہ کے، وہ جھوٹ کہتا ہے۔

اس تمام بیان سے واضح ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ ان وصایائے مخصوصہ کا انکار کر رہے ہیں۔ جو ان کے پاس نہیں تھیں۔ لیکن لوگ کہتے تھے "کہ ہیں"، اس انکار اور تردید کے باوجود ان کی وفات کے بعد کسی مفتری نے یہ " وصایائے نبوی ؐ "، گھڑیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی طرف ان کو منسوب کر دیا۔

بہر حال اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ احادیث کو بھی وحی سمجھا کرتے تھے

کیونکہ وحی کی ذیل ہی میں انہوں نے اس صحیفۂ احادیث کا تذکرہ فرمایا تھا، اور سوال میں بھی وحی کے متعلق ہی سوال تھا۔ برق صاحب! حدیث کے ایک ٹکڑے سے استدلال کرنا اور دوسرے کا جو آپ کے خلاف ہو انکار کر دینا انصاف سے بعید ہے، غور کیجئے گا۔

غلط فہمی

ایک سلیم الفطرت مسلمان کا وطیرہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ایسی حدیث کو تسلیم کرے جو قرآن سے متعارض نہ ہو خواہ وہ بخاری میں ہو یا کسی مسند میں اور ہر ایسی حدیث کو بلا دریغ ٹھکرا دے۔ خواہ وہ بخاری ہی میں ہو، جو.....

(دو اسلام)

ازالہ

محض قرآن مجید سے متعارض نہ ہونا صحت کی دلیل نہیں، مثلاً ہر نماز میں سورۂ اخلاص پڑھا کرو، یہ قرآن مجید سے متعارض نہیں ہے، تو کیا یہ حدیث ہو جائے گی۔

صحت احادیث کے لئے برق صاحب

کے تجویز کردہ معیار قرآن مجید کی روشنی میں

کتاب دو اسلام کے ختم کرنے سے پہلے برق صاحب نے حدیث کو پرکھنے کیلئے چند معیار مقرر فرمائے ہیں ان معیاروں کا سلسلہ وار جواب درج ذیل ہے لیکن جواب سے پہلے ہم ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ۔

سوال

اگر ان معیاروں پر قرآن مجید بھی پورا نہ اترے تو پھر یہ معیار سچے ہیں یا قرآنِ مجید؟ اگر قرآنِ مجید سچا ہے اور درحقیقت قرآن مجید ہی سچا ہے تو پھر یہ معیار یقیناً باطل ہیں، اور ان میں سے کسی معیار کو حتمی سمجھ کر حدیث کو پرکھنا سراسر ظلم ہے۔

نمبر ۱۔ برق صاحب کا تجویز کردہ پہلا معیار

تعلیمات قرآنی کے منافی ہونا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث تعلیمات قرآنی کے منافی ہو گی وہ حدیث جعلی ہو گی، یہ معیار اگرچہ کسی حد تک صحیح ہے، لیکن ہر حالت میں نہیں۔ مثلاً قرآنِ مجید ہر مردار کو حرام کرتا ہے لیکن حدیث میں ہے کہ مردار مچھلی حلال ہے۔ تو کیا یہ حدیث قرآن مجید کے منافی کہلائے گی، نہیں بلکہ قرآنی حکم عام کو خاص کرنے والی کہی جائے گی۔ لہٰذا یہ حدیث موضوع نہیں ہو گی۔

پھر اس اصول و معیار کو کلیتہً تسلیم کرنے سے ایک اور امر بھی مانع ہے وہ یہ کہ کوئی فتنہ پرور اٹھے اور قرآن کی کسی آیت کے معنی اپنے رنگ میں کرلے اور جب اس سے کہا جائے کہ

حدیث میں اس طرح ہے تو وہ فوراً کہہ دے کہ یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے لہذا جعلی ہے، میں اسے نہیں مانتا، حالانکہ وہ حدیث قرآن مجید کے خلاف نہیں ہوگی بلکہ اس کے مخترعہ معنی کے خلاف ہوگی۔

مثلاً کراچی میں ایک فرقہ ابھی نکلا ہے جو "لقمانی" کہلاتا ہے۔ اس فرقہ کے بانی سید رضا لقمان ابھی زندہ ہیں اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت جبریل رسولِ اعظم بن کر آنے والے ہیں جب ان کے ایک مبلغ کے سامنے ہم نے "خاتم النبیین" والی آیت پڑھی، تو اس مبلغ نے جواب دیا کہ بے شک اس آیت کی رُو سے نبی ختم ہوگئے لیکن رسول ختم نہیں ہوئے۔ رسول آتے رہیں گے ہم نے حدیث پڑھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رسالت اور نبوت دونوں منقطع ہوگئیں، اب میرے بعد نہ کوئی رسول بن سکتا ہے نہ نبی۔ تو وہ مبلغ کہنے لگے کہ یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے قرآن مجید میں تو رسول کے آنے کا ذکر ہے۔ لہذا یہ حدیث موضوع ہے۔ اب قرآنِ مجید کی جس آیت کو انہوں نے اپنی دلیل میں پیش کیا وہ یہ ہے اور جو ترجمہ انہوں نے کیا وہ بھی آیت کے مقابل درج ہے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ	اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر ہیں یہ باز نہیں آ سکتے، جب تک ان کے پاس دلیل نہ آئے یعنی اللہ کا رسول، جو پاک صحیفے پڑھتا ہو۔

(البینۃ: ۱، ۲)

ابتک اس کا مطلب مسلم یہ سمجھتے رہے ہیں کہ یہ کافر باز آنے والے نہیں تھے، جب تک ان کے پاس اللہ کا رسول نہ آتا۔ رسول آگیا تو یہ لوگ باز آگئے گویا تمام مسلمین کے نزدیک اس آیت میں رسول سے مراد حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے آنے کے بعد بہت سے کافر اپنے کفر سے باز آگئے، وہ مبلغ کہنے لگے کہ سب کافر کہاں باز آئے اور آیت میں یہ ہے کہ سب باز آجائیں گے۔ لہذا کوئی رسول ایسا آنا چاہیئے جس کے آنے کے بعد سب باز آجائیں اور یہ رسول سب سے بڑا رسول ہوگا یعنی "رسولِ اعظم" اور یہ خود حضرت جبریل علیہ السلام ہوں گے یہ تھا ان کا مخترعہ مطلب، اور اس مطلب کے خلاف حدیث پڑھنا، گویا گھڑی ہوئی حدیث پڑھنا ہے۔ ان کے نزدیک یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے حالانکہ درحقیقت یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف نہیں بلکہ ان کے ایجاد کردہ معنی کے خلاف ہے۔

تیسری بات جو اس سلسلہ میں ہمیں عرض کرنی ہے وہ یہ کہ اس معیار پر تو قرآن مجید کی

بعض آیات بھی پوری نہیں اترتیں، مثلاً قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ قرآن مجید لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن ایک آیت میں ہے کہ:۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا	اللہ اس کے ذریعہ بہت سوں کو
(البقرۃ:۔ ۲۶)	گمراہ کر دیتا ہے۔

یعنی قرآن مجید ذریعہ گمراہی بھی ہے اور یہ قرآنی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے کہ قرآن مجید لوگوں کو گمراہ کرے۔ لہذا یہ آیت معیار پر پوری نہیں اترتی تو اس آیت کے متعلق کیا کہیں۔

۲۔ قرآنِ مجید میں متعدد جگہ حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے ہر جگہ یہی ہے، کہ ابلیس فرشتہ تھا، مثلاً:۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا	جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم
لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ	کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا
(البقرۃ:۔ ۳۴)	سوائے ابلیس کے۔

لہذا اس آیت اور اس جیسی اور کئی آیات سے ثابت ہوا کہ ابلیس فرشتہ تھا، یہ ہے تعلیماتِ قرآنی، اب اس تعلیمات قرآنی کے خلاف ہمیں یہ آیت ملتی ہے۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ ؕ (الکھف:۔ ۵۰)	ابلیس جنوں میں سے تھا۔

بتلائیے کیا یہ آیت بھی قرآنی تعلیمات کے منافی ہونے کی وجہ سے جعلی ہو گئی؟۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا کام ہدایت کرنا ہے اور اس نے اپنے ذمہ اس کو فرض کر لیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ؗ	ہدایت دینا ہمارے ذمہ واجب
(واللیل:۔ ۱۲)	ہے۔

تو گویا تعلیمات قرآنی کا مسلمہ اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کرتا ہے گمراہ نہیں کرتا، اب یہ آیت سنئے:۔

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ	کیا تم اس شخص کو ہدایت کرنا چاہتے ہو
اللّٰهُ ۔ (النساء:۔ ۸۸)	جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا۔

گویا یہ آیت بھی معیار پر پوری نہیں اترتی اس لئے کہ اس میں اللہ کو گمراہ کرنے والا بنایا گیا ہے، اسی قسم کی یہ آیت ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ	اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے
صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا	تو اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے

يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۔ (الانعام :۔ ۱۲۵) گویا ہدایت پر آنا اس کے لئے اتنا مشکل ہو جاتا ہے جتنا آسمان پر چڑھنا۔

یہ آیت بھی قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے بھلا وہ رحمٰن ورحیم اللہ، جو ہزارہا انبیاء کو لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجے وہ ایسا کر سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو خود ہی ہدایت سے روک دے، اور ان کے سینے کو ایسا تنگ کر دے کہ ہدایت پر آنا ان کے لئے ناممکن ہو جائے۔

۵۔ قرآن مجید کی تعلیمات یہ ہیں :۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۔ (الشوریٰ ۔ ۱۱) اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں۔

یعنی وہ بے مثل ہے، لاثانی ہے، بے جسم ہے، اس کو جسم والوں سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ اب یہ آیت سنئے :۔

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ (المائدۃ : ۶۴) اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ وہ کوئی جسم رکھتا ہے جس میں ہماری طرح دو ہاتھ ہیں، لہٰذا یہ آیت سراسر شانِ الوہیت اور قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔ اب اس آیت کو کیا کہیں؟ کیا وہی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں جو ایسی حدیث کے متعلق برق صاحب استعمال فرما رہے ہیں۔ اس قسم کی تقریباً سو آیات پیش کی جاسکتی ہیں جو تعلیمات قرآنی کے خلاف نظر آتی ہیں تو کیا وہ اس مجوزہ معیار پر پوری نہ اترنے کے باعث جعلی کہی جاسکتی ہیں؟ اگر نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے تو پھر یہ معیار جعلی ہے باطل ہے ایسا کلیہ بنانا محض دھوکہ ہے اور اگر ان آیات کا باوجود قرآنی تعلیمات کے منافی ہونے کے کوئی مقام ہے اور کوئی مطلب ہے تو وہی مقام اور وہی مطلب حدیث کے لئے بھی ہو سکتا ہے یہ کیا کہ اگر آیت معیار پر نہ اترے تو تاویل کر کے اس کو تعلیمات قرآنی کے مطابق بنا لیا جائے، اور حدیث پوری نہ اترے تو اسے مسترد کر دیا جائے کیا یہ انصاف ہے؟

۲۔ برق صاحب کا دوسرا مجوزہ معیار

قرآنِ مجید میں تحریف

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث قرآن مجید میں تحریف تسلیم کرتی ہو وہ جعلی ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ تحریف سے برق صاحب کی کیا مراد ہے؟ اگر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جو قرآن مجید تھا بعد میں اس میں تحریف ہو گئی تو اس تحریف کی خبر دینے والی حدیث یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو ہو گی نہیں کسی اور کا قول ہو گا، اور اس معیار کی

زد میں وہ قول آئے گا، نہ کہ حدیث۔ لہٰذا اس معیار سے حدیث کو پرکھنا کسی حالت میں صحیح نہیں ہو سکتا۔

اور اگر برق صاحب کا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں قرآن مجید میں تحریف ہوئی اور اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات منسوخ ہو گئیں۔ تو بیشک یہ چیز حدیث میں ملتی ہے۔ اور وہ حدیث صحیح ہے، یہ معیار صحیح نہیں وجہ یہ ہے کہ جس نبی نے یہ کہا کہ اس آیت کو قرآن مجید کی آیت سمجھو اور تلاوت کرتے رہو۔ اگر وہی نبی یہ کہے کہ اب یہ آیت منسوخ ہو گئی اس کی تلاوت منسوخ کر دو تو کیا وجہ ہے کہ ہم اسے سچا نہ سمجھیں۔ اگر آپ کہیں کہ نبی ایسا کہہ ہی نہیں سکتا یہ تو بعد میں لوگوں نے اس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ تو اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے، پھر اس معیار پر تو بعض آیاتِ قرآنی بھی نہیں اترتیں، مثلاً:۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۔ (البقرۃ ۱- ۱۰۶)

جب ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل نازل کر دیتے ہیں۔

اگر آپ یہ فرمائیں کہ اس سے مراد قرآنی آیت نہیں، بلکہ شریعت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر آپ یہ مان لیجئے کہ تورات و انجیل منسوخ ہو گئیں یا بھلا دی گئیں۔ لیکن آپ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ آپ تو یہ کہتے ہیں کہ تورات و انجیل محفوظ ہیں اور غیر منسوخ ہیں اور صرف تورات یا انجیل پر ایمان لا کر، اور اس پر عمل کر کے انسان نجات پا سکتا ہے، قرآن مجید پر ایمان لانے کی اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب اس اشکال کو آپ کیسے دفع کریں گے۔ پھر یہ بھی تو بتائیے کہ آیت کے معنی شریعت کرنا کس دلیل سے ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو شریعت کا لفظ معلوم نہ تھا جو آیت کا لفظ استعمال کیا۔ لہٰذا اس بات کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آیت سے مراد قرآنی آیت ہے اور یہ کہ وہ منسوخ بھی ہو سکتی ہے، اور بھلائی بھی جا سکتی ہے تو کیا اب اس آیت کو بھی جعلی کہہ سکتے ہیں جس سے قرآنی آیات کا نسخ اور طاقِ نسیان ہونا ثابت ہوتا ہے، دوسری آیت ملاحظہ فرمائیے:۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ ۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (الاعلیٰ ۱- ۶، ۷)

(اے رسولؐ) ہم آپ کو پڑھائیں گے پس آپ نہیں بھولیں گے سوائے اس کے جو اللہ ہی آپ کو بھلانا چاہے۔

اس آیت سے بھی قرآنی آیات میں کمی بیشی ہونے کا امکان پایا جاتا ہے، اب بتائیے کیا یہ آیت بھی جعلی ہے کیونکہ اس سے تحریف کا امکان ثابت ہوتا ہے؟ اس قسم کی اور بھی آیات

میں جن سے قرآنی آیات کا نسخ ثابت ہوتا ہے تو کیا ان سب کو جعلی کہا جائے گا۔ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا یہ معیار غلط ہے؟

آخر میں ہم اتنا اور عرض کرتے ہیں کہ اصطلاح شریعت میں تحریف اس تغیر و تبدل کا نام ہے جو بعض لوگ کتب الٰہیہ میں کرتے رہتے ہیں لیکن جو تغیر و تبدل اللہ تبارک و تعالیٰ خود کرے وہ تحریف کی تعریف میں نہیں آتا۔ لہٰذا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں آیت یا حکم منسوخ کر دیا تو یہ تحریف نہ ہوگی۔ اس کو تحریف کہنا ہی غلطی ہے۔

۳۔ برق صاحب کا تیسرا مجوزہ معیار

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ازواجِ مطہراتؓ اور صحابہ کرامؓ کی توہین

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی زوجہ مطہرہ رضی یا کسی صحابی کی توہین ہو وہ حدیث موضوع ہوگی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر یہ معیار درست ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس معیار پر قرآنِ مجید پورا اترتا ہے، ہرگز نہیں ملاحظہ فرمایئے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ (عبس :۔ ۱، ۲)	رسول نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا جب کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا۔

بتایئے کیا اس آیت میں شانِ رسالت کی توہین نہیں کہ اخلاقِ کریمانہ کے مجسمہ کو بد اخلاق بتایا گیا ہے۔ پھر یہ آیت قرآنی تعلیمات کے بھی خلاف ہے، قرآنِ مجید کی تعلیم اس آیت میں بیان ہوئی ہے جو درج ذیل ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم :۔ ۴)	اور (اے رسولؐ) آپ کے اخلاق عظیم الشان ہیں۔

لہٰذا عَبَسَ کی مذکورہ بالا آیت دو طرح سے محلِ نظر ہے، اوّل توہین رسولؐ کے لحاظ سے دوم قرآنی تعلیم یعنی سورہ قلم کی مذکورہ بالا آیت سے متعارض ہونے کے لحاظ سے۔

۲۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ	ہم نے آپ کو فتح مبین دے دی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ

ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ۝ (الفتح ۱-۲) — معاف کر دے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ ۝ (محمد ۱۹) — (اے رسولؐ) اپنے گناہوں کی معافی مانگیے۔

تیسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (اذا جاء ۳) — (اے رسولؐ) اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیے۔ بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

ان تینوں آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ گنہ گار تھے کیا یہ توہین نہیں؟ اگر ہے تو بتلائیے ان آیات کے متعلق کیا خیال ہے؟

حضرت آدم علیہ السّلام کی توہین

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (طٰہٰ ۱۲۱) — آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور گمراہ ہو گئے۔

وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ ۱۱۵) — ہم نے آدم میں عزم نہیں پایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی توہین

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑ ڈالے تو کفار نے پوچھا:۔

ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ (الانبیاء ۶۲) — اے ابراہیم! ہمارے بتوں کے ساتھ یہ معاملہ تم نے کیا ہے؟

ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:۔

بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا (الانبیاء ۶۳) — نہیں، بلکہ یہ کام اس بڑے بت نے کیا ہے۔

یعنی ابراہیم علیہ السّلام نے خلاف واقعہ بات کہی، بتائیے ابراہیم علیہ السلام کی طرف کذب کی نسبت کرنا ان کی توہین نہیں:۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی توہین

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھا۔ ایک ان کی قوم کا فرد تھا اور دوسرا دشمن قوم کا فرد تھا۔

فَاسْتَغَاثَہُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِہٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّہٖ فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی فَقَضٰی عَلَیْہِ قَالَ ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ (القصص ۔ ۱۵)

ان کی قوم کے آدمی نے موسیٰ علیہ السلام کی دشمن قوم کے آدمی کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی، پس موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ایسا مکا مارا کہ اس کا کام تمام ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ شیطانی کام ہے۔

گویا موسیٰ علیہ السلام حمیّتِ قومی کے جذبہ سے سرشار تھے، بے سوچے سمجھے، بغیر تحقیق کئے انہوں نے دوسرے آدمی کو مار ڈالا، بعد میں پچھتائے اور اپنے اس فعل کو شیطانی فعل سمجھے، کیا اس آیت میں ان کی توہین نہیں ہے؟ اور سنیئے:۔

وَاَلْقَی الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْہِ یَجُرُّہٗٓ اِلَیْہِ (الاعراف ۔ ۱۵۰)

موسیٰ علیہ السلام نے تورات کو پٹخ دیا اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

حضرت ہارون علیہ السلام بالکل بے قصور تھے، انہوں نے کہا:۔

لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ ۚ (طٰہٰ ۔ ۹۴)

میرے سر اور داڑھی کو نہ پکڑیے۔

بس بالکل بے قصور ہوں، انہوں نے میرا کہنا نہ مانا، اور بچھڑا پوجا، وغیرہ وغیرہ۔ کہیئے کیا ان آیات میں موسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں ہے کہ غصّہ میں آکر کتابِ الٰہی کو دے پٹخا، اور اللہ کے ایک مقدس نبی کو مارا، اس کی بے عزتی کی اور یہ سب کچھ بغیر تحقیق و تفتیش کے کر ڈالا۔

حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السّلام کی توہین

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

وَرَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا (یوسف ۔ ۱۰۰)

یوسف علیہ السلام نے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب حضرت یوسف کے لئے سجدہ میں گر گئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ماں باپ نے بھی بیٹے کو سجدہ کیا۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:۔

یٰٓاَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ (یوسف ۔ ۱۰۰)

اے ابا جان یہ میرے خواب کی تعبیر ہے۔

بچپن میں انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ گیارہ تارے اور سورج چاند ان کو سجدہ کر رہے ہیں

تو یہ گویا اس خواب کی تعبیر تھی، سورج سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام، چاند سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ محترمہ اور گیارہ تاروں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی تھے، ایک رسول نے دوسرے رسول کو سجدہ کیا، بلکہ رسول نے اپنے بیٹے کو سجدہ کیا، کیا یہ ان انبیاء کی توہین نہیں، کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ ماضی میں جو سجدہ بادشاہ کو کیا جاتا تھا، اس کا ماخذ یہی قرآنی آیات تھیں۔

خُلاصہ

الغرض ان آیات اور ان جیسی آیات سے توہینِ انبیاء ظاہر ہوتی ہے۔ بتایئے ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے۔

ازواجِ مطہّرات کی توہین

وہ ازواجِ مطہرات کے بارے میں قرآنِ مجید کہتا ہے:۔

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا (التحریم:۔ ۴)

اگر تم توبہ کرو تو (اچھا ہے) اس لئے کہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔

یہ وہ خواتین ہیں جن کے متعلق قرآنِ مجید کہتا ہے:۔

لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ (الاحزاب:۔ ۳۲)

عورتوں میں سے کوئی ایک بھی تمہاری مثل نہیں۔

یہ وہ جماعت ہے جو تمام عورتوں سے افضل ہے لیکن سورۂ تحریم کی مندرجہ بالا آیت سے ان میں سے بعض کے قلوب کی کجی ظاہر ہوتی ہے کیا یہ ان ازواجِ مطہرات کی توہین نہیں اگر توہین ہے، تو پھر اس آیت کے متعلق کیا کہا جائے؟ ظاہر ہے کہ آیت کے متعلق تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ برق صاحب کا مجوزہ معیار غلط ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی توہین

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَ

اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا، جب تم اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی دکھائی، اور حکمِ رسولؐ

عَصَيْتُم مِّنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ
(آلِ عمران :- ۱۵۲)

میں اختلاف کیا اور خاطر خواہ فتح آجانے کے بعد تم نے (رسول کی) نافرمانی کی۔ تم میں سے بعض دنیا کے طالب ہیں اور بعض آخرت کے۔

یہ جنگِ اُحد کا بیان ہے اور اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب مسلمین ہی کے متعلق ہے اس لئے کہ منافقین تو لڑائی میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ تو لڑائی سے پہلے ہی مدینہ منوّرہ واپس چلے گئے تھے اور اس نافرمانی اور دنیا طلبی کی وجہ سے جو مصیبت آئی تھی اس میں وہ شریک نہیں تھے۔ اس مصیبت کا ذکر مذکورہ بالا الفاظ کے آگے سورۂ آلِ عمران ہی میں بیان ہوا ہے۔

۴۔ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (آلِ عمران :- ۱۵۵)

تم میں سے جن لوگوں نے میدان جنگ سے منہ موڑا، یہ اس لئے ہوا کہ شیطان نے ان کے بعض گناہوں کے سبب ان کو پھسلا دیا اور تحقیق اللہ نے انہیں معاف کر دیا بے شک اللہ غفور اور حلیم ہے۔

گناہ کئے، شیطان نے بہکایا، میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، یہ سب کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ اور پھر مزا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر توبہ کے معاف کر دیا، اور برق صاحب یہ فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ معاف ہی نہیں کرتا۔ اگر آپ کہیں کہ سزا دے کر معاف کر دیا تو پھر وہ معافی ہی کیا ہوئی، سزا دے کر معاف کرنا بھی کوئی معافی ہے۔

۳۔ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ
(آلِ عمران :- ۱۵۴)

پھر اللہ نے غم کے بعد امن نازل فرمایا ایک اونگھ نے تم میں سے ایک جماعت کو ڈھانک لیا، اور تم میں سے ایک جماعت کو اپنی جان کی فکر تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جاہلیت کا گمان کر رہے تھے۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ
(الجمعۃ :- ۱۱)

اور یہ لوگ جب کوئی تجارت یا تماشہ دیکھتے ہیں تو اس کی طرف چلے جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

۵۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ

جب حنین کی لڑائی میں تم نے اپنی کثرت

كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا ..... ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِيْنَ ۝ (التوبۃ:۔ ۲۵)

پر ناز کیا اور پھر کوئی چیز تمہارے کام نہ آئی ..... پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے۔

۶۔ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ (الانفال:۔ ۵، ۶)

مؤمنین کی ایک جماعت جہاد سے نفرت کرتی تھی، وہ حق ظاہر ہو جانے کے بعد حق کے معاملہ میں اے رسول آپ سے جھگڑا کر رہے تھے، گویا ان کو ان کی آنکھوں دیکھے موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا تھا۔

یہ ہے جنگ بدر میں صحابہ کی ایک جماعت کا نقشہ، برخلاف اس کے حدیث میں ہے، کہ صحابہؓ نے کہا، ہم سمندر میں کود پڑیں گے، یہ کریں گے، وہ کریں گے، بتائیے کون سی چیز ان دونوں میں صحابہ کے شایانِ شان ہے؟

(یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ منافقین اس جنگ تک وجود میں نہیں آئے تھے)

۷۔ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۝ (البقرۃ:۔ ۱۸۷)

اللہ تعالیٰ نے معلوم کر لیا کہ تم اپنی جانوں سے خیانت کرتے تھے۔ پس اللہ رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہوا، اور تمہارا قصور معاف فرما دیا اب تم اپنی بیویوں سے مل جل سکتے ہو اور جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اس کی جستجو بھی کر سکتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام روزہ کی حالت میں جماع کر بیٹھتے تھے کیا اس آیت میں توہینِ صحابہ نہیں؟ اگر ہے تو کیا یہ آیت معیار پر پوری اترتی ہے۔

۸۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (المائدۃ:۔ ۲۴)

موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نے کہا، اے موسیٰ تم جاؤ اور تمہارا رب، تم دونوں لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

۹۔ اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ (الاعراف:۔ ۱۳۸)

موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نے ایک قوم کو بت پوجتے دیکھ کر کہا، کہ ہمارے لئے بھی ایسا معبود بنا دیجئے جیسا ان کا معبود ہے موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم جاہل ہو۔

۱۰۔ موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب نے بچھڑے کی پوجا کی، ہارون علیہ السلام نے منع کیا تو کہنے لگے۔

لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ۝ (طٰہٰ:۔ ۹۱) — ہم تو اس کی پوجا ہرگز نہیں چھوڑیں گے جبتک موسیٰ (علیہ السلام) نہ آجائیں۔

ایک رسول موجود ہے اس پر ایمان بھی لاچکے ہیں، لیکن اس کا کہنا نہیں مانتے اور بچھڑے کی پوجا میں مصروف ہیں۔ کیا اس آیت میں نبیوں کی صحبت میں رہنے والی جماعت کی توہین نہیں ہے۔

خُلاصہ

کیا مندرجہ بالا آیات سے صحابہ کی توہین نہیں ہوتی، اگر یہ آیات صحیح ہیں تو کیا وجہ کسی حدیث میں کوئی ذرا سی بات بھی نظر آجائے تو اسے جعلی سمجھا جائے۔ الغرض اس معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں، لہٰذا یہ معیار ہی باطل ہے۔ نہ کہ آیاتِ قرآنی۔

۴۔ برق صاحب کا چوتھا مجوّزہ معیار

حقائقِ کونیہ کے خلاف ہونا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث حقائقِ کونیہ کے خلاف ہوگی وہ موضوع ہوگی۔ اس سلسلہ میں بھی ہم چند آیاتِ قرآنی پیش کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝ (الانبیآء:۔ ۶۹) — اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈی ہوجا، اور سلامتی والی بن جا....

آگ کا کام جلانا ہے اس کی خصوصیت گرم ہونا ہے، لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی حقیقتِ کونیہ کے خلاف ٹھنڈی ہو اور جلائے نہیں لہٰذا یہ آیت معیار پر پوری نہیں اترتی۔

۲۔ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۝ (الطلاق:۔ ۱۲) — اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور ان ہی کے مثل (سات) زمینیں بنائیں۔

چونکہ زمین صرف ایک ہے، لہٰذا اس آیت کے متعلق کیا کہیں؟۔

۳۔ خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا (ملک:۳) — اللہ تعالیٰ نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔

بلحاظ جدید سائنس آسمان کوئی چیز نہیں، محض حدِ نگاہ ہے، لہذا اس کا سات ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

۴۔ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ (الکھف:۔ ۸۶) — ذوالقرنین نے سورج کو کیچڑ کے ایک چشمہ میں ڈوبتے ہوئے پایا۔

کیا یہ حقیقت ہے؟

۵۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھی سے کہا:۔

آتِنَا غَدَاءَنَا (الکھف:۔ ۶۲) — ہمارا ناشتہ لاؤ۔

ان کے ساتھی نے جواب دیا۔

وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا (الکھف:۔ ۶۳) — بڑا عجیب و غریب واقعہ ہوا کہ وہ بھنی ہوئی مچھلی (زندہ ہوکر) سمندر میں چلی گئی۔

۶۔ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (البقرۃ:۔ ۷۴) — اور بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

کیا پتھروں میں احساس ہوتا ہے کیا پتھر کا ڈرنا حقیقتِ کونیہ ہے؟

برق صاحب! یہ ہیں قرآنی آیات اور وہ ہے آپ کا معیار۔

نتیجہ

اب اگر معیار کو صحیح مانیں تو بڑی مشکل ہوتی ہے، کہ قرآنی آیات مشکوک ٹھہرتی ہیں لہذا یہ معیار ہی غلط ہے، اگر آیات کی تاویل کی جائے، تو پھر یہی چیز حدیث کے سلسلہ میں بھی قابلِ عمل ہونی چاہئے خواہ مخواہ فرضی معیاروں پر کسنا نامناسب ہے۔

۵۔ برق صاحب کا پانچواں مجوزہ معیار

انسانی فطرت کا جھٹلانا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث انسانی فطرت کے خلاف ہو وہ موضوع ہوگی اس سلسلہ میں چند آیاتِ قرآنی ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ — حضرت زکریا عرض کرتے ہیں، اے میرے رب میرے لڑکا کیسے پیدا ہوگا، حالانکہ میری

مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (مریم: ۸ و ۹)

بیوی بانجھ ہے، اور میں بے حد بوڑھا ہوگیا ہوں حتیٰ کہ اکڑ گیا ہوں، اللہ نے فرمایا، ایسی حالت میں ہی ہوگا، یہ مجھ پر آسان ہے۔

الغرض حضرت یحییٰ علیہ السلام تولد ہوئے۔ یہ پیدائش انسانی فطرت کے خلاف ہے، مرد بوڑھا ہو اور عورت بانجھ ہو تو بچہ پیدا ہونا ناممکن ہے۔ لہذا یہ آیات مجوزہ معیار پر پوری نہیں اترتیں۔

۲۔ حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دی جاتی ہے تو وہ کہتی ہیں۔

أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (مریم: ۲۰، ۲۱)

میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے، حالانکہ مجھے کسی مرد نے (نہ جائز طریقہ سے) ہاتھ لگایا اور نہ میں بدکار ہوں فرشتے نے کہا اسی حالت میں ہوگا، تیرے رب نے کہا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے۔

بغیر باپ کے بچہ پیدا ہونا یہ بھی فطرتِ انسانی کے خلاف ہے:۔

۳۔ قوم کے لوگ حضرت مریم کے پاس آئے اور انہیں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا، حضرت مریم نے شیر خوار بچے کی طرف اشارہ کر دیا، کہ اس سے پوچھو، قوم کہنے لگی۔

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ (مریم: ۲۹)

ہم گہوارے میں جھولنے والے بچے سے کیسے بات کر سکتے ہیں۔

اس بچہ نے کہا:۔

إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ ۝ (مریم: ۳۰)

میں اللہ کا بندہ ہوں۔

نوزائیدہ بچہ کا بولنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

۴۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دی گئی تو ان کی بیوی بولیں:۔

يَا وَيْلَتَىٰ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهٰذَا بَعْلِي شَيْخًا (ھود: ۷۲)

ہائے افسوس کیا میں جنوں گی حالانکہ میں بڑھیا ہو چکی ہوں اور یہ میرے خاوند بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔

پھر اس بشارت کے مطابق حضرت اسحاق علیہ السلام تولد ہوئے جب مرد و عورت دونوں بوڑھے ہوں تو ان کے اولاد ہونا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

نتیجہ

چونکہ اس معیار سے قرآنی آیات پر زد پڑتی ہے لہذا یہ معیار بھی باطل ہے اور اس پر حدیث کو پرکھنا لغو ہے،

۶۔ برق صاحب کا چھٹا مجوّزہ معیار

عقل، تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث عقل، تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو وہ موضوع ہوگی اس سلسلہ میں چند آیات بینات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۚ (النمل : ۴۰)	اس شخص نے جس کو کتاب کا کچھ علم تھا، کہا کہ میں ملکہ سبا کا تخت اتنی دیر میں لے آؤں گا، جتنی دیر میں آپ کی نگاہ واپس آئے (اور اتنی دیر میں وہ آگیا) تو اس کو اپنے پاس دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا، یہ میرے رب کا فضل ہے۔

یہ عقل و تجربہ کے خلاف ہے، کہ پلک جھپکنے میں ہزاروں میل دور سے ایک وزنی چیز منتقل ہو جائے گویا یہ آیت بھی مجوزہ معیار پر پوری نہیں اترتی، اب اس کے متعلق کیا کہا جائے۔

۲۔ وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ (الانفال : ۴۸)	جب شیطان نے کافروں کے اعمال ان کو مزین کرکے دکھائے، اور کہا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، میں تمہارا ساتھی ہوں، لیکن جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوگیا اور کہا میں تم سے بیزار ہوں۔ میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے، میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔

شیطان کا سامنے آنا، اور بات کرنا، تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے، پھر اس کا اللہ سے ڈرنا بھی حیرت انگیز ہے۔ اس کو تو قیامت تک کے لئے از روئے قرآن مجید مہلت دے دی گئی ہے، لہٰذا اس کا خوف الٰہی سے ڈر کر بھاگنا خلاف عقل ہے اور کافروں سے اس کا بیزار ہونا بھی خلاف عقل ہے، اس کے اصلی دوست تو کافر ہی ہوتے ہیں۔

۳۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ	اور جب تمہارے رب نے اولادِ آدمؑ کی

مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی شَهِدۡنَا اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِیۡنَ ۝
(الاعراف: ۱۷۲)

پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے خود ان کے مقابلہ میں گواہی طلب کی کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے کہا کیوں نہیں بے شک تو ہمارا رب ہے ہم گواہ ہیں۔ (یہ اس لئے کیا) کہ کہیں روز قیامت تم یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔

یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ پیدائش سے پہلے اقرار کرا لیا، اس اقرار سے کیا فائدہ؟ یہ اقرار کس کو یاد ہے؟ پھر یہ بھی خلاف عقل ہے کہ اولاد آدم جو ابھی وجود میں نہیں آئی تھی ان کی پیٹھیں کہاں سے آگئیں کہ ان کی پیٹھوں سے تمام اولاد کو نکال لیا۔

۴۔ وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ یَتَوَفَّی الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡمَلٰٓئِکَةُ یَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ۝
(الانفال: ۵۰)

اور اگر تم دیکھو جس وقت فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، اور ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے جاتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ جلنے کا مزا چکھو۔

یہ آیت بھی مشاہدہ کے خلاف ہے نہ کبھی یہ آواز سنائی دیتی ہے نہ فرشتے دکھائی دیتے ہیں اگر وہ مارتے تو کیا آواز نہیں آتی، مارا جائے اور آواز نہ ہو یہ خلاف عقل و تجربہ ہے۔

نتیجہ

یہ قرآنی آیات ہیں جو اس معیار پر پوری نہیں اترتیں، لہذا یہ معیار غلط ہے، نہ کہ قرآنی آیات، ہماری عقل اور ہمارا تجربہ حقیقت میں کوئی چیز نہیں، جو شخص جانتا ہے وہ جانتا ہے، اور جو نہیں جانتا اس کی سمجھ میں اس جاننے والے کی بات نہیں آسکتی، بذریعہ لاسلکی جو ہزاروں میل کی بات ہم سن لیتے ہیں کیا ہمارے اجداد کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور آج بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مثلاً پانی کے ایک قطرہ میں کروڑوں جراثیم کا ہونا، یہ عقل میں آنے والی بات نہیں، نہ اس کا ہم نے کبھی مشاہدہ کیا۔ لہذا یہ عقل کے بھی خلاف ہے اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے، محض چند فضلا پر یقین کر کے ہم اعتبار کر لیتے ہیں کہ واقعی ایسا ہوگا۔ اور جب فضلا کے علم و فضل پر اعتبار کر کے ہم ان کی خلافِ عقل و مشاہدہ عجیب و غریب بات تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر اس رسول کی کوئی خلافِ عقل و مشاہدہ بات جس رسول پر ہم ایمان لائے ہیں کیوں نہ تسلیم کریں، ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل کی

رسائی وہاں تک نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم مشاہدہ کر ہی نہ سکتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا تجربہ غلط ہو۔ لہذا صرف ان باتوں کی بنا پر حدیث کی یا رسولؐ کی تکذیب نہیں کر سکتے۔ نہ پانی کے ایک قطرہ میں کروڑوں جراثیم کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے نہ ہماری عقل میں آتا ہے لیکن پھر بھی ہم اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں یہ بھی ایک قسم کا ایمان بالغیب ہے اور جب کسی حکیم یا سائنس داں کی بات پر ایمان بالغیب ہو سکتا ہے تو پھر رسولؐ کی بات پر ایمان بالغیب کیوں نہ لایا جائے۔ کیوں اس کی بات کو عقل و تجربہ کی میزان میں رکھ کر تولنے لگیں۔ کیا یہ انصاف ہے۔ رسول پر ایمان بالغیب ہی ذریعہ ہدایت و نجات ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا ہم سے مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ	اللہ کی کتاب متقی لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت و نجات ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔
(البقرۃ ۱-۲-۳)	

اب سنیئے مشاہدہ کی بات، ہم ریل میں سفر کرتے ہیں تو نزدیک کی چیزیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہماری مخالف سمت میں بھاگ رہی ہیں، یہ نظر کا دھوکہ ہے پھر دور کی چیزیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہی سمت جا رہی ہیں حالانکہ درحقیقت وہ بھی ہماری مخالف سمت میں ہی جاتی ہیں، لیکن مشاہدہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اب اگر کوئی سائنس داں ہم سے یہ کہے کہ وہ دور کی چیزیں بھی مخالف سمت میں جا رہی ہیں تو کیا ہم اس کی تکذیب کریں کیونکہ ہمارے مشاہدہ کے خلاف ہے۔ نہیں بلکہ حقیقت کو جاننے والے کی بات ماننی چاہئے۔ مشاہدہ غلط ہو سکتا ہے، آنکھیں خطا کر سکتی ہیں۔ لہذا ہم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافِ مشاہدہ بات کو بھی تسلیم کریں گے، اور ایمان اسی کا نام ہے، اس کے علاوہ کفر ہی کفر ہے۔

اسی طرح جب ہم کہیں جاتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند بھی ہمارے ساتھ چل رہا ہے یہ بھی آنکھ کی خطا ہے۔ اسی طرح جب بادل چاند کے نیچے سے گذرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند دوڑ رہا ہے، اور بادل ساکن ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے، دو مساوی خطوط علیحدہ علیحدہ کچھ فاصلے پر کھینچے جائیں اور پھر ان میں سے ایک کے پاس ایک بہت لمبا خط کھینچا جائے تو یہ خط اپنے دوسرے مساوی خط سے چھوٹا معلوم ہو گا۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت کے خلاف ہے ریگستان میں سراب کا نظر آنا بھی محض دھوکا ہے غرض یہ کہ اس قسم کی خطائیں ہیں جو آنکھ سے سرزد ہوتی ہیں، مشاہدہ غلط بھی ہو سکتا ہے لہذا محض مشاہدہ کی خاطر ہم رسول جیسے مخبر صادق کی خبر پر شبہ کرنے لگیں یہ کسی طرح بھی ایمان کی شان نہیں۔ اس تمام بحث سے ثابت ہوا کہ یہ معیار بھی غلط ہے اور اس معیار پر حدیث کو پرکھنا لغو و لایعنی ہے

۷۔ برق صاحب کا ساتواں مجوّزہ معیار

مسلّمہ تاریخی واقعات کی تردید

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث کسی مسلّمہ تاریخی واقعہ کی تردید کرتی ہو وہ موضوع ہے اس سلسلہ میں قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ یہ مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب رسولوں کے آخر میں آئے لیکن قرآن کہتا ہے:۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (النجم:۔ ۵۶) — یہ پہلے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ہیں۔

۲۔ کوہ طور آج بھی موجود ہے لیکن قرآنِ مجید کہتا ہے:۔

جَعَلَهٗ دَكًّا (الاعراف:۔ ۱۴۳) — تجلیاتِ الٰہی نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔

۳۔ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (الشعراء:۔ ۵۷تا۵۹) — ہم نے قومِ فرعون کو باغات، چشمے اور خزانوں اور محلات سے نکال کر باہر کر دیا۔ اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا۔

بنی اسرائیل تو مصر چھوڑ کر چلے آئے تھے، پھر وہ وارث کیسے ہو گئے؟ یہ تاریخ کے خلاف ہے۔

۵۔ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا (اٰلِ عمران:۔ ۱۶۵) — جو نقصان کافروں سے تمہیں پہنچا تم اس سے دگنا انہیں پہنچا چکے ہو۔

یہ مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے کہ جنگ بدر میں ستّر کافر قتل ہوئے اور جنگ احد میں ستّر مسلم شہید ہوئے یعنی دونوں کا نقصان برابر تھا۔ لیکن قرآنِ مجید کی مذکورہ بالا آیت کافروں کا نقصان دوگنا بتاتی ہے لہٰذا یہ آیت مسلّمہ تاریخی واقعہ کے خلاف ہے اب بتائیے اس آیت کے متعلق کیا کہیں؟

کیونکہ اس معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں، لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے، تاریخ غلط ہو سکتی ہے لیکن قرآن و حدیث غلط نہیں ہو سکتے۔

۸۔ برق صاحب کا آٹھواں مجوّزہ معیار

اسلام کے اہم اصولوں مثلاً جہاد وایثار وغیرہ کی منزلت گھٹاتی ہو

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث سے جہاد وغیرہ کی منزلت میں فرق آتا ہے وہ حدیث جعلی ہے اس سلسلہ میں قرآنی آیات ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ
هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَ
الَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ وَ
الَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝
إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝
فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ
وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ
عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ
هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ
الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝
(المؤمنون ۱۔ اتا ۱۱)

بے شک ایمان والے فلاح پائیں گے، وہ جو نماز میں خشوع کرتے ہیں، اور لغو کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور وہ لوگ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے اور اپنی لونڈیوں کے، کیونکہ ان سے ایسا کرنے میں کوئی ملامت نہیں، اور ان کے علاوہ کسی دوسری عورت سے کرنے والے گنہ گار ہیں، اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرتے ہیں، اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یہ ہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، اور یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات میں کہیں جہاد کا ذکر نہیں اور باوجود اس کے جنت الفردوس کا وعدہ ہے کیونکہ یہ آیات جہاد کی اہمیت گھٹاتی ہیں لہٰذا ان کے متعلق کیا کہا جائے۔

۲۔ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝
وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ۝
لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَالَّذِينَ
يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ وَالَّذِينَ
هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۝

جو لوگ ہمیشہ نماز ادا کرتے رہتے ہیں اور جن لوگوں کے مال میں سائل اور محروم کے لئے حصے مقرر ہیں، اور جو لوگ یوم آخرت کی تصدیق کرتے ہیں، اور جو لوگ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے

إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُكْرَمُونَ ۝

(المعارج:- ۲۳ تا ۳۵)

ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب غیر مامون ہے ۔ اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے، ان کے معاملہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں ۔ اور ان کے علاوہ تلاش کرنے والے گنہ گار ہیں ۔ اور جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں ۔ اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں ، یہ لوگ باغوں میں عزت کے ساتھ رہیں گے ۔

ان آیات میں جہاد کی طرف اشارہ تک نہیں، پھر بھی جنّت کا وعدہ ہے

۳۔ وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۝ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا ۝ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۝ وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ۝ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ۝ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہلوں سے بات کرتے ہیں تو صاحب سلامت کی بات کہتے ہیں ، راتوں کو نماز پڑھتے ہیں ، اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہم کو عذاب دوزخ سے بچا ، اس کا عذاب بہت بُرا ہے اور وہ لوگ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتے نہ کسی ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل کرنا اللہ تعالےٰ نے حرام کر دیا ہے اور قتل کرتے ہیں تو حق کے ساتھ اور جو لوگ زنا نہیں کرتے ۔ اور جو شخص ایسا کرے وہ گنہ گار ہے ، اس کے لئے قیامت کے دن کئی گنا

وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ٥ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ٥ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ٥ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ٥ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ٥ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ٥ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ٥ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ٥

(الفرقان ۲۵: ۶۳ تا ۷۶)

عذاب ہے۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، مگر وہ جو توبہ کرلے اور ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرتا رہے تو اس کی برائیوں کو ہم نیکیوں سے بدل دیں گے اور اللہ غفور ہے رحیم ہے اور جو توبہ کرے اور پھر نیک عمل کرے تو ایسا ہی شخص درحقیقت اللہ کے ہاں تائب شمار ہوتا ہے، اور جو لوگ بے ہودہ کاموں میں حاضر نہیں ہوتے، اور جب بیہودہ مشاغل کے پاس سے ان کا گذر ہوتا ہے تو وقار سے گذر جاتے ہیں اور وہ لوگ کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیات بیان کی جائیں تو اندھے اور بہرے نہیں بن جاتے اور وہ لوگ جو اس طرح دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہماری بیویوں اور اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے اور ہمیں متقین کا پیش رو بنا دے۔ ان لوگوں کو ان کے صبر کے عوض جنت کے بالاخانے ملیں گے ان کی ملاقات تحیۃ و سلام سے ہوا کرے گی، ان اچھے مقامات میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

نیک اعمال کی اتنی لمبی فہرست ہے، لیکن کہیں بھی جہاد کا ذکر نہیں، اور نہ ایثار کا، اس قسم کی بہت سی آیات ہیں۔

نتیجہ

کیونکہ اس مجوزہ معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں، لہذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

۹۔ برق صاحب کا نواں مجوّزہ معیار

رہبانیّت اور نفس کشی کو جہادِ اکبر قرار دیتی ہو

اگرچہ ایسی کوئی حدیث نہیں جس میں رہبانیت اور نفس کشی کو جہادِ اکبر قرار دیا ہو، تاہم معیار کی قوت ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن مجید میں ہے :۔

۱۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزّمّل :۔ ۸)
اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور تمام دنیاوی لائق سے قطع تعلق کرکے اس کی طرف رجوع کرو۔

۲۔ یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

سَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ○ (آلِ عمران :۔ ۳۹)
وہ سردار ہوں گے، نفس کشی کرنے والے ہونگے اور نبی ہوں گے صالحین میں سے۔

۳۔ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي (آلِ عمران :۔ ۳۵)
جب عمران کی بیوی نے کہا اے میرے رب میں نذر مانتی ہوں کہ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے اس کو تیرے لئے آزاد چھوڑ دوں گی پس تو اسے قبول فرما۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ (آلِ عمران :۔ ۳۷)
اللہ نے اُسے بوجہ احسن قبول فرما لیا۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ترکِ دنیا اللہ کو پسند ہے اور اگر مرد و عورت راہبانہ زندگی گذاریں تو یہ اس کو محبوب ہے، یعنی راہب (MONK) و راہبہ (NUN) بن جانا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ کیونکہ ان آیات میں بظاہر رہبانیت اور نفس کشی کی ترغیب پائی جاتی ہے لہٰذا یہ معیار باطل ہے۔

۱۰۔ برق صاحب کا دسواں مجوّزہ معیار

مسلمانوں کو دنیا سے بیزار کرنا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث مسلمین کو دنیا سے بیزار کرے وہ جعلی ہے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَىٰ
(النساء: ۷۷)

کہہ دیجئے کہ دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے اور آخرت بہتر ہے اس کیلئے جو تقویٰ اختیار کرے۔

۲۔ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۔
(آلِ عمران: ۱۵۲)

تم میں سے بعض دنیا کے طالب ہیں اور بعض آخرت کے طالب ہیں، پھر اللہ نے تم کو ان سے پھیر دیا، تاکہ تم کو مبتلائے مصیبت کرے۔

اس سے ثابت ہوا کہ دنیا طلبی کی سزا میں مسلمین کو جنگ احد میں مبتلائے مصیبت کیا گیا۔

۳۔ مَن كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَن كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن نَّصِيبٍ ۝
(الشوریٰ: ۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہے تو ہم اس کی کھیتی میں زیادتی کردیں گے اور جو شخص دنیا کی کھیتی کا خواہش مند ہے تو اس کو اس میں سے کچھ دے دیں گے، لیکن آخرت میں اس کے لئے کچھ نہیں۔

۴۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے دنیا مانگی تو جواب ملا کہ:۔

اِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝
(الاحزاب: ۲۸، ۲۹)

اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور دنیا کی زیب و زینت چاہیئے، تو آؤ میں تم کو مال دے کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کئے دیتا ہوں اور اگر اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور آخرت کے گھر کی طالب ہو تو پھر بے شک اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

گویا اللہ، رسول، اور آخرت کے طلب گار کو دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہئے:۔

۵۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ
(طٰہٰ: ۱۳۱)

اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس مال و متاع کو نہ دیکھئے، جو ہم نے ان لوگوں کو دے رکھا ہے۔

الغرض اس قسم کی بیسیوں آیتیں ہیں جو دنیا سے بیزار کراتی ہیں۔ لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

۱۱۔ برق صاحب کا تجویز کردہ گیارھواں معیار
ایک ایک دعا پر لاکھوں جنّتیں تقسیم کرنا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ ہو کہ فلاں دعا پڑھنے سے ایک لاکھ جنتیں مل جائیں گی وہ حدیث جعلی ہے۔ برق صاحب ایسی صحیح حدیث تو کوئی موجود نہیں البتہ ایسی آیات ضرور موجود ہیں جو صرف "ربنا اللہ" کہنے پر جنت کا وارث بنا دیتی ہیں۔ سنیئے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ	بے شک جن لوگوں نے کہا "ربنا اللہ" ہمارا
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	رب اللہ ہے پھر اس پر جمے رہے تو ان پر
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا	فرشتے نازل ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ نہ ڈرو
بِالْجَنَّةِ (حٰمٓ سجدہ: ۳۰)	نہ غم کھاؤ اور جنت کی بشارت سنو!

کیونکہ اس معیار پر قرآن مجید کی آیات بھی پوری نہیں اترتیں۔ لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

۱۲۔ برق صاحب کا تجویز کردہ بارھواں معیار
وضو کرنے پر سارے گناہ معاف کرنا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ بشارت ہو کہ وضو کرنے سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ برق صاحب! وضو تو خیر بہت بڑا عمل ہے اور ایک بہت بڑے مقصد کا پیش خیمہ ہے قرآن مجید تو صرف جھک کر "حِطَّةٌ" کہنے پر سارے گناہوں کے معاف کرنے کی خوشخبری دیتا ہے، سنیئے:۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا	دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل
حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ	ہونا اور "حِطَّةٌ" کہنا، ہم تمہارے سب گناہ
(البقرۃ: ۵۸)	معاف کر دیں گے۔

اس معیار پر بھی قرآنی آیات پوری نہیں اترتیں لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

. . . .

۱۳۔ برق صاحب کا تجویز کردہ تیرھواں معیار

دوات کی سیاہی کو ایک لاکھ شہیدوں کے خون سے افضل ٹھہرانا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ ہو کہ دوات کی سیاہی ایک لاکھ شہیدوں کے خون سے افضل ہے وہ جعلی ہے برق صاحب ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں ہے لہٰذا یہ معیار ہی بے کار ہے، مگر اتنا ضرور عرض ہے کہ ایک عالم کی دوات کی سیاہی کا مقصد کیا ہے وہی جو ایک شہید کے خون کا مقصد ہے یعنی دین الٰہی کی حفاظت، پھر مزید برآں سیاہی سے دین الٰہی کی حفاظت ہی نہیں ہوتی بلکہ دین الٰہی کی تبلیغ بھی ہوتی ہے۔ گویا سیاہی دونوں کام کرتی ہے حملہ بھی کرتی ہے اور دفاع بھی، پھر خونِ شہید کا اثر عارضی ہوتا ہے لیکن اس سیاہی سے لکھی ہوئی کتاب کا فیضان قیامت تک جاری رہتا ہے لہٰذا لکھنے والے کے نامۂ اعمال میں ثواب کے انبار لگ جاتے ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سیاہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ الغرض یہ معیار بھی باطل ہے۔

۱۴۔ برق صاحب کا تجویز کردہ چودھواں معیار

ذکرِ خدا کو جان و مال کی قربانی سے بہتر قرار دیتی ہو

اس سلسلہ میں سنئے کہ قرآنِ مجید کیا فرماتا ہے۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ (العنکبوت: ۴۵) اور بے شک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔

اس آیت کے علاوہ بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی فضیلت بیان ہوئی ہے، بلکہ بعض آیات میں تو جہاد کو مقاماتِ ذکر کی حفاظت کا ذریعہ بتایا گیا ہے گویا اصل مقصد ذکرِ الٰہی ہے اور جہاد اس کا خادم، اس لحاظ سے اور مذکورہ بالا آیت کے لحاظ سے یہ معیار بھی باطل ہے۔

۱۵۔ برق صاحب کا تجویز کردہ پندرھواں معیار

سورج کو عرش کے نیچے سجدہ کرانا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں ہو کہ سورج عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، و

باطل ہے:۔

سورج کا سجدہ کرنا تو قرآنِ مجید سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو زمین
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ	و آسمان کی تمام مخلوقات سجدہ کرتی
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَ	ہے۔ اور سورج، چاند، تارے اور
الْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ	پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت
وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ	سے انسان بھی سجدہ کرتے ہیں ۔

(الحج:۔ ۱۸)

قرآنِ مجید کی رُو سے تو سورج ہی سجدہ نہیں کرتا بلکہ پہاڑ بھی سجدہ کرتے ہیں، درخت بھی سجدہ کرتے ہیں، جانور بھی سجدہ کرتے ہیں اور یہاں سجدہ سے حکمِ کونی مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ حکمِ کونی کے تو تمام انسان تابع ہیں اور آیت میں تمام انسانوں کا ذکر نہیں، لہٰذا سجدہ سے مراد وہی عبادت کا سجدہ ہے اور یہی عبادت کا سجدہ سورج بھی کرتا ہے اور پہاڑ بھی۔ لہٰذا اس مجوّزہ معیار پر آیاتِ قرآنی بھی پوری نہیں اترتیں اور اس لحاظ سے یہ معیار بھی باطل ہے ۔

۱۶۔ برق صاحب کا مجوّزہ سولھواں معیار

درختوں کو رُلانا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ خبر ہو کہ درخت رویا تو وہ حدیث موضوع ہے برق صاحب درختوں کے احساسات کو جدید سائنس نے بھی تسلیم کر لیا ہے مگر ابھی تک معجزہ پر آپ کو شک ہے، اچھا اب قرآنی آیات سنیئے:۔

۱۔ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ	اور ہم نے پہاڑوں کو داوٗدؑ کے ساتھ مسخر کر دیا تھا
يُسَبِّحْنَ ۝ (الانبیاء:۔ ۷۹)	وہ پہاڑ تسبیح پڑھا کرتے تھے۔

اگر پتھر تسبیح پڑھ سکتے ہیں تو پھر درخت کا رونا تعجب خیز کیوں ؟

۲۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ	اور ہوا سلیمانؑ کے تابع تھی ان کے حکم سے
بِأَمْرِهٖ (الانبیاء:۔ ۸۱)	چلتی تھی۔

ہوا جیسی چیز ایک رسولؑ کی محکوم ہو تو کوئی تعجب نہیں ؟ درخت کا رونا تعجب خیز کیوں ؟

۳۔ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (البقرۃ ۲:۷۴) — اور بعض پتھر ایسے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

گویا ان پتھروں کو خوف محسوس ہوتا ہے، وہ گر پڑتے ہیں، ان میں بغیر دل و دماغ کے احساس ہوتا ہے۔

الغرض اس معیار پر بہت سی آیات پوری نہیں اترتیں لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے، پھر معجزہ کا نام ہی اس قسم کے معیاروں کے بطلان کے لئے کافی ہے۔

۱۷۔ برق صاحب کا سترھواں مجوّزہ معیار

صوم و حیض میں مباشرت کی اجازت دینا

برق صاحب مباشرت سے مجامعت مراد لیتے ہیں اور کیونکہ کسی حدیث میں بحالت صوم و حیض مجامعت کی اجازت نہیں لہٰذا یہ معیار ہی کالعدم ہے۔

۱۸۔ برق صاحب کا اٹھارھواں مجوّزہ معیار

طریقت اور پیرگری کو اچھالنا

کسی صحیح حدیث میں یہ مضمون نہیں، لیکن قرآنِ مجید میں اس کا اشارہ پایا جاتا ہے، سنیئے:۔
سورۃ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات اور سفر کا ایک قصّہ مذکور ہے اس سفر میں حضرت خضر نے ایسے کام کئے جو بظاہر یا تو خلافِ شرع تھے یا خلافِ عقل، یعنی جس کشتی میں سوار تھے اس کو توڑ ڈالا، ایک معصوم بچے کو قتل کر دیا، ایک دیوار کی بلا وجہ اور بغیر اجرت کے مرمت کر دی۔ ان تینوں باتوں کے رمز تک حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر نہ پہنچ سکے، بلکہ ہر بات پر اعتراض کیا، بالآخر حضرت خضر علیہ السلام نے استادانہ حیثیت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں کا راز سمجھا دیا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ شریعت کے عالم ظاہر پرست ہوتے ہیں انہیں حقیقت کا علم نہیں ہوتا، طریقت والے شریعت سے ماوراء ہوتے ہیں وہ ایسے کام کر گذرتے ہیں جو بظاہر خلافِ شرع معلوم ہوتے ہیں لیکن باطن میں وہ عین شرع ہوتے ہیں، دیکھیے موسیٰ علیہ السلام صاحبِ شریعت رسول تھے لیکن ان کو صرف ظاہر کا علم تھا اور حضرت خضر صاحبِ طریقت و معرفت تھے وہ ان حقائق سے آشنا تھے،

جن سے موسیٰ علیہ السلام قطعاً نابلد تھے بلکہ ان تک موسیٰ علیہ السلام کی رسائی نہ ہو سکتی تھی، لہذا صاحبِ طریقت کا مرتبہ صاحب شریعت سے بڑا ہے اگر کوئی پیر خلافِ شریعت کام کرتا نظر آئے تو اس کو بُرا مت سمجھو، بلکہ یہ خیال کرو کہ پیر ایسی جگہ پہنچ گیا ہے جہاں وہ ظاہری شریعت سے بے پرواہ ہو کر کام کرتا ہے اور وہ حقیقی شرع ہے۔ الغرض قرآن مجید کے اس قصہ سے بظاہر طریقت اور پیری مریدی کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔ بتائیے کیا یہ قصہ بھی محلِ نظر ہے، ہرگز نہیں، قصہ تو محلِ نظر ہو نہیں سکتا اس لئے کہ قرآنِ مجید میں ہے اور معیار بھی صحیح ہے لہذا سوائے تاویل کے اور کوئی چارۂ کار نہیں اسی طرح کوئی بات اگر بفرضِ محال صحیح حدیث میں آجائے۔ تو اس کی بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں تاویل کر لینی چاہیئے۔

۱۹۔ برق صاحب کا انیسواں مجوّزہ معیار

صرف کلمہ پڑھنے پر زانی کو جنت میں بھیجنا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ ہو کہ صرف کلمہ پڑھنے سے جنت مل جائے گی، خواہ کلمہ پڑھنے والا زانی ہی کیوں نہ ہو تو وہ حدیث موضوع ہے۔ برق صاحب حدیث تو ایسی کوئی نہیں جس کا یہ مطلب ہو۔ آپ کو غلط فہمی ہو گئی اور آپ کی اس غلط فہمی کا جواب بارھویں باب میں تفصیل سے دیا جا چکا ہے، اب سنیئے، قرآنِ مجید تو صرف "رَبُّنَا اللّٰہُ" کہنے پر جنت کی خوشخبری دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ (حٰمٓ السجدۃ ۱-۳۰)	بے شک جن لوگوں نے کہا "ربنا اللہ" اور پھر اس پر جمے رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو کہتے ہیں نہ ڈرو، نہ غم کھاؤ، اور جنت کی بشارت سنو!

کیونکہ اس معیار پر قرآنِ مجید کی آیت بھی پوری نہیں اترتی لہذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

۲۰۔ برق صاحب کا بیسواں مجوّزہ معیار

سورج کو شیطان کے سینگوں میں پھنسانا

حدیث کا یہ مطلب تو نہیں کہ سورج شیطان کے دو سینگوں میں پھنس جاتا ہے جس حدیث

کی طرف برق صاحب کا اشارہ ہے اس کا جواب انیسویں باب میں دیا جا چکا ہے اب قرآنِ مجید کی آیت سنئے:۔

تَغْرُبُ فِی عَیْنٍ حَمِئَۃٍ — سورج کیچڑ کے چشمہ میں ڈوبتا ہے۔

(الکہف:۔ ۸۶)

بتلایئے جو آیت سورج کو کیچڑ کے چشمہ میں ڈوبتی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر صحیح ہے اور ضرور صحیح ہے تو پھر یہ معیار ہی باطل ہے۔ قرآن وحدیث کے ظاہری معنوں پر ایمان لانا چاہیئے اگر ان کی حقیقت تک ہم نہیں پہنچ سکتے تو خاموش ہو جانا چاہیئے نہ کہ اعتراض کرنا چاہیئے۔

۲۱۔ برق صاحب کا اکیسواں مجوّزہ معیار

مشکل اسلام کو چھوڑ کر آسان اسلام کی دعوت دینا

برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس حدیث میں یہ مذکور ہو کہ بغیر محنت ومشقت کے جنت مل جائے گی تو وہ حدیث موضوع ہوگی۔ غالباً ان کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی مسلم تکالیف برداشت نہ کرے صدمے نہ سہے وہ حقیقۃً مسلم ہی نہیں، حالانکہ بات درحقیقت یہ نہیں ہے آسان اسلام تو خود اللہ تعالیٰ پیش کرتا ہے، سنئے:۔

۱۔ مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج:۔ ۷۸) — اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی مشکل نہیں ڈالی۔

۲۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ:۔ ۱۸۵) — اللہ تم پر آسانیوں کا ارادہ کرتا ہے اور تم پر مشکلات ڈالنا نہیں چاہتا۔

۳۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرۃ:۔ ۲۸۶) — اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں ڈالتا۔

۴۔ یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (الاعراف:۔ ۱۵۷) — اللہ کا رسول لوگوں سے ان کے بوجھ اتار کر الگ رکھ دیتا ہے اور وہ طوق جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے توڑ کر پھینک دیتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ مسلمین کو تعلیم دیتا ہے کہ اس طرح دعا مانگو:۔

۵۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا — اے ہمارے رب ہم پر ایسے بھاری احکام نافذ مت فرما جو تو نے ہم سے پیشتر لوگوں

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِہٖ (البقرۃ :۔ ۲۸۶) پر نافذ فرمائے تھے اور ایسے احکام بھی نافذ نہ فرما جن کی تکمیل کی ہم میں طاقت نہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآنِ مجید آسان اسلام کی دعوت دیتا ہے لہٰذا اس معیار پہ قرآن مجید بھی پورا نہیں اترتا۔ اب ان دونوں میں سے ایک ہی چیز صحیح ہوسکتی ہے یعنی یا تو قرآنِ مجید صحیح ہے یا معیار، اور کیونکہ قرآنِ مجید قطعی الصحت ہے لہٰذا یہ معیار باطل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں احکام بہت مجمل ہیں۔ نماز کے نہ اوقات ہیں نہ شرائط، نہ رکعات کی تعداد، نہ ان کی ہیئت، احادیث میں جو جو باتیں مذکور ہیں ان کی وجہ سے نماز ایک باقاعدہ اور منظم عبادت بن جاتی ہے صرف قرآنِ مجید کی رُو سے تو نماز کو آسان بنانے والا آسان بنا سکتا ہے لیکن حدیث ایسا کرنے سے روکتی ہے یعنی وہ نماز کو مشکل بنا دیتی ہے۔ پھر سود کے احکام اور مختلف صورتیں، خرید و فروخت کے مفصل احکام وغیرہ وغیرہ یہ سب مشکلیں ہیں جو احادیث میں ملتی ہیں۔ پھر جہاد کے متعلق مختلف ہدایات اور پابندیاں یہ بھی احادیث میں ملتی ہیں، احادیث میں ناچ، گانے، فنونِ لطیفہ اور لغو کھیلوں کی ممانعت ملتی ہے غرض یہ کہ احادیث کی وجہ سے کچھ مشکلات ظہور ہی جاتی ہیں۔ لہٰذا احادیث کا پیش کیا ہوا اسلام، قرآنِ مجید کے اسلام سے کچھ زیادہ ہی مشکل ہے اس لحاظ سے اس معیار کی زد احادیث سے زیادہ قرآنِ مجید پر پڑتی ہے لہٰذا یہ معیار باطل ہے۔

خُلاصہ

یہ کل اکیس معیار تھے جو برق صاحب نے پیش کئے ہیں اور ان میں سے کسی معیار پر قرآن مجید بھی پورا نہیں اترتا، لہٰذا تمام معیار لغو اور باطل ہیں۔

احادیث کو پرکھنے کے لئے یہ معیار آخری سند نہیں ہوسکتے، صادق، حافظ، ضابط اشخاص کا بیان تسلیم کرنا ہی پڑے گا، خواہ ہماری فہم میں آئے یا نہ آئے۔ احادیث کی اصل کسوٹی یہی ہے کہ بیان کرنے والا صدق، حفظ، ضبط کے اوصاف سے متصف ہو اور اگر کسی راوی میں یہ اوصاف پائے جائیں تو پھر ان معیاروں پر بھی غور ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔

معیارِ مزید

برق صاحب نے ایک معیار چھوڑ دیا اور وہ ہے "اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف بات بیان کرنا"۔ یہ بات احادیث میں تو غالباً نہیں ملتی لیکن قرآنِ مجید میں ضرور مل جاتی ہے:۔ مثلاً :۔

۱۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کو ایذا

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (الاحزاب :۔ ۵۷)

پہنچاتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچانا مذکور ہے تو کیا یہ آیت اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے ۔

۲۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ۔ (البقرۃ :۔ ۱۵)

اللہ ان سے مذاق کرتا ہے ۔

۳۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۔ (النساء :۔ ۸۸)

اور جس کو اللہ گمراہ کرے اس کے لئے تمہیں ہرگز راستہ نہیں ملے گا ۔

یہ ہیں چند آیات جو نمونۃً پیش کر دی گئی ہیں، ظاہر معنوں کے لحاظ سے تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیات قرآنِ مجید میں نہیں ہو سکتیں، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ اقدس کے خلاف ہیں لیکن یہ قرآنِ مجید ہی کی آیتیں ہیں اور ان پر ہمارا ایمان ہے اب اگر تاویل کر کے ان کو اعتراض سے بچایا جا سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اسی قسم کی بلکہ اس سے کم اعتراض والی احادیث کے ساتھ یہ رویّہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا ۔

معیارِ مزید

برق صاحب چاہتے تو ایک معیار کا اور اضافہ کر دیتے وہ یہ کہ اگر کوئی حدیث کسی جاہلیت کی رسم کی سرپرستی کرتی ہو، تو وہ بھی موضوع ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس معیار کے لئے قرآنِ مجید ہی سدِّراہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے :۔

۱۔ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۚ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (النمل :۔ ۸، ۹)

جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے تو آواز آئی کہ جو ہستی آگ میں ہے وہ برکت والی ہے اور جو اس کے آس پاس ہے وہ بھی برکت والا ہے، پاک ہے وہ اللہ جو رب العالمین ہے اے موسیٰ وہ ہستی میں ہوں زبردست اور حکمت والا ۔

کیا ان آیات سے آتش پرستی کو تقویت نہیں پہنچتی؟

اگر کسی تاویل سے ان آیات پر ایمان ہے تو پھر بہت ہی کم اعتراض والی احادیث پر ایمان کیوں نہ لایا جائے بظاہر یہ آیت قابلِ اعتراض نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں اعتراض سے بالکل پاک ہے، اسی طرح بعض احادیث بظاہر قابلِ اعتراض معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں وہ بھی

اعتراض سے بالکل پاک ہوتی ہیں، غرض یہ کہ یہ تمام معیار باطل ہیں۔ معتبر آدمی کی بات قابلِ تسلیم ہونی چاہیئے۔

سب سے بڑا معیار

احادیث کو پرکھنے کا سب سے بڑا معیار یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کے خلاف نہ ہو کسی قرآنی آیت سے متعارض نہ ہو۔ واقعی بظاہر تو یہ بڑا زبردست معیار ہے، اور بہت ہی خوشنما اور دیدہ زیب معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بھی بالکل قابلِ وقعت نہیں ہے، کچھ بحث تو اس پر معیار اوّل کے ضمن میں گذر چکی ہے، لیکن اس معیار کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اس پر کچھ مزید تحریر کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث کسی قرآنی آیت کے خلاف ہو تو وہ موضوع ہے تو کیا اگر کوئی قرآنی آیت کسی دوسری آیت کے خلاف ہو تو وہ بھی موضوع ہے یا نہیں؟ اگر وہ آیت موضوع نہیں تو حدیث کیوں؟ آپ کہیں گے کہ ایسی تو کوئی بھی آیت نہیں جو دوسری آیت کے خلاف ہو، ہم کہتے ہیں، ایسی بہت سی آیات ہیں، ملاحظہ فرمائیے!

۱۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؁
(الحاقۃ، ۴۳)۔

ترجمہ۔ یہ قرآن مجید رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

۱۔ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔
(التکویر ۱۹ الحاقۃ:۔ ۴۰)

ترجمہ:۔ یہ رسول کریم کا قول ہے۔

ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے یا کسی فرشتہ کا۔

۲۔ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؁ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؁
(النمل:۔ ۸، ۹)

ترجمہ:۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے تو آواز آئی کہ جو بستی آگ میں اور آگ کے اطراف میں ہے وہ برکت والی ہے اور اللہ رب العالمین

۲۔ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ؁
(القصص:۔ ۳۰)

ترجمہ:۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے تو وادیٔ ایمن کے کنارے سے ایک مبارک مقام میں ایک درخت سے آواز آئی کہ اے موسیٰ، میں اللہ رب

پاک ہے اے موسیٰ وہ ہستی میں ہوں، اللہ العالمین ہوں۔
زبردست حکمت والا۔

پہلی آیت میں ہے کہ آگ سے آواز آئی، دوسری میں ہے کہ درخت سے آواز آئی۔

۳۔ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً۔ (البقرۃ ۔ ۵۱)
۳۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً۔ (الاعراف ۔ ۱۴۲)

ترجمہ :۔ اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ لیا۔
ترجمہ :۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ لیا۔

پہلی میں چالیس رات اور دوسری میں تیس رات۔

خلاصہ

غرض یہ کہ اس قسم کی متعدد آیات ہیں جو غلط فہمی کی وجہ سے بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نظر آتی ہیں۔ اب کیا ہمارا یہ فرض ہے کہ دونوں کو یا ایک کو مسترد کردیں، نہیں ہرگز نہیں اور نہ ہم ایسا کرتے ہیں اور نہ برق صاحب ایسا کریں گے اور جب ایسا نہیں کرتے تو کوئی صورت تطبیق کی نکالنی پڑتی ہے اور ظاہری تضاد کو دور کرلیتے ہیں تو پھر آخر کیا مشکل ہے کہ اگر آیات و احادیث میں غلط فہمی کی وجہ سے تضاد نظر آئے تو ان میں تطبیق کے عمل کو بالائے طاق رکھ کر احادیث کو مسترد کرنے کے لئے تیار ہوجائیں۔ آیات و احادیث کے تضاد یا احادیث کے مابین اختلاف کو اکثر لوگوں نے ہوا بنا رکھا ہے حالانکہ ایسا اختلاف تو قرآن مجید میں بھی موجود ہے پھر کیا قرآن مجید کو چھوڑ دیا جائے، اگر نہیں تو احادیث کو چھوڑنے کی کیا وجہ ہے؟

قرآن مجید کی دو آیتوں میں تضاد نظر آتا ہے لیکن ہم دونوں کو تسلیم کرتے ہیں کسی ایک کو بھی مسترد نہیں کرتے۔ کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ دونوں ثابت شدہ ہیں، ثابت شدہ چیز کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی چیز حدیث کے معاملہ میں بھی صحیح ہے اگر کسی آیت اور کسی حدیث میں تضاد نظر آئے تو اگر حدیث ثابت شدہ ہے تو اس کا انکار نہیں کیا جائیگا، بلکہ دونوں میں تطبیق کی صورت پیدا کی جائے گی۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔
"ساری امت حدیث کو اسلام سمجھ بیٹھی ہے۔" (دو اسلام صـ ۳۴۹)

ازالہ

تو پھر برق صاحب آپ کا عقیدہ ساری امت کے خلاف کیوں؟ یہ صحیح ہے کہ ساری امت حدیث کو اسلام سمجھتی ہے اور اس کو سمجھنا ہی چاہیئے، اس لئے کہ اس کے بغیر

قرآن مجید بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتا جو چاہے، جیسے معنی کرلے، اور اس کی مثال ہم گذشتہ صفحات میں اور خصوصاً تمہید میں دے چکے ہیں، اور ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حدیث کو اسلام تو آپ بھی سمجھتے ہیں ہاں موضوع حدیث کو آپ اسلام نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے۔

"اسلام دو ہیں، ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے دوسرا وضعی احادیث کا اسلام،" (دو اسلام ص۲۰)

ہم بھی ان وضعی احادیث کے اسلام کی مخالفت میں آپ کے ساتھ ہیں، اور آپ کا یہ بھی قول ہے کہ:۔

"حاشا و کلاً مجھے حدیث سے بغض نہیں، بلکہ ان انسانی اقوال سے ضد ہے، جنہیں یہودیوں، زندیقوں اور ہمارے فرقہ باز راہ نماؤں نے تراش کر مہبط الوحی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس لئے منسوب کر دیا تھا کہ خدا، رسول اور قرآن کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہ رہے۔" (دو اسلام ص۵۹)

ہمیں بھی آپ کے اس قول سے اتفاق ہے، بے شک بعض لوگوں نے حدیثیں گھڑیں، لیکن وہ حدیثیں الگ چھانٹ دی گئیں، پھر آپ ہی کا یہ بھی قول ہے کہ:۔

"ائمۂ حدیث میں ایسے بزرگ بھی پائے جاتے ہیں جن پر ملتِ اسلامیہ کو ہمیشہ ناز رہا ہے، ان کا علمی مقام اتنا بلند، اور ان کے ثقافتی کارنامے اتنے عظیم ہیں کہ ہمیں ان پر تنقید کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی" (دو اسلام ص۹۴)

ہم بھی آپ کی تائید کرتے ہیں، آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے بلکہ آپ کا تو اقوالِ رسولؐ پر ایمان ہے۔ جیسا کہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

م:۔ تو کیا اقوالِ رسولؐ قابلِ ایمان نہیں؟

ب:۔ کیوں نہیں! بشرطیکہ کہیں سے کوئی قولِ رسولؐ مل جائے رونا تو اسی بات کا ہے کہ اقوالِ رسولؐ کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے۔ اگر اقوالِ رسولؐ مل جاتے تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا، اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے۔" (دو اسلام ص۱۱)

گویا برق صاحب اقوالِ رسولؐ پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اقوالِ رسولؐ قرآن حکیم کی تشریح ہیں اور ہمیں بھی برق صاحب سے اس معاملہ میں کلیتہً اتفاق ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اقوالِ رسولؐ ہیں کہاں؟ تو برق صاحب خود آپ ہی کا قول ہے کہ بہت سے اقوالِ رسولؐ موجود ہیں، محدثین نے کھرا کھوٹا الگ کر دیا ہے۔ آپ کی عبارات یہ ہیں۔

"بحمد اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گذرے ہیں، جنہوں نے ایسے تمام واقعات پر سخت تنقید کی، فجزاہم اللہ احسن الجزاء" (دو اسلام صہ ۹۰)

"اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ امام مالک کا کردار تقدس اور خلوص تمام شبہات سے ورلوتر تھا اور کہ انہوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرنے کے لئے تمام انسانی ذرائع استعمال کئے ہوں گے۔" (دو اسلام صہ ۱۶۲)

"اس میں کلام نہیں کہ امام بخاری (وفات ۲۵۶ھ) نے صحیح احادیث کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کئے، ہر حدیث کو پرکھنے کے لئے تمام امکانی وسائل اختیار فرمائے، راویوں کا کھوج لگایا، ہر قابلِ ذکر محدث سے مشورہ کیا اور سالہا سال کی مسلسل جستجو اور تگاپو کے بعد اپنا مجموعہ تیار کیا" (دو اسلام صہ ۱۷۵)

برق صاحب کو اعتراف ہے کہ اس مجموعہ صحیح بخاری میں صرف چند احادیث ناقابلِ اعتبار ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اس مجموعہ میں چند ایسی احادیث موجود ہیں۔۔۔۔"

گویا ان چند کو نکال کر باقی احادیث کو برق صاحب بھی صحیح سمجھتے ہیں، برق صاحب کو یہ شبہ تھا کہ اقوالِ رسول کہیں ہیں ہی نہیں، لیکن اب وہ خود ہی تسلیم کر رہے ہیں کہ چند احادیث کو نکال کر صحیح بخاری کی تمام احادیث صحیح ہیں، فللہ الحمد۔

لہٰذا ان سے گذارش ہے کہ اس مجموعہ پر اب ان کو اعتماد کر لینا چاہئے۔ چند احادیث کے متعلق جو شکوک تھے وہ دور کر دئے گئے۔ لہٰذا پورا مجموعہ صحیح بخاری قطعاً صحیح ہے، پھر برق صاحب آپ ہی نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی حدیث صحیح موجود ہی نہیں" (دو اسلام صہ ۳۴۱)

"دوم:۔ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں۔"
(دو اسلام صہ ۳۴۱)

یہ بھی آپ ہی کا قول ہے کہ:۔

"اس طرح کی ہزار ہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں صحابہ کرام کی جرأت، شجاعت، ایثار، سرفروشی، خدمتِ خلق، حرارتِ ایمانی، عشقِ رسول، تقویٰ اور نظم وضبط کی حیات انگیز داستانیں سناتی ہیں۔ اس عہد کے تمدن پر مکمل روشنی ڈالتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اسلام کی حیرت انگیز ترقی کے اسباب کیا تھے؟ اکاسرہ کیوں مٹ

گئے، قیاصرہ کو کیوں شکست ہوئی، مٹھی بھر مسلمان سندھ کے ریگستان سے فرانس کی عشرت گاہوں تک کیسے چھا گئے، لٹیرے فرمانروا کیسے بن گئے، گڈریے اورنگ جہانبانی پر کیسے جا بیٹھے، وحشی، فلسفہ وحکمت کا درس کیسے دینے لگے، شرابیوں اور جواریوں میں اس بلا کی پاکیزگی کہاں سے آگئی، ۳۶۰ بتوں کے پجاری ایک خدا، ایک قبلہ، ایک مرکز اور ایک نصب العین کے تخیل پر کیسے متحد ہو گئے؟"

"یہ تمام تفاصیل احادیث میں ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں، اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں۔ مولانا شبلی کے "الفاروق" کا ماخذ یہی احادیث تھیں، اور یہ وہ کتاب عظیم ہے جو اس وقت تک لاکھوں کیریکٹر (کردار) بنا چکی ہے اگر عہد رسولؐ کے ایک فرد کی سیرت اس قدر انقلاب پیدا کر سکتی ہے، تو اندازہ لگائیے، کہ اگر احادیث کے تمام کردار اسی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کر دئے جائیں، تو نتائج کس قدر حیرت انگیز ہو سکتے ہیں"۔ (دو اسلام ص ۳۴۲، ص ۳۴۳)

برق صاحب آپ کی یہ عبارات بتا رہی ہیں کہ صحیح اقوالِ رسولؐ آپ کو مل چکے ہیں، ہزار ہا صحیح احادیث موجود ہیں، جن پر آپ نازاں ہیں۔ لہذا اب کیوں نہ ان احادیث پر ایمان آپ نہ ہو گا۔ ضرور ہو گا، کیونکہ آپ نے اپنے آخری باب کا عنوان ہی یہ رکھا ہے، کہ :-

"صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا"

فللہ الحمد!

خلاصۂ کتاب

برق صاحب! غلط فہمی سے آپ نے تدوین حدیث اور بعض صحیح احادیث پر اعتراض کئے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ کی ان غلط فہمیوں کا گذشتہ صفحات میں ازالہ کر دیا گیا ہے آپ نے جو اعتراض کئے تھے وہ نیک نیتی سے کئے تھے۔ ورنہ حقیقت میں آپ حدیث کے منکر نہیں ہیں آپ نے جو کچھ لکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے والہانہ عقیدت کی بنا پر لکھا اس لئے اس میں ایک حد تک آپ معذور ہیں۔

ضمیمہ

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واطاعت کی اہمیت جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم قرآنِ مجید کی وہ تمام آیات مطالعہ کریں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم ہے یا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے، اور اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے وہ آیات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (البقرۃ:۔ ۱۱۹)

ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

۲۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (البقرۃ:۔ ۱۴۳)

اور جس قبلہ پر کہ آپ ہیں وہ ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کون رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں کفر کی طرف واپس ہو جاتا ہے اور یہ بات اگرچہ لوگوں پر گراں گزری لیکن ان لوگوں پر گراں نہیں گزری جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اتباعِ رسول کتنی اہمیت کی چیز ہے کہ اس کی جانچ کے لئے احکام میں ترمیم وتنسیخ کی جارہی ہے۔ ایسی ایسی باتوں کا حکم دیا جارہا ہے کہ جن میں بظاہر کوئی اہمیت نظر نہیں آتی، محض اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اور اپنی عقلوں پر ایمان لانے والوں میں امتیاز پیدا ہو جائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے متبعین، جھوٹوں سے ممتاز ہو جائیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتباعِ رسولؐ ہدایت والے ہی کر سکتے ہیں

اور جو اتباعِ رسول سے منہ موڑتے ہیں محض اس لئے کہ حکمِ رسول کی مصلحت ان کی عقل میں نہیں آتی وہ گویا کفر کی طرف واپس ہو جاتے ہیں۔

۳۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرۃ:- ۱۷۷)

یہ نیکی نہیں ہے کہ مشرق کی طرف منہ کیا جائے یا مغرب کی طرف، بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔

۴۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (البقرۃ:- ۲۸۵)

ہر مومن ایمان لایا اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر وہ اس طرح کہتے ہیں کہ ہم رسولوں میں سے کسی ایک میں تفریق نہیں کرتے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کی بات سنی اور ہم نے اطاعت کی۔

۵۔ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ (آلِ عمران:- ۲۰)

پس اگر کافر حجت کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے اللہ کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، اور یہی کام ان لوگوں نے بھی کیا ہے جو میری اتباع کرتے ہیں۔

۶۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آلِ عمران:- ۳۱)

کہہ دیجئے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ ہے تو میری اتباع کرو، پھر اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اتباعِ رسول کرے، خواہ اللہ سے محبت کرنے والا امرِ ملت ہو یا عام آدمی، اللہ اسی شخص سے محبت کرتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے۔

۷۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آلِ عمران:- ۳۲)

کہہ دیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اگر تم اس اطاعت سے منہ موڑو، تو اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں کرتا۔

گویا اطاعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انحراف کفر ہے اور غضبِ الٰہی کا سبب ہے۔

۸۔ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا

عیسیٰ علیہ السلام کے حواری دعا کرتے ہیں، اے

الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝
(آلِ عمران:۔ ۵۳)

ہمارے رب ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا اور ہم نے رسول کی پیروی کی پس ہم کو شاہدین کے ساتھ لکھ لے۔

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے کا ذکر کر کے پھر اتباعِ رسول کا ذکر کیا، حالانکہ انہیں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اس کتاب کی ہم نے پیروی کی، لیکن اتباعِ رسول کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کو واضح کر دیا، گویا اتباعِ رسول کے بغیر ایمان و عمل بے کار ہے۔

۹۔ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (آلِ عمران:۔ ۶۸)

بیشک ابراہیم سے تو ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی، اور اس نبی کا تعلق ہے اور مومنین کا تعلق ہے۔

یہاں بھی رسولؐ کی پیروی پر زور دیا گیا ہے۔

۱۰۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (آلِ عمران:۔ ۸۱)

اور جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب تمہیں کتاب اور حکمت مل جائے، پھر کوئی نبی مبعوث ہو جو تمہاری شریعت کی تصدیق کرتا ہو تو اس پر ضرور ایمان لانا، اور اس کی مدد کرنا۔

۱۱۔ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (آلِ عمران:۔ ۱۰۱)

تم کیسے کفر کر سکتے ہو۔ حالانکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جا رہی ہیں، اور اللہ کا رسول تم میں موجود ہے۔

گویا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔

۱۲۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (آلِ عمران:۔ ۱۳۲)

اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

گویا بغیر اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت کی امید فضول ہے۔

۱۳۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَ

محمدؐ رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی رسول ہو چکے ہیں، پس اگر وہ انتقال فرما جائیں یا شہید ہو جائیں، تو کیا تم الٹے پاؤں کفر کی طرف واپس ہو جاؤ گے اور جو کوئی واپس ہو گا، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اور اللہ شکر کرنے والوں

سَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ ہ
(آلِ عمران ۱۴۴)

کو جزائے خیر دے گا۔

۱۴۔ لَقَدۡ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ۚ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ہ
(آلِ عمران ۱۶۴)

بے شک اللہ نے مؤمنین پر احسان کیا ہے، کہ ایک رسول انہیں میں سے مبعوث فرمایا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں تھے۔

آیت نمبر ۱۳ میں فرمایا کہ شکر کرنے والوں کو جزا ملے گی اور آیت نمبر ۱۴ میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت احسانِ عظیم ہے۔ لہٰذا شکر بھی اس احسان ہی کا ادا کرنا مقصود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے گا جو بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شکر ادا کرتے ہیں اور وہ اس طرح نہیں کہ ان کی زندگی میں شکر ادا کرے اور موت کے بعد نہیں، یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک نکتہ بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہر حال ایک رسول ہیں لہٰذا ان کو موت آنا لازمی ہے تو پھر یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اطاعت کو زلیست کا تابع بنا دیا جائے۔ اور بعد میں اطاعت سے منہ موڑ لیا جائے نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اطاعت کا سوال ان کی زلیست کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ دائمی ہے اگر اُن کی رسالت دائمی ہے تو اطاعت بھی دائمی ہے۔

۱۵۔ وَ لَقَدۡ صَدَقَکُمُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗۤ اِذۡ تَحُسُّوۡنَہُمۡ بِاِذۡنِہٖ ۚ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَ تَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَ عَصَیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىکُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ (آلِ عمران ۱۵۲)

اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا جب کہ تم اس کے حکم سے کافروں کا قلع قمع کر رہے تھے یہاں تک کہ تم نے بزدلی دکھائی، اور حکم رسول ؐ میں اختلاف کیا اور اس کے حکم کی نافرمانی کی حالانکہ حسب دلخواہ تم کو فتح مل چکی تھی۔

گویا حکم رسول کی تاویل کی وجہ سے فتح وکامرانی کو غم ومصیبت میں تبدیل کر دیا گیا۔

۱۶۔ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطۡلِعَکُمۡ عَلَی الۡغَیۡبِ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَجۡتَبِیۡ مِنۡ رُّسُلِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ ۚ
(آلِ عمران ۱۷۹)

اللہ تم میں سے کسی کو غیب پر مطلع نہیں کرتا، بلکہ اپنے رسولوں کو اس کام کے لئے منتخب کرتا ہے، لہٰذا تم اللہ پہ اور اس کے رسولوں پہ ایمان لاؤ

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ رسول جسے غیب پر مطلع کیا گیا ہو اگر وہ قرآن مجید کی تشریح کرے تو اس کی تشریح غیر مستند ہو اور دوسروں کی مستند مانی جائے۔

۱۷۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ۔ (آل عمران:۔ ۱۹۴)	اے ہمارے رب ہمیں وہ چیزیں عطا فرما جو تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

یہاں بھی کتاب الٰہی کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ کتاب الٰہی میں تمام وعدے نہیں ہوتے بلکہ تمام وعدوں کا جامع رسول ہوتا ہے۔ اس کے بیان میں کتاب الٰہی کا علاوہ دوسرے وعدے بھی شامل ہوتے ہیں۔

۱۸۔ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (النساء:۔ ۱۳)	جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
۱۹۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (النساء:۔ ۱۴)	اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کے حدود سے آگے نکل گیا اللہ اس کو ہمیشہ کیلئے دوزخ میں داخل کرے گا اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہو گا۔
۲۰۔ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (النساء:۔ ۴۲)	قیامت کے دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسولؐ کی نافرمانی کی ہو گی یہ چاہیں گے کہ کاش انہیں مٹی میں ملا دیا جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔
۲۱۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (النساء:۔ ۵۹)	اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو، اور اپنے امراء کی، پھر اگر تمہارا آپس میں اختلاف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرو، اگر تم اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔

دو جگہ "اَطِیْعُوْا" کا لفظ ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے، اور ان سے اختلاف کو ناجائز ہی نہیں سمجھا گیا بلکہ تمام اختلافات کے وقت انکی طرف رجوع کرنے کو ایمان کی نشانی بتایا گیا ہے۔

۲۲۔ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۰ (النساۤء :- ۶۱)	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کی طرف، اور رسولؐ کی طرف، تو آپ دیکھتے ہیں کہ منافقین آپ کے پاس آنے سے اعراض کرتے ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کرنے والا منافق ہے اگر اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ" اور "اِلَى الرَّسُوْلِ" کی درمیانی واؤ کو واؤ تفسیری مانا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ رسول کہے وہ سب "مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ" ہے اور اگر اس واؤ کو واؤ عطفی مانا جائے، اور ما انزل اللہ" سے قرآنِ مجید مراد لیا جائے تو پھر یہ ظاہر ہے کہ "الی الرسول" قرآنِ مجید کے علاوہ مستقل ماخذ قانون ہے۔

۲۳۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (النساۤء :- ۶۴)	اور ہم نے ہر رسول کو اسی لئے بھیجا، کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہاں بھی کتابِ الٰہی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ذکر کیا تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے اور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ بس کتابِ الٰہی کی اطاعت ہم پر فرض ہے کیونکہ وہ اللہ کی اطاعت ہے اور اللہ کے ساتھ دوسرے کی اطاعت شرک ہے لہٰذا اللہ ہی نے فرمادیا، کہ ہمارے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو، گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہمارے حکم دینے کی وجہ سے شرک نہ ہوگی، بلکہ رسولؐ ہونے کی وجہ سے وہ جو کچھ کہیں گے وہ ہمارا ہی حکم ہوگا ان کا ذاتی حکم نہ ہوگا، ہاں اگر تم اپنی طرف سے کسی کی اطاعت کرو گے تو یہ شرک ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اطاعت کا حکم نہیں دیا۔ اور اسی ضمن میں ائمہ کی تقلید بھی آجاتی ہے جو شرک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی امام کی تقلید ہم پر فرض نہیں کی، نہ اس کی اجازت دی، صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت شرک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرضِ عین ہے۔

یہاں "رسول" سے مراد مرکزِ ملت لینا کسی طرح صحیح نہیں اس لئے کہ مرکزِ ملت کو اللہ تعالیٰ

نہیں بھیجتا ۔ اور آیت میں بھیجنے کا ذکر ہے ۔ لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اطاعت مستقلاً فرض ہے نہ کہ کسی اور کی ۔

۲۴۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔ (النساء:۔ ۶۵)	آپ کے رب کی قسم لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے تمام اختلافات میں آپ کو حکم نہ مان لیں، پھر آپ کے فیصلہ سے دل میں تنگی بھی محسوس نہ کریں، بلکہ برضا اور رغبت تسلیم کر لیں ۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و اطاعت کو کتنے مہتم بالشان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے مرکز ملت کی اطاعت مراد ہے اور پھر صرف عملی اور ظاہری اطاعت پر ہی زور نہیں دیا گیا بلکہ دل کی اطاعت اور کشادگی پر بھی زور دیا گیا ہے، گویا ایمان کی شان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات دل سے مانی جائے اس پر ایمان ہو، جو شخص عملاً تو اطاعت کرتا ہے لیکن دل سے تسلیم نہیں کرتا، آیت کی رُو سے وہ بھی مؤمن نہیں، چہ جائیکہ وہ شخص جو نہ دل سے مانے، نہ عمل سے وہ تو کھلا باغی ہے ۔

۲۵۔ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (النساء:۔ ۶۹)	جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے ۔
۲۶۔ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:۔ ۸۰)	جس نے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی ۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت عین اطاعتِ الٰہی ہے اور اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت شرک نہیں ہے ۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ وہ تو احکامِ الٰہی پہنچاتے ہیں ۔

۲۷۔ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۔ (النساء:۔ ۱۱۵)	جو شخص ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسولؐ کے خلاف چلے اور مؤمنین کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ کو اختیار کرے تو ہم بھی اسے ادھر ہی جانے دیں گے اور اس کو دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے ۔

چودہ سو سال سے مؤمنین کا یہی راستہ رہا ہے کہ وہ اللہ ورسول سے قرآن و حدیث ہی مراد لیتے رہے اب جو اس راستہ کو چھوڑ کر اللہ ورسول کے معنی مرکز ملت کرتا ہے وہ گویا ہدایت کے آجانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہے اور اپنا ٹھکانا جہنم میں بناتا ہے ۔

۲۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ (النساء ۴:۔ ۱۳۶)

اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس پر نازل کی گئی اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہے اور جو انکار کرے اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا تو وہ بہت بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گیا ۔

۲۹۔ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا (النساء ۴:۔ ۱۵۱)

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے مابین تفریق کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بعض پر ہم ایمان لاتے ہیں اور بعض پر ایمان نہیں لاتے، اور چاہتے ہیں کہ درمیان میں کوئی راستہ نکال لیں ایسے لوگ ہی حقیقی کافر ہیں ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائیں وہ کافر ہیں ۔

۳۰۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ (النساء ۴:۔ ۱۵۲)

اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور ان میں تفریق نہیں کی، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے گا، اور اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے ۔

۳۱۔ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ

اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے، تاکہ لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ

عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ زبردست حکمت والا ہے۔

(النسآء:- ۱۶۵)

اس آیت میں بھی کتاب الٰہی کو حجت تمام کرنے والا نہیں فرمایا، کیونکہ کتابِ الٰہی کی موجودگی میں اختلافات باقی رہ سکتے ہیں۔ اور گمراہی پھیل سکتی ہے، لیکن رسول کے آجانے کے بعد اختلافات ختم ہوجاتے ہیں۔ تاویلات بعیدہ کا سدِ باب ہوجاتا ہے، اور اختلافات اور گمراہی پر اڑے رہنے کی کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔ گویا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی اتمامِ حجت ہے اور بس۔

۳۲۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ (النسآء:- ۱۷۰)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ رسولؐ آگیا، پس ایمان لے آؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

۳۳۔ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ (النسآء:- ۱۷۱)

پس اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ۔

۳۴۔ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ۔ (المائدة:- ۱۲)

(اے بنی اسرائیل) میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی، اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کا احترام کیا۔

۳۵۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ (المائدة:- ۱۵)

اے اہلِ کتاب بے شک تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا جو شریعت کی ان باتوں میں سے جو تم چھپاتے تھے، بہت سی باتوں کو بیان کرتا ہے، اور بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے۔

۳۶۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ (المائدة:- ۱۹)

اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے جو اگلے رسولوں کے آنے کے ایک مدت بعد آیا ہے کہ کہیں تم یہ نہ کہہ دو، کہ ہمارے پاس تو کوئی بشیر اور نذیر آیا ہی نہیں، لہٰذا اب تمہارے پاس بھی بشیر اور نذیر آگیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ کتاب کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں نہ کہ صرف مکّہ کے کفار کی طرف، جیسا کہ بعض لوگ غلط فہمی سے کہہ دیا کرتے ہیں۔

۳۷۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (المائدۃ: ۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں ان کو قتل کر دیا جائے، یا پھانسی دے دی جائے یا مخالف طرف کے ہاتھ پیر کاٹ دئے جائیں یا جلا وطن کر دیا جائے۔

۳۸۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (البقرۃ: ۲۷۹)

پس اگر تم سود لینا نہیں چھوڑو گے، تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے تم کو اعلان جنگ ہے۔

۳۹۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ (المائدۃ: ۵۵)

تمہارا دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول ہونا چاہیئے، اور وہ مؤمنین ہونے چاہئیں جو نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور رکوع کرتے ہیں یعنی عاجزی کرتے ہیں۔

۴۰۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (المائدۃ: ۵۶)

اور جو شخص اللہ، اس کے رسول، اور ایمان والوں کو دوست رکھے پس ایسے لوگ ہی اللہ کا لشکر ہیں اور یہی غالب رہیں گے۔

۴۱۔ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (المائدۃ: ۸۱)

اور اگر بنی اسرائیل اللہ، نبی اور جو کچھ اس کی طرف اتارا گیا ہے اس پر ایمان لاتے تو کبھی بھی کافروں کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

۴۲۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (المائدۃ: ۹۲)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ڈرتے رہو پھر اگر تم رسول کی اطاعت سے منہ موڑ و، تو جان لو کہ ہمارے رسولؐ کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

۴۲۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝
(المائدۃ ۔ ۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں کہ جس راستہ پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا وہی کافی ہے کیا ایسی حالت میں بھی جب کہ ان کے آباؤ اجداد کو کچھ علم ہی نہ ہو، اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں۔

اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا ماخذ قانون ہونا بالبداہت ثابت ہے

۴۴۔ وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ
(الانعام ۔ ۱۲۴)

اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہمیں بھی ویسی ہی چیز نہ ملے، جیسی اللہ کے رسولوں کو ملی، اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کو دے۔

اس آیت سے منصب رسالت کی بلندی آشکارا ہے، ایسی بلند مرتبہ شخصیت کی تشریح کے ہوتے ہوئے دوسرے شخص کی تشریح کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی شریعت میں اس کی کوئی قدر وقیمت ہے۔

۴۵۔ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ

میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں یعنی وہ لوگ جو رسول، نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جس کا تذکرہ وہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ رسول ان کو نیک باتوں کا حکم دیتا ہے، بُری باتوں سے روکتا ہے ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے طوق اور بوجھ اتار کر پھینک دیتا ہے جو طوق اور بوجھ ان پر لاد دیئے گئے تھے۔

عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کا احترام کیا اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں ۔

(الاعراف :- ۱۵۶، ۱۵۷)

اتباعِ رسول کی اہمیت کو کتنے شاندار الفاظ میں بیان کیا گیا ہے پھر شریعت سازی کو اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کی طرف منسوب کر کے بتا دیا کہ جو کچھ رسول کہے وہ دین ہے، وہ نور ہے، اس کی اتباع موجب فلاح ہے ۔

۴۶ ۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاِۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝	کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں وہ اللہ جس کی حکومت آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی کا اس کے سوائے کوئی حاکم و معبود نہیں، وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر بھی ایمان لاؤ وہ نبی کہ اللہ اور اللہ کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے تم اس رسول ہی کی پیروی کرو، تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے ۔

(الاعراف :- ۱۵۸)

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتباعِ رسولؐ کے بغیر ہدایت نہیں مل سکتی، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس آیت اور گزشتہ آیت میں رسول سے مراد مرکزِ ملت ہے ۔

۴۷ ۔ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝	کہہ دیجئے کہ مالِ غنیمت اللہ تعالیٰ، اور رسول کے لئے ہے، پس اللہ سے ڈرو، اور اپنے آپس کے معاملات کی اصلاح کرو، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مؤمن ہو ۔

(الانفال :- ۱)

۴۸ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝	کافروں پر یہ مصیبت اس لئے آئی کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے ۔

(الانفال :- ۱۳)

۴۹۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝
(الانفال ۸۔ ۲۰)

اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو، ایسی حالت میں کہ تم اس کا حکم سن رہے ہو۔

۵۰۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ (الانفال ۸۔ ۲۴)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو جواب دو جب وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائیں جس چیز کے ذریعہ تمہیں (اصلی) زندگی نصیب ہو۔

۵۱۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
(الانفال ۸۔ ۲۷)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو، اور جان بوجھ کر اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو۔

۵۲۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔
(الانفال ۸۔ ۴۱)

خبردار ہو جاؤ کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، رسول ؐ کے لئے ہے اور اقرباء، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لئے ہے۔

۵۳۔ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ
(الانفال ۸۔ ۴۶)

اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں نہ جھگڑو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

۵۴۔ بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝
(التوبۃ ۹۔ ۱)

جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا (اب) اللہ اور اس کا رسول ان سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔

۵۵)۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ
(التوبۃ ۹۔ ۳)

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن اعلانِ عام ہے، کہ بے شک، اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مشرکین سے بیزار ہیں۔

اس آیت کے آخری حصہ میں اللہ اور اس کے رسول کے درمیان "بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ

کے الفاظ ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول دو مختلف ہستیاں ہیں نہ یہ کہ "اللہ و رسول" ایک ہی ہستی ہے یعنی "مرکز ملت" اگر بالفرضِ محال ایسا ہوتا بھی تو دونوں کو اس طرح علیحدہ نہ کیا جاتا، بلکہ جہاں اللہ تھا، اس کے متصل رَسُوْلُہٗ بھی ہوتا اور کیونکہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا بالبداہت ثابت ہوا کہ "اللہ و رسول" سے مراد مرکز ملت ہرگز نہیں اور یہ آیت اس زعم باطل کے پرخچے اڑانے کے لئے بھرپور وار ہے۔

۵۶۔ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ (التوبۃ: ۷)	اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے رسولؐ کے نزدیک مشرکین کے لئے عہد کیسے برقرار رہ سکتا ہے (جب کہ انہوں نے عہد توڑ ڈالا ہو) سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجدِ حرام کے قریب معاہدہ کیا ہے تو جب تک وہ عہد پر قائم رہیں تم بھی اپنے عہد پر قائم رہو۔

یہاں بھی "عِنْدَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ" نہیں ہے بلکہ "عِنْدَ اللّٰہِ" اور "عِنْدَ رَسُوْلِہٖ" علیحدہ علیحدہ ہیں اس سے بھی ثابت ہوا کہ یہ دو ہستیاں ہیں نہ کہ دونوں کو ملا کر ایک ہستی۔ اسی طرح اللہ اور رسول کے ساتھ "اَطِيْعُوْا" علیحدہ علیحدہ آنا بھی اسی بات کو ثابت کرتا ہے۔

۵۷۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (التوبۃ: ۱۶)	کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم یوں ہی چھوڑ دیئے جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے یہ معلوم ہی نہیں کیا کہ کون تم میں سے جہاد کرتا ہے اور کون اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مؤمنین کے علاوہ کسی کو دوست نہیں بناتا اور اللہ کو سب خبر ہے جو تم کر رہے ہو۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سے اور مؤمنین سے علیحدہ ذکر کیا ہے نہ کہ اللہ اور رسولؐ کو ایک جگہ جمع کیا جس سے مرکز ملت مراد لیا جائے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مؤمنین میں شمار کیا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مؤمنین کا مطاع ہونے اور اپنا رسول ہونے کے لحاظ سے الگ ذکر کر کے ان کے مقام کی بلندی کی طرف اشارہ کیا اس سے یہ دعویٰ بھی باطل ہو گیا کہ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مؤمن ہیں، لہٰذا ان پر بھی اللہ و رسول یعنی مرکزِ ملت کی اطاعت فرض ہے، اس دعویٰ کی حقیقت ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ "نفس اللہ کا بھی ہے" جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ — اللہ تعالیٰ اپنے نفس سے تم کو ڈراتا ہے۔

(آلِ عمران: ۳۰)

لہذا اللہ کو بھی (نعوذ باللہ) موت آئے گی جیسا کہ اس آیت میں ہے:۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ — ہر نفس کو موت کا مزا چکھنا ہے۔

(آلِ عمران: ۱۸۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین میں شمار کر کے ان پر مرکزِ ملت کی اطاعت کو فرض قرار دینا ایسا کمزور دعویٰ ہے کہ اس کے توڑنے کی چنداں حاجت ہی نہیں ہے۔

۵۸۔ قُلْ إِنْ كَانَ آبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ٱقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهٖ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ

کہہ دیجئے کہ اگر تم کو اپنے آباؤ و اجداد اولاد، بھائی بند، بیویاں اور رشتہ دار، اور وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا ہو جانے سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو، یہانتک کہ اللہ اپنا حکم نازل فرمائے (یعنی عذاب بھیجے) اور اللہ تو فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

(التوبۃ: ۲۴)

۵۹۔ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ٥

ان اہل کتاب سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں لاتے اور ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کر دیا ہے اور سچے دین کو قبول نہیں کرتے (اور لڑائی کو اس وقت تک جاری رکھو) جب تک وہ ذلیل ہو کر جزیہ دینا قبول نہ کریں۔

(التوبۃ: ۲۹)

اس آیت سے بھی ثابت ہوا کہ تحریم کا اختیار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی دیا گیا ہے، اور:۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ — جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔

(النساء: ۸۰)

کے ماتحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حرام کیا ہوا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حرام کیا ہوا اگر تحلیل وتحریم صرف قرآن مجید کے ذریعہ ہی ہوتی تو اس آیت میں اس کام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ کیا جاتا۔

۶۰۔ هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبۃ:۔ ۳۳)	اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ اس کو پورے دین پر غالب کردے، اگرچہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علوِ شان ملاحظہ فرمائیے، کیا مرکز ملت کی بھی یہی شان ہے، کیا مرکز ملت کو بھی اللہ تعالیٰ ہی مبعوث فرماتا ہے۔ کیا اس آیت میں بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد مرکز ملت ہے۔

۶۱۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَیُؤْتِیْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَی اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝ (التوبۃ:۔ ۵۹)	اگر منافق اس چیز سے راضی ہوجاتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دی اور کہتے کہ ہم کو اللہ کافی ہے وہ ہم کو اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول دے گا، بیشک ہم اللہ کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

یہاں بھی "مِنْ فَضْلِهٖ" بیچ میں لاکر یہ ثابت کردیا کہ اللہ اور رسولؐ دو ہستیاں ہیں نہ کہ ایک یعنی مرکز ملت۔

۶۲۔ وَمِنْهُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَیَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَیُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (التوبۃ:۔ ۶۱)	بعض منافق نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اُذُن ہے کہہ دیجئے کہ اُذُن ہونا یعنی تمہاری مکاری کی باتیں سن کر چشم پوشی کرنا، تمہارے لئے بہتر ہے وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مومنین کی بات بھی مان لیتا ہے اور تم میں سے وہ لوگ جو درحقیقت مومن ہیں ان کے لئے تو وہ مجسم رحمت ہے اور جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔
۶۳۔ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ	ان کا مال قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا گیا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ

بِرَسُوْلِہٖ (التوبۃ: ۵۴)	کے ساتھ کفر کیا۔
۶۴۔ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لِیُرْضُوْکُمْ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ٥ (التوبۃ: ۶۲)	منافقین تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم راضی ہو جاؤ۔ حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حقدار ہیں کہ انہیں راضی کریں اگر وہ مومن ہیں۔
۶۵۔ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّہٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاَنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ خَالِدًا فِیْھَا ذٰلِکَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ (التوبۃ: ۶۳)	کیا انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف چلتا ہے اس کیلئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، یہ بڑی رسوائی ہے۔
۶۶۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّمَا کُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ وَرَسُوْلِہٖ کُنْتُمْ تَسْتَھْزِءُوْنَ (التوبۃ: ۶۵)	اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہہ دیں گے کہ ہم تو یوں ہی بحث و مذاق کر رہے تھے۔ آپ کہہ دیجئے کیا اللہ اس کی آیات، اور اس کے رسول سے مذاق کرتے ہو۔

یہاں بھی اللہ اور رسولؐ کے درمیان لفظ "آیات" ہے یعنی اللہ و رسول مل کر کوئی ایک فرد نہیں، بلکہ الگ الگ دو ہستیاں ہیں۔ لہٰذا اس آیت میں "اللہ اور رسولؐ" سے مرکزِ ملت مراد لینا قطعاً ناممکن ہے۔

۶۷۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اُولٰٓئِکَ سَیَرْحَمُھُمُ اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ٥ (التوبۃ: ۷۱)	مومن مرد، اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں، لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ اللہ ان پر جلد رحم فرمائے گا، بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بھی رسولؐ کو مومنین سے علیحدہ شمار کیا گیا ہے، اب اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی مومنین میں شمار کیا جائے، اور "اللہ و رسول" سے مرکزِ ملت مراد لیا جائے تو پھر یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ کون سا مرکزِ ملت ہے جس کی اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کرنی پڑتی ہے۔

۶۸۔ وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۔

(التوبۃ ۹۔ ۷۴)

منافقین اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے اور اس بات کا ارادہ کیا جو ان کو نہ مل سکی کیا یہ اس بات کا بدلہ لے رہے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے اللہ کے فضل سے ان کو مالدار کر دیا۔

۶۹۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۔

(التوبۃ ۹۔ ۸۰)

ان منافقین کے لئے آپ استغفار کریں، یا نہ کریں اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

۷۰۔ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ ۔

(التوبۃ ۹۔ ۸۴)

اور ان منافقین میں سے اگر کوئی مر جائے تو آپ اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں، بیشک انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حالت میں مر گئے کہ وہ فاسق تھے۔

۷۱۔ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلّٰهِ وَرَسُولِهِ

(التوبۃ ۹۔ ۹۱)

اگر ضعیف مریض اور ایسے لوگ جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں، جہاد نہ کریں تو کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خیر خواہی کرتے رہیں۔

۷۲۔ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۔

(التوبۃ ۹۔ ۹۴)

عنقریب اللہ (تعالیٰ) اور اس کا رسول تمہارے اعمال کو دیکھیں گے، پھر تم اللہ عالم الغیب والشہادہ کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے، اور وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے تھے۔

۷۳۔ وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ

اور بعض دیہاتی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان

بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّہَا قُرْبَۃٌ لَّہُمْ (التوبۃ:۔ ۹۹)	لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس سے اللہ کا تقرب، اور رسول کی دعائے خیر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں خبردار بیشک یہ چیز ان کے لئے باعث تقرب ہے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول دو ہستیاں ہیں، نہ کہ اللہ اور رسول ملا کر ایک ہستی یعنی مرکز ملت۔

۴۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِہِمْ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمْ وَتُزَکِّیْہِمْ بِہَا وَصَلِّ عَلَیْہِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمْ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ (التوبۃ:۔ ۱۰۳)	اے رسولؐ! ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر ان کو مطہر و مزکی بنائیے اور ان کے لئے دعا کیجئے، بے شک آپ کی دعا اُن کے لئے باعث تسکین ہے اور اللہ تعالیٰ سمیع اور علیم ہے۔

کیا کسی مرکز ملت کی دعا بھی باعث تسکین ہو سکتی ہے، کیا اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ بشارت ہے:۔

۵۔ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (التوبۃ:۔ ۱۰۵)	کہہ دیجئے کہ عمل کرو، تمہارے اعمال کو اللہ اور اس کا رسولؐ اور مؤمنین دیکھیں گے۔

اس آیت میں بھی رسول کو، اللہ اور مؤمنین سے الگ ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ رسول ایک ایسی ہستی ہے جو اللہ تعالیٰ اور مؤمنین کے درمیان واسطہ ہے جب تک اس واسطہ کی اتباع نہ کی جائے اللہ کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔

۶۔ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّہُمْ لَکٰذِبُوْنَ ۝ (التوبۃ:۔ ۱۰۷)	اور جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد بنائی کہ ضرر پہنچائیں، کفر کریں، مؤمنین کے درمیان تفرقہ پیدا کریں اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے پہلے جنگ کر چکے ہیں ان کیلئے گھات کی جگہ بنائیں وہ لوگ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ بھلائی کا تھا، اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔
۷۔ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ	بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایسا رسول

اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبۃ۔ ۱۲۸)

آگیا ہے کہ تمہاری تکلیف اس پر شاق گذرتی ہے تمہاری بھلائی کا حریص ہے اور مؤمنین کے لئے رؤف اور رحیم ہے۔

کیا کسی مرکزِ ملت کی بھی یہی شان ہے؟ کیا یہاں بھی رسول سے مراد مرکزِ ملت ہے۔

۷۸۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (یوسف۔ ۱۰۸)

کہہ دیجئے کہ یہ ہے میرا راستہ، میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، بصیرت پر میں بھی ہوں اور میری پیروی کرنے والے بھی اور اللہ شرک سے پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اتباعِ رسول کی اہمیت اس آیت سے واضح ہے۔

۷۹۔ الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ (ابراھیم۔ ۱)

یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اس لئے نازل کی ہے کہ آپ لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے تاریکی سے روشنی کی طرف نکال کر اللہ عزت والے تعریف والے کے راستہ پر لے آئیں۔

تاریکی سے روشنی کی طرف لانے کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں نہ کہ کتاب الٰہی غور فرمائیے!۔

۸۰۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل۔ ۴۴)

اور ہم نے اس نصیحت کو آپ کی طرف نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اس چیز کی تشریح کردیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے تاکہ وہ غور کریں۔

۸۱۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (الحج۔ ۴۹)

کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کے لئے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔

کیا اس معاملہ میں کوئی مرکزِ ملت آپ کا شریک ہو سکتا ہے۔

۸۲۔ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (النور۔ ۴۷)

اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی، پھر ان میں سے ایک فریق اس سے منہ موڑ لیتا ہے اور یہ لوگ حقیقت میں مؤمن ہی نہیں ہیں۔

۸۳۔ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝

(النور: ۴۸، ۴۹)

اور جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ایک فریق اس سے اعراض کرتا ہے، اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ حق ان کا ہے تو رسولؐ کے پاس مطیع بن کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

۸۴۔ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

(النور: ۵۰)

کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ان کی حق تلفی کریں گے (ان میں سے کوئی بات نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ خود ہی ظالم ہیں۔

۸۵۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(النور: ۵۱)

یقیناً مومنین کا تو یہ قول ہونا چاہئے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو یہ کہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

۸۶۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

(النور: ۵۲)

اور جو کوئی اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور اللہ سے ڈرے اور پرہیزگاری اختیار کرے، تو بس ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

۸۷۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

(النور: ۵۴)

کہہ دیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم منہ موڑو، تو رسول اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے اور تم اپنے فرائض کے ذمہ دار ہو اور اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت یاب ہوگے۔ اور رسولؐ کے ذمہ تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

اس آیت میں لفظ "اَطِيْعُوا" اللہ سے پہلے بھی آیا ہے اور رسولؐ سے پہلے بھی۔ اگر صرف ایک جگہ ہوتا تو یہ گنجائش نکل سکتی تھی کہ دونوں کو ملا کر ایک ہی ہستی مراد ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ اور

رسولؐ دو ہستیاں ہیں نہ کہ ایک مرکزِ ملت۔

دوم۔ اللہ اور رسولؐ کا ذکر کرنے کے بعد جن جن آیات میں ضمیر صیغہ واحد غائب آیا ہے، اس کا مرجع ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ دوسری آیات کی طرح اس آیت میں بھی اللہ اور رسولؐ کے ذکر کے بعد ضمیر صیغہ واحد غائب ہے، اور اس آیت میں اس کا مرجع کسی طرح سے بھی اللہ نہیں ہو سکتا۔

سوم۔ اس آیت سے بھی ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بغیر ہدایت نہیں مل سکتی۔ اس آیت میں کسی صورت میں بھی اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ ملت نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مرکزِ ملت کے ذمہ صرف پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ منوانا بھی ہوتا ہے، حاکم وقت اپنا قانون منوا کر چھوڑتا ہے لیکن رسالت کا منوانا رسول کے ذمہ لازم نہیں ہوتا اور نہ وہ رسالت منوانے پر مجبور کرتا ہے بلکہ وہ رسالت کو پہنچا دیتا ہے۔ اور یہی اس کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ الغرض اس آیت میں رسولؐ سے مراد حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور ان کی اطاعت ہر ایک پر فرض ہے، بغیر ان کی اطاعت کے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

۸۸۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (النور ۱-۵۶)	نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، اور رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

اس آیت میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ذکر ہے لہٰذا جو لوگ اللہ اور رسول سے مرکزِ ملت مراد لیتے ہیں اب وہ صرف رسولؐ سے کیا مراد لیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں "اللہ" کے لفظ کو چھوڑ کر صرف لفظ "رسول" کا ذکر کرنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں مضمر ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہوگئی، تو بس اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوگئی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النسآء:۔ ۸۰)	جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

لہٰذا کہنا یہ چاہیئے کہ اللہ و رسول جہاں دونوں آجائیں وہاں بھی ان سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوتے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔

۸۹۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مومن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے

بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔

(النور ۱۰- ۶۲)

رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جب وہ رسول کے ساتھ کسی کام پر جمع ہوں، تو بغیر اس کی اجازت کے وہاں سے ہلتے نہیں، بے شک (اے رسول) جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ "اللہ و رسول" کے ذکر کے بعد جب ضمیر واحد غائب آئے تو اس کا مرجع عام طور پر رسول ہی ہوتا ہے۔

۹۰۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔

(النور: ۶۳)

رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا آپس میں ایک دوسرے کے بلانے کو سمجھتے ہو، تحقیق اللہ ان لوگوں سے خوب واقف ہے۔ جو تم میں سے نظر بچا کر کھسک جاتے ہیں، پس ایسے لوگوں کو جو رسول کے حکم و فعل کی مخالفت کرتے ہیں ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں وہ کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، یا دردناک عذاب میں نہ پھنس جائیں۔

کیا کوئی دوسرا شخص بھی اس خصوصیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہے۔

۹۱۔ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا۔ (الفرقان ۱- ۲۷)

اور قیامت کے روز ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا اور کہے گا اے کاش میں نے رسول کی راہ اختیار کی ہوتی۔

۹۲۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۔

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعراء ۱- ۱۰۸، ۱۱۰)

۹۳۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۔

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعراء ۱- ۱۲۶)

۹۴۔ اسی چیز پر حضرت ہود علیہ السلام نے پھر زور دیا اور دوبارہ فرمایا:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ — اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعرآء:۔ ۱۳۱)

۹۵۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ — اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعرآء:۔ ۱۴۴)

۹۶۔ اسی چیز پر حضرت صالح علیہ السلام نے پھر زور دیا اور فرمایا:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ — اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعرآء:۔ ۱۵۰)

۹۷۔ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ — اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعرآء:۔ ۱۶۳)

۹۸۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ — اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(الشعرآء:۔ ۱۷۹)

۹۹۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ — اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(آلِ عمران:۔ ۵۰)

ان آیات بیّنات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا اصولِ اوّلین نبی کی اطاعت ہے اور یہ کہ ہر نبی نے صرف اپنی اطاعت کی دعوت دی ہے۔ حالانکہ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اللہ سے ڈرو اور صرف اسی کی اطاعت کرو لیکن ایسا نہیں کہا بلکہ اپنی اور صرف اپنی اطاعت کی طرف بلاتے رہے کیا اس سے نبی کی اطاعت کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔

۱۰۰۔ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ — اگر یہ لوگ آپ کی نافرمانی کریں تو آپ کہہ دیجیے۔ کہ میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں۔

(الشعرآء:۔ ۲۱۶)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض ہے۔

۱۰۱۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلٰی — پس آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیے

الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝ — بے شک آپ حق مبین پر ہیں۔

(النمل :- ۷۹)

کیا کسی مرکزِ ملت کو بھی یہ سند عطا ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا :-

۱۰۲۔ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُوْنَ ۝ — تم اور جو لوگ تمہاری ہی پیروی کریں گے غالب رہیں گے۔

(القصص :- ۳۵)

مندرجہ ذیل ارشادِ باری پر غور فرمائیے :-

۱۰۳۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ — نبی مؤمنین کے لئے ان کے نفوس سے زیادہ اَولیٰ ہے۔ اور نبی کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں۔

(الاحزاب :- ۶)

کیا کوئی مرکزِ ملت بھی اس حکم میں داخل ہے ؟ کیا یہاں بھی نبی سے مراد مرکزِ ملت ہے ؟ کیا ہر خلیفہ کی بیویاں امت کی مائیں ہیں ؟ کیا خلفائے راشدین میں سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ کی بیویوں سے دوسروں نے نکاح نہیں کئے۔ ضرور کئے۔ بس ثابت ہوا کہ رسولؐ سے مراد مرکزِ ملت ہرگز نہیں اور نہ رسولؐ کو مؤمنین میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ مؤمنین سے الگ ایک اور اعلیٰ اور انسب مرتبہ کے ذیل میں اس کا ذکر آتا ہے وہ اگرچہ مؤمن ہوتا ہے لیکن کیونکہ وہ تمام مؤمنین کے لئے نمونہ اور مطاع ہوتا ہے لہٰذا اس کے متعلق احکام کو خصوصیت سے علیحدہ بیان کیا جاتا ہے تاکہ عام مؤمنین کی طرح کوئی اس کو امت کا ایک معمولی فرد نہ سمجھ لے۔

۱۰۴)۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ — ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور قیامت کے دن کی امید رکھتے ہیں۔ اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں، رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

(الاحزاب :- ۲۱)

کیا کسی مرکزِ ملت کی بھی یہی شان ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے مرکزِ ملت کے نقشِ قدم پر چلنا ضروری ہو، ہرگز نہیں، مرکزِ ملت سے خطا ہو سکتی ہے، اس کے لئے صواب پر ہونے کی کوئی آسمانی سند موجود نہیں ہوتی، نہ وحی سے اس کی خطا کی اصلاح ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ مؤمنین کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، پس ثابت ہوا کہ اس آیت میں رسولؐ سے مراد مرکزِ ملت ہرگز نہیں ہو سکتا۔

۱۰۵۔ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ — اور جب مؤمنین نے لشکروں کو دیکھا، تو کہنے

قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ (الاحزاب:۔ ۲۲)

لگے یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ فرمایا تھا اس سے ان کی ایمانی قوت اور اطاعت شعاری اور بڑھ گئی۔

کیا مرکز ملت بھی ایسا وعدہ کرسکتا ہے۔ ہرگز نہیں کرسکتا اس کو کیا خبر کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے رسولؐ کے پاس وحی آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ اطلاع پاکر وعدہ کرسکتا ہے پھر جس آیت میں یہ وعدہ کیا گیا تھا وہ آیت قرآن مجید میں کہاں ہے کیونکہ وہ قرآن مجید میں نہیں، لہٰذا اس کا نزول قرآن مجید کے علاوہ کسی اور وحی کے ذریعہ ہوا اور وہ وحی وہی ہے جس کو حدیث کہا جاتا ہے اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ "اللہ و رسول" سے مراد مرکز ملت ہرگز نہیں ہوسکتا، اور جہاں کہیں بھی قرآن مجید میں یہ الفاظ آئے ہیں ان سے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہوتے ہیں۔ نہ کہ فرضی الفاظ "مرکز ملت"۔

۱۰۶۔ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الاحزاب:۔ ۲۹)

اے نبی کی بیویو! اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طلب گار ہو، تو پھر اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کیلئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

کیا اس آیت میں "اللہ و رسول" سے مراد مرکز ملت ہے؟ کیا اس آیت میں ازواج مطہرات سے کہا جا رہا ہے کہ تم جو بھی مرکز ملت ہو، اس کی طلب گار رہو، اس کی طرف رغبت کرو، اس کی اطاعت کرو۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ رسولؐ سے مراد یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

۱۰۷۔ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝ (الاحزاب:۔ ۳۱)

اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی، ہم اس کو دہرا اجر دیں گے اور اس کے لئے ہم نے عزت والا رزق تیار کر رکھا ہے۔

کیا ازواج مطہرات کو حکم دیا جا رہا ہے کہ امیر وقت کی فرمانبرداری کرو، ہرگز نہیں، بلکہ رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

۱۰۸۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ

کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لئے یہ زیبا نہیں ہے، کہ جب اللہ اور اس کا رسول

يَكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (الاحزاب:۔ ۳۶)

کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو ان کو اس معاملہ میں اختیار باقی رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔

۱۰۹۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (الاحزاب:۔ ۴۰)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم بالغ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، بلکہ وہ تو اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کو ختم کرنے والے، اور اللہ ہر ایک شے کو جاننے والا ہے۔

کیا یہاں بھی رسول اللہ سے مراد مرکز ملت ہے! اور اگر ہے تو پھر اس کے ساتھ خاتم النبیین کا کیا جوڑ ہے؟ لہذا رسول سے مراد مرکز ملت کہیں بھی نہیں، بلکہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں، جیسا کہ اس آیت میں صریحاً نام نامی، اسم گرامی مذکور ہے۔

۱۱۰۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب:۔ ۴۵، ۴۶)

اے نبی ہم نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

کیا اس آیت میں بھی نبی سے مراد مرکز ملت ہو سکتا ہے؟

۱۱۱۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (الاحزاب:۔ ۵۰)

اے نبی ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جن کا آپ نے مہر دیا ہے اور وہ لونڈیاں بھی حلال ہیں جو اللہ تعالیٰ جہاد میں آپ کے قبضہ میں دے دے اور چچا کی بیٹیاں، پھوپھی کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو، وہ بھی حلال ہیں اور وہ مؤمن عورت بھی حلال ہے جو اپنے نفس کو نبی کے حوالہ کر دے اگر نبی اس سے نکاح کا ارادہ کرے یہ بات خالص آپ کیلئے ہے مومنین کے لئے نہیں ہے۔

کیا یہ خصوصیت ہر مرکزِ ملت کو حاصل ہے؟ ہرگز نہیں۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا اور بالبداہت ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ عام مؤمنین سے بہت بلند ہے۔ اور آپ کا شمار عام مؤمنین سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اور عام مؤمنین سے بہت ہی اونچے درجہ میں آپ کا ذکر آتا ہے اور آپ کے لئے مخصوص احکام ہوتے ہیں جو مؤمنین کے لئے نہیں ہوتے، لہٰذا یہ کہنا کہ رسول بھی مؤمن ہے اور اس پر بھی مرکزِ ملت کی اطاعت فرض ہے مضحکہ خیز ہے۔

۱۱۲۔ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝ (الاحزاب:۔ ۶۶)	جس دن کافر آگ میں ڈالے جائیں گے، تو کہیں گے، اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی، اور رسول کی اطاعت کی ہوتی۔
۱۱۳) وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ۝ (الاحزاب:۔ ۵۳)	تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ، اور نہ تمہارے لئے یہ حلال ہے کہ کبھی بھی اس کے بعد اس کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔

کیا مرکزِ ملت کی بیویوں سے بھی اس کی موت کے بعد نکاح حرام ہے؟ کیا خلفاء کی بیویوں سے ان کے مرنے کے بعد نکاح نہیں ہوئے؟

۱۱۴۔ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (الاحزاب:۔ ۵۶)	بے شک اللہ تعالیٰ، اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے رہتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود وسلام بھیجتے رہا کرو۔
۱۱۵۔ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا ۝ (الاحزاب:۔ ۵۷)	بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ناراض کرتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔
۱۱۶۔ مَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ (الاحزاب:۔ ۷۱)	جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے حقیقت میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔

۱۱۷۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سبا:۔ ۲۸)

اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۱۱۸۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰسٓ:۔ ۶۹)

اور نبی کو ہم نے شاعری نہیں سکھائی اور یہ اس کے شایانِ شان بھی نہیں۔

کیا یہاں بھی نبی سے مراد مرکزِ ملت ہے؟ کیا بہت سے مرکزِ ملت شاعر نہیں تھے۔

۱۱۹۔ قَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ (الدخان:۔ ۱۳)

بے شک ان کے پاس رسولِ مبین آچکا ہے۔

۱۲۰۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝ (محمد:۔ ۳۲)

بے شک جو لوگ کافر ہیں اور اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، اور ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرتے ہیں یہ لوگ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ ان کے سارے اعمال ضائع کر دئے جائیں گے۔

۱۲۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد:۔ ۳۳)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

۱۲۲۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ (الفتح:۔ ۸، ۹)

بے شک ہم نے آپ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ (اے لوگو) تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اس کا احترام کرو، اس کی توقیر کرو، اور صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرو۔

۱۲۳۔ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝ (الفتح:۔ ۱۳)

اور جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے، تو ہم نے ایسے کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔

۱۲۴۔ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے

الْاَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (الفتح :- ۱۷)

جائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جو کوئی منہ موڑے گا، تو اللہ تعالٰے اُس کو دردناک عذاب دے گا۔

۱۲۵۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (الفتح :- ۲۸)

وہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے۔ اور اللہ گواہی کے لئے کافی ہے۔

۱۲۶۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (الفتح :- ۲۹)

محمد (صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔

یعنی کوئی مرکزِ ملت رسول نہیں ہے۔ بس محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہیں۔ اس صراحت کے باوجود اگر کوئی شخص رسول کے معنی مرکزِ ملت کرے، تو وہ یہ سوچ لے کہ میدان محشر میں اللہ تعالےٰ کو کیا جواب دے گا۔

۱۲۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (الحجرات :- ۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو! اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ سمیع وعلیم ہے۔

۱۲۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (الحجرات :- ۲)

اے ایمان والو! نبی کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کرو، اور اس سے بات کرتے وقت اتنے زور سے بات نہ کرو، جتنے زور سے آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

اب اگر تسلیم کر لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی ایمان لانے والوں میں شامل ہیں اور ہر وہ حکم جو ایمان لانے والوں پر فرض ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر بھی اسی طرح فرض ہے، تو پھر بتایا جائے کہ اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا کہ وہ نبی کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کریں اور وہ نبی کون تھا؟

۱۲۹۔ إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ۝
(الحجرات: ۳)

بے شک جو لوگ اللہ کے رسول کی موجودگی میں اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے آزمالیا ہے، ایسے لوگوں کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔

۱۳۰۔ وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ (الحجرات: ۷)

خبردار! اللہ کا رسول تم میں موجود ہے اگر وہ بہت سی باتوں میں تمہارا کہنا مان لے تو تم مشکل میں مبتلا ہو جاؤ۔

۱۳۱۔ إِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝
(الحجرات: ۱۴)

اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے۔ تو اللہ تمہارے عملوں میں سے ذرا سی بھی کمی نہیں کرے گا۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

۱۳۲۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ
(الحجرات: ۱۵)

یقیناً مومن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انہوں نے شک نہیں کیا اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں۔

۱۳۳۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (النجم: ۳-۴)

نبی اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا وہ جو کچھ کہتا ہے وحی ہوتی ہے۔

۱۳۴۔ آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَنفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ۝
(الحدید: ۷)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس مال میں تم خلیفہ بنائے گئے ہو پھر تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور خرچ کرتے رہے ان کے لئے بڑا اجر ہے

۱۳۵۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ (الحدید: ۱۹)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، تو یہی لوگ اللہ کے نزدیک صدیق ہیں، شہید ہیں۔

۱۳۶۔ سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (الحدید:۲۱)

اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف سبقت کرو جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کے مثل ہے۔ وہ جنت ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

۱۳۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(الحدید:۲۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصے عطا فرمائے گا، اور تمہارے لئے نور مقرر کرے گا کہ تم اس کی روشنی میں چل سکو، تم کو معاف کرے گا، اور اللہ غفور رحیم ہے۔

۱۳۸۔ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۝ (المجادلۃ:۴)

یہ احکام اس لئے دئے جا رہے ہیں تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

۱۳۹۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (المجادلۃ:۵)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسی طرح ہلاک ہوں گے جس طرح ان سے پہلے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں اور بیشک ہم نے روشن نشانیاں اتاری ہیں، اور کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

۱۴۰۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشی کرنے سے منع کیا گیا تھا، لیکن وہ لوگ پھر وہی کام کر رہے ہیں جس سے منع کیا گیا تھا یہ لوگ گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کے متعلق سرگوشی کرتے ہیں اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے نہیں کیا، اور پھر اپنے دلوں میں کہتے ہیں کیوں ہم پر ہمارے اس کہنے کی وجہ سے اللہ عذاب

فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

نہیں بھیجتا ان کے لئے دوزخ کافی ہے۔ اس میں وہ داخل ہوں گے کہ وہ بہت بری جگہ ہے

(المجادلۃ ۱- ۸)

۱۴۱- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ (المجادلۃ ۱- ۹)

اے ایمان والو! تم جب سرگوشی کیا کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کے لئے سرگوشی نہ کیا کرو بلکہ نیکی اور تقوٰی کے لئے سرگوشی کیا کرو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم اکٹھے جاؤ گے۔

۱۴۲- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی کیا کرو تو پہلے صدقہ دیا کرو، یہ تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ پھر اگر تمہارے پاس کچھ نہ ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

(المجادلۃ ۱- ۱۲)

۱۴۳- ءَأَشْفَقْتُمْ أَن تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

کیا سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دینے سے تم ڈر گئے، کیونکہ تم یہ نہ کر سکے، تو اللہ تعالیٰ تمہاری طرف متوجہ ہوا، لہٰذا نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو، اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

(المجادلۃ ۱- ۱۳)

۱۴۴- إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۝

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ لوگ بہت ذلیل ہوں گے۔

(المجادلۃ ۱- ۲۰)

۱۴۵- لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ

آپ ایسی کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ تع پر اور قیامت پر ایمان رکھتی ہو اور پھر بھی وہ ان لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، خواہ وہ لوگ

أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

(المجادلۃ: ۲۲)

ان کے آباؤ اجداد، اولاد و احفاد، بھائی اور قبیلہ والے ہی کیوں نہ ہوں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو ثبت فرما دیا ہے اور اپنی روح کے ساتھ ان کو قوت دی ہے ان کو جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اللہ ان سے راضی ہے وہ اللہ سے راضی ہیں، یہ اللہ کی جماعت ہے، خبردار اللہ ہی کی جماعت کے لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

* * *

۱۴۶۔ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَن يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

(الحشر: ۴)

یہ سزا انہیں اس لئے دی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرے تو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

۱۴۷۔ وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

(الحشر: ۶)

اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو بغیر لڑائی کے دیا، اس کے لئے تم نے نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

* * *

۱۴۸۔ مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ (الحشر: ۷)

جو مال اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے قبضہ میں دے وہ اللہ کے لئے ہے، رسول کے لئے ہے، اور اقربا، مساکین اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ دولت اغنیاء ہی میں نہ آتی جاتی رہے، اور جو چیز تم کو رسول دے وہ لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔

۱۴۹۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔ (الحشر:۔ ۸)

فئی کا مال ان فقراءِ مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے مالوں سے محروم کر دئے گئے، جو اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے جویا ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں۔

۱۵۰۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (الممتحنة:۔ ۱۲)

اے نبیؐ! جب آپ کے پاس مؤمن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں، اس بات پر کہ اللہ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کریں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا نہیں کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی نہ کسی پر بہتان تراشی کریں گی، اور نہ معروف کاموں میں آپ کی نافرمانی کریں گی، تو آپ ان سے بیعت لیا کیجئے، اور ان کے لئے استغفار کیا کیجئے، بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

۱۵۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (الصف:۔ ۱۱)

اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

۱۵۲۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (المنافقون:۔ ۸)

عزت اللہ کے لئے ہے، اس کے رسول کے لئے ہے اور مؤمنین کے لئے ہے، لیکن منافقین نہیں جانتے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کو مؤمنین سے الگ ذکر فرمایا ہے۔

۱۵۳۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۔ (التغابن ۱۔ ۸)

پس ایمان لاؤ اللہ پر، اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا، اور اللہ خبردار ہے اس چیز سے جو تم کرتے ہو۔

۱۵۴۔ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۔ (التغابن ۲۔ ۱۲)

اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر تم اطاعتِ رسول سے منہ موڑو تو ہمارے رسول کے ذمہ تو صرف علی الاعلان پہنچا دینا ہے۔

۱۵۵۔ مَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْہَآ اَبَدًا ۔ (الجن ۱۔ ۲۳)

جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے واسطے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

۱۵۶۔ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَہْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَہُمُ الْبَیِّنَۃُ ۔ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۔ فِیْہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ۔ (البینۃ)

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر ہیں وہ کفر سے باز آنے والے نہیں تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آتی یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول نہ آتا، جو پاک صحیفے تلاوت کرتا ہو جس میں ٹھوس مضامین ہوں۔

خلاصہ

الغرض اس قسم کی تمام آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا فرض، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا لازمی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اور مخالفت کرنے والا جہنمی ہے۔ بار بار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر زور دیا کہیں اپنے ساتھ رسول کا ذکر کیا، تو کہیں صرف رسول کا ذکر کیا۔ غرض یہ کہ اس کثرت سے اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کہ اب اس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے اور ہر مسلم پر فرض ہے اور قیامت تک کے لئے فرض ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ نہیں کیا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول سے مراد مرکزِ ملت ہے انہیں سوچنا چاہیئے کہ اللہ کا یہی منشا تھا تو کہیں تو ان الفاظ کو یا ان کے مترادف الفاظ کو استعمال کیا ہوتا، کہ مرکزِ ملت کی اطاعت فرض ہے قرآن مجید کی جو تشریح وہ کرے اس کا ماننا فرض ہے اس سے اختلاف کفر ہے حیرت ہوتی ہے کہ مسئلہ

نو اتنا اہم، اور اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی اس کی وضاحت نہیں کی کہ رسول سے مراد مرکزِ ملت ہے، یا امیر المؤمنین، خلیفۃ المسلمین ہے۔ اس کا نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ مزید براں بعض آیات اس قسم کی اوپر گزر چکی ہیں جن میں رسولؐ کے معنی مرکز ملت کے ہو ہی نہیں سکتے لہٰذا یہی ماننا پڑے گا کہ اطاعتِ رسول ہی وہ اہم شعبۂ دین ہے جس کے بغیر اسلامیات ہیچ ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام صرف اپنی اطاعت ہی کی طرف دعوت دیتے رہے کیوں؟ اس لئے کہ ان کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے لئے ان کو وسیلہ بنایا ہے اور اپنی اطاعت کو ان کی اطاعت میں منتقل کر دیا ہے اور یہ کہہ کر معاملہ بالکل صاف کر دیا ہے کہ :-

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝
(النساء :- ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی، بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے رسول کی اطاعت سے منہ موڑا تو اے رسول آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت محض سیاسی اطاعت ہوتی، تو اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا زور نہ دیا جاتا، بلکہ امیر کی اطاعت پر زور دیا جاتا، اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر زور اور اطاعتِ امیر کا صرف ایک مرتبہ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت شرعی، دینی، سیاسی ہر لحاظ سے ضروری ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال قوانینِ شرعیہ کا ماخذ ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسوۂ رسول کے اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے، اپنی محبت کو اس کی پیروی کے ساتھ مشروط کر دیا ہے، اور فیصلۂ رسول کو برضا و رغبت، بے چون وچرا تسلیم کرنے کا حکم دیا، اور جو فیصلۂ رسولؐ کو تسلیم نہ کرے یا تسلیم تو کرے لیکن دل میں اس کے تسلیم کرنے سے ایک قسم کی خلش ہو یا شک ہو تو قسم کھا کر اعلان فرمایا کہ وہ مؤمن نہیں۔

ارشاد باری ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝
(النساء :- ۶۵)

تیرے رب کی قسم! وہ لوگ مؤمن نہیں جو اپنے تمام اختلافات میں تجھ کو "حکم" نہ بنائیں، پھر تیرے فیصلہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ برضا و رغبت تسلیم کرلیں۔

غلام جیلانی برق
ایم اے - پی ایچ ڈی

کیمبل پور

196-

آقائے محترم

[illegible]

برق صاحب کی خطوط کی عبارت واضح خطِ نستعلیق میں

برق صاحب کا پہلا خط

۱۶ - ۵ - ۷۱

آقائے محترم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج ہی آپ کی گرانقدر تصنیف "تفہیم اسلام" ملی اور ملتے ہی چند صفحات پڑھ ڈالے - "دو اسلام" کے بڑے بڑے عیوب تین ہیں :

اوّل - اس کے پہلے ایڈیشن میں متعدد علمی اغلاط تھیں (مثلاً بعض احادیث کا غلط ترجمہ وغیرہ)، جنہیں بڑی حد تک دوسرے ایڈیشن میں نکال دیا گیا تھا لیکن اب بھی کچھ باقی ہیں -

دوم - میرا یہ موقف کہ احادیث کی تدوین وتسوید اڑھائی سوؔ بعد ہوئی تھی، سروپا غلط ہے - یہ غلطی دوسرے ایڈیشن میں بھی موجود ہے -

میں نے اس کی تلافی تو کر دی ہے کہ "تاریخ تدوین حدیث" لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ حضورؐ پر نور کی حیات مبارکہ ہی میں تقریباً ۴۰ ہزار احادیث ضبط ہو چکی تھیں، لیکن یہ کتاب شاید ہی کبھی چھپے - آج سے تین برس پہلے لاہور کا ایک بھوکا اور بے سروسامان طابع وناشر یہ کتاب لے گیا تھا اور میرے انتہائی اصرار کے باوجود نہ تو اُس نے تاحال کتابت کرائی اور نہ مسوّدہ واپس کیا - یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ مسوّدہ ضائع ہو جائے گا -

تیسرا عیب یہ کہ دو اسلام کی زبان غیر سنجیدہ، غیر علمی اور سخت جانبدارانہ ہے - کتاب لکھتے وقت میرے مقاصد دو تھے :

اوّل - ضعیف روایات کی تنقیص،

دوم - غیر محقق اور ہر حدیث کو صحیح سمجھنے والے علمار کی تضحیک - اللہ مجھے معاف کرے -

میں آپ کی زبان، اندازِ تحریر، اسلوبِ بیان اور متانت سے بہت متاثر ہوا ہوں - پوری کتاب پڑھنے کے بعد میں شاید پھر آپکو ایک خط لکھوں - سردست میں اس تخلیق پر آپ کی خدمت میں مبارک پیش کرتا ہوں - والسّلام -

غلام جیلانی برق

؎ یہاں لفظ سال یا برس رہ گیا ہے -

برقؔ صاحب کا دوسرا خط

۲۶-۱۱-۷۱

قابلِ صد احترام السلام علیکم و رحمۃ اللہ

۱۔ یاد آوری اور تہنیت عید کا بہت بہت شکریہ۔

۲۔ آپ کی قابل قدر کتاب "تفہیم" کے متعلق میں کچھ عرصہ پہلے اپنے تاثرات کا اظہار کر چکا ہوں[عہ]۔ اصل چیز وہ جذبہ ہے جو کسی کتاب کی تخلیق کا باعث بنتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کا مقصد ان اثرات کو مٹانا تھا جو میری کتاب سے پیدا ہوئے تھے۔ اس للّٰہیت پر پہلے بھی مبارک پیش کر چکا ہوں اور پھر پیش کرتا ہوں۔ میری آزردگی کا نہ تو سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ قابل التفات ہے۔ والسلام

غلام جیلانی برق

برقؔ صاحب کا تیسرا خط

۱۴-۱۱-۷۲ صاحب صد احترام السلام علیکم

۱۔ یاد آوری کا شکریہ۔

۲۔ میں نے ناشرین "دو اسلام" کو تاکید کی ہے کہ وہ اس کا آئندہ کوئی ایڈیشن شائع نہ کریں۔

۳۔ تاریخ تدوین حدیث گم ہو گئی تھی، ساری نہیں بلکہ ۳۲ اوراق۔ وہ مجھے دوبارہ لکھنے پڑے۔ مآخذ کی دوبارہ تلاش کی اور مسوّدے کو مکمل کر کے پھر ارسال کیا۔ اب اس کی کتابت ہو رہی ہے۔ دعا فرمائیں اس کی اشاعت میں آئندہ کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ والسلام

غلام جیلانی برق

عہ۔ یہ خط ہمیں نہیں ملا۔